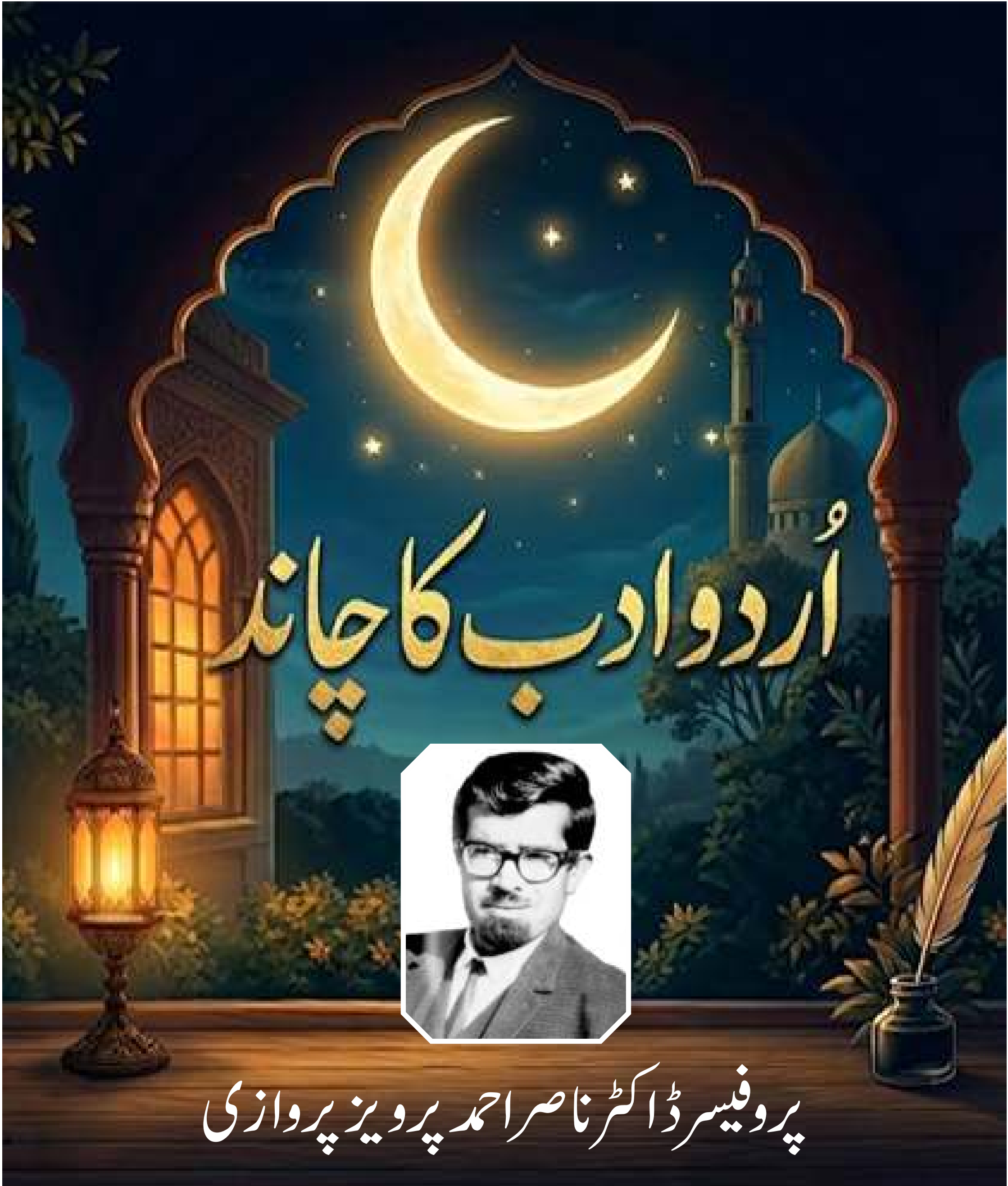

اُردو ادب کا چاند

پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی

مرتبہ

رانا عبدالرزاق خان، لندن

محترم ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب کی چند تصاویر

اُردوادب کا چاند

(سیرت ڈاکٹر پرویز پروازی)

مرتبہ

رانا عبدالرزاق خان،لندن

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب	:	اُردوادب کا چاند
مصنف	:	رانا عبدالرزاق خان
ناشر	:	قندیل ادب انٹرنیشنل لندن
سن اشاعت	:	2026ء
ملنے کا پتہ	:	ٹوٹنگ وانڈز ورتھ لندن

Qindeel-e-Elim

(Articals on History, Education, Politics & Poetry.)

By: Rana Abdul Razak Khan London

E-mail:ranarazzaq52@gmail.com

(M) 00447886304637

فہرست

نمبر	مضامین	صفحہ
	فہرست	iii
	حرف آغاز	xi
	پروازی صاحب کا ایک ادبی کارنامہ۔ زکریا ورک کینیڈا	xiii
	کہی ان کہی۔صفدرنذیر جاوید گولیکی واقفِ زندگی کینیڈا	xv
	تبصرہ بر ’’اردو ادب کا چاند‘‘ رانا محمد حسن خان	xviii
	محترم پروفیسر ناصر احمد پرویز پروازی صاحب۔عبدالحمید حمیدی ٹورانٹو	xx
	اردو ادب کا چاند۔عبدالکریم خالد صاحب۔لاہور	xiii
	مکرم و مولانا احمد خان صاحب نسیم مجاہد برما۔سعدیہ ناصر صاحبہ	1
	مکرم مولانا نسیم مہدی صاحب مربی سلسلہ۔سعدیہ ناصر	3
	مکرم نسیم مہدی صاحب مرحوم کے کارہائے نمایاں۔ابوالحسن	5
	تعارف پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی	9
	میرے ابوجان، مرحوم پروفیسر ناصر احمد خان پرویز پروازی۔سعدیہ	11
	محترم پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد خان صاحب المعروف پرویز پروازی وفات پا گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون	25

	پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد خان صاحب پرویز پروازی صاحب کا ذکر خیر	26
	مولانا نسیم مہدی صاحب رانا عبدالرزاق خاں	31
	استاذ الاساتذہ۔ڈاکٹر پرویز پروازی۔ڈاکٹر عبدالکریم خالد	35
	استاذی جناب پروازی صاحب کی خوش مزاجی۔ناصر احمد وینس	45
	ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی کچھ شکستہ داستانیں، کچھ پریشاں تذکرے ہدایت اللہ ہادی، ایڈیٹر احمدیہ گزٹ کینیڈا	50
	پروفیسر پرویز پروازی کی باتیں اور انمٹ یادیں زکریا ورک۔ٹورانٹو	69
	پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد خان پرویز پروازی۔ انجینئر محمود مجیب اصغر سویڈن	85
	اردو خودنوشت، ایک قدم آگے۔عارف وقار	90
	میرے اُستاد میرے محسن۔پروفیسر مبارک احمد عابد	93
	پروازی صاحب کی یاد میں۔بشیر طارق سسکٹون کنیڈا	96
	''اپنے استاد ڈاکٹر پرویز پروازی کی یاد میں'' ناصر عباس نیّر	102
	مشہور ادیب داؤد رہبر کا تبصرہ	105
	ایک نابغۂ روزگار شخصیّت محترم پروفیسر ناصر احمد پرویز پروازی محمد کولمبس خاں جرمنی	108
	پروفیسر ناصر احمد پروازی: چیف سید معین شاہ	111

	قہقہوں کے وہ ”زمانے آج رخصت ہو گئے۔عبدالکریم قدسی۔امریکہ	115
	آہ! ناصراحمد خاں پرویز پروازی مرحوم	116
	استاذی المحترم پروفیسر پرویز پروازی صاحب کی یاد میں منیر احمد باجوہ	117
	محترم ناصراحمد پرویز پروازی مرحوم۔منوراحمد کنڈے	118
	محترم ناصراحمد پرویز پروازی مرحوم۔ڈاکٹر عبدالکریم خالد	119
	پروایزی صاحب کے چند مضامین	120
	قادیان کے بزرگ۔ڈاکٹر ناصراحمد پرویز پروازی	120
	حضرت میر قاسم علی صاحب	120
	حضرت مولوی شیر علی	124
	بابا جی فضل محمد ہرسیاں والے	125
	حضرت میر محمد اسماعیل	126
	سابق پروفیسر تعلیم الاسلام کالج ربوہ۔ایک احمدی سائنس دان کا اعزاز	127
	سعید انجم۔فلسفی شاعر+افسانہ نگار۔پرویز پروازی	129
	باسکٹ بال سے ہدایت اللہ ہادی تک۔پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی	145
	شعروسخن	152
	بحضور سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ۔از ناصراحمد صاحب پروازی	153
	ناصر دین بھی ہے حافظ قرآن بھی ہے	154

	دلوں کو تسخیر کرنے والا دلوں کو تسخیر کر رہا ہے	155
	غزل۔ خوشبو کی طرح پیرہن گل سے جدا ہیں	156
	غزل۔ جو زخم بھر چکا ہے وہی پھر ہرا نہ ہو	157
	غزل۔ خاکِ ہوائے دشتِ وفا مل گئی مجھے	157
	غزل۔ رسنگ سنگ ہے مگر آتش بجان ہے	158
	غزل۔ حلقۂ چشم تحیر سے رہائی دیتا ہے	158
	غزل۔ اندھے، گونگے ہیں اور بہرے ہیں	159
	غزل۔ شہر میں ایک تو ہو میرے علاوہ کوئی	159
	غزل۔ اس شخص کے سینے میں	160
	غزل۔ دلوں پہ یوں نقش کیا	160
	غزل۔ چہرے سجے ہوئے ہیں	161
	غزل۔ معجزہ دیکھ لیا دل کی شکیبائی کا	161
	غزل۔ سوچ کے گہرے سمند میں اُترنا ہوگا	162
	غزل۔ دل مبتلا ہے اک وفا نا آشنا کے ساتھ	162
	غزل۔ رہ طلب کا مسافر	163
	غزل۔ خزاں رسیدہ بہاریں، ستم رسیدہ چمن	163
	غزل۔ جو شمع ہم نے جلائی جلا سکا نہ کوئی	164

	غزل۔تیرے اسیر ہو کے ہم گویا رہا ہوئے	164
	غزل۔آئی سحر تورات کے سائے ہوا ہوئے	164
	غزل۔انی معک یا مسرور شہر بنا ہے کوہ طور	165
	غزل۔آئی سحر تورات کے سائے ہوا ہوئے	165
	غزل۔کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے؟	166
	غزل۔خزاں رسیدہ بہاریں ستم رسیدہ چمن	166
	غزل۔اے محسنِ زمانہ	167
	ربائی۔	169
	غزل۔یہ کوئی دجل ہے یا کوئی عدل ہے	170
	غزل۔لگالو قیمتِ دل تم کڑی کڑی کر کے	171
	اجنبی	172
	ذِکرِ اُردُو۔اردو کانفرس 1964ء	173
	حرف آغاز	175
	خطبہ استقبالیہ	176
	خطبۂ افتتاح	178
	پیغامات	179

	اردو رسائل زبان کی کس طرح خدمت کرسکتی ہیں۔حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب امام جماعت احمدیہ	182
	ادب اور زندگی کا رشتہ۔سجاد باقر رضوی	190
	اردو بحیثیت قومی زبان۔ڈاکٹر وحید قریشی	202
	اردو زبان میں دخیل الفاظ کا مسئلہ۔سہیل بخاری (۔پی۔ایچ۔ڈی)	209
	اردو میں سائینسی تدریس کے امکانات ممتاز حسین۔صدر شعبہ اردو زرعی یونیورسٹی لائلپور	220
	غیر ممالک میں احمدی اردو کی ترویج و اشاعت میں کیا حصہ لے رہے ہیں۔نسیم سیفی	228
	رپورٹ۔تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی دوسری کل پاکستان اردو کانفرنس	238
	احمدیہ کلچر۔پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی	242
	فہرست مضامین	243
	اظہارِ سپاس	245
	دیباچہ	246
	احمدیہ کلچر	249
	میرا مرشد	284
	تازہ بستیاں آباد	307

	دو نسلوں کا بُعد	308
	خاموش علماء	329
	اپنے اساتذہ کے بارے میں	351
	کچھ بے نفس لوگ	356
	گودڑ میں کے لعل	369
	غیر ممکن کو یہ ممکن میں بدل دیتی ہے	377
	رشتۂ مودت	386
	خدا کے کچھ متوکل بندے	393
	سرخ رومال والا صوفی	398
	مددگار کارکن	405
	اگرچہ سربتراشد قلندری داند	413
	خاموش کارکن	421
	ہمارا مکتبِ عشق	425
	ہمارے دکاندار!	469
	جلسہ سالانہ اور آب خورے	482
	مالک رام کی احمدیت	489
	پاکستان میں اردو ادب اور جماعت احمدیہ	504

	ربوہ کے احمدی شعراء	518
	جانے والے کا جانا	526
	دوتین سفرنامچے	558
	جادہ، جادہ، جادہ پیمائی	558
	ذرا اوسلو تک	584
	سر بریدہ کی واپسی	598
	بسم اللہ الرحمن الرحیم	606

حرف آغاز

اردو ادب کا چاند۔رانا عبدالرزاق خاں

محض میرے پروردگار کا یہ احسان اور فضل ہے کہ خاکسار جب بھی کوئی کتاب مرتب کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ میری مدد خوب کرتا ہے ۔کتاب کی تکمیل کے بعد خاکسار خود حیران ہوتا ہے کہ یہ کام کیسے ممکن ہو گیا۔جنوری 2026ء کے شروع میں محترم پروازی صاحب کے بارے میں محترم ڈاکٹر عبدالکریم خالد صاحب سے ایک مشاعرہ کرنے کا مشورہ کیا۔تو وہ راضی ہو گئے۔محترم زکریہ ورک صاحب سے بھی مشورہ کیا تو فرمانے لگے کہ میں اس مشاعرے کا ذکر پروازی صاحب کے بچوں سے بھی کروں گا۔آپ مشاعرے کا لنک ضرور بھیج دیں یہ مشاعرہ ۱۲ فروری ۲۰۲۶ کو زوم پر ہوا۔جس میں صدارت محترم ڈاکٹر عبدالکریم خالد صاحب کی تھی۔مہمان خصوصی ڈاکٹر منور احمد کنڈے، اصغر خیالی صاحب اور عبدالشکور شاکر امریکہ تھے۔خاکسار اور منیر احمد باجوہ نیز رانا محمد حسن، صدیق کنجاہی اور عبدالحمید حمیدی بھی موجود تھے۔میں نے لنک بھیج دیا ۔اس مشاعرے میں پروازی صاحب پر کئی شعراء نے تبصرے بھی کئے۔اور ان کے متعلق نظمیں بھی کہیں۔آخر میں محترم ڈاکٹر عبدالکریم خالد صاحب محترم پروازی صاحب پر قدر تبصرہ کیا۔خاکسار نے اس دن محترم پروازی صاحب پر کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا۔

محترم ڈاکٹر عبدالکریم خالد صاحب اور زکریا ورک صاحب نے میری بہت حوصلہ افزائی کی اور تعاون کا یقین دلایا۔محترم پروازی صاحب کی بیٹی سعدیہ صاحبہ نے ان کی ۱۱ غیر مطبوعہ غزلیں اپنے قلم سے لکھ کر ارسال کیں۔وہ تو میرے لئے ایک نئی دریافت تھی۔زکریا ورک صاحب نے المنار امریکہ

دسمبر ۲۰۲۳ اور کتب کی فہرست اور کئی غزلیں الفضل ربوہ اور المنار ٹی آئی کالج ربوہ سے تلاشِ بسیار کے بعد مجھے ارسال کیں ۔ بعض اہل قلم دوستوں سے تبصرہ لکھنے کی درخواست کی ۔ وہ بھی معاون ثابت ہوئے ۔ جب کتاب صد صفحات تک پہنچی تو اس کی ضخامت کو بڑھانے کے لئے پروازی صاحب کی کچھ کتب کا ذکر ضروری سمجھا نیز میری پسندیدہ کتب جو کہ مرحوم کی اعلیٰ خدمات نشاندہی کرتی تھیں ۔ آپ کی کتاب ذکرِ اردو اور احمدیہ کلچر کو شامل کر دیا گیا ۔ تاکہ مرحوم کا دل اردو ادب کی ترویج کے لئے ہمیشہ دھڑکتا رہا ۔ اس شخص نے ایک نابغہ روزگار کی طرح اردو کی آبیاری کی ۔ اور دیارِ غیر میں اردو ادب کی آبیاری کو مقدم رکھا اور اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا ۔ سارے پاک و ہند کے علاوہ جاپان ، سویڈن یورپ امریکہ ، کینیڈا اردو ادب کی روشنی بکھیرے رکھی ۔ پاکستان میں بھی اس کے حاسدین اور معاندین اس کی روشنی در پے رہنے کے باوجود ناکام و نامراد رہے ۔ بیوروکریسی اور ناہنجار ملاؤں بھی اس کی کاوشوں کا بال بیکا نہ کر سکے ۔ بار بار تبادلے پروازی صاحب کے ارادوں کو شکست نہ دے سکے ۔ خاکسار بھی ان کا شاگرد رہا ہے ۔ ۱۹۶۹ اور ۱۹۷۰ میں خاکسار ان سے اردو پڑھتا رہا ۔ آپ کی کلاس میں طلباء اسقدر محویت سے اردو پڑھتے تھے کہ جنگل سی خاموشی ہوتی تھی ۔ محترم پروازی صاحب ایک شعر کی تشریح میں پورا پیریڈ صرف کر دیتے تھے ۔ ادبی لطائف بیان کرنے کا انہیں بہت سلیقہ تھا ۔ چہرے پر مسکراہٹ ابدی تھی اس مثل مہتاب شخص کا چہرہ آج بھی مسکراتا ہوا میرے سامنے آجاتا ہے ۔ تو دل غمگین ہو جاتا ہے ۔

وہ شخص خلافت کا دیوانہ اور ایک وضع دار شخصیت کا مالک تھا ۔ اس کے والد مولانا احمد خاں نسیم صاحب بھی ایک جید عالم تھے ۔ اور ان کے بھائی مولانا نسیم مہدی صاحب مرحوم بھی ایک عظیم خادم احمدیت تھے ۔ آپ ایک مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے ۔ محترم پروازی صاحب کے ہزاروں

شاگرد ساری دنیا کے دوصد سے زائد ممالک میں ان کی پیروی میں اردو ادب کی روشنی اب بھی مسلسل بکھیر رہے ہیں۔ ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اپنے اساتذہ کا احترام اور شفقت پدری میں بہت ہی باعمل شخصیت کے مالک تھے۔ خدا غریق رحمت کرے۔ بہت ہی خوبیوں کے مالک تھے۔

پروازی صاحب کا ایک ادبی کارنامہ

زکریا ورک کینیڈا

اس کتاب (اردو ادب کا چاند) میں پروفیسر پرویز پروازی صاحب کی جملہ تصانیف کی جو فہرست دی گئی ہے اس میں ایک تصنیف نادانستہ طور پر بیان کرنے سے رہ گئی ہے۔ پروازی صاحب 1980ء میں ربوہ سے شائع ہونیوالے رسالہ ماہنامہ انصاراللہ کے ایڈیٹر تھے۔ ایک سال قبل پروفیسر عبدالسلام کو نوبیل انعام سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں پروازی صاحب نے نہایت عرق ریزی رسالے کا خاص ایڈیشن ''عبدالسلام نمبر'' کے نام سے شائع کیا۔ 1999 میں خاکسار ربوہ میں تھا تو خلافت لائبریری کے انچارج چوہدری محمد صادق صاحب کے توسط سے مجھے اس رسالے کو فوٹو کاپی کرنے کی اجازت مل گئی۔ یہ کاپی ابھی تک میرے پاس ہے۔

اس رسالے کے لئے سارا مواد پروازی صاحب نے خود تلاش کیا یا تیار کیا۔ اس کے مندرجات سے اس کی اہمیت اُجاگر ہوتی ہے: تجلیات الٰہیہ سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا اقتباس، سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ کے ارشادات، صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کا مبارکباد کا پیغام پاکستان ٹائمز 16، اکتوبر 1979، محترم چوہدی محمد حسین کی ڈائری کا ایک ورق، حالات زندگی صفحات دس تا بیس، حکومت پاکستان کیبنٹ سیکریٹریٹ (کیبنٹ ڈویژن) مبارکباد کا پیغام، وائس چانسلر قائد

اعظم یو نیورسٹی کی طرف سے پیش کردہ سپاسنامہ، مکہ سے شائع ہونیوالے رسالہ العالم الاسلامی میں اعلان۔ڈاکٹر سلام کے نوبیل انعام ملنے پر صفحہ 43 پر پاکستانی اخبارات میں چھپنے والی 108 خبروں اور مضامین کا اشاریہ دیا گیا ہے جو کہ قابل تعریف ہے۔

صاحبزدہ مرزا طاہر احمد صاحب نے رسالہ ملنے پر ایڈیٹر کو لکھا: انصاراللہ کا تازہ شمارہ موصول ہوًا۔ اپنے stuff کے لحاظ سے بڑا اچھا معیار ہے مگر اتنے اچھے مضامین کا اتنے ناقص گٹ اپ کے ساتھ دیکھ کر افسوس ہوًا۔ کتاب ہذا کی ایک منفرد و مثبت بات یہ ہے کہ اس میں پہلی بار رانا عبدالرزاق خاں صاحب کی محنت اور خلوص سے پروازی صاحب کا کلام جو ہمیں دستیاب ہو سکا اس کو ’’دیوان پرویز پروازی ‘‘کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔ان کا کلام جماعت احمدیہ کے مختلف رسالوں، اخبارات، نیز غیر مطبوعہ کلام ایک جگہ کتابی صورت میں نہیں تھا اس لئے یہ اعزاز مؤلف کتاب کو جاتا ہے کہ انہوں ہے کہ اس طرف توجہ فرمائی۔غیر مطبوعہ کلام کے حصول کے لئے ہم پروازی صاحب کی لائق و فائق دختر سعدیہ ناصر کے بھی شکر گزار ہیں۔

اس معرکہ آراء کتاب کے شروع میں آپ کے شاگردوں (پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم خالد صاحب، ناصر وینس صاحب، خاکسار زکریہ ورک) کے جو مضامین شامل اشاعت کئے گئے ہیں یہ سب مجلس طلبائے قدیم ٹی آئی کالج کے رسالہ المنار امریکہ جلد نمبر 3، شمارہ نمبر 4، اپریل 2024 میں شائع ہوئے تھے جس کے لئے ہم اس کے مدیران، ادیب شہیر سفیر رامہ اور ناصر جمیل کے بھی ممنون احسان ہیں۔نیز رانا عبدالرزاق خاں صاحب نے عرصہ تین ماہ میں یہ کتاب تیار کر کے پروازی صاحب کے شاگرد ہونے کا کمال حق ادا کیا ہے۔

زکریا ورک مسیپل۔(ٹورنٹو، کینیڈا۔ 12۔اپریل 2026)

کہی ان کہی

صفدر نذیر جاوید گولیکی واقفِ زندگی کینیڈا

’’سورج کے ساتھ ساتھ‘‘ لکھنے والے ناصر احمد خاں ڈاکٹر پرویز پروازی کی سوانح ’’اردو ادب کا چاند‘‘ کے نام سے مکرم عبدالرزاق صاحب عاصی صحرائی نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے لکھے ہیں۔ آج کے دور میں جب ہر طرف افراتفری کا عالم ہے۔ اردو ادب کے اس چاند کی روشنی کو مدہم نہیں ہونے دیا۔ بلکہ چار چاند لگا دیئے ہیں۔

حضرت مسیح موعودؑ کے ماننے والوں نے جس کام کو ہاتھ میں لیا اسے بام عروج تک پہنچایا اور خدا نے اپنے وعدوں کے مطابق ان کے کاموں میں برکتیں رکھ دیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام ہوں، سر چوہدری ظفر اللہ خان صاحبؓ یا سر افتخار احمد ایاز صاحب، سائنسی دنیا ہو طب کی دنیا ہو۔ ادب کی دنیا ہو، غرض یہ کہ کوئی بھی علم کا میدان ہو۔ احمدی احباب کو اللہ تعالیٰ نے فوقیت عطا کی ہے۔ ادب کی دنیا میں ناصر احمد خاں ڈاکٹر پرویز پروازی کا نام جانا پہچانا ہے۔

نہایت قیمتی اور اعلیٰ مقالے اور کتب بیسیوں سے زائد تحریر کئے۔ آپ کی بیٹی سعدیہ نے خوب کہا۔

’’وہ جو خود قلم پکڑتے تھے تو صفحات پر اپنے الفاظ سے حالات و واقعات کی ایسی تصویر کھینچتے تھے کہ پڑھنے والوں کی نظروں کے سامنے ان حالات و واقعات کی فلم چل پڑتی تھی کبھی وہ آپ کو قادیان کی گلیوں میں حضرت مسیح موعودؑ کے صحابہ کے ساتھ لا کھڑا کرتے تھے تو کبھی ٹی آئی کالج کے کلاس روم میں بٹھاتے تھے کبھی جاپان کی سیر پر لے جاتے تو کبھی سویڈن۔ آپ کا منفرد انداز بیان دلوں کو موہ لینے والا تھا۔

جاپانی کلچر اور سوسائٹی سے بے حد متاثر تھے اور جاپان کی بہت تعریف ’’سورج کے ساتھ ساتھ‘‘ میں

لکھی اور آخری عمر تک جبکہ سویڈن اور کینیڈا جیسے ملک دیکھ چکے تھے یہ رائے قائم رہی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ نے 16 اکتوبر 2023ء خطبہ جمعہ میں آپ کے اوصاف کریمانہ بیان کر کے ہمیشہ کے لئے ان کے کاموں کو امر کر دیا۔ آپ کا حاصل عمر ''حبل الورید'' قرآن کریم کا اردو ترجمہ (غیر مطبوعہ)'' ہے اللہ کرے ان کی اولاد اسے شائع کر دے۔

شعروشاعری سے خوب لگاؤ تھا۔ اور بقول ڈاکٹر عبدالکریم خالد صاحب لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کا م آفاق کی اس کارگر شیشہ گری کا ان کی ایک مثنوی کا ایک شعر جو 18 اشعار میں سے ہے۔ دل میں اپنی جگہ بناتا چلا جاتا ہے اور یہ ٹی آئی کالج کے بارے میں ہے۔

اخوت کے پانی سے سیراب بند ہے محبت کی چنچل نگاہوں کی بستی یہ علم وعمل کی حسیں شاہراہوں پر چلتی ہوئی درسگاہوں کی بستی تحقیق کے میدان کے یہ شہ سوار تھے۔ آپ نے سینکڑوں علمی ادبی تنقیدی مضامین ملک کے وقیع جرائد ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ...... ''پس نوشت'' 2003 اور دوسری ''پس نوشت'' 2008ء میں شائع ہو چکی ہے۔ پس نوشت حصہ سوم 2010ء میں شائع ہوئی جو 69 آپ بیتیوں کا تجزیہ ہے۔ گویا 211 آپ بیتیاں آپ کے مطالعہ کے دائرہ کو سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ کس قدر بڑا تھا۔ معروف ترقی پسند دانش ورحمید اختر کی بات سو فیصد اور لوہے پر لکیر کی طرح ہے۔

کسی بھی زیر تبصرہ کتاب میں کوئی تضاد بیانی ہو یا کسی لکھنے والے نے واقعات بیان کرنے میں غلطی کا ارتکاب کیا ہو تو برسوں بلکہ عشروں قبل شائع ہونے والی کسی دوسری آپ بیتی کے مستند حوالوں سے مع اس کتاب کا صفحہ نمبر کے متعلقہ تحریر کے ذریعہ صحیح واقعات سامنے آتے ہیں دو اڑھائی سو کتابوں کے جن کی اشاعت کا زمانہ ستر اسی برس پر محیط ہو متن سے ایسے حوالوں کو ڈھونڈ نکالنا یا یاد رکھنا ہمارے جیسے خاکی انسان کے بس کی تو بات ہی نہیں۔ ایسا جناتی کام پروازی صاحب جیسا آدمی ہی کر سکتا ہے، جسے

اپنے علمی اور تحقیقاتی کام سے جنون کی حد تک لگاؤ ہو۔ (پس نوشت جلد سوم صفحہ 10)

پس دنیائے ادب کی نابغۂ روزگار شخصیت کے بارے میں کچھ مزید کہنا یا لکھنا مجھ جیسے کم علم حقیر پُر تقصیر آدمی کے لئے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے خاص طور پر ایسی علمی، ادبی ذوق رکھنے والے قارئین کے سامنے جو شعر و سخن، فکر و فن کی دنیا میں لاجواب ہوں اور صاحب ذوق قارئین حضرات ہوں وہاں میری یہ ادنیٰ سی تحریر سورج کو چراغ دیکھانے کے مترادف ہے۔

مَیں یہاں اس بات کا تذکرہ کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہا ہوں کہ مکرم پرویزی صاحب کے خسر محترم مولانا محمد احمد جلیل صاحب جامعہ احمدیہ میں ہمارے حدیث کے استاد ہوتے تھے یہ بزرگان ایسے مقام کے تھے جب کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا۔آپ جیسے اعلیٰ پائے کے بزرگوں سے علم حاصل کرنے بڑی سعادت سے کم نہیں۔اور ان کی علمی فراست اور دور اندیشی کو داد دیجئے جنہوں نے اپنے لختِ جگر کے لئے پروازی جیسا ہیرا پسند کیا۔جس نے دنیا میں اپنا ایک نام اور مقام پیدا کیا۔آپ پر لکھی جانے والی کتاب میں مجھے جیسے نابلد کو شامل کرنا میری عزت افرائی ہے۔

بہر حال امر واقع یہ ہے کہ جن لوگوں کے بارہ میں لکھنا آسان لگتا ہے ان کے بارہ میں ہی لکھنا مشکل ہوتا ہے۔ بہر حال مکرم عبد الرزاق خان صاحب عاصی صحرائی کی فرمائش پر یہ چند الفاظ لکھ کر ثواب دارین حاصل کرنے کا متمنی ہوں۔گر قبول است۔

صفدر نذیر جاوید گولیکی کینیڈا

14/3/2026

تبصرہ بر ”اردو ادب کا چاند“

رانا عبدالرزاق خاں صاحب کی ایک اور کتاب ” اردو ادب کا چاند“ کی چاندنی نے مجھے مجبور کیا ہے کہ اس کتاب کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور کہوں۔ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ یہ کتاب موصوف کی 16 ویں کتاب ہے۔محترم رانا صاحب نے ” اردو ادب کا چاند“ جس نامور علمی، ادبی ہستی کو کہا ہے وہ قادر الکلام شاعر، محقق، بلند پایہ نقاد، ادیب، انشا پرداز اور مترجم ڈاکٹر ناصر احمد خاں ہے مگر ادبی دنیا میں پرویز پروازی کے نام سے مشہور ہے۔ گو خاکسار اس اردو ادب کے چاند سے کبھی نہیں ملا مگر ان کی کتاب پس نوشت نے ان سے ادبی تعلق پیدا کر دیا تھا۔ان کے سوانح عمریوں کے تنقیدی جائزے نے میرے غور وفکر کرنے کے انداز میں مثبت تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ سوانح عمریوں کے تنقیدی جائزے نےمجھے پہلی بار باور کرایا کہ جوش ملیح آبادی کی یادوں کی بارات میں فخر ومباہات کا عنصر، مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی آپ بیتی میں شرمندگی اور ندامت کا احساس اور قدرت اللہ شہاب کی کتاب شہاب نامہ فکشن اور فیکٹ کا مجموعہ ہے۔ پروازی صاحب نے 211 آپ بیتیوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ سچ بولنے والوں کو مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے پروازی صاحب کو بھی سچ بولنے کی پاداش میں مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا مگر یہ سچ کا عاشق مسکراتے چہرے کے ساتھ اپنا کام کرتے ہوئے آگے سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ پروازی صاحب کا تدریسی سفر گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ سے شروع ہوا کچھ عرصہ بعد تعلیم الاسلام کالج میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔اوساکا یونیورسٹی جاپان میں بطور پروفیسر اردو پڑھاتے رہے اس کے ساتھ ساتھ جاپان کی منتخب کردہ ہائیکو شاعری کا اردو میں ترجمہ بھی کرتے تھے۔ان کی مشہور کتاب ”سورج کے ساتھ ساتھ“ جاپان سے ان کی محبت کی عکاس ہے۔آپ

جاپان میں چار برس رہے اور واپس پاکستان آنے پر انہیں بے حد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مذہبی تعصب کے باعث بالآخر انہیں جس وطن سے بے حد محبت تھی اسے چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا اور آپ سویڈن چلے گئے بعد ازاں کینیڈا میں اپنی وفات تک مقیم رہے، جس کی تفصیل اس کتاب میں موجود ہے۔

ہجرت کے سفر میں دل نے یہ جانا آخر کار	گھر وہی ہوتا ہے جس میں کوئی یاد بستی ہو

617 صفحات پر مشتمل کتاب ''اردو ادب کا چاند'' میں پرویز پروازی صاحب کی علمی، ادبی زندگی کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔ پرویز پروازی صاحب کی تمام کتابوں اور مضامین کا تعارف اور ان کے ہونہار شاگردوں و دیگر ادبی شخصیات کے تبصرے بھی اس کتاب کی زینت ہیں۔ امام جماعت احمدیہ مسلمہ اور پرویز پروازی صاحب کی بٹیا محترمہ سعدیہ ناصر صاحبہ نے جس انداز سے پروازی صاحب کے حالات زندگی بیان کیے ہیں وہ بجا طور پر ہمارے لیے مشعل راہ ہیں خاص طور پر نوجوانوں کے لیے۔

وقت کے ہاتھوں میں کیا رکھا ہے ، سب جانتے ہیں
پھر بھی انسان امیدوں کے چراغ جلاتا ہے

محترم رانا عبدالرزاق خان صاحب کی یہ کاوش بلا مبالغہ داد و تحسین کی حقدار ہے۔ رانا صاحب کا جماعت احمدیہ مسلمہ کی نابغۂ روزگار ہستیوں کے حالات زندگی قلم بند کرنے جیسا اہم اور کٹھن کام سر انجام دینا نہ صرف ان ہستیوں کی عظمت کا اعتراف ہے بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں پر احسان بھی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ رانا صاحب کو صحت و تندرستی والی لمبی اور فعال زندگی عطا فرمائے اور انہیں مختلف موضوعات پر لکھنے کی توفیق عطا فرماتا چلا جائے۔ آمین یا رب العالمین

خاکسار

چیف ایڈیٹر پیشوا انٹرنیشنل لندن

رانا محمد حسن خاں

محترم پروفیسر ناصر احمد پرویز پروازی صاحب

عبدالحمید حمیدی ٹورانٹو

محترم پروفیسر ناصر احمد پروازی صاحب سے خاکسار کی پہلی ملاقات تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں ہوئی۔ جبکہ خاکسار نے 1968ء میں فسٹ ائیر میں داخلہ حاصل کیا۔ پروازی صاحب اردو کے استاد تھے اور سارے طالب علموں میں بہت مقبول تھے۔ ان کی کلاس کالج کے مین ہال میں ہوا کرتی تھی۔ جہاں پر سارے ہی گروپ پری میڈیکل اور پری انجینئرنگ کے اکٹھے ان کے پیریڈ میں جمع ہوتے تھے۔ ان کا پڑھانے کا انداز دوسرے اساتذہ سے بہت مختلف تھا۔ شعروں کی تشریح کرنا ہو یا اردو کے افسانے یا اردو گرامر پر بات کرنی ہو۔ طالب علموں کو سوال کرنے اور جستجو کرنے اور تحریروں اور لکھاریوں پر مختلف زاویوں سے سوچ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ طالب علم صرف کورس کی کتاب کی حد تک نہ رہے۔ بلکہ اس کی سوچ کا دائرہ وسیع ہو۔ کالج میں پروازی صاحب کا دفتر ایک چھوٹی سی جگہ پر تھا۔ جس میں بمشکل دو یا تین افراد بیٹھ سکتے تھے۔ پروازی صاحب اس پر بہت خوش تھے۔ ہوسٹل میں خاکسار کی رہائش تھی۔ تو اکثر اوقات ضروریات کی خرید نے کی خاطر گول بازار کا رُخ کیا جاتا تھا۔ ربوہ کی سڑکیں اس زمانے میں بالکل کچی مٹی کی تھیں۔ اور ہر وقت دھول اُڑتی رہتی تھی۔ ایک شام کا ذکر ہے کہ خاکسار اپنے کزن ڈاکٹر عطاء الرحمان کے ساتھ گول بازار پہنچا تو عین اس وقت موسم خراب ہوا اور آندھی اور بارش شروع ہوگئی۔ وہاں پر اس وقت اتفاق سے پروازی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔

شام کافی ہوگئی تھی ہوسٹل میں تو Mess بند ہو چکا تھا۔ اور ہمیں خوب بھوک لگ رہی تھی۔ چنانچہ ہم

نے پروازی صاحب کے ساتھ گول بازار میں ایک ہوٹل سے چنے اور تنور کی روٹیاں لیں اور اس طرح اکٹھے بھوک کا علاج کیا یہ ایک یادگار واقعہ تھا۔ایک اور واقعہ یوں ہے خاکسار ہوسٹل سے نکلا اور گول بازار جانے کے لئے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتا گیا ہمارے آگے بھی چند لڑکے جا رہے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک لڑکا گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ ہم نے کوشش کی کہ اس کو فضل عمر ہسپتال پہنچایا جائے۔ چنانچہ قریب ہی ایک گھر سے ہم ایک چارپائی مستعار لی اور اس کو چارپائی پر ڈال کر ہسپتال لے گئے۔ یہ گھر جہاں سے چارپائی مستعار لی تھی پروازی صاحب کا گھر تھا۔ بعد میں اس لڑکے کے متعلق علم ہوا کہ اس لڑکے کو اس سے قبل بھی کوئی دورہ وغیرہ پڑ جاتا تھا۔کینیڈا میں محترم پروازی صاحب سے ملاقات ہوئی تو خاکسار کو وہ واقعہ یاد آ گیا۔ کہ کس طرح انہوں نے ہمیں چارپائی عطا کی تھی کہ لڑکے کو ہسپتال لے جائیں۔اس پر انہوں نے بے ساختہ کہا۔ میں تو ابھی تک انتظار کر رہا ہوں کہ آپ میری چارپائی واپس لوٹائیں گے۔اس پر محفل زعفران زار بن گئی۔

ٹورنٹو میں خاکسار نے محترم پروازی صاحب کی صدارت میں بے شمار مشاعرے پڑھے، ان کو پروگراموں میں ڈسپلن کا بہت خیال رہتا تھا اور وہ پروگرام کے دوران اگر کوئی غلطی ہو جاتی تو اس کی نشان دہی کر دیا کرتے تھے۔شاعری کی نئے لکھنے والوں کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ خاکسار کے استاد تھے۔مگر جب بھی ملاقات ہوتی تو مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کرتے اور بالکل دوستوں کی طرح رویہ ہوتا تھا۔ اندازِ گفتگو شگفتہ ہوا کرتا تھا۔ اور مزاح کا پہلو گفتگو سے نکال لیا کرتے تھے۔ خاکسار کوئی مرتبہ ان کی رہائش گاہ پر جا کر ملاقات کا بھی شرف حاصل ہوا۔ جماعتی تعلق کو انہوں نے برملا بیان کیا۔کینیڈا کے ایک بہت اچھے شاعر جو کہ ایک مقامی ٹی وی کے ساتھ منسلک تھے۔انہوں نے پروازی صاحب کا انٹرویو کیا تو پروازی صاحب نے قادیان میں اپنی پیدائش سے لے کر ربوہ میں تعلیم الاسلام

کالج سے وابستگی اور ساری تفاصیل بیان کیں اور وہ انٹرویو مقامی ٹی وی پر نشر بھی کیا گیا۔

ربوہ میں تعلیم الاسلام کالج کے دور میں خاکسار کی رہائش فضل عمر ہوسٹل میں تھی اور ہوسٹل کی روایات تھیں کہ سالانہ تقریبات منعقد ہوتی تھی۔جس میں خاکے پیش کئے جاتے تھے۔خاکسار نے اس کے لئے خاکے پیش کئے اور انعامات بھی حاصل کئے۔ان خاکوں کی تیاری میں پروازی صاحب نے بھی خاکسار کی مدد کی۔وفات سے قبل پروازی صاحب کچھ عرصہ علیل رہے۔اور چلنے پھرنے میں دقت ہونے لگی واکر سے چلتے تھے کچھ عرصہ ہسپتال میں داخل رہنے کے بعد اپنے مولیٰ کے حضور حاضر ہو گئے۔اس طرح اردو ادب کا ایک روشن ستارہ غروب ہو گیا۔اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

محترم رانا عبدالرزاق خاں ایڈیٹر قندیل ادب انٹرنیشنل لندن نے یہ کتاب لکھ کر ہم سب پر ایک عظیم احسان کیا ہے۔یہ کتاب محترم پروازی صاحب پر ایک مفصل پہلی کتاب ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیروں جزا دے۔آمین۔

خاکسار

عبدالحمید حمیدی کینیڈا

اردو ادب کا چاند

ڈاکٹر عبدالکریم خالد صاحب ۔ لاہور

اپنی نوعیت کا منفرد عنوان ''اردو ادب کا چاند'' ہمارے ہر دل عزیز اور مقبول استاد پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی کے لئے خاص کیا گیا ہے اور اس کے مخترع ہیں، میرے نہایت پیارے دوست جناب رانا عبدالرزاق خان، جن کی استعداد علمی و قلمی کا میں ہمیشہ سے معترف ہوں اور ان کے ادبی کارہائے بے مثال کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ رانا صاحب کا اختصاص یہ ہے کہ انہیں کسی پل قرار نہیں ہے۔ ارادہ باندھتے ہیں، اسباب علم و ہنر بہم پہنچاتے ہیں اور برسوں پر پھیلے ہوئے منصوبوں کو آن کی آن میں نبٹا کر آئندہ منصوبوں کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ محض سوچتے ہی نہیں، کر گزرتے ہیں اور مجھ جیسے تاخیر روا رکھنے والوں کے پاس سوائے چشم حیرت کے کچھ باقی نہیں بچتا۔ دنیا نہاں کے کام انہوں نے اپنے سپرد کر رکھے ہیں۔ کہیں ''قندیل ادب'' چھپ رہا ہے۔ کہیں ''قندیل حق'' آ رہا ہے۔ کہیں ''بقائے ادب'' کی تزئین میں مصروف ہیں۔ کتابوں پر کتابیں چھپ رہی ہیں۔ ڈھیروں کتابیں، جنہیں اوپر نیچے رکھ کر دیکھیں تو ایک مینار بن جائے۔ آپ نے ''قطب مینار'' تو سنا ہوگا جو ہندوستان کی شناخت ہے لیکن لندن کے قلب میں ایستادہ ''کتب مینار'' کو جاننا چاہتے ہیں تو رانا عبدالرزاق خان کے وسیع و عریض اور قدآور کام کو دیکھ لیں۔ ''اردو ادب کا یہ کتب مینار'' اپنی تحیر آمیز کارکردگی کے سبب آپ کو ورطہ حیرت میں ڈال دے گا۔ یہ حیرانی آپ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دے گی کہ اردو ادب کے مراکز سے دور بیٹھ کر اتنا بڑا کام سرانجام دینا کیسے ممکن ہے؟

رانا عبدالرزاق خان کو میں ان جواں مردوں میں شمار کرتا ہوں جن کی اساس آہنی ہوتی ہے اور وہ

ہر طرح کے طوفان اور مشکل کا مقابلہ ہمت، حوصلے اور پامردی کے ساتھ کرتے ہیں اور گھبراہٹ یا پریشانی کا ہلکا سا لہریا بھی ان کی پیشانی پر نہیں جاگتا۔ ارادہ، استقلال اور عزم راسخ ان کی شخصیت کا جوہر ہوتا ہے اور وہ ہر عہد اور زمانے میں سرفراز رہتے ہیں۔ آپ ''اردو ادب کا چاند'' پڑھیں گے تو جہاں استاد محترم پروازی صاحب کو یاد کریں گے وہاں رانا عبدالرزاق خان کو بھی داد دیں گے۔

عبدالکریم خالد صاحب۔ لاہور۔

24 اپریل 2026۔ جمعہ

مکرم ومحترم مولانا احمد خان صاحب نسیم مجاہد برماو سابق ناظر اصلاح وارشاد

سعدیہ ناصر صاحبہ

مکرم ومحترم مولانا احمد خان صاحب نسیم مجاہد برماو سابق ناظر اصلاح وارشاد 1908ء میں چنگا بنگیال تحصیل گوجرخان میں پیدا ہوئے۔آپ کا نام حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے رکھا تھا۔حضورؑ نے اپنے خط میں فرمایا تھا کہ بچے کا نام احمد خان رکھیں اللہ تعالیٰ بچے کو خادم دین بنائے۔آپ کے والد محترم میاں فضل خان صاحب اور والدہ محترمہ مہتاب بی بی تھیں۔آپ کا بچپن قادیان میں گذرا اور تعلیم بھی قادیان میں ہی حاصل کی۔تعلیم الاسلام ہائی سکول کے بعد آپ نے مولوی فاضل کی ڈگری کے لئے جامعہ احمدیہ میں داخلہ لیا۔مولانا احمد خان نسیم صاحب نے چھوٹی عمر سے ہی اپنی زندگی خدمتِ دین کے لئے وقف کر دی تھی۔اور آپ کا شمار ابتدائی مبلغین سلسلہ میں ہوتا ہے۔مولانا صاحب نے خلافت سے جی جان سے محبت واخلاص و وفا کی۔آپ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کی زندہ مثال تھے۔آپ کا حضرت مصلح موعودؓ سے اور آپ کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ سے بہت اخلاص کا تعلق تھا۔مولوی فاضل کی ڈگری حاصل کرنے تادمِ آخر آپ نے اطاعت کا بہت اعلیٰ نمونہ دکھایا۔حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے مولانا صاحب کو 1935ء میں احمدیہ مشن کے قیام کی غرض سے برما بھجوایا۔برما کے لئے پہلے مبلغ کی حیثیت سے آپ نے بہت خدمات انجام دیں۔مشن ہاؤس قائم کیا اور سینکڑوں لوگوں کی احمدیت قبول کرنے کا ذریعہ بنے۔آپ کا نام آج بھی برما کے احمدیوں میں پہلے مبلغ کی حیثیت سے

بہت عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ دسمبر 1939ء میں آپ واپس قادیان آ گئے۔ 1947ء میں ملک شدید بدنظمی اور فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ اور مولانا صاحب کو اس انتہائی مشکل وقت میں خدمت کی سعادت حاصل ہوئی۔ آپ کو اسی سلسلے میں گرفتار بھی کر لیا گیا اور خدا کی راہ میں اسیری کی صعوبتیں بھی اٹھانی پڑیں۔ اسیری کے دوران آپ پر شدید تکلیفیں وارد کی گئیں۔ ان کا منہ کالا کر کے بازاروں میں پھرایا اور لوگوں سے پٹوایا۔ اور تشدد کر کے پوچھا جاتا کہ بتاؤ اسلحہ کے ذخائر کہاں ہے۔ آپ نے صبر و تحمل کا قابلِ رشک نمونہ دکھایا۔ آپ اپریل 1948ء تک قید میں رہے۔ مکرم مولانا احمد خان نسیم صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ تبلیغی دورہ جات میں گذرا۔ آپ مختلف گاؤں جاتے، تبلیغی کاموں اور پھر احمدیوں کی تعلیم و تربیت کی غرض سے آپ کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے پاکستان بننے کے بعد آپ کو مقامی تبلیغ کے فرائض اور نگرانی کا شعبہ دیا۔ جسے آپ نے تا دمِ آخر نہایت محنت، جانفشانی اور کامیابی سے سرانجام دیا۔ آپ کو دیہاتی لوگوں کے ساتھ میل ملاقات اور گفتگو کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ آپ نے سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لائلپور، سرگودھا اور جھنگ کے اضلاع میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ حضرت چوہدری فتح محمد سیال صاحب کی وفات کے بعد آپ کو ایڈیشنل ناظر اصلاح و ارشاد مقامی مقرر کیا گیا اور آپ نے اپنی وفات تک اسی شعبے میں خدمات دیں۔

26 اکتوبر 1976ء کو اچانک ایک معمولی نوعیت کا آپریشن کے دوران آپ کو اچانک دل کا حملہ ہوا اور مولائے حقیقی سے جا ملے۔ 27 اکتوبر کو حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے آپ کا نماز جنازہ پڑھایا جس میں ہزاروں کی تعداد میں احمدی احباب نے شرکت کی۔ حضور نے خود کافی آگے تک آپ کی میت کو کندھا دیا اور تدفین مکمل ہو جانے تک وہیں موجود رہے۔ اور بعد ازاں پُرسوز اجتماعی دعا کروائی۔ اللہ

تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے دین کے اس خادم کی تمام خدمات قبول فرمائے اور اپنی اعلیٰ جنتوں کا وارث بنائے۔(آمین)

مکرم مولانا نسیم مہدی صاحب مربی سلسلہ

سعدیہ ناصر

مکرم نسیم مہدی صاحب مربی سلسلہ عالیہ احمدیہ مکرم مولانا احمد خان نسیم کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔آپ کی پیدائش 12 فروری 1953ء کو ربوہ میں ہوئی۔آپ کی والدہ محترمہ کا نام فتح بیگم صاحبہ تھا۔چھوٹی عمر سے ہی آپ بہت محنتی اور ہونہار طالب علم تھے اور تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔میٹرک کے امتحان میں آپ نے ٹاپ کیا اور ان کی بہت خواہش تھی کہ ڈاکٹر بنتے۔نمبر اتنے اچھے تھے کہ داخلہ ملنے میں کوئی مشکل نہیں تھی۔لیکن آپ نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی اس تحریک پر کہ جامعہ کو ہونہار طالب علموں کی ضرورت ہے لبیک کرتے ہوتے اپنے والد محترم کی شدید خواہش کا بھی احترام کرتے ہوئے جامعہ احمدیہ میں دخلہ لے لیا۔اور اپنی زندگی کا رخ خدمتِ دین کی طرف موڑ دیا۔اس کے بعد ایک زمانے نے دیکھا کہ ایک ہونہار اور فدائی خادم دین نے خلافت کے زیر سایہ کیسے کیسے کام کئے۔

جامعہ احمدیہ میں تعلیم کے دوران آپ نے ہر سال خدا کے فضل سے ٹاپ کیا۔1976ء میں شاہد کی ڈگری مکمل کی۔اس کے بعد کچھ عرصہ آپ کو اصلاح وارشاد مقامی میں خدمت کا موقع ملا۔اور 1977ء میں بطور مبلغ سوئٹزرلینڈ تقرری ہوئی اور آپ اپنی اہلیہ مکرم مہدی صاحبہ بنت عبد العزیز بھامبڑی صاحب وہاں چلے گئے۔وہاں آپ نے بطور امیر جماعت اور مشنری انچارج سوئٹزرلینڈ، اٹلی اور

آسٹریا میں 1983ء تک خدمات انجام دیں۔

1983ء میں آپ واپس پاکستان بلا لیا گیا۔ اور 1984ء میں چند ماہ آپ کو بطور قائم مقام وکیل التبشیر کے طور پر کام کرنے کی توفیق ملی۔ 1984ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی ہجرت کے بعد چند مہینوں کے بعد آپ لنڈن آئے اور کچھ عرصے حضور کے پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر خدمت کا موقع بھی ملا۔ 1985ء میں آپ کی تقرری کینیڈا ہوئی۔ جہاں آپ نے 23 سال بطور مبلغ، بعد ازاں مبلغ انچارج اور امیر جماعت کینیڈا کی حیثیت سے بے لوث خدمات انجام دیں۔ آپ کی کینیڈا میں تقرری کے دوران قابلِ قدر خدمات میں سے پیس ویلج کا قیام، احمدیہ ایواڈ آف پیس کا قیام، بیت الاسلام مسجد وان، نور مسجد کیلگری، جامعہ احمدیہ کینیڈا کی بنیاد اور ایم ٹی اے نورتھ امریکہ مشن کا قیام شامل ہیں۔

2008ء میں مکرم نسیم مہدی صاحب کا تبادلہ امریکہ ہوا جہاں آپ کو نائب امیر اور مشنری انچارج کے طور پر خدمات بجالانے کی توفیق ملی۔ مسجد بیت الرحمان میری لینڈ جو کہ مرکزی مسجد ہے کے قریب ہی آپ کی رہائش تھی۔ وہاں بھی یہ داعی الیٰ اللہ خلقِ خدا کا دین حق کی تبلیغ میں لگ گیا۔ انٹر فیتھ پروگراموں کا انعقاد اور آپس کے ialogue کو فروغ دینے میں آپ پیش پیش رہتے تھے۔ ایک موقعہ پر افطار کے لئے وائٹ ہاؤس میں صدر اوباما کی طرف سے دعوت بھی دی گئی۔ ان کا شروع کیا گیا ایک پراجیکٹ مسلمز فار لائف تھا۔ جو 11 / 9 کے متاثرین کی یاد میں شروع کیا گیا تھا۔ اور اس کا مقصد مریضوں کے لئے خون کا عطیہ فراہم کرنا تھا۔ آپ نے تبلیغی کاموں کے لئے میکسیکو، گوئٹے مالا اور مارشل Islands کا سفر بھی اختیار کیا۔

2016ء میں آپ نے اپنی گرتی صحت کی وجہ سے early ریٹائرمنٹ کی درخواست دی اور اس

کے کچھ عرصہ بعد ہی کینیڈا منتقل ہو گئے۔اور پھر اپنی وفات تک کینیڈا میں ہی رہے 24 مئی 2022ءکو آپ ایک لمبی بیماری کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے اور آپ کی تمام خدماتِ دین کو قبول فرماتے ہوئے آپ کو اپنی رضا کی جنتوں میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔(آمین)

مکرم نسیم مہدی صاحب مرحوم کے کارہائے نمایاں

ابوالحسن۔کینیڈا

محترم پروازی صاحب کے ایک چھوٹے بھائی مکرم مولانا نسیم مہدی صاحب تھے۔ ان کی پیدائش 11 فروری 1953 میں پاکستان میں ہوئی اور وفات 24 مئی 2022 کو کینیڈا میں ہوئی۔آپ نے 69 سال عمر پائی۔ میٹرک۔کا امتحان امتیازی پوزیشن میں پاس کرنے کے بعد اپنے والد محترم مولانا احمد نسیم صاحب کی خواہش پر جامعہ احمدیہ ربوہ میں داخلہ لے لیا۔جامعہ پاس کرتے ہی حضرت خلیفہ الثالث نے ان کی تقرری سوئٹزرلینڈ میں بطور امیر جماعت اور مشنری انچارج کی جہاں وہ سات سال تک خدمات ادا کرتے رہے۔پھر کچھ عرصہ وکالت تبشیر ربوہ میں نائب کی حثیت میں کام کیا۔حضرت خلیفہ الرابع کے 1973 میں لندن آنے کے بعد ان کو حضور نے لندن بلالیا اور کوئی دس ماہ کے قریب حضور کے پرائیویٹ سیکرٹری کا کام کیا۔مئی 1985 میں وہ کینیڈا تشریف لائے اور چوبیس 24 سال تک بحثیت امیر جماعت اور مشنری انچارج خدمات سرانجام دیں۔2009 میں حضور نے ان کی تبدیلی بحثیت نائب امیر اور مشنری انچارج جماعت ہائے امریکہ کر دی جہاں وہ 2016 تک جماعتی

خدمات ادا کرتے رہے۔

کینیڈا میں ان کی امارت کے دوران بے شمار سنگ میل کام ہوئے۔ان کی مقناطیسی شخصیت نے ساری جماعت کو ان کو گرویدہ بنا لیا اور اپنے اخلاق فاضلہ سے ہر گھر اور ہر دل میں اپنی مخصوص جگہ بنا لی۔ جماعت احمدیہ کینیڈا کی ترقی میں انہی کا نمایاں حصہ ہے جس کو تاریخ کبھی بُھلا نہیں سکتی۔ کینیڈا آتے ہی انہوں نے جماعت کی پہلی مسجد کی تعمیر کے لیے زمین خریدنے کی کمیٹی بنائی اور اُسی سال دسمبر 1985 میں زمین خریدنے کا کام مکمل کیا۔ اگلے سال 1986 میں مسجد کی تعمیر کے لیے کمیٹی بنائی اور حضور انور کو کینیڈا بُلا کر سنگ بنیاد رکھوایا۔ مسجد کی تعمیر کا کام اکتوبر 1989 میں شروع ہوا اور اکتوبر 1992 میں ٹورانٹو شہر کے شمال میں وان شہر میں بیت السلام مسجد کا حضور انور سے افتتاح کروایا۔ چھ سال بعد 1998 میں اسی مسجد کے نواح میں تمام زمینیں رہائشی مکان بنانے کے اجازت نامے میں شامل ہوگئیں تو ایک پرائیویٹ رہائشی پراجیکٹ جس کو پیس ولیج کے نام سے جانا جاتا ہے اس میں بھی مکرم نسیم مہدی صاحب نے ہر قسم کے تعاون اور امداد کی کوششیں کیں۔ گو کہ یہ ایک مکمل طور پر ایک پرائیویٹ پراجیکٹ تھا جس میں نہ جماعت کی زمین اور نہ کسی قسم کی مالی معاونت شامل تھی اور نہ اس کی ضرورت تھی لیکن مکرم نسیم مہدی صاحب کی خواہش صرف بیت الاسلام مسجد کی آبادکاری تھی۔ مسجد چونکہ اس وقت رہائشی آبادی سے دور تھی اس لیے ان کی خواہش تھی کہ احمدی لوگ اگر مسجد کے نزدیک رہائش اختیار کریں کے تو مسجد میں آنا اور بچوں کی تربیت میں بہت آسان ہو جائے گا۔

اسی طرح انہی کے دور امارت میں کینیڈا کے دوسرے شہروں میں بھی مشن ہاوسز اور مساجد کے لیے زمینیں خریدی۔ مثلاً۔ کیلگری ، سسکاٹون ، ریجائنا، ایڈمنٹن، ونی پیگ ، وینکوور، منٹریال، آٹوہ، ہیملٹن ، برامٹن، ٹورانٹو ، پکرنگ، ونڈسر، سینٹ کیتھرین ، مسی ساگا ،لندن ، ان تمام شہروں میں

جماعت کے مشن کے قیام اور مساجد کے لیے زمینیں خریدی اور مساجد کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ گو کہ بعض مساجد ان کے امریکہ جانے کے بعد تکمیل کو پہنچی لیکن ان تمام پراجیکٹس کا بنیادی کام مکرم نسیم مہدی صاحب نے ہی شروع کیا۔ ایک اور کام جو رہتی دنیا تک قائم رہے گا وہ احمدی پناہ گزینوں کی آبادکاری کا ہے۔ انہوں نے ہی احمدی لوگوں کے لیے کینیڈا میں آنے کے راستے ہموار کیے اور پھر ہر قسم کی امداد بھی فراہم کی۔ جماعت کی مالی ترقی میں بھی ان کے کارنامے کم نہیں ہیں۔ جب وہ کینیڈا تشریف لائے تو جماعت کا سالانہ بجٹ چند ہزار ڈالرز کا تھا اور جب ان کی تبدیلی امریکہ ہوئی تو اس وقت جماعت کا بجٹ کئی ملین ڈالرز کا ہو چکا تھا۔ جماعت احمدیہ کے تجدید اور چندہ کے نظام کو کمپیوٹر کے نظام میں تبدیل کرنا بھی انہی کا کام تھا جس کے لیے انہاں نے ماہرین کی ایک کمیٹی بنائی جنہوں نے سب پروگرامز لکھے۔ آج ساری دنیا کی جماعتوں میں وہی نظام کام کر رہا ہے۔ گو کہ نئے آنے والے لوگوں نے اس نظام کو بہتر بنانے کی بھی بہت کوششیں کی ہیں لیکن اس کام کو شروع کرنے کا سہرا مکرم نسیم مہدی صاحب کا ہے۔

احمدیہ گزٹ کینیڈا جو ایک ہاتھ سے لکھا ہوا ماہانہ سالہ تھا اس کو بھی انہوں نے کمپیوٹر کی مدد سے بہت اعلیٰ کر دیا۔ ایک اور بہت ہی اعلیٰ کام جو انہوں نے کیا وہ احمدیہ ابوڈ آف پیس کی کئی منزلہ عمارت کی تعمیر تھی۔ گو کہ اس پراجیکٹ میں اونٹاریو حکومت کی امداد بھی شامل تھی لیکن س عمارت کی ملکیت جماعت احمدیہ کینیڈا کی ہے۔ اس عمارت نے احمدی پناہ گزینوں کی آبادکاری میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ جماعت احمدیہ کینیڈا کا جامعہ کا ادارہ بھی مکرم نسیم مہدی صاحب کی امارت کا کارنامہ ہے۔ آپ نے نہایت محنت اور ذاتی توجہ سے اس کی آبیاری کی۔ پہلے سالوں کے اس ادارہ کے تعلیم یافتہ مربیان اس کام کے عینی گواہ ہیں کہ کس محبت اور لگن سے انہوں نے اس پودہ کو لگایا اور اس کی رکھوالی بھی کی۔

استاذی المکرم پروفیسر پرویز پروازی صاحب کی طرح مکرم نسیم مہدی صاحب بھی بہت ہنس مکھ، خوش مزاج، خوش اخلاق، محبت کرنے والے اور لوگوں کے دلوں میں رہنے والے شخص تھے۔ مکرم پروازی صاحب مرحوم میرے استاد اور محسن تھے جنہوں نے مجھے اردو ادب کی تعلیم دی اور اس نعمت کا عمر بھر کے لیے چسکا لگا دیا۔ مکرم نسیم مہدی صاحب میرے بہت عزیز اور قریبی دوستوں میں سے تھے جن کی کمی ہر روز محسوس ہوتی ہے۔

دونوں بھائیوں نے اپنی بہت قیمتی اور نہ بھولنے والی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ دونوں کی کمی کو کوئی اور شخص پورا نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کی ارواح پر بے شمار برکات نازل کرے۔

تعارف پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی

ڈاکٹر پرویز پروازی..نام:ناصر احمد خاں

قلمی نام:پرویز پروازی.جائے پیدائش:قادیان

تاریخ پیدائش:20اکتوبر1936ء

1958۔ تعلیم:بی اے آنرز۔تعلیم الاسلام کالج ربوہ

1960۔ایم اے،یونیورسٹی اورئینٹل کالج لاہور

1968۔ پی ایچ ڈی،پنجاب یونیورسٹی

تدریس:1960۔ گورنمنٹ کالج مظفرگڑھ

1961 تا1969 تعلیم الاسلام کالج ربوہ لیکچرار

1969 تا1975 تعلیم الاسلام کالج،پروفیسر

1975 تا 1979 وزیٹنگ پروفیسر،اوسا کا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز،جاپان

1979 تا1982 انٹر کالج کمالیہ،اسسٹنٹ پروفیسر

1982 تا 1986 مسلم انٹر کالج چک 41ج ب فیصل آباد،اسسٹنٹ پروفیسر

1986 تا 1990،گورنمنٹ کالج فیصل آباد،اسسٹنٹ پروفیسر

1991 تا2001(دوسری ہجرت کے بعد)پروفیسر ریسرچ ایٹ اپسالا یونیورسٹی سویڈن

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی۔ تصنیفات وتالیفات

1964۔ذکر اردو تعلیم الاسلام کالج کی پہلی کل پاکستان اردو کانفرنس کے مضامین کا مجموعہ،

1977۔خوبصورت جاپان اور میں، کاوا باتا یاسوناری کی نوبل سپیچ کا اردو ترجمہ

1978۔یوکی گونی، کاوا باتا کے نوبل ناول کا اردو ترجمہ

1980۔جاپان کا سب سے لمبا دن

1980۔جاپان کی ہائیکو شاعری کا انتخاب اور ترجمہ

1981۔سورج کے ساتھ ساتھ، جاپان کا سفر نامہ

1997۔صدائے آب، ہائیکو پر تنقیدی مضامین،

2002۔آ گی ہے، ہیروشیما کے المیہ کے پس منظر میں ناول

2003۔احمدیہ کلچر

2003۔ سر ظفر اللہ خاں کا تحریک آزادی میں حصہ

2003، پس نوشت۔اردو کی خود نوشت سوانح عمریوں کا جائزہ

2005۔سر ظفر اللہ کی یادداشتیں،

Reminiscences of Sir Zafarullah ۔2006

2008۔پس نوشت اور پسِ پس نوشت (مزید خود نوشت سوانح عمریوں کا تجزیہ)

2010۔پس نوشت سوم (مزید خود نوشتوں کا جائزہ)

خود نوشتوں کے تجزیہ کا کام جاری ہے، جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

حاصل عمر: ''حبل الورید'' قرآن حکیم کا اردو ترجمہ (غیر مطبوعہ)

تیسری ہجرت کے بعد 2003ء سے کینیڈا میں مقیم ہیں۔

میرے ابوجان
مرحوم پروفیسر ناصر احمد خان پرویز پروازی
سعدیہ ناصر

آج قلم لے کر بیٹھی ہوں کہ اپنے پیارے ابوجان کے متعلق کچھ لکھوں وہ جو خود قلم پکڑتے تھے تو صفحات پر اپنے الفاظ سے حالات و واقعات کی ایسی تصویر کھینچتے تھے کہ پڑھنے والوں کی نظروں کے سامنے ان حالات و واقعات کی فلم چل پڑتی تھی۔کبھی وہ آپ کو قادیان کی گلیوں میں حضرت مسیح موعودؑ کے صحابہ کے ساتھ لا کھڑا کرتے تھے تو کبھی ٹی آئی کالج کے کلاس روم میں لا بٹھاتے تھے کبھی جاپان کی سیر پر لے جاتے تو کبھی سویڈن کی۔آپ کا منفرد اندازِ بیاں دلوں کو موہ لینے والا تھا۔

اللہ کرے کہ میں بھی کچھ لکھ پاؤں۔ان کے کچھ ذاتی حالات جو میں نے ان کی بیٹی کی حیثیت سے دیکھے۔محسوس کئے اور ان کی زبانی سنے۔

آغاز آباء و اجداد کے مختصر سے تعارف سے کرتی ہوں۔ 1908ء میرے دادا جان مولوی احمد خان نسیم صاحب کی پیدائش ہوئی تو ان کے والد محترم محمد فضل خان صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں نام کی درخواست بھیجی۔محمد فضل خان صاحب نے بذریعہ خط تو بیعت کی ہوئی تھی لیکن ابھی دیدار نہیں ہوا تھا۔اتفاق ایسا تھا کہ جس دن آپ کو اپنے نومولود بیٹے کے نام کا خط ملا۔اسی

دن حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات کی خبر بھی پہنچ گئی۔اس بات کا آپ کو بے انتہاء صدمہ ہوا کہ آپ کو نہ ہی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا دیدار نصیب ہوا اور نہ ہی ان کی زندگی میں قادیان جانے کا موقع ملا۔آپ نے اپنے گاؤں چنگا بنگیال کی ساری زمینیں ٹھیکے پر دیں اور مع خاندان قادیان منتقل ہو گئے اور تقسیم ہند تک وہیں پر رہے۔قادیان آنے کے بعد پڑدادا جی کو حضرت بوزینب کے گھر کی دربانی کا کام ملا۔ہمارے موجودہ امام حضرت خلیفۃ المسیح الخامس (ایدہ اللہ بنصرہ العزیز) کی دادی اور حضرت مرزا شریف احمد صاحبؓ کی بیگم صاحبہ بوزینب کے نام سے جانی جاتی تھیں۔بہرحال یہ خاندان قادیان میں آباد ہو گیا۔وہیں میرے دادا جان بڑے ہوئے۔ان کی شادی ہوئی اور 1936ء میں میرے ابو جان کی پیدائش بھی قادیان میں ہوئی اپنی زندگی کے پہلے دس گیارہ سال ابو نے قادیان کی گلیوں میں گذارے۔پرائمری سکول وہیں جاتے تھے لیکن امتحان غالباً پاکستان بننے کے بعد پاکستان آ کر دیا۔

1947ء میں جب پاکستان بن گیا تو آپ لوگ ہجرت کر کے واپس اپنے گاؤں چنگا بنگیاں آ گئے دادا جان کو اس وقت قریباً 2 سال کا عرصہ قید میں گزارنا پڑا اور آپ دو سال بعد اپنی فیملی کے پاس چنگا بنگیال پہنچے۔ابو بتاتے تھے کہ وہ جب گاؤں میں واپس آباد ہوئے تو نہ وہاں بجلی تھی نہ پانی تھا۔اور نہ ہی کوئی سکول تھا۔ساتھ والے گاؤں میں ایک پرائمری سکول تھا جہاں ابو نے پرائمری پاس کیا۔مڈل سکول تقریباً چار میل دور ایک قصبے قاضیاں میں تھا۔وہاں آپ نے مڈل پاس کیا۔دادا جان کی رہائی اور واپسی تک ربوہ بھی آباد ہونا شروع ہو چکا تھا۔غالباً 1950ء یا 1951ء میں آپ ربوہ منتقل ہو گئے۔ اس وقت ابھی ربوہ میں ہائی سکول نہیں تھا۔میٹرک کے لئے چنیوٹ جانا پڑتا تھا۔آپ بتاتے تھے کہ صبح 6 بجے گاڑی سے جاتے تھے۔اور شام 6 بجے واپس آتے تھے۔میٹرک کی تعلیم کے دوران ہی

میری دادی جان بیمار ہوئیں اور وفات پا گئیں۔ والدہ کی وفات کے بعد دادا جان نے ابو کے لئے بورڈنگ میں رہنے کا انتظام کر دیا تاکہ پڑھائی میں حرج نہ ہو۔ آپ نے میٹرک پاس تو کر لیا لیکن نمبر زیادہ اچھے نہیں آئے۔ اور سیکنڈ ڈویژن آئی۔ میٹرک کرنے کے بعد ابو نے تقریباً چھ سات مہینے نور ہسپتال میں کلرک کا کام کیا۔ نور ہسپتال جب نئی عمارت بنی تو فضل عمر ہسپتال بن گیا۔ اس زمانے کے محدود وسائل کے ساتھ لاہور جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ داخلے کی فیس جمع کرنے کیلئے آپ نے وہاں کام کیا۔ اور ہسپتال کے ابتدائی کارکنوں میں شامل ہوئے۔ اس کے بعد آپ کو حضرت مرزا بشیر احمد صاحب ؓ کے کلرک کی حیثیت سے بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں ابو نے مضامین لکھنا شروع کر دیئے تھے جو رسالہ قندیل میں چھپتے تھے۔ اور بعد میں الفضل میں بھی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک دفعہ مرزا ناصر احمد صاحب جو بعد میں خلیفۃ المسیح الثالث رحمۃ اللہ بنے۔ اپنے چچا سے ملنے ان کے دفتر آئے ابو بھی وہاں کام میں مصروف تھے۔ انہوں نے ابو کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ میاں یہ جگہ تمہاری نہیں ہے تمہیں آگے بڑھنا ہے۔

جب کالج ربوہ آ گیا تو ابو نے وہاں داخلہ لیا۔ نوکری سے وہ اسی مقصد کے لئے 60 روپے جمع کر چکے تھے۔ تاکہ داخلہ لے سکیں داخلہ کروانے گئے تو صرف 6 روپے میں داخلہ ہو گیا۔ کیونکہ باقی سب ڈیوز میاں صاحب نے معاف کر دیئے تھے۔ فیس معاف ہو گئی ڈیوز معاف ہو گئے اور 5 روپے وظیفہ بھی لگ گیا۔ F.A آپ نے بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا اور کالج میں پوزیشن بھی حاصل کی۔ بی اے میں آپ کو وظیفہ ملا جو کہ 70 روپے تھا۔ اس زمانے کے لحاظ سے کافی بڑی رقم تھی۔ بی اے کرنے کے بعد آپ ایم اے کرنا چاہتے تھے۔ اور داخلے اور فیس کی رقم اکٹھی کرنے کے لئے آپ نے ٹیوشن پڑھانی شروع کی۔ آخر 100 روپیہ جیب میں لئے اورینٹل کالج لاہور پہنچ گئے۔ پرنسپل ڈاکٹر سید

عبداللہ صاحب نے مارک شیٹ دیکھ کر مشورہ دیا کہ عربی میں ایم اے کر لیں۔ ممکن تھا کہ وظیفہ آ جاتا۔ لیکن آپ نے اردو میں ایم اے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ آپ نے داخلہ لیا۔ فیس اور ہوسٹل کے خرچے کی قسطیں لگوائیں جو پھر آپ کالج کے بعد دو ٹیوشنیں پڑھا کر ادا کرتے رہے۔ گذارہ اچھا ہوتا رہا۔ لیکن جب ایم اے کے امتحانوں کا وقت آیا تو رول نمبر لینے کے لئے 350 روپے کی ضرورت پڑی۔ پریشانی میں بیٹھے تھے کہ ایک دوست نے مشورہ دیا کہ جو مختلف ادبی اور علمی مقابلہ جات میں جیتے گئے بڑے بڑے کپ پڑے تھے انہیں بیچ دیا جائے تو دونوں نے وہ سارے کپ ایک بوری میں ڈالے اور انار کلی ایک کپ والے کے پاس لے گئے۔ وہ بولا کہ لوگ تو کپ خریدنے آتے ہیں اور تم بیچنے آئے ہو۔ بہر حال وہ کپ ایم اے کی فیس میں مددگار بنے۔ 350 روپے لے کر کلرک کے پاس پہنچے اور رول نمبر مانگا۔ اس نے رول نمبر دے دیا اور کہا کہ فیس ادا ہو چکی تھی بعد میں پتا لگا کہ ابو کے استاد پروفیسر وقار عظیم صاحب نے بھانپ لیا تھا کہ جو ابھی تک رول نمبر نہیں لیا گیا تو یقیناً فیس کی ادائیگی میں دقت ہے۔ ابو 350 روپے لے کر پروفیسر صاحب کے پاس گئے۔ تو انہوں نے وہ پیسے نہیں لئے اور کہا کہ بیٹا یہ تو میں نے دے دیئے ہیں۔ اب تم اس سے کسی مستحق ضرورت مند طالب علم کی مدد کر دینا۔ ابو پھر ایک لمبے عرصہ تک 350 روپے کسی نہ کسی مستحق ضرورت مند طالب علم کو دیتے رہے۔

ایم اے پاس کرنے کے بعد آپ نے کچھ عرصہ مظفر گڑھ میں بطور لیکچرار کام کیا۔ اور اس کے بعد اپنے بہت ہی پیارے کالج ٹی آئی کالج میں آ گئے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنی پی ایچ ڈی بھی شروع کی اور ہفتے میں دو دن لاہور جاتے اور یونیورسٹی اور لائبریری میں وقت گذارتے۔ اسی زمانے میں کئی دفعہ آپ کو باہر فٹ پاتھ پر بھی رات گذارنی پڑی۔ علم حاصل کرنے کے شوق میں آپ نے بہت محنت کی اور بہت تکلیفیں بھی اٹھائیں۔ ٹی آئی کالج سے ابو کو بہت زیادہ محبت تھی۔ وہاں کا درس

وتدریش کا دور، اس زمانے کی یادیں آپ کی زندگی کا سرمایہ تھیں۔ وہاں گذرے شب و روز وہاں کے بنائے ہوئے تعلقات اور وہاں کی ہر چیز آپ کو بے انتہا عزیز تھے۔ ان کی تحریروں اور باتوں میں یہ بات عیاں تھی کہ وہ مقدس ادارہ آپ کے لئے کیا اہمیت رکھتا تھا۔ آپ کہتے تھے کہ میں جو کچھ بھی ہوں اسی کالج کی وجہ سے ہوں۔ مجھے اس کالج نے بہت کچھ دیا ہے۔

میرے ابو اور امی کی شادی 1964ء میں ہوئی۔ نکاح اس سے دو یا تین سال پہلے ہوا تھا۔ بقول میری امی کے نہ ان کے پاس پیسے تھے کہ شادی کرتے اور نہ ہمارے پاس تھے۔ اس لئے نکاح اتنے سال رہا۔ میری امی جان امۃ المجید ناصر صاحبہ فلاسفی میں ایم اے تھیں اور جامعہ نصرت میں لیکچرار تھیں۔ ان دونوں کی جوڑی بہت خوبصورت جوڑی تھی۔ ابو کو میری امی سے بے انتہاء محبت تھی۔ امی بتاتی تھیں کہ نکاح اور شادی کے درمیانی وقت میں ابو ہر روز ایک خط لکھ کر امی کے لئے بھیجتے تھے۔ امی نے کبھی خط نہیں لکھا اور ابو نے کبھی خط میں ناغہ نہیں کیا۔ پھر شادی ہوئی تو ابو، امی کے گھر والوں کا اور امی ابو کے گھر والوں کا اپنے گھر والوں سے بڑھ کر خیال رکھتے۔ یہ خیال صرف دکھاوے کی حد تک نہیں تھا بلکہ وہ دل سے ایک دوسرے کے رشتوں سے محبت کرتے تھے۔ تیرا میرا کا تصور ہی نہیں تھا۔ ہم بھی یہی دیکھتے بڑے ہوئے اور جب بڑے ہو کر اپنی زندگیوں میں قدم رکھا تو یہ ایک شدید شاک لگا کہ تیرا اور میرا بھی کوئی چیز ہے۔ ورنہ ہم تو اسی خیال میں بڑے ہوئے کہ تیرا میرا کچھ نہیں سب ہمارا ہے۔ میرے ماں باپ کا یہ وصف ایسا ہے جسے میں اپنا ''Personal favourite'' وصف کہہ سکتی ہوں۔

ساٹھ اور ستر کی دہائی میں آپ کی جوٹی آئی کالج میں قابلِ قدر خدمات تھیں اس کے متعلق مجھے یقین ہے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اردو کانفرنسیں شاندار مشاعروں کا انعقاد ادبی محفلیں وغیرہ۔ وہ زمانہ میں نے نہیں دیکھا لیکن اتنا میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ ابو اس زمانے کو اپنی زندگی کا بہترین

وقت تصور کرتے تھے۔اس زمانے کی باتیں، واقعات اور اپنے مختلف تجربات کا وہ اکثر ذکر کرتے تھے۔ 1975ء تک آپ نے ٹی آئی کالج میں پروفیسر کے طور پر پڑھایا۔

1974-75 میں ابو کے ایک شاگرد ڈاکٹر صفی اللہ وڑائچ صاحب اوسا کا یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کرنے گئے ہوئے تھے۔انہوں نے ابو کو بتایا کہ اردو کے پروفیسر کی جگہ خالی ہو رہی تھی اور یہ مشورہ دیا کہ وہ اپلائی کریں۔ابو نے اپلائی کر دیا اور وہاں جاب مل گئی۔ستمبر 1975ء میں بمع فیملی آپ جاپان چلے گئے۔آپ کے سفرنامے ''سورج کے ساتھ ساتھ'' میں آپ نے وہاں کے حالات وواقعات بہت خوبصورت انداز میں تحریر کئے ہیں۔اور میں اپنی تحریر میں دوبارہ وہ بیان نہیں کروں گی۔اسی پر اکتفا کروں گی کہ میرے والدین جاپان کی بہت تعریفیں کرتے تھے ان کی نظر میں نہ جاپان جیسا کوئی ملک تھا اور نہ جاپانی لوگوں جیسے لوگ۔وہاں کی ہر بات شاندار تھی۔یہ رائے ان کی آخر عمر تک قائم تھی جبکہ وہ سویڈن اور کینیڈا جیسے ممالک میں رہ بھی چکے تھے۔اور دیگر دنیا کے ممالک کی سیر بھی کر چکے تھے۔جاپان میں یقیناً کچھ تو تھا جو اگر زندگی میں کبھی موقع ملا تو میں جا کر ضرور دیکھوں گی کہ میرے ماں باپ اس زمین سے محبت کرتے تھے۔ابو نے جاپان میں بھی اپنے شاگردوں اور کولیگز کے دلوں میں ایک خاص جگہ بنالی۔آپ کی شخصیت میں ایک کشش تھی کہ جو آپ سے تعلق بناتا وہ پھر قائم رہتا۔ابو کی وفات پر جاپان سے ان کو لولیگ ہاما گو.جی صاحب کا فون آیا۔وہ بہت دیر تک امی سے اردو میں ابو کی باتیں کرتے رہے۔وہ پاکستانی ثقافت اور معیشت کے استاد تھے اور پاکستان بھی دومرتبہ آئے۔ابو کے شاگرد بھی جب پاکستان آتے تو ربوہ ضرور آتے۔دادا جان ان کی خوب خاطر مدارات کرتے اور سیر بھی کرواتے۔انہی میں سے کسی نے چنیوٹ اور ربوہ کا موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ ان دونوں شہروں میں صرف 6 میل کا فاصلہ ہے لیکن ان کی تہذیبوں میں 6 سو سال کا فرق ہے۔جاپان میں

چار سال قیام کیا۔خوب سیر یں کی عزت بھی بہت کمائی ۔ نئے تعلقات بنائے اور بالاخر اپنے وطن لوٹ آئے ۔جس کی زمین اور زبان سے آپ کو بہت محبت تھی ۔

حسرت یہ تھی کہ ان کی گلی میں رہے یہ خاک
ہم خاک ہو گئے تو ہوا تیز ہو گئی

واپس تو چلے آئے لیکن پھر وطن عزیز کے لوگوں نے کیا سلوک کیا۔اس کا ذکر دل کو دکھی سا کر دیتا ہے۔

1979ء میں جاپان سے واپس آئے تو اصولی طور پر تو آپ کو واپس ٹی آئی کالج میں ہی لینا چاہئے تھا۔آپ نے بہت کوشش کی اور آپ کی شدید خواہش بھی تھی ۔لیکن ایسا نہ ہوا آپ کو ہر طرح سے ستایا گیا۔ایک پی ایچ ڈی پروفیسر کو کبھی کمالیہ انٹر میڈیٹ کالج تو کبھی چک 41ج ب انٹر میڈیٹ کالج میں بھیجا گیا۔ ہمارے ملک پاکستان کا سب سے بڑا المیہ ہی یہ رہا ہے کہ انہوں نے قابل قدر لوگوں کی قدر نہیں کی ۔محض مذہبی تعصب اور منافرت کی بنیاد پر ڈاکٹر عبدالسلام کی بھی ناقدری کی ۔اور میرے ابو جان اور نا جانے اور کتنے قیمتی لوگ اسی تعصب کی لپیٹ میں آئے ۔اسی بے قدری عادت کی قیمت ہے جو آج تک ہماری قوم صحیح بات اور صحیح لوگوں کو پہچان نہیں پائی اور پستی کی گہرائیوں میں گرتی چلی جا رہی ہے۔جاپان سے واپس آنے کے بعد 80 کی دہائی غالباً ہمارے خاندان کے لئے سب سے مشکل وقت تھا۔ابو کی مشکلات اور مختلف جگھوں پر پوسٹنگز امی کے لئے جامعہ نصرت گرلز کالج میں شدید مخالفت اور چیلنجز، تنخواہوں کا بند ہونا اور مالی پریشانیاں ۔اگر چہ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی لیکن وہ وقت میری یادداشت میں ایک اندھیرے وقت کی یاد دلاتا ہے۔

1990۔91ء کے قریب ابو ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور انگلینڈ حضور کی خدمت میں حاضر

ہوئے۔حضور کے مشورے سے پھر سویڈن میں آ کر اسائلم کیا جو مل گیا۔1993ء میں ہمارے یعنی امی، میری چھوٹی بہن رضوانہ جس کو نوشا کہتے ہیں اور میں، ہمارے آنے تک ابو کو ایک شدید دل کا دورہ اور By-pass ہو چکا تھا۔جیسے انہوں نے خود لکھا تھا کہ سویڈن میں انہوں نے اپنی بیماری اور تنہائی کا مقابلہ کرنے کے لئے قلم کا سہارا لیا۔اس وقت میں آپ نے قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔کتابیں لکھیں اور مضامین لکھے۔سویڈن کا زمانہ وہ زمانہ تھا جو میں نے ابو کے ساتھ بہت قریب گذارا۔اب تک تو زندگی گویا ایک تیز رفتار گاڑی کی طرح چل رہی تھی۔ہمارے آنے سے ابو اتنے خوش تھے کہ وہ میں بیان نہیں کر سکتی۔انہوں نے بھرپور تیاری کی ہوئی تھی۔جس دن ہم پہنچے تھے برف پڑ رہی تھی اور ابو ہمیں پہلی دفعہ برف پڑتے دیکھتے ہوئے بہت خوش تھے۔ان کا مسکراتا مطمئن پُرسکون چہرہ آج تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

اپسالا میں تین فیملیز کی ایک چھوٹی سی جماعت تھی۔ان میں ایک فیملی ڈاکٹر خالد عطاء صاحب کی تھی۔ان کی بیگم امۃ الحی صاحبہ جن کو ہم بے بی باجی کہتے تھے اپنے بیٹوں کے ساتھ ہماری فیملی کا حصہ ہی بن گئے تھے۔ابو کی بیماری میں ابو وہاں اکیلے تھے انہوں نے ابو کی دن رات خدمت کی۔اور ابو کا ہر طرح سے خیال رکھا۔امی اور ابو ہمیشہ ان کے احسانات کا ذکر کرتے تھے۔جب ایم ٹی اے ڈش لگانے کا وقت آیا تو ہمارے اپارٹمنٹ کا رُخ اس کی مناسبت سے نہیں تھا۔ڈش بے بی باجی کے گھر لگا اور ہمارا وہاں ہر جمعے پیدل یا بس پر جانا معمول بن گیا۔ابو ان کے گھر پہنچتے ہی پکوڑوں کی فرمائش کر دیتے اور بے بی باجی فٹافٹ پکوڑے تیار کر کے پیش کر دیتیں۔

ہمارے گھر میں ہر وقت میری اور میری بہن کی سہیلیوں کا ہجوم لگا رہتا۔امی ابو ان کی بہت خاطریں کرتے۔اور کبھی تنگی کا اظہار نہیں کرتے تھے۔وہ ہمارے امی ابو کو امی ابو ہی بلاتی تھیں اور امی

ابو بھی انہیں اپنی بیٹیوں کی طرح ہی پیار کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سب کو ہمارے گھر آنے کی اجازت بلا جھجک فوراً مل جاتی تھی۔ امی کی پاکستان میں ابھی سروس باقی تھی اور ریٹائرمنٹ میں کچھ سال تھے اور میری نانی جان بھی ربوہ میں بہت بیمار تھیں۔ انہیں پارکنسنز تھی جس کی وجہ سے وہ بالکل بستر پر تھیں۔ امی شروع کے کچھ سال زیادہ وقت پاکستان میں ہی رہتی تھیں۔ اور کچھ مہینوں کے لئے سویڈن آتی تھیں۔ ہم دونوں بہنیں ابو کے ساتھ رہتے۔ ابو امی کی غیر موجودگی میں ہمارا بہت زیادہ خیال رکھتے۔ بہت لاڈ اٹھاتے۔ اور مزے مزے کی چیزیں بنا کر اور لا کر کھلاتے۔ امی جاتے وقت میرے اور نوشہ کے ذمہ مختلف کام لگا جاتیں۔ ان میں برتن دھونا نوشہ کے ذمے تھا۔ نوشہ نے زیادہ تر تن نہ دھونے کا یہ حل نکالا کہ ایک پلیٹ اور گلاس پر میرا نام لکھ دیا اور ایک پر ابو کا۔ اور اس کے علاوہ ہمیں اور برتن استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ نوشہ ابو کی بہت لاڈلی تھی اور ابو کو اس کے بنائے ہوئے اس قانون کا اتنا خیال تھا کہ ایک رات میں اٹھ کر کچن کچھ لینے آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ابو مدھم سی روشنی میں پانی پینے کے لئے گلاس پر اپنا نام پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہ غلط گلاس میں پی لیا تو بیٹی ناراض نہ ہو جائے۔

اپسالا میں بھی آپ نے اپنی ادبی مصروفیات کا سلسلہ جاری رکھا۔ سویڈش رائٹرز یونین کی میٹنگز میں آپ باقاعدگی سے شمولیت کرتے۔ اپسالا یونیورسٹی سے بھی وابستہ رہے۔ ایک دفعہ آپ رائٹرز یونین کی میٹنگ کے لئے سٹاک ہام یونیورسٹی ٹیکسی پر جا رہے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور اردو بولتا تھا۔ وہاں پر تو کوئی اردو بولنے والا مل جائے تو خوشی کی انتہا نہیں رہتی تھی۔ بڑا اچھا سفر گذرا۔ آخر سٹاک ہالم یونیورسٹی کے باہر پہنچ گئے۔ اب ڈرائیور نے 15، 20 منٹ چکر کاٹے اور آخر پتا چلا کہ جہاں شروع میں پہنچے تھے وہیں جانا تھا۔ ابو کی جیسی مذاق کی عادت تھی انہوں نے ڈرائیو کو کہا کہ تم نے کیا سکھوں والا کام کیا ہے۔ یہ کہہ کر آپ اترے تو یاد آیا کہ موصوف کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔ آپ کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

کرتار سنگھ۔ایک لمحہ خاموشی کے بعد دونوں نے کھل کر قہقہہ لگایا۔ابو یہ لطیفہ شوق سے سناتے تھے۔

آپ کو ہمیشہ سے بہت لمبی واک کرنے کی عادت تھی۔آپ روزانہ صبح کئی میل پیدل چلتے۔یہ عادت آپ کو ربوہ میں بھی تھی اور اپسالا میں بھی آپ باقاعدگی سے دو گھنٹے واک پر جایا کرتے تھے۔ ان کا ایک من پسند روٹ تھا جہاں ہم بھی کبھی سائیکل پر اور کبھی پیدل آپ کے ساتھ ہو لیتے تھے۔وہ راستہ ایک جھیل پر جا کر ختم ہوتا۔ابو کو وہاں جا کر تنہائی میں بیٹھنا بہت پسند تھا۔وہ یقیناً وہاں بیٹھ کر خدا کی تخلیق کی ہوئی خوبصورت زمین و آسمان سے محظوظ ہوتے ہوں گے اور غالباً شاعر اور ادیب کی حیثیت سے اپنے خیالات کو الفاظ میں بھی ڈھالنے کا خاکہ تیار کرتے ہوں گے۔آپ اکثر اوقات گھر میں بھی چائے بنوا کر صحن کے دوازے سے باہر دیکھتے ہوئے خاموشی سے چائے پیتے رہتے۔نہ باہر کوئی قابلِ دید منظر ہوتا اور نہ ہی کوئی ریل پیل۔میں ان کو دیکھ کر یہ سمجھ نہیں پاتی تھی کہ وہ اتنی خاموشی سے بیٹھ کر کیا کر رہے ہیں۔لیکن اب سمجھتی ہوں کہ آپ جو اتنی خوبصورتی سے لفظوں کی مالا پروتے تھے تو اس کے پیچھے گہری سوچیں اور غور و فکر کار فرما تھا۔وہ وقت بہت ہی خوبصورت وقت تھا۔اگر وقت کی سوئی گھما کر پیچھے جانا ممکن ہوتا تو میں واپس اس زمانے میں اپنے پیارے ماں باپ کی شفقتوں میں چلی جاتی۔لیکن یہ کہاں ممکن ہوا کرتا ہے۔

2001ء میں امی ابو اور نوشہ کینیڈا آ گئے۔میں اس سے پہلے 1998ء میں آ گئی تھی ہم چار بہن بھائی کینیڈا میں تھے۔امی ابو کی صحت خراب رہتی تھی۔ابو کو ہارٹ کا مسئلہ تھا اور امی سٹروک کی مریضہ تھیں۔ہم نے انہیں اصرار کر کے کینیڈا بلا لیا۔

جون 2001ء میں مستقل طور پر امی ابو کینیڈا منتقل ہو گئے۔امی نے تو اس کے بعد سوائے ایک بار امریکہ کے کینیڈا نہیں چھوڑا۔لیکن ابو کئی مرتبہ سویڈن بھی گئے اور انگلینڈ، جرمنی اور امریکہ بھی گئے۔ابو

کے شاگرد جو دنیا کے ہر ملک میں پھیلے ہیں۔ وہ مختلف مواقعوں پر مشاعروں کا اہتمام کرتے اور ابو کو بھی بلاتے اور ابو بہت شوق اور محبت سے جاتے۔ ابو کا اپنے شاگردوں سے پیار تو بے مثال تھا ہی لیکن ان کے شاگردوں کا بھی آپ سے پیار حد سے زیادہ تھا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے۔ کہ میرے ابو کی زندگی کی بہت سی خوشیاں ان کے ساتھ وابستہ تھیں۔

کینیڈا آنے کے بعد تقریباً سات آٹھ سال ان کے پاس کوئی مستقل امیگریشن سٹیٹس نہیں تھا۔ ان کے پاس میڈیکل کی سہولت بھی نہیں تھی۔ ابو کو اس عرصے میں کئی دفعہ ہسپتال جانا پڑا۔ اینجیو پلاسٹی وغیرہ بھی ہوئی۔ کبھی تو انشورنس کور کر دیتی تھی۔ لیکن بہت دفعہ انشورنس نہیں ہوتی تھی۔ بہر حال وہ وقت مشکل تو تھا لیکن دوسرے مشکل وقتوں کی طرح وہ بھی گذر گیا۔ کینیڈا میں اللہ کے فضل سے جماعت کافی بڑی تھی۔ کہاں ایسالا میں دو تین فیملیز اور کہاں کینیڈا کا پیس ویلج۔ ابو امی کی مستقل رہائش تو ماہر بھائی کے پاس مسی ساگا میں تھی۔ لیکن بیت الاسلام مسجد اور پیس ویلج آنا جانا رہتا تھا۔ ابو کے بہت ہی پیارے بھائی اور اس وقت کینیڈا جماعت کے امیر اور مشنری مکرم نسیم مہدی صاحب بھی پیس ویلج میں ہی تھے۔ اگر چہ وہ ابو سے عمر میں 17 سال چھوٹے تھے لیکن ابو ان کی مربی اور خادم سلسلہ ہونے کی وجہ سے بہت عزت کرتے تھے اور محبت تو بے پناہ تھی ہی۔ امی تو ان کو اپنا بیٹا تصور کرتی تھیں۔ اور وہ بھی میرے دونوں ماں باپ سے بہت محبت کرتے تھے۔ ٹورانٹو جماعت کی گہما گہمی اور رونق میں تو کوئی بھی اجنبیت محسوس نہیں کرتا تو میرے والدین تو ربوہ سے آئے اپنے بہت سے شاگردوں اور دوستوں سے مل گئے۔ ادبی سرگرمیاں بھی جاری رہیں جن میں ابو بھرپور شامل ہوتے۔ مشاعروں کا انعقاد، ٹی آئی کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے پروگرام اور بہت سی اور تقریبات۔ راول ٹی وی پر ایک گفتگو کا پروگرام ''چہرے'' تھا۔ ابو اس کی میزبانی کرتے تھے۔ اس کی بہت تیاری کرتے اور اہتمام

سے ہر پروگرام میں بڑی دلچسپ گفتگو ہوتی۔ یہ پروگرام کافی عرصہ راول ٹی وی پر چلتا رہا۔

ابو کو کتابوں سے عشق تھا۔کبھی لائبریری سے کتابیں لاتے تو کبھی دوکانوں سے خرید کر لاتے۔ جرارڈ سٹریٹ پر ایک اردو کتابوں کی دوکان تھی جس کا نام غالباً اسلامی کتب تھا۔ ابو وہاں کبھی کسی دوست، بچے یا کبھی بس پر بھی جایا کرتے تھے۔ جو کتاب لیتے۔ ان کے کمرے میں کتابوں اور کاغذوں کا ایک انبار رہتا۔کبھی ہم ابو کی غیر حاضری میں ان کی چیزوں کو ترتیب دینے کی کوشش کرتے تو ہمیں کافی ڈانٹ پڑتی تھی اور ابو کو کئی دن تک ان کی چیزیں نہیں ملتی تھیں جو وہ ڈھونڈ رہے ہوتے تھے۔ہمیں لگتا ھا کہ اس انبار میں سے کچھ کیسے مل سکتا ہے۔لیکن ابو وہاں سے مطلوبہ چیز ایک سیکنڈ میں ڈھونڈ نکالتے تھے۔آخری کار ہمیں سمجھ آ ہی گئی کہ یہ منظم بے نظمی تھی۔ جو باہر والے کو تو بے نظمی لگتی تھی لیکن ابو کے لئے ایک منظم نظام تھا۔صرف وہی سمجھتے تھے اور خوب سمجھتے تھے۔

جہاں تک ابو کی خاندانی زندگی کا تعلق ہے تو جیسے آپ باہر محفلوں کا مرکز تھے اسی طرح خاندانی محفلوں اور دعوتوں میں بھی وہ محفل کی جان ہوتے تھے۔ خاندان کے بہت سے لوگ کینیڈا میں آباد ہیں۔ ابو کے بہن بھائی اور ان کے کئی بچے اس کے علاوہ ان کے اپنے بچے اور سارے بچوں کے بچے بھی نظروں کے سامنے تھے۔ امی ابو اس بات پر اکثر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے۔ کہ ان کے سارے بچے آدھے گھنٹے کے اندر فاصلے پر ہیں۔ ان کے تیرہ پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں ہیں۔ اور ان سب میں امی ابو کی جان تھی۔

پوتیوں اور نواسیوں سے ابو کا بہت ہی خاص پیار کا سلوک تھا۔ ہر ایک کی بات سنتے۔ ان کی کامیابیوں پر خوش ہوتے اور انعام بھی دیتے۔ جب کوئی بچی آتی تو اسے دیکھ کر آپ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھتا۔ اسے چومتے اور بہت پیار کی باتیں کرتے۔

ابو کی چھوٹی بہن سلیمہ بھروانہ صاحبہ جن کو گھر میں بے بی کہتے ہیں اپنے شوہر مکرم اسلم بھروانہ صاحب کی وفات 28 مئی 2010 کو شہادت کے بعد کینیڈا منتقل ہو گئیں۔ ابو ہر روز انہیں فون کرتے اور خیریت پوچھتے۔ جب بھی گھر سے کہیں جانے کے لئے نکلتے تو پہلے پوچھتے کہ بے جی چلی گئی۔ ان کی چھوٹی پوتی ذونیرہ سے انہیں خاص پیار تھا۔ جب بھی ویڈیو کال کرتے تو انہیں کہتے ذونیرہ سے تو بات کرواؤ۔ وہ جب ملنے بھی آتی تو اسے خاص طور پر پیار کرتے۔

2020 میں کوویڈ کے شروع کے دنوں میں ابو سیڑھیوں سے گر گئے جس کی وجہ سے ان کی ٹانگ میں دو جگہ فریکچر ہو گیا۔ سرجری ممکن نہیں تھی تو ہسپتال میں دو ہفتے مکمل isolation میں رہے۔ نہ کسی کو جانے کی اجازت تھی۔ اور نہ بہت زیادہ رابطہ ہو پاتا تھا۔ وہ وقت ابو کے لئے بہت تکلیف دہ ثابت ہوا۔ ابو جب گھر آئے تو ان کی ذہنی حالت بہت بدل چکی تھی۔ اس کے بعد وہ زیادہ لکھ نہیں پاتے تھے۔ اوران کی ہمت بہت گر گئی۔ واکر کے ساتھ چل تو لیتے تھے لیکن پھر زیادہ ایکٹو نہیں ہو پائے۔

آخری بیماری بہت سنگین نہیں تھی۔ بیمار ہونے سے چند دن پہلے دو شادیاں اٹینڈ کی اور کئی دوستوں اور رشتے داروں سے ملاقات ہوئی۔ پیٹ میں کچھ تکلیف تھی جس کی وجہ سے ہسپتال چیک اپ کروانے کے لئے گئے۔ ابو کا دل، گردے اور پھیپھڑے سب ہی کمزور تھے لیکن Stable تھے اور دوائیوں سے مینیج ہو رہے تھے۔ ہسپتال میں ٹیسٹ وغیرہ ہوئے اور اسی کے دوران گردوں پر شدید اثر پڑا۔ اوران کے گردے جو پہلے ہی بارڈر لائن پر تھے بری طرح متاثر ہوئے۔ اور فنکشن اور کم ہو گیا۔ اور نوبت dialysis تک پہنچ گئی۔ دل اتنا کمزور تھا کہ ڈاکٹروں کے خیال میں dialysis کامیاب نہیں ہو پانا تھا۔ ڈاکٹر نے ابو کا فیصلہ پوچھا تو ابو نے ڈاکٹر کو کہا کہ تم جو کر سکتے ہو باقی اللہ پر چھوڑ دو۔ انہیں امی کی بہت فکر تھی۔ انہوں نے مجھے تاکید کی کہ امی کو مت بتانا کہ ڈاکٹر کے خیال میں امید کم ہے اور

وقت کم ہے۔ جب تک ابو بات کر سکتے تھے وہ پوچھنے والوں کو یہی کہتے تھے کہ الحمدللہ میری طبیعت بہت بہتر ہے۔

ابو 6 ہفتے ہسپتال میں رہے۔اور ہمیشہ کی طرح بہت ہمت اور حوصلے سے بیماری کا مقابلہ کیا۔اس دوران میں انہوں نے کئی دفعہ حضور کی خدمت میں خط لکھنے کے لئے کہا جو میں لکھتی رہی۔مگر آخری کچھ دنوں میں ابو نے اپنے ہاتھوں سے بھی حضور انور کی خدمت میں دعا کے لئے خط لکھے۔اور امیر صاحب کینیڈا کی خدمت میں خط لکھا جس میں دعا کے لئے درخواست کی۔Dialysis پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا اور ابو کی تکلیف بڑھتی جارہی تھی۔آخری سیشن آپ کے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔میں ان کے ساتھ تھی اور ابو ہر ایک منٹ کے بعد پوچھتے تھے کہ اب کتنا وقت رہتا ہے۔اس کے بعد Dialysis روک دیا گیا۔27 ستمبر کی رات ابو کو ہسپتال کے Palliative care میں منتقل کر دیا گیا۔اور 28 ستمبر کی صبح تقریباً 7:20 پر آپ ہمیں چھوڑ کر اپنے خالق سے جا ملے۔ **اناللہ و انا الیہ راجعون۔**

ہسپتال کے آخری 6 ہفتے ابو اپنی پوتیوں اور نواسیوں میں گھرے رہے۔کمرے میں اور باہر ویٹنگ روم میں بچیاں ہر وقت موجود رہتیں۔ابو ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔اگر کوئی زیادہ دیر نظر نہیں آتی تھی تو اس کا پوچھتے اور بلا لیتے۔ہسپتال والوں نے بھی بہت تعاون کیا اور اتنے لوگوں کے وہاں رہنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔امی ویسے تو گھر سے باہر جانا نہیں جاتی تھیں لیکن ابو کی اس بیماری میں تقریباً روزانہ ہسپتال آتیں۔اور ابو اٹھ کر بیٹھ جاتے اور بہت خوشی سے باتیں کرتے۔

اس وقت جب میں یہ لکھ رہی ہوں امی کی وفات کو بھی 3 مہینے ہو گئے ہیں۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میرے دونوں ماں باپ کو اپنی جنتوں میں ایک عالیشان گھر عطا فرمائے۔ان سے مغفرت کا سلوک فرمائے اور درجات بلند سے بلند کرتا چلا جائے۔(آمین)

محترم پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد خان صاحب المعروف پرویز پروازی وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ مایہ ناز ماہر تعلیم، اردو کے قادر الکلام شاعر، اعلیٰ پائے کے نقاد، انشا پرداز اور مصنف تھے

(ابو سدید)

احباب جماعت کو بہت دکھ اور افسوس کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ جماعت احمدیہ کے اردو کے معروف شاعر، ادیب، مصنف اور مایہ ناز ماہر تعلیم محترم پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد خان صاحب المعروف پرویز پروازی مورخہ 28 ستمبر بروز جمعرات 2023ء بعمر 87 سال کینیڈا میں بقضائے الٰہی وفات پا گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ نے ایک لمبا عرصہ بیماری میں گزارا۔ آپ محترم مولانا احمد خان صاحب نسیم (مبلغ سلسلہ) کے بیٹے، مولانا محمد احمد جلیل صاحب کے داماد اور محترم مولانا نسیم مہدی صاحب مرحوم (مبلغ سلسلہ) کے بھائی تھے۔ آپ کا اصل نام ناصر احمد خاں تھا جبکہ قلمی نام پرویز پروازی استعمال کرتے تھے اور اسی نام سے دنیائے ادب اور تعلیم کے میدانوں میں پاکستان اور پھر بیرون پاکستان مشہور ہوئے۔ آپ 20 اکتوبر 1936ء کو قادیان میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ربوہ میں مقیم ہو گئے۔ جون 1956ء میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ اور 1958ء میں بی اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ 1960ء میں ایم اے، یونیورسٹی اورمینٹل کالج لاہور سے پاس کیا۔

آپ نے سلسلۂ تدریس کا آغاز 1960ء میں گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ سے کیا۔ 1961ء تا1969ء تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں بطور لیکچرار پڑھاتے رہے۔ پھر ترقی حاصل کر کے بطور پروفیسر 1969 تا 1975، تعلیم الاسلام کالج میں ہی تدریس کی خدمات انجام دیں۔ 1975ء تا 1979ء آپ وزٹینگ پروفیسر اوساکا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز جاپان رہے۔ 1979ء تا1982ء انٹر کالج کمالیہ میں اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر تدریس کا کام کیا۔ 1982ء تا 1986ء مسلم انٹر کالج چک 41 ج ب فیصل آباد میں اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ 1986ء تا 1990ء بطور اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں پڑھایا۔ 1991ء تا2001ء، پروفیسر ریسرچ ایٹ اپسالا یونیورسٹی سویڈن میں خدمات انجام دیں۔

آپ کی متعدد تصنیفات اور تالیفات منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

1964ء۔ ذکر اردو، تعلیم الاسلام کالج کی پہلی کل پاکستان اردو کانفرنس کے مضامین کا مجموعہ

1977ء۔ خوبصورت جاپان اور میں، کاواباتا یاسوناری کی نوبیل تقریر کا اردو ترجمہ

1978۔ یوکی گونی، کاواباتا کے ناول کا اردو ترجمہ

1980ء۔ جاپان کا سب سے لمبا دن۔ 1980ء۔ جاپان کی ہائیکو شاعری کا انتخاب اور ترجمہ

1981ء۔ سورج کے ساتھ ساتھ، جاپان کا سفر نامہ

1997ء۔ صدائے آب، ہائیکو پر تنقیدی مضامین

2002ء۔ آ کی ہے، ہیروشیما کے المیہ کے پس منظر میں ناول

2003ء۔ احمدیہ کلچر۔ جلد 2003ء سر ظفر اللہ کا تحریک آزادی میں حصہ

2003ء۔ پس نوشت اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں کا جائزہ

2005ء۔ سر ظفر اللہ کی یادداشتیں

Reminiscences of Sir ZafarUllah۔2006ء

2008ء۔ پس نوشت اور پس پس نوشت (مزید خودنوشت سوانح عمریوں کا تجزیہ)

2010ء۔ پس نوشت سوم (مزید خودنوشتوں کا جائزہ)

آپ کا حاصل عمر" حبل الورید" قرآن کریم کا اردو ترجمہ (غیر مطبوعہ) ہے۔خودنوشتوں کے تجزیے کا کام آپ نے آخر تک جاری رکھا۔آپ پاکستان سے تیسری ہجرت کے بعد 2003ء سے کینیڈا میں مقیم رہے۔آپ بذلہ سنج اور مرنجان مرنج طبیعت کے حامل اور بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔دور طالب علمی سے لے کر آخر عمر تک اپنے دوستوں،قریبیوں اور رشتہ داروں میں ہر دلعزیز رہے۔جس محفل میں ہوتے صاحب محفل ہوتے۔کالج کے اسٹیج پر ہوتے یا بعد میں کسی تقریب میں آپ کا طرزِ خطابت منفرد ہوتا۔ساتھی طلبہ کو آپ کی ڈیبیٹ کا اچھوتا انداز بہت پسند تھا جس کی وجہ سے آپ جہاں بھی جاتے اور مقابلوں میں حصہ لیتے وہاں سامعین آپ کے منتظر ہوتے۔آپ بہت ہمدرد اور پیار کرنے والی شخصیت تھے۔دوستوں کے دوست اور غمخوار بھی تھے۔خلافت احمدیہ سے ہمیشہ وابستہ رہے اور خوب فیض بھی پایا۔ایسی نستعلیق شخصیت اور نایاب لوگ دیکھنے کو بہت کم ملتے ہیں۔آپ کی وفات کے ساتھ ترقی پسند اردو ادب اور منفرد انداز کا درس وتدریس کا ایک شاندار دور اختتام کو پہنچا۔دنیا بھر میں آپ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔آپ اردو کا گہرا ذوق رکھنے والے قیمتی سرمایہ تھے اس سلسلہ میں آپ کی خدمات یاد رکھی جائیں گی۔

آپ کے لواحقین میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے، مغفرت کی چادر میں لپیٹ لے،اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے۔

پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد خان صاحب پرویز پروازی صاحب کا ذکر خیر

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز فرماتے ہیں

"بعض مرحومین کا ذکر بھی کروں گا جیسا میں سے پہلا ذکر ہے: پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد خان صاحب جو پرویز پروازی صاحب کے نام سے مشہور تھے۔

گذشتہ دنوں کینیڈا میں ستاسی سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

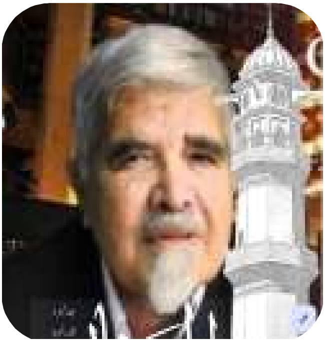

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔

آپ قادیان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد مولانا احمد خان صاحب نسیم مبلغ سلسلہ تھے۔ پھر بڑا لمبا عرصہ ایڈیشنل ناظر اصلاح وارشاد مقامی رہے اور وہ بھی بڑے دبنگ قسم کے آدمی تھے۔ جماعتوں کو انہوں نے بڑا آرگنائز کیا۔ ان کی والدہ رحمت بی بی تھیں۔ پروازی صاحب نے قادیان میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر میٹرک کے بعد انہوں نے کالج میں داخلہ نہیں لیا کیونکہ تعلیم الاسلام کالج اس وقت لاہور میں ہوتا تھا۔ پھر جب کالج ربوہ میں شفٹ ہوا تو انہوں نے وہاں کالج میں داخلہ لیا۔ 1958ء میں بی اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ 1969ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ایم اے کیا اور 68ء میں پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پروفیسر ناصر پروازی صاحب 1960ء میں اردو میں ایم اے کرنے کے بعد لیکچرر مقرر

ہوئے اور تدریس کا آغاز انہوں نے حکومت کے گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ سے کیا۔ پھر ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ الفضل میں، ماہنامہ مصباح میں، خالد وغیرہ میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ اسی طرح شعر و شاعری سے بھی ان کو خاص شغف تھا۔ اچھے شعر کہا کرتے تھے۔ جب تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں بن گیا تو وقف کر کے 1961ء میں یہ وہاں آ گئے اور 1969ء تک لیکچرر کے طور پر کام کیا۔ 1969ء سے 75ء تک تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں اردو ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ کے طور پر مقرر کیے گئے۔ 1975ء سے 79ء تک اوساکا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز (Osaka University of Foreign Studies) جاپان میں وزیٹنگ پروفیسر مقرر ہوئے جہاں خدمات کے دوران انہوں نے پاکستان اور جاپان کے بہترین تعلقات کی بڑی کوشش کی۔ ٹوکیو میں جماعت کے قیام کے سلسلے میں بھی انہوں نے مدد کی۔ 1979ء میں یہ واپس آ گئے تو پھر کالج قومیائے جانے کے بعد پاکستان کے مختلف کالجوں میں یہ اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر پڑھاتے رہے۔ 86ء سے 90ء تک یہ بطور اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں پڑھایا کرتے تھے۔ احمدی ہونے کی وجہ سے اس دَور میں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر جب نوبت گرفتاری تک پہنچ گئی تو سب چھوڑ چھاڑ کے یہاں یوکے آ گئے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر ان کے حکم سے سویڈن ہجرت کی اور وہاں 1991ء سے 2001ء تک اُپسالہ یونیورسٹی (Uppsala University) سویڈن میں پروفیسر کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ سویڈن میں قیام کے دوران نوبیل پرائز کمیٹی فار لٹریچر کے رکن بھی بنے اور سولہ سال خدمات سرانجام دیتے رہے۔ 2003ء میں کینیڈا ہجرت کر گئے۔ دنیائے ادب اور تعلیم کے میدان میں آپ کا نام کافی مشہور رہے۔ ان کی اہلیہ امۃ المجید صاحبہ بنت مولوی محمد احمد صاحب جلیل ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو دو بیٹوں اور تین بیٹیوں سے نوازا۔

ان کی اہلیہ کہتی ہیں کہ تریسٹھ سال کا ہمارا ساتھ تھا۔ ہر اونچ نیچ، خوشی غمی، عسر و یسر میں انہوں نے خوب ساتھ نبھایا اور کیونکہ میں والدین کی بڑی بیٹی تھی، ربوہ میں رہی۔ انہوں نے بھی، (پروفیسر پروازی صاحب نے بھی) کبھی مجھے ان کی خدمت سے نہیں روکا بلکہ میرے سے بڑھ کر ان کا خیال رکھا۔ کہتی ہیں ان کا سلوک میرے سب رشتے داروں سے یعنی اپنے سسرالی رشتے داروں سے بھی بہت مثالی تھا۔ ایتائے ذی القربیٰ کی ایک اعلیٰ مثال تھی۔ انتہائی محبت اور اخلاص سے رشتے داروں سے پیش آیا کرتے تھے۔ان کی ہر خوشی غمی میں شریک ہونا۔

ان کے بیٹے طاہر احمد خان کہتے ہیں: کسی بھی حال میں اور حالت میں چہرے پر مسکراہٹ ہی ہوتی تھی۔ ہمیشہ خلافتِ احمدیہ سے والہانہ محبت کرتے رہے اور لکھا ہے کہ تادم مرگ میرے سے ان کا رابطہ رہا اور دعا کی درخواست کرتے رہے۔ گذشتہ دنوں شدید بیماری میں بھی جب ڈاکٹر جواب دے چکے تھے اور ان سے ہاتھ سے لکھنا بھی مشکل تھا پہلے تو پیغام بھیجتے رہے پھر بعض دفعہ بڑی شکستہ تحریر میں اپنے ہاتھ سے اپنے بستر سے لیٹے لیٹے ہی دعا کا خط لکھ کے مجھے بھجوایا کرتے تھے۔ بڑا اخلاص و وفا کا تعلق تھا۔ان کے بیٹے لکھتے ہیں کہ جاپان میں قیام کے دوران والد صاحب کو انسائیکلو پیڈیا کا انعام ملا جو اس زمانے میں ایک بڑا انعام ہوتا تھا وہ انہوں نے خلافت لائبریری کو donate کر دیا۔ 1980ء کی دہائی میں علامہ اقبال گولڈ میڈل فار لٹریچر سے بھی نوازا گیا لیکن احمدی ہونے کی وجہ سے ان کو بلایا نہیں گیا اور ان کا میڈل گھر میں بھیج دیا گیا۔

ان کی بیٹی امۃ الودود کہتی ہیں: میرے والد کو قرآن کریم سے عشق تھا۔ بلا ناغہ روزانہ پورے سیپارے کی تلاوت کرتے تھے اور کہتی ہیں کبھی مجھے کسی مضمون یا تقریر کے لیے کوئی حوالہ چاہیے ہوتا تو ایک منٹ میں بتا دیتے کہ فلاں سورت کی فلاں آیت میں یہ تلاش کرو۔ کہتی ہیں کہ ہمارے والد نے

ہمیں خلافت سے محبت سکھائی۔confidence دیا کہ اپنے دل کی بات بیان کرسکوں اور خلیفہ وقت سے تعلق پیدا کرسکوں۔

ان کی دوسری بیٹی سعدیہ کہتی ہیں: میرے والد خلافت کے شیدائی تھے۔ ہمیشہ ان کی گفتگو میں اور رویّے میں خلافت احمدیہ کے لیے انتہا درجے کی محبت اور ادب دیکھا۔ ہمیشہ دیکھتے تھے کہ ہمارے والد ہر کام سے پہلے خلیفہ وقت کو خط لکھتے تھے، دعا کی درخواست کرتے تھے اور بیماری کے آخری ایام میں بھی جب ڈاکٹر نے آکر تشویش کا اظہار کیا، ناامیدی کی باتیں کیں تو ڈاکٹر کے ان کے کمرے سے نکلتے ہی انہوں نے مجھے کہا کہ پین اور کاغذ لاؤ اور کمزور اور کانپتے ہاتھوں سے دعا کے لیے انہوں نے مجھے خط لکھا جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ خط لکھتے تھے۔ صدقہ بہت دیتے تھے۔ جتنی رقم ہوتی صرف صدقہ میں دے دیتے تھے۔

نائلہ محمود نواسی ہیں۔ ظفر محمود ان کے والد ہیں۔ کہتی ہیں میں نے اپنے نانا کے ذریعے سے دیکھا اور سیکھا کہ ایمان کیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے سچی محبت کیسے نظر آتی ہے۔ کہتی ہیں مَیں آپ کی حالت اور آخری سانس تک مسلسل شہادت والی انگلی اٹھا اٹھا کر بار بار اللہ تعالیٰ کو دل سے الحمدللہ الحمدللہ کہنے پر حیران رہ جاتی تھی کہ آخری وقت میں بھی مستقل الحمدللہ پڑھتے رہے۔ کہتی ہیں ان کی محبت کو دیکھ کر میرے دل میں ایک شعلہ بھڑکا ہے کہ اللہ تعالیٰ، قرآن پاک اور خلافت سے جیسی محبت انہیں تھی ویسی مجھے بھی مل جائے۔ اللہ تعالیٰ ان سے مغفرت اور رحم کا سلوک فرمائے اور ان کے بچوں اور نسل کو بھی ان کی نیکیوں کو جاری رکھنے کی توفیق دے۔

(بحوالہ خطبہ جمعہ 6/ اکتوبر 2023ء فرمودہ حضرت مرزا مسرور احمد، خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز)

مولانا نسیم مہدی صاحب

رانا عبدالرزاق خاں

محترم پروازی صاحب کے ایک چھوٹے بھائی مولانا نسیم مہدی صاحب مرحوم بھی تھے ۔ جو کہ مربی سلسلہ احمدیہ تھے ۔ وہ بھی ایک نابغہ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی تقرری ۱۹۸۵ میں کینیڈا ہوئی، آپ کی مقناطیسی شخصیت نے اطاعت خلافت میں وہ کمال کے جوہر دکھائے کہ لوگ عش عش کرنے لگے۔ جماعت احمدیہ کی دن دوگنی رات چوگنی ترقی دیکھ کر دشمنانِ احمدیت بھی انگشت بدندان تھے۔ آپ کی امارت میں عہد فاروقی کی طرح کارہائے نمایاں سرانجام دیئے گئے۔ کہ پہلے اس طور کے عظیم الشان کام جماعت کی تاریخ میں کم ہی دیکھے گئے ہیں۔ فتح نصیب جرنیل کے خادم نے کینیڈا میں جماعتی تاریخ کو چار چاند لگادیئے۔ مساجد اور مشن ہاؤسز کی تعمیر کے ساتھ ساتھ آپ کے حسن کارکردگی نے ایوان اقتدار کے حکمرانوں کو شائستگی سے اسقدر اپنا گرویدہ بنالیا۔ جنہوں نے جماعت کو کچھ اس فراخدلی سے خوشآمدید کہا کہ پیس ولیج جیسا معجزہ رونما ہوا۔ جو کینیڈا کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ مولانا نسیم مہدی صاحب کا ذکر کتاب میں اس لئے ضروری تھا کہ ان کی تربیت میں بھی محترم پروازی صاحب کی تربیت کا بہت عمل دخل تھا۔ خاکسار مولانا نسیم مہدی صاحب کے تمام کارہائے نمایاں کا ذکر تو نہیں کرسکتا۔ مگر ایک مختصر فہرست درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ تاکہ احباب کو اس خاندان کے لئے دعا کرنے کا موقع مل سکے ۔۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

مولانا نسیم مہدی کے کینیڈا عہد امارت کے سنگ میل

(1) زیورخ سے ٹورنٹو تشریف آوری۔ مئی 1985ء

(2)نواں جلسہ سالانہ کینیڈا۔جون1985ء

(3)مسجد کے لئے25، ایکڑ زمین کی خرید مسجد بیت الاسلام کا وان شہر میں سنگ بنیاد 20ستمبر1986ء

(4)مسجد بیت الاسلام کی تعمیر کا کام شروع ہوا ستمبر1989ء

(5)ٹورنٹو مشن ہاؤس میں کمپیوٹر نصب ہوا IBM 36اگست1986ء

(6)دسواں جلسہ سالانہ کینیڈا جماعت اکتوبر1986ء

(7)ڈاکٹر عبدالسلام کی آٹاوہ سے ٹورنٹو تشریف آوری مارچ1987ء

(8)حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ کی دوسری بار کینیڈا آمد ستمبر1987ء

(9)گیارھواں جلسہ سالانہ جماعت کینیڈا۔اکتوبر1987ء

(10)پہلا نیشنل اجتماع مجلس خدام الاحمدیہ کینیڈا۔1988ء

(11)جشن تشکر صد سالہ تقریبات23مارچ1989ء

(12)حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ کا کینیڈا میں ورود مسعود جون1989ء

☆مسجد کیلگری کا افتتاح۔28جون1989ء

☆آٹاوہ میں مشن ہاؤس کے لئے100ایکٹرز مین کی خرید۔دسمبر1990ء

☆ونی پیگ میں احمدیہ مشن ہاؤس کی خرید نومبر1990ء

☆پندرہواں جلسہ سالانہ جماعت کینیڈا جولائی1991ء

☆مجلس انصاراللہ کینیڈا کا پہلا قومی اجتماع ستمبر1991ء

☆معروف رہ نما حکیم محمد سعید کی بیت الاسلام میں آمد۔1992ء

☆حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ کا دس روزہ دورہ کینیڈا اکتوبر1992ء

☆مسجد بیت الاسلام کا افتتاح از حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ اکتوبر1992ء

☆ چودہ منزلہ احمدیہ دارالامان (ٹورنٹو) جماعت کے حوالے کیا گیا جولائی 1993ء

☆ (کل اخراجات 25 ملین ڈالر، 166 اپارٹمنٹ)

☆ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ کا مغربی کینیڈا کا نجی دورہ جولائی 1994ء

☆ 20واں جلسہ سالانہ جماعت ہائے کینیڈا جون 1996ء

☆ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ کا الاسکا کا تاریخی سفر 20 ستمبر 1997ء

☆ کینیڈا کے پہلے احمدی شیخ کرم دین 1998-1899 کی وفات 1998ء

☆ ۲۷واں جلسہ سالانہ کینیڈا۔ جولائی 2003

☆ جامعہ احمدیہ کینیڈا کا مسز ساگا میں افتتاح۔ 7 ستمبر 2003ء

☆ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ کا پہلا تاریخ ساز دورہ کینیڈا۔ 21 جون 2004ء

☆ ۲۸واں جلسہ سالانہ کینیڈا، انٹرنیشنل سینٹرز نزد ٹورنٹو ائرپورٹ جولائی 2004ء

☆ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ کا وین کوور کا بابرکت دورہ۔ جون 2005ء

☆ ۳۰واں جلسہ سالانہ کینیڈا۔ احمدیہ پارک کا وان شہر میں افتتاح۔ 2007ء

☆ ملک لال خاں صاحب امیر جماعت کینیڈا مقرر ہوئے

☆ اور مولانا نسیم 1 مہدی صاحب مشنری انچارج۔ 2007ء

☆ صد سالہ خلافت احمدیہ جوبلی سال کی تقریبات 2008-19098۔ 2008ء

☆ احمدیہ گزٹ کینیڈا کا خصوصی شمارہ مئی جون 2008ء

☆ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ کی ٹورنٹو تشریف آوری جولائی 2008ء

☆ مسجد بیت النور کیلگری کا افتتاح جولائی 2008ء

☆ مرسلہ: زکریا ورک، ماخذ: تاریخ جماعت احمدیہ کینیڈا، مرتبہ ہادی علی چوہدری مارچ 2022ء

استاذ الاساتذہ۔ڈاکٹر پرویز پروازی

ڈاکٹر عبدالکریم خالد

1968ء میں میٹرک کرنے کے بعد جب میں پروازی صاحب کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوا تو ان پر عین جوانی کا عالم تھا۔نہایت وجیہہ دراز قد،فرنچ کٹ ڈاڑھی سر کے بال نفاست سے ترشے سنورے ہوئے،کاٹن کی اچکن زیب تن کیے ہوئے سیاہ فریم کی عینک لگائے ایک ادائے بے نیازی سے خرام کرتے تو انہیں دیکھنے اور دیکھتے رہنے کو جی کرتا اور جب کلام کرتے تو پھر وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔گفتگو میں کوئی اُن کے سامنے ٹک ہی نہیں سکتا تھا۔شگفتگی،تازگی اور گاہے مزاح کی چاشنی ان کی باتوں کا حسن تھا۔ان کی باوقار اور پرکشش شخصیت کا ہو بہو عکس میرے دھیان میں ابھی تک موجود ہے۔میں انہیں جانے پہچانے راستے پر چلتے ہوئے اب بھی دیکھتا ہوں،جہاں سے گزر کر وہ کالج پہنچتے تھے۔ریلوے لائن کے متوازی راستے پر پیدل چلتے ہوئے وہ کالج کے پچھلے دروازے سے داخل ہوتے اور سائیکل اسٹینڈ کے قریب سے برآمدے کی دو سیڑھیاں چڑھ کے اپنے کمرے تک پہنچتے۔ان کا مختصر سا کمرہ کالج کی عمارت کے پچھلے حصے میں آخری سرے پر تھا جس میں ان کی نشست کے پہلو میں دو تین کرسیاں لگی ہوئیں جن پر ہم طالب علم یا ان کے ملنے والے بیٹھتے تھے۔

ایسا بھی ہوتا کہ وہ سیدھے چلتے ہوئے کلاس میں آجاتے۔اردو کی کلاس کالج کے کشادہ ہال میں ہوتی جہاں انٹرمیڈیٹ کے تمام سیکشنوں کے طلباء جمع ہو کر ان کی آمد کے منتظر ہوتے۔اُن کی تشریف آوری سے پہلے روسٹرم پر مائک لگا ہوتا۔ہر طالبعلم کی یہ کوشش ہوتی کہ وہ وقت سے پہلے ان کی کلاس

میں موجود ہو۔ تاخیر سے آنے والا یا تو ہال سے باہر ہی کھڑا رہتا یا اندر آنے کی صورت میں نتائج کا خود ذمہ دار ہوتا۔ عین وقت پر پروازی صاحب سٹیج کے بغلی دروازے سے ہال میں داخل ہوتے اور ہم سب ان کے احترام میں کھڑے ہو جاتے۔ وہ سیدھے روسٹرم پر تشریف لاتے اور کچھ دیر خاموش کھڑے رہتے اور جب چھوٹی چھوٹی آوازیں آنا بند ہو جاتیں اور ایک گھمبیر خاموشی طاری ہو جاتی تو ان کی آواز اس سکوت کو توڑتی۔ نہایت آہستگی اور دھیرج سے لیکچر کا آغاز کرتے۔ دھیرے دھیرے آواز بلند ہوتی جاتی۔ شاعری کی قرات بہت عمدہ، شعر دل میں اترتے چلے جاتے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

آدھا مطلب شعر خوانی ہی میں سمجھا دیتے اور جب شعر کی تشریح و توضیح کرتے تو مفاہیم پہلو بدل بدل کر سامنے لاتے۔ حقائق اور معارف کے دریا بہا دیتے۔ سبک خرام، ندی، دریا کی تیز لہروں کی صورت اختیار کر جاتی۔ میر کی غزلیں، آتش و غالب کی غزلیں، استاد محترم نے جو پڑھا دیں، سو پڑھا دیں۔ یوں از بر ہو گئیں کہ آج تک نہ ذہن سے محو ہوئیں، نہ دل وہ سماں بھول پایا۔ زندگی میں کئی نابغوں سے سابقہ پڑا مگر پروازی صاحب کے بعد کوئی نظر میں جچا ہی نہیں۔ اقبال کی غزل پڑھائی۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

تو اس کے ساتھ ہی سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کے یہ اشعار بھی پڑھ ڈالے۔

مجھے دیکھ طالب منتظر مجھے دیکھ شکل مجاز میں
جو خلوص دل کی رمق بھی ہے تیرے ادعائے نیاز میں

تیرے دل میں میرا ظہور ہے ترا سر ہی خود سر طور ہے
تری آنکھ میں مرا نور ہے مجھے کون کہتا ہے دور ہے
مجھے دیکھتا جو نہیں ہے تو یہ تری نظر کا قصور ہے
مجھے دیکھ طالب منتظر مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تری جبین نیاز میں

ان کا اشعار پڑھنے کا انداز ایسا دل نشیں اور دل پذیر تھا کہ تشریح سے پہلے ہی انہوں نے ہمیں تفہیم کی انتہائی سطح پر کھڑا کر دیا۔ آگے جو تشریح ہوئی اس کا جواب نہیں۔ جو پڑھا دیا وہ زندگی بھر بھولا نہیں۔ ان کی زبان سے نکلے ہوئے لفظ اور جملے کے جملے شیخ کی طرح دل میں گڑ گئے۔ لیکچر کے لیکچر زبانی یاد ہو گئے۔ اب کہاں ملتے ہیں ایسے استاد۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر۔

پروازی صاحب کی اعلیٰ ترین تدریسی مہارت، طرز بیان اور اثر انگیز گفتگو کا سلسلہ دھیان میں آتا ہے تو ''ہوائے دور مئے خوش گوار'' کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان سے براہ راست فیض پانے والے شاگردوں کی تعداد گننے میں نہیں آتی جو اس وقت دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ شاگرد اپنے دوسرے اساتذہ کو بھی یاد رکھتے ہوں گے مگر پروازی صاحب شائد واحد استاد ہیں جو اپنے کسی بھی شاگرد کے حاشیہ خیال سے کبھی محو نہیں ہوئے۔ میرا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ ان کے طویل عرصہ تدریس کے دوران میں ان کی مقبولیت کا گراف ہمیشہ اونچا رہا۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی سحر انگیز شخصیت ہے جس کے حصار میں کوئی ایک بار آیا تو پھر نکل نہیں سکا دوسرے ان کی بے پناہ علمی و ادبی بصیرت ہے جو اپنی ایک الگ شان رکھتی ہے۔ زبان و بیان پر عالمانہ دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی اتھاہ میں اتر کر اس کی باریکیوں تک رسائی کا ہنر ان ہی سے مخصوص ہے۔ ادب پاروں کے فہم و ادراک کے معاملے میں ان کی

نکتہ رس طبیعت ایسے ایسے نکات ڈھونڈ لائی جنہیں تلاش کر لینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

انٹر کے دوران میں انہیں فاصلے پر بیٹھ کر دیکھتا اور سنتا تھا، مگر بی۔اے میں انہیں بہت قریب سے دیکھا۔اردو اختیاری کی کلاس میں ہم تین طالب علم تھے جو ان کے محدود کمرے میں سما جاتے تھے۔ میرے ساتھ محمد اسلم خالد (لندن) اور ضیاء الرحمن امجد مرحوم تھے۔ضیاء پاکستان ٹیلی ویژن میں پروڈیوسر ہو گئے تھے۔حالات حاضرہ کے پروگرام کرتے رہے۔افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور جلد رخصت ہو گئے۔محمد اسلم خالد بہت متین اور منجھے ہوئے طالب علم تھے۔ان کا اعزاز یہ ہے کہ وہ کے.جی سکول میں ہمارے حضور کے کلاس فیلو رہے ہیں (1958ء) ہم تینوں پروازی صاحب کے قریب سکڑ کر بیٹھ جاتے تھے۔ان کی باتیں سنتے تھے اور ان کے قرب سے فیض پاتے تھے۔شادی چائے لے کر آ جاتا "پروبجی دی چاء" وہ اپنے مخصوص انداز میں کینٹین پر جا کر آرڈر دیتا اور دونوں ہاتھوں سے ٹرے تھامے ہوئے لے آتا۔ہم چائے پیتے اور گفتگو جاری رہتی۔نصاب سے بات چلتی اور کہیں دُور جا نکلتی۔مثنوی سحر البیان پڑھاتے ہوئے واقعات کے تسلسل میں زبان اور بیان زیر بحث آتے۔

دُوں دُوں خوشی کی خبر کیوں نہ دوں"

مثنوی کے اس مصرع میں "دُوں دُوں" نوبت کی آواز ہے جس کے بجنے پر خوشی کا اعلان ہوتا ہے۔استاد محترم بین السطور میں اتر کر ہمیں وہ نکات سمجھاتے کہ ہم حیرت کے عالم میں منہ کھولے ان کی طرف تکتے رہ جاتے۔ پروازی صاحب کی کلاس میں بیٹھ کر ہمیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔ تعلیم کے ساتھ وہ ہماری تربیت سے بھی بے خبر نہ تھے۔ہماری حرکات وسکنات پر نظر رکھتے۔مجھ سے کئی غلطیاں ہوئیں وہ شفقت سے جتا دیتے۔اعتماد بھی بلا کا تھا۔مرزا خلیل احمد مرحوم کے برادر نسبتی کی شادی تھی۔انہوں نے تعاون طلب کیا تو مجھے بھیج دیا۔میں نے آرائش وزیبائش کے کام میں ان کی مدد

کی تو انہوں نے پروازی صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ ادھر پروازی صاحب الٹا میرا شکریہ ادا کرتے رہے۔ عجیب لوگ تھے۔ اخلاق و اکرام کی اس بلندی پر تھے کہ دیکھنے کے لئے دستار سنبھالنا پڑتی ہے۔ مرزا خلیل احمد مرحوم حضرت مصلح موعود کے صاحبزادے اور خلیفۃ المسیح الاوّل کے نواسے تھے۔ میرے ذرا سے کام کی اتنی قدر کی کہ راہ چلتے ہوئے مجھے دیکھ کر رک جاتے تھے اور مصافحے کا شرف بخشتے اور گلے لگاتے تھے۔ پروازی صاحب ایک بار مجھ سمیت اپنے چند شاگروں کو ساتھ لے کر لاہور تشریف لائے اور یہاں اپنے اساتذہ اور نام ور ادیبوں، شاعروں سے ملوایا۔ ان میں میرزا ادیب، احسان دانش، سید وقار عظیم، سجاد باقر رضوی، عبادت بریلوی، مولانا غلام رسول مہر اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر علامہ علاؤالدین صدیقی شامل تھے۔ ان شخصیات سے پروازی صاحب کے گہرے مراسم تھے اور انہوں نے نہایت محبت سے ہماری پذیرائی کی۔ یہ سب لوگ پروازی صاحب سے جس اپنائیت سے ملے اس سے استاد محترم کی قدر ہمارے دل میں کچھ اور بڑھ گئی۔

کالج میں کئی نام ور ادبی شخصیات کو مدعو کر کے اپنے طالب علموں کے لیے از دیاد علم کا سامان بہم پہنچاتے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور غلام جیلانی اصغر تو ان کے مستقل مہمان تھے وہ ذرا سے بلاوے پر چلے آتے۔ اور محفل شعر یا کوئی ادبی تقریب بپا ہو جاتی۔ ایک بار پروفیسر حمید احمد خان تشریف لائے۔ مجھے ”بزم اردو“ کے صدر کی حیثیت سے صدارت کا اعزاز حاصل ہوا۔ چوہدری محمد علی صاحب نے ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب ''تخلیقی عمل'' کے حوالے سے مضمون پڑھا اور پروفیسر حمید احمد خان نے گفتگو کی۔

پروازی صاحب کی اصل پہچان ان کی شاعری کے حوالے سے ہے، ادبی دنیا میں وہ اسی حوالے سے معروف ہیں لیکن دل چسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے تحقیق، تنقید اور تراجم کے ذیل میں متعدد کتابیں لکھیں لیکن شاعری کی ایک کتاب بھی منظر عام پر نہیں آنے دی۔ حالانکہ ان کا شعری پایہ بہت

بلند ہے۔تعلیم الاسلام کالج میں اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران میں ان کی لکھی ہوئی ایک نظم برادرم محمد داؤ طاہر کے توسط سے دستیاب ہوئی۔اٹھارہ اشعار پر مشتمل یہ نظم مثنوی کے پیرائے میں ہے اور منظر کشی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔چند اشعار دیکھیے۔

چٹانوں کا پر ہول و خاموش دامن جہاں وقت بھی سہم کر سو گیا تھا
پہاڑوں کی وہ سحر آلود وادی جہاں ویرانیاں بو گیا تھا
جہاں گرو کی بیکراں وسعتیں تھیں جہاں رقص کرتے تھے اندھے بگولے
جہاں آرزؤوں کی خاموش قبروں سے اٹھتے تھے آہوں کے زندہ ہیولے
بہاروں کی پریاں جہاں آ کے اندھی فضاؤں کے پنجے میں جکڑی گئی تھیں
خزاؤں کی مسموم سانسیں جہاں زندگی کو جھلس کر تباہ کر گئی تھیں
یہ کس نے فضاؤں کے تاریک دامن میں ڈالا ہے لا کر یہ اجالا سویرا
یہ کس کے خجستہ قدم لے کے آئے خزاؤں میں روشن بہاروں کا پھیرا
اس خاک سے لالہ و گل کھلے ہیں جہاں شور تھا اور پانی نہیں تھا
وہاں سرو قد یوکلپٹس اُگے ہیں جہاں گھاس کا نام تک بھی نہیں تھا
اخوت کے پانی سے سیراب بندے محبت کی چنچل نگاہوں کی بستی
یہ علم و عمل کی حسین شاہراہوں پر چلتی ہوئی درسگاہوں کی بستی
وہ ٹی آئی کالج کی اجلی عمارت پہاڑی کے دامن میں ستا رہی ہے
حسین شاخساروں کی اٹھتی جوانی بہاروں کے سائے کو بہلا رہی ہے
وہ ٹی آئی کالج کہ جس نے مجھے روشنی اور رفعت کا تحفہ دیا ہے

اس کی محبت بھری گود میں آئے میں نے محبت کا پانی پیا ہے
خدا اس محبت کی بستی کو اپنی محبت سے معمور و پرنور رکھے
خدا اس کو آفات سے خود بچائے خدا اس کو آفات سے دور رکھے

طویل بحر کو عموماً سنبھالنا مشکل ہوتا ہے لیکن استاد محترم کی پختہ گوئی اور ہنر مندی ہر شعر سے عیاں ہے۔عین ممکن ہے کہ آج شاید ان اشعار کو پروازی صاحب کے بہترین نامہ سخن میں شمار نہ کیا جائے۔ لیکن یہ اس وقت کی یادگار ہے جب وہ ٹی آئی کالج ربوہ سے غالباً بی۔اے آنرز کر رہے تھے۔ پروازی صاحب مشاعروں میں اپنا کلام پیش کرتے رہے ہیں۔اور یوں اہل ذوق کی تسکین بھی ہوتی رہی اور نئے شاعروں کو سلیقے سے شعر کہنے کی رہنمائی بھی ملتی رہی۔ان کا ایک نعتیہ شعر، سادہ بیانی اور اثر انگیزی کی ایک بلیغ مثال۔

نام خیر الانام کا لکھا
ایک ہی لفظ کام کا لکھا

ان کی غزلوں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بند تھے سارے دریچے کہاں دستک دیتے
شہر میں کون سخی تھا جو گدائی دیتا

بیلیں جھکی ہوئی ہیں دریچے اداس ہیں
چہرہ وہ پھول جیسا یہاں پر جو تھا نہیں

ہولے ہولے چڑھ آیا ہے جمنا کا طوفان
رفتہ رفتہ ڈوب گئے ہیں تاج محل کے سائے

خواہش بہت تھی ہم بنیں ان کی گلی کی خاک
ہم خاک ہو گئے تو ہوا تیز ہو گئی
ہم تو رہتے ہیں محبت کے ادب میں پیچھے
لوگ ہوتے ہیں کسی اور سبب سے آگے

تحقیق کے شعبے میں پروازی صاحب کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی غیر مطبوعہ فہرست مقالات کے مطابق یہ مقالہ "اردو ناول نذیر احمد مرزا رسوا تک" کے موضوع پر 1966ء میں لکھا گیا۔ پروفیسر سید وقار عظیم اس کے نگران تھے اور اس پر پروازی صاحب کا اصل نام ناصر احمد خاں درج ہے۔ یہ مقالہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔

پروازی صاحب کے سینکڑوں علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین ملک کے وقیع جرائد ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ان کا اہم ترین ادبی کارنامہ اردو کی اہم خودنوشتوں کا تنقیدی جائزہ ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ اس کام کی تحریک انہیں اس وقت ہوئی جب وہ اپسالا یونیورسٹی سویڈن میں بعض ریسرچرز کو برصغیر کے مدبرین کی سیاسی سوانح عمریوں پر کام کروارہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اردو کے مراکز سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر آپ بیتی کے حوالے سے جو شاندار کام کیا ہے اس کی نظیر پیش کرنا مشکل ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب ''پس نوشت'' 2003ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں 75 آپ بیتیوں کے گہرے اور تفصیلی مطالعے کے بعد ان پر اپنی ناقدانہ رائے پیش کی گئی ہے۔دوسری کتاب 2008ء میں ''پس نوشت اور پس پس نوشت" کے نام سے منظر عام پر آئی۔اس کتاب کو گذشتہ کتاب کی توسیع سمجھنا چاہیے جس میں ''پس نوشت" کی تقریباً 71 آپ بیتیوں سمیت 142 آپ بیتیاں شامل ہیں۔ گویا مزید 71 آپ بیتیاں شامل کر کے اپنے مطالعے کا دائرہ وسیع کر دیا گیا ہے۔اس کتاب میں معروف دانش ور

اور مصنف ڈاکٹر داؤد رہبر کے دو طویل خطوط بھی شامل کیے گئے جن میں پروازی صاحب کے اس کام کو سراہا گیا ہے۔ البتہ تنقید کے لہجے کو نرم کرنے کا مشورہ بھی دیا گیا ہے۔ "پس نوشت" حصہ سوم 2010ء میں شائع ہوئی جس میں 69 آپ بیتیوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ یوں پروازی صاحب کے دائرہ تنقید میں آنے والی آپ بیتیوں کی تعداد 211 ہو جاتی ہے۔ یہ تعداد ''نقوش'' کے آپ بیتی نمبر اور دیگر محققین اور ناقدین کی طرف سے پیش کی گئی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ اس پر مستزاد آپ بیتیوں کی وہ تعداد بھی ہے جو اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں لکھی گئی ہیں اور انہیں بھی موضوع تنقید بنایا گیا ہے۔ پروازی صاحب اپنے گہرے مطالعے اور انتہائی توجہ اور محنت سے اس کام کو اس سطح پر لے آئے ہیں کہ آپ بیتی پر کام کرنے والا کوئی محقق اس سے اکتساب کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پروازی صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک ایک آپ بیتی کو لے کر اس کے مندرجات اور بین السطور تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور اس میں بیان کیے گئے واقعات کی صداقت کو پرکھنے کے لئے دیگر آپ بیتیوں کے حوالے بھی اپنے ذہن میں مستحضر رکھتے ہیں اور جہاں کسی نے غلط بیانی کی وہاں فوراً اس کی گرفت کرتے اور اسے واقعہ کی اصلیت اس کے درست تناظر میں یاد دلاتے ہیں۔ ان کی یادداشت میں تمام آپ بیتیاں محفوظ ہیں اور وہ ان کے جھوٹ سچ سے پوری طرح واقف ہیں۔ اس جھوٹ سچ کو بے نقاب کرنے میں وہ کسی مصلحت کو رکاوٹ نہیں بننے دیتے۔ یہاں معروف ترقی پسند دانش ور حمید اختر کی یہ سطور درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں۔

''کسی بھی زیر تبصرہ کتاب میں کوئی تضاد بیانی ہو یا کسی لکھنے والے نے واقعات بیان کرنے میں غلطی کا ارتکاب کیا ہو تو برسوں بلکہ عشروں قبل شائع ہونے والی کسی دوسری آپ بیتی کے مستند حوالوں سے معہ اس کتاب کے صفحہ نمبر کے متعلقہ تحریر کے ذریعے صحیح واقعات سامنے لے آتے ہیں۔ دو ڈھائی

سو کتابوں کے جن کی اشاعت کا زمانہ ستر اسی برس پر محیط ہو، متن سے ایسے حوالوں کو ڈھونڈ نکالنا یا یاد رکھنا ہمارے جیسے خاکی انسان کے بس کی تو بات ہی نہیں۔ ایسا جناتی کام پروازی صاحب جیسا آدمی ہی کرسکتا ہے جسے اپنے علمی اور تحقیقاتی کام سے جنون کی حد تک لگاؤ ہو۔“ (پس نوشت جلد سوم ص10)

پروازی صاحب 1975ء سے 1979ء تک جاپان کی اوساکا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز میں وزیٹنگ پروفیسر رہے ہیں۔ اس دورانیے میں انہوں نے اپنے کار منصبی سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ جاپانی زبان اور وہاں کے کلچر اور ادب کا بھی بنظر غائر مطالعہ کیا۔ اس مطالعے کا حاصل ان کی چھ کتابیں ہیں۔ جن میں ایک ناول ”آ کی ہے“۔ (1994ء) ایک سفرنامہ ”سورج کے ساتھ ساتھ“ (1980) ہائیکو پر تنقیدی مضامین (1997) اور تین تراجم ”خوب صورت جاپان اور میں“ (1997ء)۔ ”جاپان کا سب سے لمبا دن“ (1978ء) اور ”ہائیکو“ (1979) کے نام سے جاپانی شاعری کا ترجمہ شامل ہیں۔ ہمارے یہاں کے کئی اسکالر اور پروفیسر اس منصب پر جاپان رہ چکے ہیں لیکن جاپان اور اس کی ثقافت کو اُردو ادب میں متعارف کرانے کے حوالے سے ان کا خانہ خالی ہی رہا۔ یہ کام صرف پروازی صاحب ہی کر سکتے تھے جو اپنے ہدف پر نظر رکھتے اور اسے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ پروازی صاحب نے سرظفراللہ خان کے حوالے سے بھی دو کتابیں تالیف کیں جن میں ”سرظفراللہ خان کا تحریک آزادی میں حصہ“ (2002ء) اور ”سرظفراللہ خان کی یادداشتیں“ (2003) شامل ہیں۔

20 اکتوبر 1936ء کو بھارت کے شہر قادیان میں جنم لینے والے پروازی صاحب 20 اکتوبر 2023ء کو 87 برس کے ہو جائیں گے۔ ان کے علمی و ادبی ذوق وشوق کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے ابھی تک قلم ہاتھ سے نہیں رکھا۔ اگرچہ کئی عوارض دامن گیر ہیں لیکن دل کی تاب وتواں قائم ہے۔ زندگی میں بے شمار مسائل کا سامنا رہا۔ علم و ادب کا یہ گوہر نایاب ناقدری حالات کا شکار رہا لیکن اس نے کسی

مرحلے پر خود کو نگوں سار نہیں ہونے دیا۔ میں ان کی تندرستی اور صحت یابی کے لئے دعا گو ہوں۔ انہوں نے ''حبل الورید'' کے نام سے قرآن پاک کا با محاورہ اردو ترجمہ بھی کر رکھا ہے۔ اللہ کرے پروازی صاحب کا یہ اہم کام بھی جلد منظر عام پر آئے۔

استاذی المکرم جناب پروازی صاحب کی بذلہ سنجی وخوش مزاجی

ناصر احمد وینس

استاذی المکرم پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد خان پرویز پروازی صاحب اور استاذی المکرم پروفیسر ڈاکٹر محمد شریف خان صاحب تعلیم و ادب کے دو ایسے ستارے تھے جن کے ٹوٹ جانے سے آسمان کا ایک حصہ خالی ہو گیا۔ جن کے ہونے سے دنیائے ادب، علم و سائنس کی توقیر و حسن میں ایک ایسی دلکشی تھی جو انہی سے مخصوص تھی۔

زیر نظر سطور میں، اپنے مولائے حقیقی کے حضور حاضر ہونے والے استاد محترم جناب پرویز پروازی صاحب کی یادوں پر مشتمل چند بھولی بسری یادیں، ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں پیش کرنے کی جسارت کرنے لگا ہوں۔ اور شائد وجود کی یہی وہ پر اسرار صدا ہے جس کی یاد اور بازگشت میں روحوں کا سفر جاری رہتا ہے

سورج گھر سے نکل چکا تھا کرنیں تیز کیے
شبنم، گل سے پوچھ رہی تھی مہلت کتنی ہے ؟

بلاشبہ پروازی صاحب جیسے صاحبان کمال راتوں رات پیدا نہیں ہوتے۔ پروازی صاحب جتنے بڑے ادیب، شاعر، انشاء پرداز، پروفیسر اور تاریخ دان تھے، اتنے ہی عمدہ انسان بھی تھے۔ ان کے جملوں کی مخصوص کاٹ، شوخی، بذلہ سنجی ان کی باغ و بہار اور زندہ دل شخصیت کا آئینہ دار تھی۔

کیونکہ مسکراہٹ اظہار کا وہ اسلوب ہے جس کے راستے کبھی بند نہیں ہوتے۔ مزاح اور لطائف انہی راستوں کے وہ راہی ہیں جن کی ہمسفری میں زندگی ہنستی ہے، مسکراتی ہے اور مرجھائے ہوئے دل بھی کنول کی طرح کھل اٹھتے ہیں۔ استاذی المحترم پروازی صاحب کی اس خداداد صلاحیت کے چند واقعات بیان کرنا چاہتا ہوں۔

اپنے وقت کی بے مثال درسگاہ تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے فارغ التحصیل طلباء محترم پروازی صاحب کی بذلہ سنج شخصیت سے خوب واقف ہوں گے۔ بالخصوص جنہوں نے ان کا ''سفر نامہ جاپان'' پڑھا ہے وہ یقیناً جانتے ہوں گے کہ وہ معمولی موضوعات کو بھی کتنی چابکدستی سے وسعت دے کر ان کے اندر معانی کی ایک خوش باش دنیا سجا دیتے تھے۔ اور کوئی خواہ کتنا ہی زود رنج واقع کیوں نہ ہوا ہو یہ سطور پڑھتے ہی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر خود بخود کھیلنے لگ جاتی ہے۔

ایک دفعہ کالج میں پروازی صاحب اور عربی کے ایک سینئر پروفیسر صاحب کے درمیان عربی کے کسی لفظ پر بحث چل نکلی۔ دونوں میں سے کوئی بھی ہتھیار ڈالنے پر تیار نہ تھا۔ آخر عربی کے پروفیسر صاحب زچ ہو کر کہنے لگے: ''پروازی! تم بھلا عربی ادب کو کیا جانو۔ عربی زبان کا ماہر تو میں ہوں!''

پروازی صاحب (جن کے بڑے بیٹے کا نام ماہر احمد ہے) نے ان عربی کے استاد محترم کی بات پر برجستہ جواب دیا: اور میں ماہر کا باپ ہوں!

جس پر مدمقابل پروفیسر صاحب ناراض ہو گئے۔ اور سیدھے پرنسپل صاحب کو جا کر شکایت لگا

دی۔ پرنسپل صاحب نے پروازی صاحب کو بلایا اور شکایت کا تذکرہ کیا۔ پروازی صاحب کہنے لگے کہ ماہر احمد تو میرے بڑے بیٹے کا نام ہے! جس پر پرنسپل صاحب بھی ہنس پڑے اور یوں معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

ایک دوسرا واقعہ خود خاکسار کے متعلق ہے۔فرسٹ ائیر کے پہلے روز کا اردو پیریڈ تھا۔کالج ہال طلباء سے بھرا ہوا تھا۔ پروازی صاحب نے پہلے روز ہر طالب علم سے اس کا نام پوچھا۔ نیز یہ کہ وہ کہاں (مراد ربوہ کے کس محلہ یا بیرون ربوہ کسی شہر) سے ہے؟ ہر کوئی اپنے اپنے محلہ یا شہر وغیرہ کا نام بھی بتا رہا تھا۔خاکسار کی باری آئی تو عرض کیا: سر! گھر سے آیا ہوں!

تمام طلباء میری طرف دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ پروازی صاحب نے ایک بھرپور نظر مجھ پر ڈالی اور فرمایا: گھر سے عموماً وہ آتا ہے جو گھر بار والا ہو۔یعنی بال بچے دار ہو۔اچھا،اب لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دو کہ تمہارے کتنے بچے ہیں؟ بس پروازی صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔الغرض پروزی صاحب کی کس کس بات کا تذکرہ کیا جائے۔

لاء کالج لاہور میں منعقدہ ایک مباحثہ کا احوال آپ کے ایک مضمون ''ذہن کے دریچوں سے خودنمائی'' مطبوعہ روزنامہ الفضل ربوہ میں بایں الفاظ شائع ہوا کہ ارشاد حسین کاظمی کا ایک شعر ہے

ہیں دشت میں غم جان کے لالے پڑے ہوئے
چہرے وفا کی دھوپ سے کالے پڑے ہوئے

ارشاد حسین کاظمی نہایت ذہین آدمی تھے۔اس لیے اپنے ہمعصر مقررین میں سے اکثر بزعم خویش بڑے مقررین ان سے جلتے تھے۔لاء کالج کے ایک مباحثہ میں کاظمی صاحب کو خدا جانے کیا سوجھی کہ انگریزی میں تقریر کرنے کھڑے ہو گئے۔آواز پاٹ دار تھی۔اس پر استدلال کے بادشاہ،سامعین پر

چھا گئے۔ میرے پاس ہی احمد رضا قصوری بیٹھے ہوئے تھے۔ (جن کے والد کے قتل میں بھٹو کو پھانسی کی سزا ہوئی تھی) وہ بہت چین بہ چیں ہو رہے تھے۔ پہلو پہ پہلو بدل رہے تھے۔ مگر انہیں اعتراض کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں نے قصوری صاحب سے کہا ''سنا نہیں آپ نے، یہ کاظمی کتنے غلط سپیلنگ بول رہا ہے! قصوری صاحب بھولے آدمی، بھرے میں آ گئے اور فوراً پوائنٹ آف آرڈر پر کھڑے ہو گئے۔ اور کہا: ''جناب والا! فاضل مقرر سے کہا جائے کہ وہ غلط سپیلنگ بولنے سے احتراز کرے!''

اب فاضل مقرر سپیلنگ ٹھیک بولتے تھے یا غلط، قصوری صاحب کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ سارا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ تب قصوری صاحب کو احساس ہوا کہ اورینٹل کالج کا ایک مقرر (پروازی) ان کیساتھ کیا ہاتھ کر گیا ہے!

اس کے بعد تجربہ سے بھی یہی ثابت ہوتا رہا کہ قصوری صاحب کو ہمیشہ وقت کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ان کیساتھ کیا ہو گیا ہے!؟ پہلے ہلے میں تو جو جی میں آئے کہہ یا کر گزرتے ہیں!

''ذہن کے دریچوں سے خودنمائی'' نامی قسط وار مضامین میں ہی پروازی صاحب ایک اور دلچسپ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ٹی آئی کالج ربوہ کے ایک مشاعرہ میں محترم جناب راجہ غالب احمد صاحب بھی تشریف لائے۔ اس وقت جوان اور بے ریش تھے۔ میری خواہر نسبتی غور سے مشاعرہ سنتی رہی۔ جب ''غالب صاحب'' کی باری آئی تو چوکنا ہو بیٹھی۔ کیونکہ یہ نام اس کے کورس کی کتابوں میں بار بار آتا تھا اور اس نے غالب کی تصویر بھی دیکھ رکھی تھی۔ مشاعرہ ہو چکا تو کہنے لگی:

''بھائی جان! یہ غالب نے اپنی داڑھی کیوں صاف کروا دی ہے؟"

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ اب تو وہ امریکہ میں ہے۔ اگر یہاں ہوتی تو کہتا کہ لو! غالب کو دیکھ لو۔ اس نے پھر سے داڑھی چھوڑ دی ہے!

جماعت احمدیہ کے چوتھے امام سیدنا حضرت مرزا طاہر احمد صاحب (رحمہ اللہ) کے بارے میں پروازی صاحب لکھتے ہیں کہ 1991ء میں ان کی خدمت میں لندن حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ انہی دنوں ان کے متعلق انگریز مصنف مسٹر ائین آدم سن کی کتاب شائع ہو کر آئی۔ از راہ شفقت ایک نسخہ اٹھا کر دستخط فرمائے اور ہمیں دے دیا۔ ہم نے ایک ہفتہ لندن قیام کے دوران مذکورہ کتاب کا اردو ترجمہ کر لیا۔

سویڈن جانے کیلئے روانہ ہونے لگے تو ترجمہ کا مسودہ ہمارے ہاتھ میں تھا۔ فرمانے لگے کہ ''یہ کیا ہے؟'' عرض کی: ''حضور! اس ''بندے دے پتر'' کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

حیرت سے فرمایا: ''بندے دا پتر کون!؟'' میں نے عرض کیا: ''حضور! میں نے ''آدم سن'' کا ترجمہ بھی کر دیا ہے!'' بہت خندہ فرمایا۔ بعد میں دوستوں کو خود بھی یہ لطیفہ سنایا۔

ایک دفعہ پروازی صاحب نے دوران لیکچر، ربوہ کے مشہور و معروف ''نصرت کیمیکل'' والوں کے تیار کردہ چورن ہاضمون کی افادیت کے متعلق راولپنڈی کے مزاح گو شاعر ناجی سبزواری کا یہ دلچسپ قطعہ سنا کر سب طلباء کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہاضمون نامی چورن کیسا تھ اس کی افادیت کے متعلق دوا خانے والوں کی طرف سے شائع کردہ شاعری کا بیان بھی ہو جائے، جو ہر پڑیا کے ساتھ لکھی ہوتی تھی کہ:

ہاضمون کیا خوب دوائی	ربوے وچ حکیم بنائی
بندہ ہائے ہائے کردا ہووئے	ڈھڈ پیڑ نال مردا ہووئے
چٹکی پانی نال کھوائی	ہاضمون کیا عجب دوائی
کھانسی پیچش تک آزمائی	بچے کھاون وانگ مٹھائی

نصرت کیمیکل بنائی	ہاضمون کیا خوب دوائی

اس قدرتاثیر والے ہاضمون کی بابت، اب ناجی سبزواری کا یہ قطعہ محترم پروازی صاحب کی زبانی سن لیجئے گا:

اس قدر تاثیر دیکھی نہ سنی	گل گئے جبڑے میرے دانتوں سمیت
اور جب معدہ میں اتری ہاضمون	ہضم کھانا ہو گیا آنتوں سمیت

یہ چند سطور محترم پروازی صاحب کی یاد میں لکھ تو دی ہیں مگر دلی جذبات کی کیفیات وہی ہیں جن کا اظہار محسن بھوپالی نے اپنے ایک شعر میں کچھ یوں کر رکھا ہے۔

آج ٹوٹ کر اس کی یاد آئی تو احساس ہوا محسن
اتر جاتے ہیں جو دل میں وہ بھلائے نہیں جاتے۔

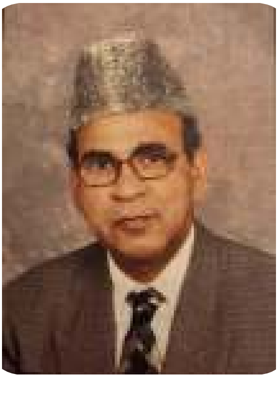

ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی

کچھ شکستہ داستانیں، کچھ پریشاں تذکرے

ہدایت اللہ ہادی، ایڈیٹر احمدیہ گزٹ کینیڈا

(نوٹ: کینیڈا کے کاروان شعروسخن اور انٹرنیشنل کونسل آف آرٹس کینیڈا کی تقریبات کے موقع پر جماعت احمدیہ عالمگیر کے دانش وروں اور شعرائے کرام پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی، پروفیسر ڈاکٹر شریف احمد خان، پروفیسر کرامت راج اور عبدالکریم قدسی کی گراں قدر خدمات کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ ہر دو تقریبات میں عاجز

نے یہ ادنیٰ تحریر پیش کی۔ یہ پروگرام یوٹیوب پر بھی پیش ہوا۔ان تقریبات کی روداد بھی باتصویر شائع ہوئیں۔)

دنیائے ادب کی نابغۂ روزگار شخصیت کے بارہ میں کچھ کہنا یا لکھنا، مجھ جیسے کم علم آدمی کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ خاص طور پر ایسی علمی ، ادبی مجلس جہاں شعر و سخن، فکروفن میں لاجواب اور صاحب ذوق سامعین حضرات موجود ہوں وہاں میری یہ ادنیٰ سی تحریر سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

امر واقع یہ ہے کہ جن لوگوں کے بارہ میں لکھنا آسان لگتا ہے،ان کے بارہ میں ہی لکھنا مشکل ہوتا ہے۔تاہم کاروانِ شعروسخن کی انتظامیہ کے ارشاد کی تعمیل میں کچھ شکستہ داستانیں کچھ پریشاں تذکرے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

آپ کا اصل نام ناصر احمد خاں تھا جب کہ قلمی نام پرویز پروازی استعمال کرتے تھے اور اسی نام سے دنیائے ادب اور تعلیم کے میدانوں میں پاکستان اور پھر بیرون پاکستان مشہور ہوئے۔آپ، حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابی حضرت محمد فاضل خان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے، محترم مولانا احمد خان صاحب نسیم ، ایڈیشنل ناظر اصلاح وارشاد مقامی ربوہ کے فرزند ارجمند،مکرم مولانا محمد احمد جلیل صاحب مفتی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے داماد اور محترم مولانا نسیم مہدی صاحب مرحوم، سابق امیر ومشنری انچارج جماعت احمدیہ کینیڈا کے بڑے بھائی تھے۔

آپ 2 اکتوبر 1936 کو قادیان میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ربوہ میں مقیم ہو گئے۔ جون 1956ء میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں داخلہ لیا۔1958 میں بی اے آنرز کی ڈگری حاصل کی اور 1960 میں ایم اے، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے پاس کیا۔ پھر اسی سال گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ

سے سلسلۂ تدریس کا آغاز کیا۔ 1962 تا 1969 تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں بطور لیکچرار پڑھاتے رہے۔آپ نے اورینٹل کالج لاہور پنجاب یونیورسٹی سے 1968 میں اردو ادب میں ڈاکٹریٹ کی۔ پھر ترقی حاصل کر کے بطور پروفیسر 1969ء تا 1975ء تعلیم الاسلام کالج میں ہی تدریس کی خدمات انجام دیں۔1975ء تا 1979 آپ وزیٹنگ پروفیسر اوسا کا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز جاپان رہے۔1979ء تا 1982ء انٹر کالج کمالیہ میں اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر تدریس کا کام کیا۔1982ء تا 1986ء مسلم انٹر کالج چک 41 ج۔ ب فیصل آباد میں اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ 1986ء تا 1990ء بطور اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں پڑھایا۔ 1991ء تا 2001ء پروفیسر ریسرچ ایسوسی ایٹ اپسالا یونیورسٹی سویڈن میں خدمات انجام دیں۔سب سے بڑھ کر عجز و انکساری یہ عالم تھا کہ ادب لٹریچر کے نوبل پرائز کمیٹی کے ممبر تھے اور اس امانت کو ایسی دیانت سے نبھایا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیا۔

آپ کی متعدد تصنیفات اور تالیفات منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

1964ء۔ ذکر اردو، تعلیم الاسلام کالج کی پہلی کل پاکستان اردو کانفرنس کے مضامین کا مجموعہ۔

1977ء۔ خوبصورت جاپان اور میں، کاواباتا یاسوناری کی نوبیل تقریر کا اردو ترجمہ

1978ء۔ یوکی گونی، کاواباتا کے ناول کا اردو ترجمہ

1980ء۔ جاپان کا سب سے لمبا دن

1980ء۔ جاپان کی ہائیکو شاعری کا انتخاب اور ترجمہ

1981ء۔ سورج کے ساتھ ساتھ، جاپان کا سفرنامہ

1997ء۔ صدائے آب، ہائیکو پر تنقیدی مضامین

2002ء۔ آ کی ہے، ہیروشیما کے المیہ کے پس منظر میں ناول

2003ء۔احمدیہ کلچر

2003ء۔ سرظفراللہ کا تحریک آزادی میں حصہ

2003ء۔پس نوشت۔اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں کا جائزہ

2005ء۔سرظفراللہ کی یادداشتیں

Reminiscences of Sir Zafarullah۔2006

2008ء۔ پس نوشت اور پسِ پسِ نوشت (مزید خودنوشت سوانح عمریوں کا تجزیہ)

2010ء۔پس نوشت سوم (مزید خودنوشتوں کا جائزہ)

آپ کا حاصل عمر ''حبل الورید'' قرآن کریم کا اردو ترجمہ (غیر مطبوعہ) ہے۔خودنوشتوں کے تجزیے کا کام آپ نے آخر تک جاری رکھا۔آپ پاکستان سے تیسری ہجرت کے بعد 2003ء سے کینیڈا میں مقیم رہے۔آپ بذلہ سنج اور مرنجاں مرنج طبیعت کے حامل اور بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ دورِ طالب علمی سے لے کرآخر عمر تک اپنے شاگردوں، دوستوں،قریبیوں اور رشتہ داروں میں ہردلعزیز رہے۔جس محفل میں ہوتے صاحب محفل ہوتے۔کالج کے اسٹیج پر ہوتے یا کسی اور تقریب میں آپ کا طرز خطابت منفرد ہوتا۔ساتھی طلبا کو آپ کے مباحثوں اور تقریروں کا اچھوتا انداز بہت پسند تھا جس کی وجہ سے آپ جہاں بھی جاتے ، سامعین آپ کے منتظر ہوتے۔آپ بہت ہمدرد اور پیار کرنے والی شخصیت تھے۔دوستوں کے دوست اور غمخوار بھی تھے۔خلافت احمدیہ سے ہمیشہ وابستہ رہے اور خوب فیض بھی پایا۔

3 مئی 2008 کو بی بی سی اردو ڈاٹ کام، لاہور آس پاس میں خودنوشت کا فن اور ڈاکٹر پروازی،

موضوعِ سخن رہا۔ چنانچہ عارف وقار صاحب نے لکھا:

’’ڈاکٹر پرویز پروازی نے سویڈن میں قیام کے دوران اپنی پیشہ ورانہ ضرورتوں کے تحت اُردو کی کچھ خود نوشت سوانح عمریاں پڑھیں تو اس صنف میں انہیں خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی اور پھر وہ پاک و ہند میں پھیلے ہوئے اپنے دوستوں، شناساؤں اور کرم فرماؤں سے مختلف سوانح عمریاں بھیجنے کی فرمائش کرنے لگے۔

نہ دوستوں کی جانب سے اس سپلائی میں کوئی لغزش آئی اور نہ ڈاکٹر پروازی کے شوق سوانح خوانی میں کوئی کمی واقع ہوئی، چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی میز پر خود نوشتوں، یادداشتوں اور توزکوں کا ڈھیر لگتا رہا لیکن گلوں کو دیکھتے رہنا تو کوئی بات نہیں، چنانچہ ڈاکٹر پروازی نے تخلیق گل کے پیچھے کارفرما عمل کا جائزہ لینا شروع کیا اور ہر پھول کی پتیوں کو گننے کے ساتھ ساتھ اس کے ڈنٹھل اور شاخ کی پیمائش بھی کی۔ انہوں نے ہر گل کی خوشبو کو بھی الگ الگ جانچا پرکھا اور واضح طور پر بتایا کہ یہ خوشبو گلستان کے دیگر لالہ ونسترن کی مہک سے کس طرح مختلف ہے۔‘‘

پھر لکھتے ہیں: ’’لیکن ڈاکٹر پروازی ایک جابر مگر عادل حکمران کی طرح رحم کی اس اپیل کو مسترد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور سوانح نگار کے لیے بے باکی کے ساتھ ساتھ حق گوئی کی شرط کو لازمی قرار دیتے ہوئے اسے کٹہرے میں کھڑا کر کے ایک زیرک وکیل کی طرح اس پر جرح کرتے ہیں اور زیب داستان کے لئے لکھے گئے ہر فالتو لفظ کا حساب مانگتے ہیں۔‘‘

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب کی پس پس نوشت کا ذکر کرتے ہوئے عارف وقار صاحب لکھتے ہیں: ’’اپنی ابتدائی شکل میں جب پانچ برس پہلے یہ کتاب منظر عام پر آئی تو اس میں صرف ستر خود نوشت سوانح عمریوں کا ذکر تھا۔...... ظاہر ہے کہ اپنی نوعیت کی اس واحد کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا

اور اس حوصلہ افزائی نے مؤلف کے لئے بھی مہمیز کا کام کیا۔ اپنی نئی صورت میں یہ ضخیم کتاب ایک سو اکاون خود نوشت سوانح عمریوں کو گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب تحقیق و تفتیش کی گہرائی اور حقائق کی کھوج میں محقق کی عرق ریزی ماضی کے فسانے بن چکے ہیں، ڈاکٹر پروازی کا یہ کارنامہ ہر طرح سے سراہنے کے قابل ہے، لیکن ساتھ ہی ان ریٹائرڈ سرکاری افسروں، جرنیلوں اور سیاست دانوں کے لئے ایک لمحہ فکریہ بھی ہے جو آج کل اپنی خود نوشت کے لئے نوٹس تیار کر رہے ہیں کیونکہ ڈاکٹر پروازی ایک ہاتھ میں چھلنی اور دوسرے میں محدب عدسہ لیے ہر نئی آنے والی آپ بیتی کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔"

آپ نے دنیائے ادب کو ایک نئے اور اچھوتے زاویہ سے روشناس کروایا۔ چنانچہ اس وقت کے علم و ادب کے اساتذہ میں اختر اورینوی، ڈاکٹر وزیر آغا اور مولانا صلاح الدین احمد نے ان کی علمی اور ادبی تحقیق پر تبصرے کیے۔ ان کے نقد و نظر نے پروازی صاحب کی تحقیق کو ایک نئی آب و تاب بخشی جو سند کا درجہ رکھتی ہے۔

ایسی نستعلیق شخصیات اور نایاب لوگ دیکھنے کو بہت کم ملتے ہیں۔ ٹورانٹو کے علمی اور ادبی حلقوں میں بے حد مقبول تھے۔ آپ کی وفات کے ساتھ ترقی پسند اردو ادب اور منفرد انداز کا درس و تدریس کا ایک شاندار دور اختتام کو پہنچا۔ دنیا بھر میں آپ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ آپ اردو کا گہر اذوق رکھتے تھے اور اردو ادب کا ایک قیمتی سرمایہ تھے۔ اس سلسلہ میں آپ کی خدمات یقیناً یاد رکھی جائیں گی۔

آپ کے علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین اور منظوم کلام نہ صرف جماعت کے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے بلکہ ادبی دنیا، نگار، فنون، ادبیات، اوراق، نئی قدریں، فکر و نظر، نقوش، ہفت روزہ

لاہور، الفرقان، النور وغیرہ جیسے رسائل میں بھی مقبولیت عام پاتے رہے۔مکرم پروفیسر صاحب مرحوم بڑے اخلاص اور محبت سے احمدیہ گزٹ کینیڈا کو اپنے مضامین اور کلام عطا فرماتے رہے جو ہمارے گزٹ کی زینت بنتے رہے اور انہیں خوب پذیرائی ملی۔ جماعت احمدیہ برطانیہ کے جلسہ سالانہ کے مواقع پر عالمی مشاعروں میں ان کی شرکت اور کلام نے اچھی خاصی شہرت پائی۔ یورپ ہو یا شمالی امریکہ آپ ہمیشہ ادبی مشاعروں کی جان رہے ہیں۔

استاذی المحترم پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب سے عاجز کا تعلق چونسٹھ برس سے ہے، اتنے میں دو جوان نسلیں تیار ہو چکی ہیں، تاہم میں نے بھولی بسری یادوں کے دریچوں کو وا کرنے کی کوشش کی تو تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ کا وہ کمرہ یاد آ گیا جو سیڑھیوں سے ملحق تھا اور وہ آٹھویں جماعت کی کلاس تھی۔اس زمانہ میں یعنی 1958 میں پروازی صاحب نے بی اے آنرز کا امتحان پاس کیا تھا اور اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ایم اے اردو ادب کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔اس درمیانی عرصہ میں انہوں نے آٹھویں جماعت کو اردو کے چند سبق پڑھائے۔عاجز اس کلاس کا طالب علم تھا اور یہ ان سے میرا پہلا تعارف تھا۔حسب معمول ہر بچے سے نام دریافت کیا اور والد کا نام پوچھا۔جب میری باری آئی۔اپنا نام بتایا اور ابا کا نام بتایا۔تو فرمانے لگے تم تو ہمارے قادیان کے محلے دار ہو۔میں تمہارے ابا کو جانتا ہوں۔تمہاری اماں ہماری اماں کی سہیلی تھیں گو کہ وہ عمر میں بڑی تھیں۔ ہمارے ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔شاہ صاحب بھی ہمارے ابا سے بڑے تھے۔ پروازی صاحب خوب ٹہل ٹہل کر پڑھاتے۔بس وہیں سے یہ ہمارے دل میں گھر کر گئے۔

جب تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ ہوا تو یہ ہمیں لازمی اردو پڑھایا کرتے تھے۔ان کی کلاس ہال کے اندر ہوتی تھی اور سب سے بڑی کلاس ہوتی تھی۔بس وہی بانکپن، جوبن، دراز قامت، دبلے پتلے،

گورے چٹے، چاک و چوبند، گھنے بال، تھری پیس کا کالا سوٹ، آنکھوں پر محدب عدسے والا کالا چشمہ، چمکتی ہوئی آنکھیں، چوڑی ہتھیلی، پتلی پتلی لمبی انگلیاں، آواز میں گھن گرج، باپ کی طرح دبنگ، بہادر، مرد آہن، دمکتا ہوا متبسم چہرہ، آواز ایسی کہ ہال کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جاتی تھی۔ بعدہٗ لاؤڈ سپیکر کا استعمال بھی شروع ہو گیا تھا۔ ایک بارعب شخصیت تھی۔ کلاس میں مکمل خاموشی طاری ہوتی۔ ہاتھ میں حاضری رجسٹر تھامے ہوتا، اتنی بڑی کلاس تھی کہ حاضری لگانا ناممکن تھا۔ تاہم ایک نظر میں ہی سب لڑکوں کی اندازے سے حاضری لگا لیتے اور وہ تقریب ٹھیک اور درست ہوتی۔

اردو ادب سے انہیں قلبی لگاؤ تھا۔ بلکہ دل و جان سے عشق تھا، اس لیے خوب ڈوب کر پڑھایا کرتے تھے۔ الفاظ کی ادائیگی اور اس کا زیر و بم لاجواب تھا۔ ہاتھوں کی حرکات وسکنات اور اشاروں کنایوں میں سحر تھا۔

میرے نزدیک کسی کامیاب استاد کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے طلباء میں اس مضمون کا ذوق وشوق پیدا کر دے اور اس مضمون سے اکتاہٹ محسوس نہ کرے یا یوں کہیے کہ لطف اندوز ہونے لگے۔ اس پہلو سے پروازی صاحب ایک کامیاب ترین استاد تھے۔ انہوں نے ہر طالب علم میں خواہ وہ سائنس کا ہو یا آرٹس کا، اردو ادب کا شعور اور وجدان پیدا کر دیا تھا۔ اور اگر میں یہ کہوں کہ انہوں نے اردو ادب سے عشق ومحبت کی سلگتی ہوئی چنگاری کو بھڑکتا ہوا شعلہ بنا دیا تھا، تو بے جا نہ ہوگا۔

محترم پروازی صاحب، محترم مولانا محمد احمد جلیل صاحب کے داماد تھے۔ مولانا صاحب کے سب سے بڑے صاحبزادے منور احمد جلیل میرے بچپن کے دوست، ہائی سکول اور کالج کے زمانہ میں میرے کلاس فیلو تھے۔ بہت ذہین وفطین طالب علم تھے۔ ریاضی میں بہت طاق تھے۔ میں ان کے گھر جاتا اور الجبرا کا ہوم ورک کرتا، اس طرح وہ میرے دوست، استاد ٹھہرے۔ اس زمانہ میں عام طور

پر والدین اپنے بچوں کے دوستوں کا بہت خیال رکھتے تھے اور خاطر مدارت کرتے تھے۔ اگر چہ گھر چھوٹے تھے مگر دل بڑے تھے۔ پیسے تھوڑے تھے مگر دل غنی تھے۔ اس طرح عاجز ان کے گھر کا ایک فرد بن گیا تھا۔ افسوس صد افسوس منور جلیل زمانہ طالب علمی میں ہی داغ مفارقت دے گئے۔ ان کی اچانک وفات سے ان کے خاندان کا ہر فرد چور چور تھا۔

ابھی جام عمر بھرا نہ تھا کہ کف دست ساقی چھلک پڑا

پروازی صاحب کی شادی 23 فروری 1964 کو ہوئی۔ سو امر واقع یہ ہے کہ عاجز کا مولانا جلیل صاحب کے گھرانہ سے تعلق پروازی صاحب سے پہلے کا تھا۔ بعد کے نشیب و فراز بھی کم و بیش میرے سامنے کے ہیں۔ پروازی صاحب کی بعدہ بیگم پروفیسر امۃ المجید صاحبہ، سابقہ پرنسپل جامعہ نصرت ربوہ المعروف جیدہ آپا، اپنے چھوٹے بھائی منور احمد جلیل کے دوست ہونے کے ناطے سے مجھے آج تک اپنا چھوٹا بھائی ہی سمجھتی رہیں۔

اسے عجیب حسن اتفاق کہیے کہ عاجز کی رفیقہ حیات طاہرہ کا بھی ان سے گہرا تعلق خاطر تھا۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ طاہرہ کی والدہ جلد وفات پا گئی تھیں اور یہ محمد آباد اسٹیٹ سندھ سے پڑھنے کی غرض سے ربوہ آئی تھیں۔ ان کے ابا ڈاکٹر احتشام الحق بھاگل پوری کا تعلق میاں عبد الرحیم احمد سے بہت پرانا تھا۔ یہ دونوں بلکہ چاروں ڈاکٹر صاحب، میاں صاحب، مولوی سید محمد عبد الباقی صاحب بھاگل پوری اور عبد السلام عمر صاحب علی گڑھ میں پڑھا کرتے تھے۔ بہار اور علی گڑھ کے دیرینہ تعلقات کی وجہ سے اُس وقت میری اہلیہ طاہرہ، بی بی رشید یعنی صاحبزادی امۃ الرشید صاحبہ کے زیر سایہ ہی پلی بڑھی، ربوہ میں تعلیم حاصل کی۔ طاہرہ احتشام، رفیعہ رامہ کی گہری دوستوں میں سے تھیں۔ ان کی ہم جولیوں میں رفیعہ رامہ، اسماء باجی، راشدہ، نوشی، سری باجی، باجی جیدہ مرزا وغیرہ شامل تھیں۔

ان سب کا کسی نہ کسی حوالہ سے خاندان سے تعلق تھا۔ یہ وہ دوست تھیں جو جیدو باجی (بیگم پروازی صاحب، پروفیسر امۃ المجید پرنسپل جامعہ نصرت ربوہ) کی ہم نوالہ و ہم پیالہ تھیں اور ان کا علامہ جلیل صاحب کے آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان میں سے بعض داغ مفارقت دے چکی ہیں۔

پروازی صاحب ہمہ وقت مجلسی شخصیت کے حامل تھے۔ اس لیے کالج کے سٹاف روم میں ان کا اٹھنا بیٹھنا انہیں ذرا نہیں بھاتا تھا۔ اور ان کے کچھ معروضی حالات بھی ایسے تھے اور مزاج بھی شاہانہ تھا کہ انہیں انتظامیہ نے کالج کی چھت کے اوپر ایک کونہ میں ایک علیحدہ کمرہ دے رکھا تھا جہاں شاگردوں، دوستوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور چائے کا دور چلتا رہتا تھا۔ ان کی شفقت اور محبت کی وجہ سے شاگرد جلد ان کے دوست بن جاتے اور ان پر سب کچھ قربان کے لیے تیار ہو جاتے۔ علم و ادب، شعر و شاعری، لطائف اور مزاح کا ماحول ہوتا۔

تعلیم الاسلام کالج کا بابا شادی، ان کی چائے کی ٹرے لاتا لاتا نہیں تھکتا تھا۔ اور بھاگ بھاگ کر ان کے لیے چائے لاتا تھا۔ عاجز بھی ان کی مجلس کا ایک با قاعدہ فرد تھا۔ عاجز جب تک تعلیم الاسلام کالج کے مجلہ المنار کی ادارت سے وابستہ رہا اس وقت تک بڑی باقاعدگی سے المنار میں پروازی صاحب کا کلام شائع کرتا رہا۔ جس کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔

تعلیم الاسلام کالج کے اساتذہ میں پروازی صاحب اور طلباء میں عاجز ٹوپی نہیں پہنتے تھے اور آج بھی نہیں پہنتے۔ اور یہ بات ہمارے چیف پراکٹر استاذی المحترم چوہدری حمید اللہ صاحب مرحوم کو معلوم تھی۔ اس لیے جرمانہ کرتے مگر اللہ کارساز ہے، پرنسپل حضرت میاں صاحب کو مجھ پر حسن ظن تھا وہ جرمانہ معاف کر دیتے۔ اور کبھی کبھی چوہدری حمید اللہ صاحب سے کہتے کہ بڑا ہو کر ٹھیک ہو جائے گا۔

پروازی صاحب نے نظریہ ضرورت کے تحت مختصر سی داڑھی ٹھوڑی پر سجا رکھی تھی۔ جسے عام طور پر

فرنچ کٹ داڑھی کہتے ہیں بعض اسے قادیانی داڑھی بھی کہتے ہیں۔

اس زمانہ میں پروازی صاحب نے ربوہ میں سب سے پہلے حلقہ ارباب ذوق قائم کیا۔ جس میں مسعود احمد خاں دہلوی، نسیم سیفی، عبد السلام اختر، چوہدری شبیر احمد، سلیم اٹاوی، سلیم صدیقی بانی سیکرٹری جماعت احمدیہ کینیڈا، نعیم قدسی اور عاجز شامل تھے۔ میں ان سب سے کم عمر تھا۔ یہ مجلس چوہدری شبیر صاحب کے دفتر وکیل المال میں ہر مہینہ کے آخری جمعہ کے روز عصر سے مغرب تک ہوتی۔ اس میں صرف ایک مختصر سا علمی مقالہ اور نقد و نظر ہوتا یا صرف ایک غزل اور پھر بال کی کھال اتاری جاتی۔ اس مجلس کی دلچسپ بات یہ تھی کہ ہمہ یاراں دوزخ، ہمہ یاراں بہشت کا ماحول تھا۔ سادگی تھی، بے تکلفی اور اپنائیت تھی۔ جیسے ہی اذان ہوتی ہم مسجد محمود میں مغرب کی نماز کے لیے چلے جاتے۔ اور پروازی صاحب مجھے کہتے ہادی! ’’جانتا ہوں تو اب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی۔‘‘ تو میں ان کو جواباً کہتا۔ ’’تر دامنی پر شیخ ہمارے نہ جائیو، دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔‘‘ عموماً ایسی نوک جھونک رہتی تھی۔ جب ہم واپس آتے، چائے کا دوسرا دور چلتا مسعود احمد خاں دہلوی نے اپنی یادوں میں بعض ایسی دلچسپ باتوں کا ذکر کیا ہے۔

تعلیم الاسلام کالج کا وہ زمانہ جس میں حضرت مرزا ناصر احمد صاحبؒ پرنسپل کے منصب پر فائز رہے۔ وہ کالج کے اپنے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ جس میں پروازی صاحب نے بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ کالج کے مشاعرے، نامور شعراء کی شرکت، اردو کانفرنس میں شہرہ آفاق ادیبوں، دانشوروں، مؤرخوں، صحافیوں وغیرہ نے شرکت کی۔ اور اسی طرح ہر سال جلسہ تقسیم اسناد اور انعامات میں، خطبات استقبالیہ، ماہرین تعلیم، یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ اور پروفیسر حضرات، وزارت تعلیم کے نمائندوں کی شرکت کو کامیاب بنانے میں دن رات محنت کی۔ امر واقع یہ ہے کہ سپورٹس اور کھیل کے میدان میں آل

پاکستان باسکٹ بال ٹورنامنٹس میں اس کالج کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ جس میں پروفیسر نصیر احمد خاں، پروفیسر چوہدری محمد علی کے خون پسینے کے ساتھ ساتھ پروازی صاحب کی محنت شاقہ بھی شامل تھی۔ ہر چند کہ یہ ڈاکٹر کھلاڑیوں میں بھی ہر دل عزیز اور مقبول تھے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ تعلیم الاسلام کالج سے فارغ ہونے کے بعد عاجز نے چھ سال مسلسل کراچی یونیورسٹی میں خاک چھانی مگر پروازی صاحب سے تعلق نہیں ٹوٹا۔ اوسا کا یونیورسٹی جاپان ہو یا اپسالا یونیورسٹی سویڈن بدستور ان سے رابطہ رہا۔

پروازی صاحب کی محبت اور ذاتی تعلق کا یہ عالم تھا کہ وہ کہتے تھے ہادی میں سب سے پہلے تمہیں مضمون بھجواتا ہوں پھر کسی دوسرے رسالے یا اخبار کو دیتا ہوں۔ غالباً احمدیہ گزٹ میں ان کا سب سے پہلا مضمون ''باسکٹ بال سے ہدایت اللہ ہادی تک'' شائع ہوا تھا جو انہوں نے سویڈن سے ہی بھجوایا تھا۔ ہم نے بھی سینہ تان کے احمدیہ گزٹ کینیڈا کے سرورق پر ان کی تصویر شائع کی۔ ایسے میں میری یہ دیدہ دلیری بعض لوگوں کے دل کو نہ بھائی۔ لیکن میرا مولا بڑا ہی کارساز ہے۔ میری اس طرح کی بے ضرر جسارتوں کی اب تک پردہ پوشی کرتا آ رہا ہے۔ پروازی صاحب نے میرے ابا کے بارہ میں بھی ایک مضمون لکھا جو الفضل میں شائع ہوا۔ جس کا عنوان تھا 'خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر'۔ اسی طرح پھر آبخورے، سرخ رومال، دو سلیم دل کے حلیم، تیز رو مسافر، جماعت احمدیہ کے تین خالد، تازہ ہوا کا جھونکا، کبھی تو اس سے ملاقات ہوگی جلسہ پر، یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں، پروفیسر شریف خاں کی اوفیالوجی وغیرہ جیسے مضامین عاجز کو بڑی محبت سے بھجواتے رہے۔ گزشتہ پینتیس سال سے پروازی صاحب کے مضامین اور منظوم کلام ہمارے احمدیہ گزٹ کینیڈا کی زینت بنتا رہا ہے عاجز نے احمدیہ گزٹ کینیڈا کو کھنگالا تو سب سے زیادہ مضامین پروازی صاحب ہی کے شائع ہوئے ہیں۔ یہ

ہمارے ادارہ کی خوش قسمتی ہے اور ان کے عاجز سے دیرینہ تعلق کی علامت بھی۔

نوے کی دہائی میں آپ کا سویڈن سے کینیڈا آنا جانا لگا رہتا۔ پھر اپنی فیملی کے ساتھ 2003 میں مستقل رہائش پذیر ہوگئے۔ یہاں آنے کے بعد تالیف وتصنیف کا سلسلہ شروع ہوا اور جب تک صحت نے اجازت دی کام کرتے رہے۔ تحدیث نعمت کے طور پر عرض ہے کہ ان کے تمام کاموں میں عاجز ان کا دست کار رہا۔ جب کتاب شائع ہوتی فوراً اس کا ایک نسخہ عاجز کو دعائیہ کلمات کے ساتھ دیتے۔ کینیڈا میں ان کی جتنی کتابیں چھپی ہیں وہ سب اورینٹل پبلشرز نے شائع کی ہیں۔ مکرم مولانا نسیم مہدی صاحب کے بھرپور تعاون سے اورینٹل پبلشرز کی رجسٹریشن خاکسار کے نام سے تھی۔ ان میں چند درج ذیل ہیں:

2003۔ احمدیہ کلچر۔ 2003۔ سر ظفراللہ کا تحریک آزادی میں حصہ

2003۔ پس نوشت اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں کا جائزہ

2005۔ سر ظفراللہ کی یادداشتیں

Reminiscences of Sir Zafarullah_2006

2008۔ پس نوشت اور پس پس نوشت (مزید خودنوشت سوانح عمریوں کا تجزیہ)

2010۔ پس نوشت سوم (مزید خودنوشتوں کا جائزہ)

عام طور پر کتابوں کے مصنف 'اظہار تشکر' کا ایک باب باندھتے ہیں۔ چونکہ پروازی صاحب کا بہت اعلیٰ ظرف تھا اور بہت بڑے آدمی تھے، اس لیے انہوں نے تالیف وتصنیف کی دنیا میں ایک نئی روایت قائم کی کہ اظہار تشکر کی بجائے اعترافات کے عنوان سے اپنی کتابوں میں ایک نیا باب باندھا جس میں اپنے تمام رفقاء کی خدمات کا جستہ جستہ اعتراف کیا اور انتہائی کھلے دل سے سب کا شکریہ ادا

کیا۔جس میں عاجز کا نام بھی ہوتا۔

تالیف وتصنیف کے کاموں کے سلسلہ میں عاجز کو پروازی صاحب کے ہاں بار ہا جانا پڑا۔ان کا گھر میزبانی کی مثال بنا رہا۔خاص طور پر ان کی صاحبزادی مونا محترمہ امۃ الودود اہلیہ مکرم ظفر محمود اپنے ابا کے ملنے والوں کا بہت خیال رکھتیں۔سب بچے خلیق،ملنسار،اپنے ابا کے ملنے جلنے والوں کا خیال رکھنے والے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے جزیل عطا فرمائے۔

بڑے پیار سے گلہ کرتے تھے کہ تم نے یہاں آ کر شاعری کیوں چھوڑ دی۔بس کوئی جواب نہ بن پایا۔لیکن شاید کوئی ایسا مشاعرہ ہوگا جس میں پروازی صاحب ہوں اور عاجز غیر حاضر ہوا ہو۔جب بھی اپنی بیٹی سعدیہ ناصر کے ہاں آتے تو عاجز کو یاد کرتے اور تاکید کرتے، طاہرہ کو ساتھ ضرور لانا۔” جیدو“ ان کو بہت یاد کرتی ہیں۔اور میں فوراً اپنی اہلیہ کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔پھر یادوں کے دریچے وا ہوتے۔تو جہاں پروازی صاحب سے طویل عرصہ سے عاجز کا تعلق خاطر رہا ہے وہاں اسی طرح سے ان کی بیگم کو میری اہلیہ جیدو باجی کہتی رہیں اور ان سے اب تک بے تکلفی اور اپنائیت کا تعلق رہا ہے۔ان کا عاجز کو پیغام ملا کہ تم طاہرہ کے ساتھ آؤ اور مجھ سے ملو۔میں نے سنا ہے کہ ناصر کے تمام مسودات تمہارے پاس ہیں۔پھر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے کوئی علم دوست عزیز، پروازی صاحب کے منظوم کلام کو مدون کرنا چاہتے ہیں۔

پروازی صاحب کی علمی،ادبی کاوشوں،کتابوں کی رونمائی اور مشاعروں میں عاجز کی شرکت عبد الحمید حمیدی،بشارت ریحان،سجاد ملک،فضل شاہد اور بعض دوسرے دوستوں کی رہین منت ہے۔عاجز ان سب دوستوں اور محسنوں کا شکر گزار ہے اور ممنون احسان بھی۔فجزاہم اللہ احسن الجزاء

ان مختصر حوالوں سے اگر میں یہ کہوں کہ پروازی صاحب میرے استاد بھی تھے، بے تکلف دوست

بھی اور رازداں بھی اور نجانے کیا کیا تھے۔

پروازی صاحب ایک لمبا عرصہ علیل رہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے برائیڈن گیٹ پر سلام سینٹر کے پیچھے والے گھر میں وفات سے کچھ عرصہ قبل آخری ملاقات کے دوران انہوں نے کہا۔ ہادی! تم نے بہت شذرے لکھے ہیں اور تم نے مہدی کا شذرہ بھی لکھا ہے۔اس کے بعد کسی نے اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ میں نے کہا کہ مہدی صاحب کی وفات کے موقع پر بعض دوستوں نے اپنے تاثرات بھجوائے تھے وہ محترم امیر صاحب نے حضور انور کی خدمت میں بھجوا دیے تھے۔ان میں سے بعض کا حضور انور نے خطبہ جمعہ میں ذکر بھی فرمایا تھا۔

پھر فرمانے لگے۔ ''تم میرا شذرہ لکھو گے تو مجھے پہلے دکھا لینا۔'' میں نے عرض کیا۔ پروازی صاحب کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میری کیا مجال! میری کیا بساط! اللہ تعالیٰ آپ کو عمر خضر عطا کرے۔ پھر چپ سادھ لی اور سوچ میں کھو گئے۔ مجھے ایسا لگا کہ اونگھ سی آ گئی ہے۔

ایک ذوقی بات ہے عرض کیے دیتا ہوں۔ اتنے بلند پایہ ادیب، شاعر، نقاد، مفکر، ہر دل عزیز اور مقبول عام شخصیت کی وفات کے موقع پر ان کے غیر از جماعت دوستوں، شاگردوں کی کثیر تعداد کے علاوہ کالج کے رفقائے کار میں پروفیسر محمد اسلم صابر صاحب اور ان کے اساتذہ کرام میں پروفیسر مبارک احمد انصاری صاحب جیسی شخصیات کا شامل ہونا، ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسے میں جیتے جی کسی کو کندھا دینا بڑے نصیب کی بات ہے۔

اس موقع پر ان کے پس ماندگان ذکر کر دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ پروازی صاحب کی جیون ساتھی محترمہ پروفیسر امۃ المجید صاحبہ سابقہ پرنسپل جامعہ نصرت ربوہ حال مسی ساگا، دو بیٹے مکرم ماہر احمد صاحب، مکرم طاہر احمد صاحب مسی ساگا اور تین بیٹیاں محترمہ امۃ الودود صاحبہ اہلیہ مکرم ظفر محمود

صاحب مسی ساگا، محترمہ سعدیہ ناصر صاحبہ وان، محترمہ رضوانہ چوہدری صاحبہ اہلیہ مکرم چوہدری ثمر احمد صاحب ملٹن، ایک بھائی مکرم ہادی احمد خان صاحب وان، اور تین بہنیں محترمہ سلیمہ طاہرہ صاحبہ اہلیہ مکرم چوہدری محمد اسلم بھروانہ صاحب شہید پیس ویلج، محترمہ جمیلہ طاہرہ صاحبہ اہلیہ مکرم عبدالمجید شاہد صاحب مرحوم ربوہ اور محترمہ نعیمہ طاہرہ صاحبہ اہلیہ مکرم راجہ مختار احمد صاحب مرحوم کراچی شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے تمام لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

پروازی صاحب کیا کمال انسان تھے، دوستوں کے دوست، یاروں کے یار، مجلس کی جاں، یادوں کے محور، بذلہ سنج، نکتہ نواز، نکتہ بیں اور مزاح کے بادشاہ تھے۔ اعلیٰ ظرف، دل جوئی اور حوصلہ افزائی میں بے مثال تھے۔ علم و ادب، نقد و نظر، سوانح عمریوں کے نقاد، افسانہ نگار، غزل الغزلات کے مرکز، صاحب طرز ادیب، بہترین مقرر، یک جنبش قلم رواں دواں۔ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں۔ غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے۔ کی انوکھی مثال تھے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ دربارِ خلافت کے اس فدائی اور شیدائی کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ جگہ عطا فرمائے۔ اور ان کے علمی، ادبی، تحقیقی اور فکری سرمایہ کو نئے نسل کو پروان چڑھانے کی توفیق دے اور ترقی پسند ادب کو خوب سے خوب تر جلا بخشے۔ آمین!

پروازی صاحب کا کلام عموماً کم چھپا ہے۔ تاہم ان کے چند نعتیہ شعر پیش خدمت ہیں:

کیا خوف مجھ کو روزِ جزا کے حساب کا	ہم نام ہوں میں ناصر عالی جناب کا
آنکھیں وہ جیسے نور کی ندی چڑھی ہوئی	چہرہ وہ جیسے، پھول کھلا ہو گلاب کا

پھر فرماتے ہیں:

کٹھن ہیں مرحلے گو ہجر کی فصیلوں کے	بڑے ہیں حوصلے لیکن ترے قتیلوں کے

کبھی تو رحمتِ بارانِ اَشک ہو ان پر	ترس گئے ہیں کنارے اُداس جھیلوں کے
دلیل بن گیا ان کے لئے ترا چہرہ	اگرچہ لوگ تو قائل نہ تھے دلیلوں سے

آپ کا مشہور ترانہ جو حضور انور کی 2005ء کی پہلی دفعہ کینیڈا تشریف آوری کے موقع پر پیش کیا گیا اور بے حد مقبول ہوا۔ گزٹ کی جان اور پہچان بنا۔ پیش خدمت ہے۔

انی معك یا مسرور

شہر بنا ہے کوہ طور	چاروں جانب نور ہی نور
نور ہی پاس اور نور ہی دور	انی معك یا مسرور

انی معك یا مسرور

تاج خلافت سر پہ تمہارے	ہم بیٹھے ہیں در پہ تمہارے
ہم ہوں تم سے کیسے دور؟	انی معك یا مسرور

انی معك یا مسرور

تیرا ہمارے دیس میں آنا	نہیں کسی پر دیس میں آنا
کینیڈا پیار سے ہے معمور	انی معك یا مسرور

انی معك یا مسرور

اھلاً سھلاً سب کہتے ہیں	ہم کہتے ہیں جب کہتے ہیں
مرحبا! یا ابن منصور	انی معك یا مسرور

انی معك یا مسرور

آج کل کے حالات اوو دوست کے حوالہ سے ان کے یوا ین او سے مخاطب درد بھرے کلام کا ایک

نمونہ پیش خدمت ہے۔

کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے؟

اے اسیرانِ حرص و ہوس کچھ کہو یہ کوئی دجل ہے یا کوئی عدل ہے
باندھ کر ہاتھ مظلوم کو ماردو کوئی دجل ہے یا کوئی عدل ہے
لوگ مرتے رہیں، بم برستے رہیں، گھر اجڑتے رہیں، گھر سلگتے رہیں
اک طرف بیٹھ کر غور کرتے رہو یہ کوئی دجل ہے یا کوئی عدل ہے
بستیاں، بستیاں نہ رہیں ان میں آباد آبادیاں مٹ گئیں
قہر ہے پھر بھی الزام ان پر دھرو یہ کوئی دجل ہے یا کوئی عدل ہے
کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے تم کو معلوم ہے سب کو معلوم ہے
پھر بھی اظہار حق میں تساہل کرو یہ کوئی دجل ہے یا کوئی عدل ہے
روکتے ہی رہو راہ مظلوم کی! پیش جائے نہ کچھ آہ مظلوم کی
مجلس امن کے پیشہ ور ظالمو! یہ کوئی دجل ہے یا کوئی عدل ہے

محفل شعر وسخن کی روئیداد میں پروازی صاحب کے اشعار کا نمونہ درج ہے۔

جام ایسا پلایا دیا مجھ کو	مر رہا تھا جلا دیا مجھ کو
تری آنکھوں کی جگمگاہٹ نے	اک تماشہ بنا دیا مجھ کو

(جنوری تا جون 1965ء، المنار صفحہ 85)

ان کی دو غزلیں پیش خدمت ہیں۔

غزل

دل مبتلا ہے اک وفا نا آشنا کے ساتھ	کیسی گرہ لگی ہے ہوا کی ہوا کے ساتھ
مہکا ہوا ہے صبح سے آنگن خیال کا!	آئی ہے تیرے جسم کی خوشبو صبا کے ساتھ
برسا ہے اب کے آنکھ کا بادل کچھ اس طرح	ہر نقش دل سے مٹ گیا نقش وفا کے ساتھ
دل خون خون ہے مگر کیا کیجئے اسے	نسبت ہے اس کو بھی کسی دست حنا کے ساتھ
بھرے پڑے تھے زرد رو پتے حواس کے	آندھی چلی تو لے گئی ان کو اڑا کے ساتھ

(المنار۔جنوری، مارچ 1968ء صفحہ 94)

غزل

آئی سحر تو رات کے سائے ہوا ہوئے	بس اک نظر سے سوختہ جاں کیا سے کیا ہوئے
گریاں ہوئے شدتِ احساس مٹ گئی	چپ ہو گئے تو پنجۂ دستِ حنا ہوئے
پھرتے ہیں تیری یاد کی خوشبو لئے ہوئے	آوارگانِ شوق بھی بادِ صَبا ہوئے
ہم کارواں سے گرد کی صورت بچھڑ گئے	سَیل ہوا نما تھے ہوا کی غذا ہوئے
ایک عمر سے تھی درد کی زنجیر پاؤں میں	تیرے اسیر ہو کے ہم گویا رہا ہوئے

(المنار۔جولائی، ستمبر 1965، صفحہ 47)

(بحوالہ المنار، یو ایس اے۔جلد نمبر 4، شمارہ نمبر 1۔دسمبر 2024)

پروفیسر پرویز پروازی کی باتیں اور انمٹ یادیں

زکریا ورک۔ٹورانٹو

ربوہ میں میرے بچپن میں ایک ادبی مجلس بزم خیال ہوا کرتی تھی۔ایک دفعہ میرے بڑے بھائی محمد ادریس اس ادبی تنظیم کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے مجھے بھی ساتھ لے گئے۔وہ اس مجلس کے سیکریٹری تھے۔یہ اجلاس شاید عبد السلام اختر کے صدر انجمن کے کوارٹرز میں منعقد ہوا تھا۔اس مجلس کا ذکر''بیتے لمحوں کی چاپ"میں صفحہ 121 پر کیا گیا ہے۔اس وقت میری عمر بارہ سال کے لگ بھگ تھی۔وہاں میں نے پہلی بار بزرگوارم پروازی صاحب کو دیکھا تھا۔پھر تعلیم الاسلام کالج میں تعلیم 1963۔65 کے دوران گرامی القدر پروازی صاحب ہمارے اردو کے استاد تھے۔میری آنکھوں کے سامنے وہ کالج کا بڑا ہال روز روشن کی طرح اب بھی ہے جہاں 200 کے قریب طلباء کو آپ اردو ادب سے لگاؤ اور شناسائی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔اشعار کی اس رنگ میں تشریح فرماتے کہ انسان سنتا ہی رہے۔مجھے یاد ہے بعض دفعہ آپ طالب علموں کو کسی کتاب سے پیراگراف پڑھنے کو دیتے تا معلوم ہو سکے کہ طالب علم کا تلفظ کیسا ہے۔

اس کے بعد میں کراچی چلا گیا۔وہاں سے جرمنی اور پھر 1973 میں کینیڈا ہجرت کر کے آ گیا۔ پروازی صاحب جاپان چلے گئے،وہاں سے پاکستان واپس آنے کے بعد شدید مذہبی جنونی ماحول اور تعصب کے بناء پر سویڈن ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔سویڈن میں جب آپ رہائش پذیر تھے تو میرا ان سے رابطہ ہوا۔خطوط کا سلسلہ جاری رہا۔اپنے ایک خط مورخہ 22 جنوری 1992 میں انہوں نے

مجھے لکھا ’’زکریا تم مجھے اکثر یاد آئے ہو مگر کوئی صورت رابطہ کی نہ ہوئی۔ پھر وہ اور میں خدا معلوم کہاں ہے۔ہم لوگوں نے ربوہ میں بڑا اچھا وقت اکھٹے گزارا ہے۔اس لئے وہ یادیں ذہن میں مستحضر ہیں۔‘‘

1994 ٹورانٹو میں آمد

1994 میں آپ ٹورانٹو اپنے بیٹے ماہر احمد سے ملنے کے لیے آئے۔ مجھ سے رابطہ ہوا۔ میں کنگسٹن سے تین سو کلو میٹر کا سفر کر کے آپ کے پاس پہنچا۔سب سے پہلے ہم نے ٹورانٹو ریفرنس لائبریری کو وزٹ کیا۔ یہاں اردو کی کتابیں کثیر تعداد میں ہیں۔اس کے بعد ہم نے کھانا کھایا۔ میرے اصرار پر کینیڈا کی راجدھانی آٹوا کی سیر کرنا پسند فرمائی۔کنگسٹن میں رات قیام کے بعد میں آپ کو آٹوا لے کر گیا۔ پارلیمنٹ پہنچے وہاں ان دنوں ایک پارلیمنٹری اسسٹنٹ جن کا نام Bob Lay تھا ان کی نسیم مہدی سے واقفیت تھی۔ میں نے باب کو فون کیا اس نے ہمارا گرمجوشی سے استقبال کیا۔اس نے ہمیں ہاؤس آف کامنز اور سینیٹ کی سیر وی آئی پی مہمان کے طور پر کروائی۔ نیز ان کی شاندار لائبریری کی ایک گھنٹے تک سیر کروائی جہاں ہمارے لیے جانا شاید ممکن نہ ہوتا۔

کچھ روز بعد میں نے آپ کو شہرہ آفاق ٹورسٹ سپاٹ Thousand Island کی بحری بوٹ پر تین گھنٹے کی سیر کروائی۔جس سے آپ بہت لطف اندوز ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد ہم آپ کو ٹورانٹو واپس چھوڑنے آئے۔ یہ سفر نامہ احمدیہ گزٹ کینیڈا میں اکتوبر 1994 میں شائع ہوا تھا جس میں ہدایت اللہ ہادی، ادریس شاہین اور خالد تاج کی مہمانی نوازی کا خاص ذکر کیا گیا تھا۔واپس سویڈن جا کر آپ نے مجھے نامہ مرقومہ 4/8/1994 میں لکھا ’’پیارے زکریا۔السلام علیکم میرے قیام کینیڈا کے دوران تم نے اور تمہاری بیوی نے جو خدمت کی اس کے لئے تہہ دل سے ممنون ہوں۔ اللہ تمہیں خوش رکھے اور دین اور دنیا میں بے شمار کامرانیاں عطا کرے۔تمہاری اولاد کو تمہارے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے۔ یہ

خط رسمی خط نہیں ہے دل سے نکلی ہوئی دعائیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔‘‘

2010-قلمکار حمید اختر سے ملاقات

مئی 2010ء میں آپ نے مجھے فون کیا کہ پاکستان کے مشہور مصنف، کالم نویس صحافی حمید اختر ٹورنٹو آ رہے ہیں اس لئے فلاں دن ٹورنٹو آ جاؤ۔ ہم ان سے ملنے جائیں گے۔ چنانچہ عاجز حسب خواہش آپ کے گھر پہنچ گیا۔ حمید اختر (1924-2011) اپنی بیٹی کے یہاں فروکش تھے جس کا گھر نارتھ یارک میں تھا۔ ان کی بیٹی نے ہماری خوب آؤ بھگت کی۔ علمی ماحول میں باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے حمید صاحب کو اپنی کتاب سوانح البیرونی پیش کی۔ لاہور واپس جا کر انہوں نے اس پر سیر حاصل تبصرہ لکھا جو روزنامہ ایکسپریس میں شائع ہوا تھا۔ کھانے کے بعد ہم تینوں پیس ولیج گئے تا ان کو اس احمدی رہائشی علاقے کی سیر کروائی جائے۔ شام کو ہم نے معزز مہمان کو ان کے گھر پہنچا دیا۔ اور پروازی صاحب کو ان کی قیام گاہ پر۔ حمید اختر کو کچھ سال ترقی پسند خیالات و نظریات اور تحریروں کی وجہ سے جیل میں پابند سلاسل بھی رہنا پڑا۔ ایام اسیری کی یادوں پر مشتمل اوسان خطا کرنے والی داستان انہوں نے کال کوٹھری کے نام سے تحریر کی جو کہ ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی سے ملاقات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ابوالکلام قاسمی (معروف ادبی نقاد، متعدد کتابوں کے مصنف اور پندرہ سال تک ایڈیٹر ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ رہے) 2014 میں ٹورانٹو تشریف لائے کیونکہ ان کا بیٹا سمیر قاسمی مسی ساگا میں رہتا تھا۔ کچھ روز بعد وہ میری رہائش گاہ پر بیگم اور بیٹے کے ہمراہ کھانے پر تشریف لائے۔ اگلے روز میں نے پروازی صاحب کو فون پر بتایا کہ قاسمی صاحب ٹورانٹو میں ہیں۔ فرمایا میں ان کا انٹرویو اپنے راول ٹی وی کے پروگرام ’’چہرے‘‘ کے لئے کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے پروازی صاحب کو ان کی قیام گاہ سے لیا۔ وہاں سے ہم قاسمی صاحب کے گھر گئے اور وہاں سے ٹیلی ویژن سٹیشن۔ میں نے سٹیشن تک جانے کے لیے راستہ ایک کاغذ پر لکھا ہوا تھا جس کو قاسمی صاحب دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے وہ میری ڈرائیونگ سے متاثر ہوئے۔ اس پروگرام میں ہم تینوں شریک ہوئے۔ اس پروگرام کو بہت سراہا گیا۔ اس کے بعد ہم قاسمی صاحب کو ایک اچھے ریستوران میں کھانے پر لے کر گئے۔ کھانا ختم ہونے سے قبل آپ نے میز کے نیچے چپکے سے میرے ہاتھ میں پچاس ڈالر کا نوٹ تھما دیا حالانکہ اس عزت افزائی کا حقدار میں بننا چاہتا تھا۔

کچھ سالوں بعد قاسمی صاحب پھر ٹورانٹو اپنے بیٹے کے پاس آئے۔ پروازی صاحب نے کہا کہ اس بار میں ان کی بیگم کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں جو کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ پروازی صاحب اور میں ان کے گھر پہنچے اور ہماری حسب معمول خاطر تواضع کی گئی۔ اس کے بعد ٹیلی ویژن سٹیشن پہنچے۔ پروازی صاحب نے نہ جانے کس طرح ان کی بیگم دردانہ قاسمی کے ادبی کام کے بارے میں کافی معلومات اکھٹی کی ہوئی تھیں۔ اور ان کے مضامین اور ادبی کام سے بخوبی واقف تھے۔ سٹوڈیو میں صرف تین افراد کی جگہ تھی اس لیے میں انٹرویو میں شامل نہ ہو سکا۔ اس ملاقات کے دوران یہ تین پروفیسر علم و آگہی کے جو موتی بکھیرتے رہے اور شعر و نغمہ پر گفتگو کرتے رہے اس کو راقم الفاظ کا جامہ پہنانے سے قاصر ہے۔ افسوس پروفیسر ابوالکلام قاسمی بعارضہ سرطان لمبی علالت کے بعد جولائی 2021 میں وفات پا گئے۔

ٹورانٹو کے راول ٹی وی پر ''چہرے'' کے نام سے آپ نے جن مشاہیر، ادیبوں، مصنفین اور شعراء کے انٹرویو کیسے ان کی تعداد میرے حساب سے کم از کم پچاس کے قریب ہے۔ آپ نے کمال شفقت اور سخاوت سے میرا انٹرویو بھی کیا جس میں میری شائع شدہ کتابوں اور مضامین پر سیر حاصل بحث کی

گئی۔ایک طالب علم کیلئے اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے۔ یہ میرے لئے کسی اعزاز یا ایوارڈ سے کم نہیں کہ ان کے پایہ کے محقق اور مایہ ناز ادیب نے مجھ ہیچمداں کا انٹرویو کیا۔آپ کو جب میں آپ کی قیام گاہ سے ٹیلی ویژن سٹیشن لے کر جاتا تو مجھے ڈائریکشن دیتے جاتے حالانکہ میرے پاس GPS کار میں ہوتا تھا۔مگر اس کے باوجود آپ مصر ہوتے کہ اس جگہ رائٹ ٹرن لو، وہاں لیفٹ لو، یہ راستہ زیادہ آسان ہے۔میری دلی خواہش ہے کہ راول ٹی وی کے منتظم فضل معین صدیقی ان انٹرویوز کو DVD پر تیار کر کے پروازی صاحب کے چاہنے والوں کو جلد فراہم سکیں گے۔میرے نزدیک خود نوشتوں کے جائزہ کے بعد یہ ان کا زندہ جاوید کارنامہ ہے۔

سابق سفیر پاکستان سے ملاقات

پاکستان کے سابق سفیر کرامت اللہ غوری کی اہلیہ عابدہ کرامت 2016 میں جب وفات پا گئیں تو پروازی صاحب نے مجھے کہا کہ ان سے ملنے جانا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں رچمنڈ ہل میں ان کے دولت خانے پر تعزیت کے لئے حاضر ہوئے۔ جناب غوری قلم اور گفتار کے غازی ہیں۔ان کے دلچسپ علمی مضامین ٹورانٹو کے اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ نیز وہ مشاعروں اور اجلاسوں کی صدارت بھی کرتے ہیں۔ ملاقات کے دوران غوری صاحب نے ہمیں اپنی اہلیہ کے اشعار اور غزلوں کی تین چار کاپیاں دکھائیں۔نابغہ روزگار ڈاکٹر عبدالسلام پر جو مضمون غوری صاحب نے زیب قرطاس کیا تھا جو ان کی کتاب ’’بارشناسائی‘‘ میں درج ہے وہ میں نے اپنی تالیف ’’سلام عبدالسلام‘‘ میں شامل کیا تھا۔ جاپان میں جہاں غوری صاحب قائم مقام سفیر تھے،ڈاکٹر سلام سے اپنی ملاقات کے متعلق وہ کہتے ہیں ’’ڈاکٹر سلام سراپا عجز و نیاز اور ہمہ تن انکسار تھے۔آنکھوں میں فطری ذہانت کی روح پرور چمک.........جیسے بادل اپنی فیاضی میں خشک سے خشک تر زمین کو بھی سیراب کرنا چاہتا ہو۔سائنس

جیسے خشک اور بنجر میدان میں ان کی ظرافت طبع اور بذلہ سنجی خاصے کی چیز تھی۔''

شاعر خوش نوا مبارک احمد عابد سے ملاقات

چند سال پہلے جماعتی حلقوں میں جانے پہچانے غزل گو شاعر پروفیسر مبارک احمد عابد (میرے ہم جماعت) ٹورانٹو تشریف لائے تو پروازی صاحب نے مجھے یاد کیا۔ ہم دونوں مبارک عابد کو ان کے فرزند دلبند عدنان کے گھر سے لے کر ریستوران میں گئے اور کھانا کھانے کے بعد دیر تک کالج کی یادوں میں محو ہو گئے۔ پروازی صاحب کو تعلیم الاسلام کالج کا سنہری دور اتنا یاد آ رہا تھا یا ستا رہا تھا کہ مبارک عابد سے صرف اسی موضوع پر بات چیت کرتے رہے۔ میٹھے میں آپ نے گلاب جامن منگوائے تو میں نے پوچھا آپ کو تو شوگر ہے؟۔ کہنے لگے میرے لیے یہ میٹھا کھانا ضروری ہے تا شوگر کم نہ ہو جائے۔ جسم کو مکمل طور پر شوگر سے محروم رکھنا مناسب نہیں۔ شوگر زیادہ ہو جائے تو اس کا تدارک ممکن ہے لیکن جسم میں شوگر کی کمی ہو جائے hypoglycemia ہو جائے تو اس سے ایسے نقصان کا احتمال ہوتا جو جان لیوا ہو سکتا۔ کینیڈا کا سفر نامہ جس میں آپ کی ظرافت طبع کی شیرینی ہر فقرے میں ٹپکتی نظر آتی ہے آپ نے لکھا کہ جب سے انسولین لگانے کی نوبت آئی ہے دعوتوں کی طرف رغبت کم ہو گئی ہے۔ بھلا میٹھا نہ کھایا جائے تو دعوت کیا ہوئی ؟ اور میٹھا کھایا جائے تو انسولین کیا ہوئی ؟

تصانیف اور رسائل

آپ نے بچپن میں ربوہ میں اپنے گھر کی بیٹھک میں چھوٹی سی لائبریری کی بنیاد ڈالی اور ربوہ کے علم دوست باسیوں سے کتابیں لے کر اس میں سجا دیں۔ پھر عوام کو دعوت عام دی گئی کہ وہ اس لائبریری کو دیکھنے ضرور آئیں۔ بچپن میں بچوں کیلئے ایک رسالہ شروع کیا جس کا نام مشعل تھا۔ یہ رسالہ لائبریری کی زینت بھی بنا۔

آپ نے پی ایچ ڈی 1947 تک اردو میں قلم بند کئے گئے ناولوں کے موضوع پر 1968 میں کی تھی۔ ایک بار انہوں نے مجھے بتایا کہ پی ایچ ڈی کرنے کے دوران لاہور میں کئی راتیں فٹ پاتھ پر سوتا رہا کیونکہ لاہور میں کسی سے اتنی واقفیت نہیں تھی اور تقسیم ہند کے پرآشوب دور کے بعد وسائل بھی نہیں تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بطور اظہار تشکر بتایا کہ پٹنہ کے احمدی فاضل اور عالم بے بدل پروفیسر ڈاکٹر اختر اورینوی (ڈی لٹ) نے ان کی مقالہ لکھنے میں فراخدلی سے مدد کی تھی۔ ہندوستان میں کتابوں اور رسائل و جرائد کی تلاش اور ان کے صفحات کی فوٹو کاپیاں یا ہاتھ سے نقل کروا کے لاہور بھجوائی تھیں۔

آپ کے نہایت دل چسپ اور عالمانہ مضامین عرصہ دراز تک الفضل ربوہ، ہفت روزہ لاہور، ہفت روزہ نیاز مانہ، احمدیہ گزٹ کینیڈا اور امریکہ، المنار ربوہ وامریکہ نیز پاکستان کے دیگر ادبی رسالوں اوراق، علامت، ماہ نو، کی زینت بنتے رہے جن کا شمار کرنا کار دارد ہے۔ سفینہ چاہیئے اس بحر بے کراں کے لیے۔ جب ایک مضمون کسی رسالے میں شائع ہوتا تو وہ اتنا عمدہ اور دلکش ہوتا کہ دیگر رسالوں میں بھی شائع ہوتا تھا۔ میری طرح ان کے سینکڑوں شاگرد یہ خرد افروز مضامین بڑے ذوق وشوق سے پڑھا کرتے تھے خاص طور پر یاد رفتگاں والے مضامین۔ خاکہ نگاری بھی آپ کا طرہ امتیاز تھا۔ سفر ناموں میں بعض دفعہ طنز ومزاح بھی شامل ہوتا تھا۔ فطرت نے ان کو شگفتہ طبیعت ودیعت کی تھی۔ دوستوں شاگردوں کی محفل میں ہمیشہ ہنستے ہنساتے دیکھے گئے۔ ان میں مذاق کرنے اور مذاق سے لطف اندوز ہونے کی اچھی خاصی صلاحیت تھی۔ دل کا آپریشن بھی ہوا، مگر قلم کا یہ مجاہد یہ بازی بھی جیت گیا۔

ماہنامہ انصاراللہ۔ ڈاکٹر عبدالسلام خاص ایڈیشن

آج سے پندرہ سال قبل جب میں ربوہ میں تھا تو خلافت لائبریری میں ماہنامہ انصاراللہ جنوری فروری 1980 کا وہ خاص رسالہ خوش قسمتی سے مل گیا جس کے پروازی صاحب ایڈیٹر تھے۔ یہ ڈاکٹر

عبدالسلام کے نوبیل انعام ملنے کے بعد کی خاص اشاعت تھی۔اس کی فوٹو کاپی میں نے کروالی۔خاص بات یہ تھی کہ اس میں اشاریہ دیا گیا تھا یعنی نوبیل انعام کی خبر اور پاکستانی اخبارات میں چھپنے والی خبروں اور مضامین کا اشاریہ۔ یہ سات صفحات پر محیط ہے۔اسکے علاوہ ڈاکٹر سلام کی سوانح حیات اور ڈاکٹر صاحب کو ملنے والے اعزازات کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

عالم اسلام کے بطل جلیل ڈاکٹر عبدالسلام کی وفات پر پروازی صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا:"وہ شخص خاموش ہو گیا جو بولتا تھا تو دنیا خاموش ہو کر اس کو سنتی تھی۔ وہ سائنس کے اتھاہ سمندر کا کنارہ، طبیعات کے سمندر کا کنارہ،طبیعات کے آسمان کا ستارہ، دل کا حلیم، اپنوں پرایوں پر مہربان، ذہینوں فطینوں کا قدردان، اپنے وطن میں علم کے فروغ کا خواہش مند، جہالت کا دشمن اور علم کی روشنی سے بہرہ مند، اس کے اُٹھ جانے سے دنیا سے ایسا علم اُٹھ گیا۔ان جیسوں کی موت کو زمانہ کی موت کہا جاتا ہے۔" (الفضل 9 جنوری 1997 صفحہ 4)

فخر پاکستان ڈاکٹر عبدالسلام کی حسرت ناک وفات پر آپ نے نظم لکھی جس کے کچھ اشعار یہ ہیں

اس احمدی سے تعلق برادرانہ تھا
مرا سلام کا رشتہ بڑا پرانا تھا
وہ شخص بو علی سینا تھا اس زمانہ کا
وہ شخص دانش و حکمت کا اک خزانہ تھا
سلا دیا جسے مٹی میں ہم نے پچھلے پہر
وہ ایک شخص نہ تھا پورا اک زمانہ تھا

(اخبار احمدیہ لندن)

آپ کی شاعری

آپ نے پاکستان، جرمنی، سویڈن، برطانیہ، کینیڈا اور امریکہ میں درجنوں مشاعروں کی صدارت اور نظامت کے فرائض سرانجام دئے۔

ایک دفعہ میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ نے ابھی تک مجموعہ کلام کیوں شائع نہیں کیا؟۔فرمایا میری شاعری زیادہ تر جماعت احمدیہ کے متعلق ہے جو جماعت کے جرائد میں چھپ چکی ہے۔اس لئے کوئی اور صاحب ذوق اس کام کو کرے۔" احمدیہ کلچر" میں صفحہ 272 میں آپ نے لکھا ''اول تو ہم مشاعرے پڑھتے نہیں، پڑھیں تو ہمیشہ تازہ ترین کلام سناتے ہیں۔لوگوں کی طرح ایک ہی غزل کو بقول شخصے ''ری پیٹتے'' نہیں چلے جاتے۔''

آپ کا ایک اعلیٰ پایہ کا ادبی مضمون" پاکستان میں اردو ادب اور جماعت احمدیہ کا کردار" پہلے ماہنامہ خالد (اگست 1997) اور پھر مکرر روزنامہ الفضل (4 نومبر 1997) میں شائع ہوا تھا۔اس کے آخر پر آپ نے اپنی شاعری کے بارے میں لکھا" راقم الحروف کو بھی نظم و نثر میں خدمت کی تھوڑی بہت توفیق ملتی رہی اور اس ہیچ مدان کے مضامین جماعت کے کسی ایک پرچے میں چھپنے کے بعد جماعت کے بہت سے دوسرے پرچوں میں اور دوسرے ممالک میں مکرر چھپتے رہے۔نظموں کا سلسلہ یہ رہا کہ خاکسار جماعت کے پرچوں میں تو چھپتا رہا مگر ملک کے وقیع ادبی رسائل کے مدیران کے کہنے کے باوجود ان رسائل سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں اپنی شعری صلاحیت کو صرف جماعت احمدیہ کی خدمت کیلئے وقف رکھنا چاہتا ہوں اور ان مدیران نے از راہ کرم میرے اس عذر کو قبول کر لیا۔ہاں یہ ضرور ہوا کہ ادبی جرائد نے جماعت کے پرچوں میں چھپنے والی کسی چیز کو اپنے پرچوں میں مکرر چھاپ کر میری عزت افزائی فرمائی۔جماعت احمدیہ کے بہت سے شعراء کے مجموعہ ہائے کلام پر تعارفیے لکھنے

کی توفیق ملتی رہی۔"

آپ کی تصانیف

آپ کی علم کے لعل و گوہر سے بھر پور تصانیف جو آپ نے 1964-2010 تک تصنیف کیں ان کی فہرست پس نوشت جلد سوم کے پس پشت جلد پر دی گئی ہے۔اس کے مطابق تعداد 16 بنتی ہے جس میں قرآن کریم کا اردو ترجمہ (غیر مطبوعہ) حبل الورید شامل ہے۔اردو، انگلش، عربی، فارسی پر آپ کو مکمل عبور حاصل تھا۔

جاپان کے متعلق آپ نے چھ کتابیں ترجمہ وتصنیف کیں جیسے سورج کے ساتھ ساتھ (سفر نامہ) اور جاپان کا سب سے لمبا دن۔

تحریک آزادی میں سر ظفر اللہ کا حصہ کتاب 2002 میں شائع ہوئی تو اس کے اعترافات میں یعنی کتاب کی تکمیل و اشاعت میں حصہ لینے والے دیگر شاگردوں کے ساتھ اس عاجز کا بھی ذکر فرمایا تھا۔

احمدیہ کلچر میں آپ کی یہ 307 صفحات پر مشتمل کتاب 2005 منظر عام پر آئی۔اس کا موضوع احمدیوں کے سماجی، معاشرتی، اور دینی رویوں کا جائزہ ہے جس کی بنیاد قادیان اور ربوہ کے ماحول کے مطالعہ پر رکھی گئی ہے۔دیباچہ میں آپ نے لکھا "اب وہ چیزیں جو تقریباً تین سو مضامین کی صورت میں سلسلہ کے مختلف رسالوں اخباروں میں بکھری پڑی تھیں کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہیں۔" یہ فی الحقیقت جماعت احمدیہ کے Who's Who اسماء الرجال کا جامع انسائیکلو پیڈیا ہے۔ذرا مضامین کے عنوان ملاحظہ فرمائیں، میرا مرشد، کچھ بے نفس لوگ، مددگار کارکن، ہمارے دکاندار، جلسہ سالانہ اور آب خورے، ربوہ کے احمدی شعراء، قدم قدم تیری یادیں۔ یہ کتاب آپ نے اپنے آٹوگراف کے ساتھ راقم کو عنایت فرمائی جس پر 2 دسمبر 2005 تاریخ درج ہے۔

ایک دفعہ راقم الحروف آپ کو کسی دوست سے ملوانے کے لیے مسی ساگا میں آپ کی قیام گاہ پر پہنچا۔کوئی مضمون ٹائپ کر رہے تھے اپنے سٹڈی روم میں انتظار کرنے کو کہا جو بھانت بھانت کی کتابوں سے فرش سے چھت تک کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بستر پر بھی کتابیں تھیں۔کمپیوٹر پر ٹائپ میں ذرا دقت ہوتے دیکھ کر بتایا کہ میری ایک آنکھ میں مکمل بینائی نہیں اس لیے ایک آنکھ سے ہی کتنے سالوں سے یہ کام کر رہا ہوں۔ ہر مضمون in-page پر خود ٹائپ کر کے رسائل کو ای میل کرتے تھے۔عاجز نے آپ کو احمدی سکالر محمد عطاء اللہ کی خودنوشت Citizen of the Two Worlds بڑی مشکل سے تلاش کر کے فراہم کی جوان کے لیے باعث مسرت ہوا تھا۔جب کسی سے بے تکلفی ہوجاتی تو اس سے ’’یار کہہ‘‘ کر مخاطب ہوتے بشمول مجھ جیسے شاگردوں سے۔ مجھے وہ پر تکلف دعوت بھی یاد آ رہی ہے جب آپ نے ملک لال خاں، کرنل (ر) محمد اسلم، سجاد ملک، ہدایت اللہ ہادی اور راقم السطور کو مسی ساگا میں اپنی رہائش گاہ پر مدعو کیا تھا۔اس کے بعد آپ کے لطیف مزاح کی پھلجھڑیاں چلتی رہیں اور محفل زعفران زار بنی رہی۔ان کے پر مزاح جملے ہلکی سی چٹکی لینے کے مترادف ہوا کرتے تھے۔جب کبھی اپنی ہونہار بیٹی کو ملنے کے لیے آتے جو میرے گھر کے قریب رہتی تھی تو مجھے فون کر دیتے۔

’’پس نوشت‘‘ کے چار ایڈیشنز

پس نوشت۔اردو کی اہم خودنوشتوں کا جائزہ۔ چار جلدوں میں اردو میں رقم کی جانے والی 316 آپ بیتیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔آپ نے بڑے شفقت سے ہر نئے ایڈیشن پر دستخط فرمائے اور مجھے مرحمت فرمائی۔ یہ کتابیں لاہور سے شعیب عادل ایڈیٹر نیا زمانہ لاہور نے شائع کی تھیں۔شعیب عادل نے راقم کی چھ کتابیں بھی شائع کی تھیں۔اس کے علاوہ درجنوں احمدی مصنفین اور شاعروں کی کتابیں

شعیب نے لاہور سے شائع کی تھیں مگر کچھ سالوں بعد شعیب بھی وطن میں تعصب اور شدت پسندی کا شکار ہو گئے جب تین سو سے زیادہ بلوائیوں نے علماء کے اکسانے پر ان کے دفتر پر حملہ کر دیا۔ بڑی مشکل سے ان کی جان بچی۔ اس خوف اور کڑے وقت میں پروازی صاحب بہت فکرمند ہوئے کہ اس کا ذریعہ معاش جاتا رہا۔ ہم دونوں نے ان کی مالی مدد کی تھی۔ آج کل شعیب عادل میری لینڈ امریکہ میں مقیم ہیں، اور نیا زمانہ امریکہ سے شائع کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر داؤد رہبر کا تبصرہ

قاموسی نوعیت کی یہ تصنیف پس نوشت یعنی اردو کی آپ بیتیوں پر پروفیسر ڈاکٹر داؤد رہبر (1926-2013) کا تبصرہ رسالہ نیا زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ داؤد رہبر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ برطانیہ، امریکہ کینیڈا میں چار دہائیوں سے تقابلی مقابلہ ادیان کے پروفیسر تھے اور متعدد کتابوں کے مصنف۔ میں نے ستر کی دہائی میں ان کی علمی کتاب گاڈ آف جسٹس پڑھی تھی جو کہ معرکہ آراء تصنیف ہے۔ آپ نے اپنی اردو کتابوں کا انگلش میں ترجمہ کیا نیز غالب کے خطوط کا بھی۔ آپ کی تصنیف ”پراگندہ طبع لوگ“ آن لائن ہمارے دوست اور کرم فرما سفیر رامہ کی apnaorg.com ویب سائٹ پر پڑھی جا سکتی ہے۔

آج سے آٹھ برس پہلے پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب نے اپنی تصنیف پس نوشت کی جلد اول تحفہ مجھے بھیجی تھی۔ میں نے انہاک سے اس کا مطالعہ کیا۔ ادبیات کے اصناف میں سب سے بڑھ کر میری دل بستگی سوانح عمریوں سے ہے۔ ڈاکٹر پروازی صاحب کا شغف ان کی بجائے آپ بیتیوں سے ہے۔ آپ بیتیوں کی تحقیق میں سبقت کا سہرا آپ کے سر ہے۔ پس نوشت کی جلد اول پڑھ کر میں نے 12 جنوری 2004 کو انہیں ایک خط لکھا پھر ایک برس بعد جلد دوم کا مسودہ ملا تو 20 مئی 2005 کو انہیں

شکریہ کا خط لکھا۔ دونوں خطوط میں آپ کی کارگزاری کی داد دی۔ جلد دوم کی طباعت کے وقت آپ نے میرے دونوں خطوط اس میں شامل کر دیے۔ بعدازاں جلد سوم اور جلد چہارم کے عطیے بھی ان کی طرف سے موصول ہوئے۔ جلد سوم 2010 میں شائع ہوئی اور جلد چہارم 2012 میں۔

جن آپ بیتیوں کا ان چار جلدوں میں تجزیہ کیا گیا ہے ان میں تعلقات بشری کے تنوع کی خبر ملتی ہے۔ رحمدلی، بے رحمی، غرور، فروتنی، خیرات، بخل، بغض، زود رنجی، دلیری، بزدلی، ریاکاری، اخلاص، انتظام، حرص، قناعت، توکل، کنبہ پروری کی مثالیں فراہم کی گئیں ہیں۔ اردو کی تہذیب کا ایک خاص فیچر ہے باحیثیت اور برگزیدہ بزرگوں کے لئے تکریم جمع کا استعمال مثلاً آل احمد سرور لکھتے ہیں رشید احمد صدیقی لاہور تشریف لائے۔ آل احمد سرور لکھتا ہے کوئی نہ کہے گا، تکریم کا یہ التزام انگریزی میں نہیں۔ جن آپ بیتیوں سے ڈاکٹر پروازی نے ہمیں متعارف کرایا ہے بیسویں صدی کے ہندوستانی اور پاکستانی معاشرہ کی عکاسی ہیں۔ اس معاشرہ کا اساسی نظام اب بادشاہی والا نہیں بلکہ جمہوریت آمادہ ہے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ اس میں جمہوریت کا ڈھونگ ہے، جمہوریت ان دونوں ملکوں میں تشکیل پذیر ہے۔ سیاسی تحریکوں کی کشاکش ان میں سلطانی جمہور کا مضحکہ خیز ناٹک ہو کر ہمارے سامنے ہے۔

ڈاکٹر پروازی کو مبداء فیض سے چوکس دماغ اور توانا حافظہ عطا ہوا ہے۔ آپ نے لگن کے ساتھ آپ بیتیوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ان سے دل چسپ اور مفید مطلب اقتباسات آپ نے تجزیہ میں مسلسل شامل رکھے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کلچرل اور سیاسی ہنگاموں سے بندہ ساٹھ برس دور رہا ان ہنگاموں کی خبر مجھے یہ چار جلدوں میں پڑھ کر ملی۔

ڈاکٹر پروازی کی اس تصنیف کی آخری جلد (جلد چہارم) میں مندرجہ ذیل قلمکار طبقات کی نمائندگی ہوئی ہے: معلمین (تعداد 16)، ادبی شخصیات (تعداد 9)، فوجی افسر (4)، وابستگان سیاست

(7)، پولیس (2)، سفیر (2)، صحافت پیشہ (3)، براڈ کاسٹر (5)، میڈیکل ڈاکٹر (2)، سرکاری عہدیدار (4)، سائنس کے پرستار (4)، فضائیہ (2)، دین کے مبلغ (2)۔ طبقات کا یہ شمار صرف جلد چہارم کے حوالے سے ہے۔ اس جدول کو ملاحظہ کر کے اندازہ ہو جائیگا کہ سابقہ تین جلدوں میں خودنوشت لکھنے والے کن متفرق میدانوں کے لوگ ہیں۔" (نیا زمانہ اپریل لاہور 2013، صفحات 40/41)

آپ بیتیوں پر ٹورانٹو میں مذاکرہ

حلقہ ارباب قلم ٹورانٹو کے زیر اہتمام 8 مارچ 2020 کو ایک مذاکرہ منعقد ہوا، اس کا موضوع پروازی صاحب کی خودنوشتوں کا جائزہ تھا۔ پروازی صاحب کے تعارف کے بعد سوال و جواب کا لمبا سلسلہ تھا۔ حاضرین سوال کرتے اور پروازی صاحب تسلی بخش بالتفصیل جواب دیتے۔ اس اجلاس میں پروازی صاحب نے اپنے دقیق علمی پراجیکٹ کے آغاز کے متعلق فرمایا: " جب میں جاپان سے واپس آیا تو انہوں نے مجھے بہاول نگر بھیج دیا۔ میں چپ کر کے بیٹھ گیا اور سوچا زیادہ سے زیادہ وہ مجھے ملازمت سے نکال دیں گے۔ تو اس وقت میں نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کیلئے سوانح عمریوں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ سوانح عمری اور خودنوشت سوانح میں فرق ہوتا ہے۔ زید یا بکر آپ کے حالات لکھے تو وہ سوانح عمری ہے۔ لیکن اگر آپ خود اپنی زندگی کے حالات لکھیں تو اس میں آپ پر بہت ذمہ داری آجاتی ہے۔ کیونکہ انسان اگر اپنے بارے میں بات کرتا ہے تو کچھ مبالغہ بھی ہوگا ظاہر ہے اپنے بارے میں ایسی باتیں ہی بیان کرنا ہوگا جو اچھی لگتی ہیں۔ وہ ایسی باتیں نہیں بیان کرے گا جو اس کو اچھی نہیں لگتیں۔ سوانح عمریوں اور خودنوشتوں میں بڑا نازک فرق ہے جس کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ تو اس ضمن میں میرا پہلا مضمون لاہور کے رسالہ علامت میں چھپا۔ وہ مضمون چھپنے کی دیر تھی کہ اس پر بحث شروع ہوگئی کہ سوانح عمری اور خودنوشت میں یہ فرق کیوں ہے اب سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا جو

قریب دو گھنٹے تک جاری رہا۔(راقم کے پاس یہ ویڈیو ہے، یادرہے کہ اس وقت پروازی صاحب اس حسین وشاداب زندگی کی 84 بہاریں دیکھ چکے تھے۔مگر حافظہ نشتر کی دھار کی طرح تیز، کاش استاد محترم اپنی خودنوشت ضبط تحریر میں لے آئے ہوتے تو یادگار چیز ہوتی)۔

کتاب گلدستہ خیال پر تبصرہ

میری جب بھی کوئی نئی کتاب منصۂ شہود پر آتی (تادم تحریر 25 کتابیں طبع ہو چکی ہیں) تو میں کچھ آپ کی نذر کرتا،تو ہمیشہ خوشی کا اظہار فرماتے تھے۔گلدستہ خیال جو کہ جماعت احمدیہ کے نامور مبلغ بشیر احمد آرچرڈ کے افکار و خیالات پر مشتمل مضامین کے مجموعہ کا اردو ترجمہ ہے۔اس کتاب پر آپ نے جنوری 2003 میں تبصرہ فرمایا''عزیزی زکریا ورک اپنے رنگ میں ادب اور سلسلہ کی خدمت جاری رکھتے ہیں۔اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔پچھلے چند برسوں میں انہوں نے پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کے بارہ میں بہت سارا مفید مواد جمع کر کے شائع کیا ہے تا کہ مستقبل کے مؤرخ کیلئے آسانی رہے۔ہم لوگ بہ حیثیت قوم احسان ناشناس قوم ہیں اس لئے کسی احمدی کے کارہائے نمایاں کو خواہ وہ سورج کی طرح ظاہر و باہر کیوں نہ ہو تعصب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔الا ماشاءاللہ۔کچھ سائنس دان ایسے بھی ہیں جو سچ کو سچ کہہ دیتے ہیں مگر ایسے لوگ شاذ کالمعدوم کے حکم میں ہیں۔اس سلسلہ کا آخری مضمون جو میری نظر سے گزرا وہ ان کی بیٹی کے مضمون کا ترجمہ ہے عزیزم زکریا نے ہفت روزہ لاہور میں شائع کروایا ہے۔ زکریا ادبی اور علمی ذوق کا آدمی ہے اور مجھے خوشی ہے کہ اس ذوق کی آبیاری میں کوتاہی نہیں کرتا۔اللہ تعالیٰ اسے بیش از پیش خدمت کی توفیق دے۔علمائے ادب نے یہی کہا ہے کہ نافع الناس وجود کہیں بھی ہو اجنبی نہیں رہتا کہ جہاں جا گزیں ہوا اپنے فیض کا چشمہ جاری کر دیتا ہے۔ادبی ذوق کے لوگ بھی اسی دائرے میں آتے ہیں کہ دنیاوی مشاغل سے جو وقت اور فرصت ملے اسے ادبی کاموں میں صرف

کرتے اور خلق خدا کے لئے نافع الناس چیزیں جمع کرتے اور انہیں اپنے قلم کے ذریعہ بانٹتے رہتے ہیں۔کینیڈا کی جماعت میں اللہ کے فضل سے بہت سے ایسے نافع الناس وجود جمع ہو گئے ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے رنگ میں جماعت کے علم کلام میں اپنا حصہ ڈالتے رہتے ہیں۔عزیزی زکریا ورک ایسے لوگوں میں سے ایک ہے۔'' ایک شاگرد کے لئے اپنے استاد محترم کے ایسے الفاظ نہ صرف باعث افتخار بلکہ کسی اعلیٰ اعزاز سے کم نہیں۔

فیصل آباد کے طالبعلم کا استاد کو خراج عقیدت

بزرگوار محترم پروازی صاحب (1936۔2023) کی وفات پر فیصل آباد کے ایک طالبعلم ناصر عباس نیر نے درج ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے ''مجھے پروازی صاحب کی کلاس کا انتظار رہتا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ باقی اساتذہ اردو ادب ہی نہیں خود تعلیمی عمل سے بے رغبتی کا سبب تھے۔ پروازی صاحب ان سب کی تلافی تھے۔ وہ اپنے ساتھ کئی کتابیں اٹھا کر لاتے۔ پہلے موضوع کا تعارف کراتے۔ پھر اس کی وضاحت کرتے اور ضرورت پڑنے پر متعلقہ کتب سے اقتباس پڑھتے۔ وہ درست معلومات کے ساتھ ساتھ ادب سے متعلق بصیرت بھی بہم پہنچاتے جاتے۔ ادب مسرت اور بصیرت،لذت اور روشنی بہ یک وقت پہنچاتا ہے۔ یہ سچائی ان کے ایک ایک جملے سے پھوٹی پڑتی۔ وہ ادب پڑھاتے ہوئے ادب کی روح نہیں کچلتے تھے۔یعنی وعظ ونصیحت نہیں کرتے تھے۔ان کی آواز گرج دار تھی۔ لہجہ نستعلیق تھا اور عمومی رویہ نہایت ہمدردانہ اور مشفقانہ تھا۔ اس کالج میں پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ ایک استاد، طالب علم کا سچا خیر خواہ ہوسکتا ہے تو دوسری طرف کوئی دوسرا استاد اس کا پکا حریف بھی ہوسکتا ہے۔ پروازی صاحب کا کمرہ ہر وقت طلباء وطالبات سے بھرا رہتا۔ وہ صرف ادب پر گفتگو کیا کرتے۔ وہ ہر طالب علم کا باقاعدہ استقبال کیا کرتے۔ کھڑے ہو جایا کرتے۔ ہم سب

شرمندہ بھی ہوتے اور تفاخر بھی محسوس کیا کرتے۔'' http://www.mukaalma.com/180810

میں اس حدیث دلپذیر کو پروازی صاحب کی غزل کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں۔

تمہاری یاد کے بکھرے ہوئے گہر ہم نے
پروئے تار نفس میں لڑی لڑی کر کے

(الفضل ربوہ 15 اپریل 1997ء)

پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد خان پرویز پروازی پی ایچ ڈی

انجینئر محمود مجیب اصغر سویڈن

انسان کی تمام ترقیاتی کا دور قلم کی بادشاہی سے شروع ہوتا ہے۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا امتیازی نشان قلمی جہاد ہے۔ بانی جماعت احمدیہ جری اللہ فی حلل الانبیاء حضرت مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدی موجود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا تعالیٰ نے سلطان القلم یعنی قلم کا بادشاہ قرار دیا۔ ہمارے دور میں ناصر احمد خان پرویز پروازی نے اردو ادب، شاعری، مضمون نویسی، علم و ادب میں کمال حاصل کیا۔

آپ کی علمی سرگرمیوں کا آغاز تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے پلیٹ فارم سے ہوا۔ آپ بطور طالب علم اور پھر بطور پروفیسر حضرت حافظ مرزا ناصر احمد (ایم اے آکسن) پرنسپل تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے منظور نظر تھے اور آپ کا سارا کیریئر حضرت پرنسپل صاحب کا ہی مرہون منت ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر سید ایس ایم شاھد (پی ایچ ڈی کیمسٹری) لکھتے ہیں ہیں (حضرت مرزا ناصر احمد پرنسپل ٹی آئی کالج ربوہ)

’’اساتذہ کو اعلی پایہ کی کتابیں لکھنے جو فرماتے بلکہ ایک دفعہ مجھے فرمایا کہ اگر میں ایف ایس سی کیمسٹری کی کتابیں اردو میں لکھ دوں تو مجھے ایک ہزار فی کتاب دیں گے اور جب انہوں نے یہ فرمایا تھا اس وقت ایک ہزار روپے کی رقم بہت بڑی رقم تھی۔ اساتذہ کی مزید علمی ترقی کی بہت حوصلہ افزائی فرماتے۔ چنانچہ خاکسار جب لندن یونیورسٹی سے اوائل 1959ء میں کیمسٹری میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے واپس لوٹا تو حضور نے کالج کے تمام اساتذہ کے ساتھ ریلوے سٹیشن پر خاکسار کو شرف ملاقات بخشا جو میرے لئے ایک بہت بڑی سعادت تھی

میرے بعد پھر حضور نے محترم ڈاکٹر نصیر احمد خان صاحب کو فزکس میں، محترم ڈاکٹر ظفر احمد وینس صاحب کو اکنامکس میں، محترم ڈاکٹر ظفر اللہ صاحب کو ریاضی میں انگلستان میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اسی طرح محترم ڈاکٹر ناصر احمد پروازی صاحب کو پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کی پوری سہولت دی۔ حضور کا ارادہ تھا کہ ہر مضمون میں اپنے اساتذہ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دلا کر تعلیم الاسلام کالج میں ہر مضمون میں ایم اے اور ایم ایس سی کی کلاسیں شروع کی جائیں تا کہ اس کالج کا درجہ ایک اچھی یونیورسٹی کے برابر کر یا جائے چنانچہ اس پروگرام کے تحت ابھی عربی اور فزکس میں ایم اے اور ایم ایس سی کی کلاسز شروع ہوئی تھیں کہ دیگر پرائیویٹ اداروں کی طرح تعلیم الاسلام کالج بھی قومی تحویل میں لے لیا گیا اور بقیہ پروگرام تشنہ رہ گئے۔‘‘ (حیات ناصر جلد اوّل)

حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کو اللہ تعالیٰ نے 8 نومبر 1965ء کو خلیفۃ المسیح الثالث کے اعلی مقام کے لئے چُن لیا۔ اس کے بعد بھی حضور کی راہ نمائی میں علم و ادب کی اعلیٰ منازل طے کرتے چلے گئے۔ اور علم کی دنیا میں ٹی آئی کالج اور احمدیت کا ایک نشان بن گئے۔ آپ ان لوگوں میں سے تھے جو لکھنے

والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ٹی آئی کالج کے اس دور کے طلباء کو پہچانتے تھے۔ سائنس اور آرٹس کی دنیا الگ الگ ہے۔ جب اس عاجز نے عملی زندگی میں آکر الفضل اور جماعت کے دوسرے رسالوں کے لئے لکھنا شروع کیا تو آپ نے اپنے ایک مضمون میں نئے لکھنے والے کے طور پر اس عاجز کا ذکر کر کے خوشی کا اظہار کیا۔

آپ کا قلم نہ صرف خود کبھی رکا بلکہ آپ کی خواہش رہتی تھی کہ کثرت سے احمدی لکھیں اس عاجز نے ایف ایس سی 1960۔1962 ٹی آئی کالج ربوہ سے کی تھی اور اس کالج کی ہی برکت سے ویسٹ پاکستان یونیورسٹی آف انجینئر نگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور چلا گیا تھا اور 1962 تا 1966 سول انجینئر نگ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ناصر احمد پرویز پروازی ہماری ٹی آئی کالج میں تعلیم کے دوران ہی آگئے تھے جس کا اس عاجز کو علم نہیں تھا۔ ایک بار اس عاجز نے اپنے دور کے ٹی آئی کالج ربوہ کے پروفیسروں پر ایک مضمون لکھا جو الفضل میں دو قسطوں میں شائع ہو۔ اسی مضمون کو امریکہ والوں نے المنار یو ایس اے میں تصویروں کے ساتھ شائع کیا۔ آپ کی نظر بڑی گہری تھی۔ ایک بار جب کہ یہ عاجز کینیڈا گیا ہوا تھا جمعہ کی نماز پر مسجد بیت السلام کی انٹرنس پر آپ سے ملاقات ہوگئی۔ آپ نے شکوہ کیا کہ اس عاجز نے اپنے مضمون میں آپ کا ذکر نہیں کیا؟ اس عاجز نے عرض کیا کہ آپ ابھی کالج میں پروفیسر بن کر نہیں آئے تھے۔ فرمانے لگے'' آپ لال خان صاحب (امیر جماعت احمدیہ کینیڈا) کے کلاس فیلو نہیں ہیں! میں تو اس وقت کالج سٹاف جائن کر چکا تھا۔ عدم علم کی وجہ سے یہ سہو ہوا لیکن اس واقعہ سے آپ کی کالج کے حوالہ سے اپنائیت اظہر من الشّمس ہے۔ بعد میں جب عرفان احمد خان صاحب (دہلوی) نے ٹی آئی کالج کے اساتذہ اور نامور سٹوڈنٹس پر پروگرام شروع کئے تو آپ ہر پروگرام میں شامل ہوتے تھے اور کالج اور محبوب پرنسپل حضرت مرزا ناصر احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی خوشگوار یادیں شیئر کرتے

تھے۔آپ کی سوانح سے اس عاجز کو پوری شناسائی تو نہیں ہے لیکن اتنا پتہ ہے کہ آپ ایڈیشنل ناظر اصلاح وارشاد مولانا احمد نسیم خان صاحب کے بڑے صاحب زادے تھے۔مولانا **وزادہ بسطۃ فی العلم و الجسم** (البقرہ:248) کے مصداق تھے ربوہ کے اردگرد کے اضلاع ان کے ذمہ تھے۔ اس عاجز کے والد میاں فضل الرحمن بسمل (بی اے بی ٹی) جب بھیرہ کے امیر جماعت تھے تو ایک مرتبہ مولانا ان کے دور میں بھیرہ بھی تشریف لے گئے تھے۔والد صاحب بتاتے تھے ان کا حلقہ احباب بڑا وسیع تھا۔حضرت خلیفۃ المسیح اوّل کے زمانے کے ایک معروف حکیم جنہوں نے سنا ہے بیعت بھی کی تھی ان کو ملنے کے لئے اپنی جیپ پر والد صاحب کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ناصر پرویز پروازی صاحب سلسلہ عالیہ کے معروف عالم، جامعہ کے پروفیسر اور مفتی سلسلہ مولانا محمد احمد جلیل مرحوم کے داماد تھے۔ مولانا کا اس عاجز سے بھی تعارف تھا۔ بڑی مرنجان مرج طبیعت کے مالک تھے۔ان کی صاحبزادی پرویز پروازی صاحب کی اہلیہ بھی تعلیم کے شعبہ سے متعلق رہیں۔نصرت گرلز کالج ربوہ کی پرنسپل کے طور پر ریٹائر ہوئیں۔ہمارے سکول کے زمانے میں نوٹ بکس کی جلد کے باہر انگلش poetry کا یہ سبق آموز stanza لکھا ہوتا تھا

The heights by great men reached and kept

Were not attained by sudden flight

But they while their companions slept

Were toiling upward in the night

(The ladder of St Augustine by Henry Wandsworth Longfellow)

ڈاکٹر ناصر احمد خان پرویز پروازی صاحب کو بھی اپنا مقام محمود حاصل کرنے کے لئے زندگی میں

بڑی جد و جہد کرنی پڑی جیسا کہ اس stanza میں شاعر نے بیان کیا ہے۔بہر حال ڈاکٹر ناصر احمد صاحب پرویز پروازی صاحب کی کامیاب اور مبارک زندگی اور قلمی اور علمی خدمات اور استحکام خلافت اور ترقی علم و ادب کئی آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ کا کام دے گی۔آپ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد یہ عاجز اپنی معروضات کو حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ کے ایک اقتباس پر ختم کرتا ہے 1964ء کی کانووکیشن پر آپ نے اپنے خطاب میں فرمایا۔آپ درس گاہ کی تعلیم سے فارغ ہو رہے ہیں مگر تعلیم سے فارغ نہیں ہو رہے۔علم ایک بحر بے کنار ہے اس لئے ایک انسان علم میں خواہ کسی قدر ترقی کر جائے علم ختم نہیں ہوتا۔اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے

قل لو کان البحر مدادا لکلمت ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمت ربی ولو جئنا بمثلہ مددا (الکھف:110)

کہہ دے کہ اگر سمندر کو سیاہی بنا کر اس سے خدا تعالیٰ کی معرفت کی باتیں، اس کے دیئے ہوئے علوم اور قدرت کے راز، ضبط تحریر میں لانا چاہو تو وہ ایک سمندر کیا اس جیسا ایک اور سمندر بھی لے آؤ تو وہ بھی ختم ہو جائے گا مگر خدا کی باتیں اور اس کے دیئے ہوئے علوم ختم نہ ہوں گے۔اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اور حضور کی اتباع میں ہر مسلمان کی زبان سے یہ کہلوایا کہ **رب زدنی علما** (طہ:115) اے اللہ مجھے اپنی معرفت اور علم میں بڑھاتا جا۔ پس علم کبھی نہ ختم ہونے والی چیز ہے اس لئے آپ تادم حیات علم کی جستجو میں رہیں اور اس کے حصول کے لئے ہمیشہ کوشاں رہیں۔اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کے ساتھ ہو۔(حیات ناصر جلد اول صفحہ 219,218)

اردو خودنوشت، ایک قدم آگے۔ عارف وقار

جن لوگوں نے نوجوانی میں پاکستان بنتے دیکھا تھا وہ نئی صدی کے آغاز تک سترّ اسّی برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اِن میں سے جو لوگ پاکستان آکر اعلیٰ عہدوں تک رسائی حاصل کر سکے یا علمی ادبی شعبوں میں نام کما سکے اُن کے لئے اکیسویں صدی کا آغاز، پلٹ کر ماضی کی طرف دیکھنے کا لمحہ تھا۔ ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ کر ان میں سے کچھ لوگوں نے اپنے حالاتِ زندگی رقم کرنے کی ٹھانی اور یوں اُردو کے افق پر گزشتہ بیس پچیس برس کے دوران رنگ رنگ کی خودنوشت سوانح عمریاں جلوں افروز ہوئیں۔

ڈاکٹر پرویز پروازی کو اس صنفِ ادب سے طبعی لگاؤ ہے اور انھوں نے بڑی سنجیدگی سے اردو سوانح عمریوں کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ سات برس پہلے اُن کے تجزیوں کا اولین مجموعہ منظرِ عام آیا تو ہاتھوں ہاتھوں لیا گیا۔ اُس میں جن ستر سوانح عمریوں کا ذکر تھا وہ حسین احمد مدنی، شورش کاشمیری، زیڈ اے بخاری، سر ظفر اللہ خان، قدرت اللہ شہاب اور جنرل جہاں داد سے لیکر دیوان سنگھ مفتون، جوش ملیح آبادی، کشور ناہید اور رام لال کے بیان کردہ حالاتِ زندگی کا احاطہ کرتی تھیں۔ سوانح عمری کا شوق ڈاکٹر پروازی کو اس میدان میں بہت آگے تک لے گیا اور انہوں نے اگلے پانچ برسوں میں احمد ندیم قاسمی، احسان دانش، مختار مسعود، شیخ ایاز، امرتا پریتم، قرۃ العین حیدر، اے حمید، الطاف گوہر، ڈاکٹر کرن سنگھ، مسعود کھدر پوش اور جسٹس منیر سے لیکر جنرل روئیداد خان، جنرل عتیق الرحمٰن اور پرویز مشرف تک کی خودنوشت سوانحِ عمریاں کھنگال ڈالیں۔

کتاب کے اس دوسرے ایڈیشن میں نئی اور پرانی کل ملا کر ایک سو اکاون سوانح عمریوں کا انتہائی باریک بینی اور عرق ریزی سے تجزیہ کیا گیا تھا۔ اس موقعے پر راقم نے لکھا تھا: ’’...... ایک ایسے زمانے

میں جب تحقیق وتفتیش کی گہرائی اور حقائق کی کھوج میں محقق کی عرق ریزی، ماضی کے افسانے بن چکے ہیں، ڈاکٹر پروازی کا یہ کارنامہ ہر طرح سے سراہنے کے قابل ہے، لیکن ساتھ ہی اُن ریٹائرڈ سرکاری افسروں، جرنیلوں اور سیاست دانوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ بھی ہے جو آج کل اپنی خودنوشت کے لئے نوٹس تیار کر رہے ہیں کیونکہ ڈاکٹر پروازی ایک ہاتھ میں چھلنی اور دوسرے میں محدّب عدسہ لئے ہر نئی آنے والی آپ بیتی کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں......‘‘

اِس وقت جبکہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں اُس چھلنی اور محدب عدسے کے نتائج واضح ہو چکے ہیں اور پروازی صاحب کا تیسرا تحقیقی کارنامہ ’پس نوشت سوم‘ منظرِ عام پر آچکا ہے جس میں میر تقی میر سے لیکر قتیل شفائی تک، موسیقار نوشاد سے لیکر مغنیہ ملکہ پکھراج تک معروف پبلشر مولوی فیروز الدین سے لیکر فلمی مصنف سکے دار تک اور ملک معراج خالد سے لیکر اے پی جے عبد الکلام تک کوئی ستّر شخصیات کی خودنوشت سوانح عمریوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

خودنوشت لکھنے والا عموماً اپنی یادداشت کی بنیاد پر بیتے ہوئے واقعات کی تفصیل رقم کرتا ہے۔ ویسے بھی اسے تاریخی تناظر سے زیادہ اپنے ذاتی نقطۂ نگاہ کی فکر ہوتی ہے چنانچہ اسکی تحریر میں ایک مورخ اور محقق والی واقعاتی صحت اکثر مفقود ہوجاتی ہے، لیکن ڈاکٹر پرویز پروازی اسے کوئی معمولی کوتاہی سمجھ کر درگزر کرنے کے قائل نہیں ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک یہ آپ بیتیاں مستقبل کے مؤرخ کو قومی تاریخ کا خام مال فراہم کرنے کی ذمہ دار ہیں اور یہ مال کھرا اور خالص نہیں ہوگا تو قومی تاریخ کا ریکارڈ بھی درست نہ رہ سکے گا۔

چنانچہ یوسف رضا گیلانی کی خودنوشت ’چاہِ یوسف سے صدا‘ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: کارگل کے مسئلے پر گیلانی صاحب کی معلومات یک طرفہ اور نامکمل ہیں۔ (گیلانی صاحب) لکھتے

ہیں ’نواز شریف پر اپنی فوجیں واپس بلانے کے لئے سفارتی سطح پر عالمی دباؤ بڑھ گیا تو انہوں نے امریکہ کے صدر کلنٹن سے ہنگامی طور پر ملاقات کی اور انہیں آگاہ کیا کہ اگر کارگل سے فوج واپس بلائی گئی تو فوج کی طرف سے شدید ردِعمل کا خدشہ ہے۔صدر کلنٹن نے انہیں اس خدشے سے محفوظ رکھنے کی یقین دہانی کرائی لیکن فوجیں واپس بلانے پر مُصر رہے۔وائٹ ہاؤس میں ون ٹُو ون ملاقات کے فوراً بعد مشترکہ اعلامیے میں صدر کلنٹن کی موجودگی میں نواز شریف کو فوجیں واپس بلانے کا اعلان کرنا پڑا۔‘

یوسف رضا گیلانی کے اس بیان پر ڈاکٹر پرواز ی لکھتے ہیں: ’مجھے وثوق ہے کہ گیلانی صاحب نے اُس وقت تک صدر کلنٹن کی خودنوشت ’مائی لائف‘ نہیں دیکھی ہوگی۔کلنٹن صاحب نے صاف لکھا ہے: ’نواز شریف نے چار جولائی کو امریکہ آنے کی خواہش ظاہر کی۔میں نے انہیں کہا کہ چار جولائی کو انہیں صرف اُس صورت میں امریکہ آنے کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ پیشگی اس بات کی یقین دہانی کرائیں کہ وہ کارگل سے اپنی فوجیں حتمی طور پر واپس بلائیں گے،نواز شریف نے ایسی یقین دہانی کرائی تب ہم نے چار جولائی کو آنے کی اجازت اور دعوت دی‘ (مائی لائف صفحہ 531)۔

ڈاکٹر پرواز ی کے تجزیوں میں اس طرح کی تحقیق و تفتیش سے ہمیں قدم قدم پہ واسطہ پڑتا ہے۔مستقبل کا ادبی مورخ اگر پاکستان میں آٹو بایوگرافی کی تاریخ رقم کرے تو ہمارے زمانے کو یقیناً خود نوشت کے دورِ پرواز ی سے تعبیر کرے گا۔ایک ایسا دور جس میں دو عقابی آنکھیں ہر نئی آنے والی خود نوشت پر مرکوز تھیں اور کھرے کھوٹے کی پہچان کا ایک مستند پیمانہ مقرر ہو چکا تھا۔

(بی بی سی اردو ڈاٹ کام،لاہور 11 جولائی 2010ء)

میرے اُستاد میرے محسن۔ پروفیسر مبارک احمد عابد

میرے اُستاد میرے محسن میرے دوست ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔وہ علم کا گہوارہ تھے۔وہ علمی گھرانے میں پیدا ہوئے علمی خانوادے میں ہی شادی ہوئی۔ہمسفر بھی خدا کے فضل سے باعلم اور درجنوں صفات والی ملیں۔تدریس میں جب قدم رکھا تو ناصرِ دیں کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔تعلیم الاسلام کالج کی خو ش قسمتی کہیئے کہ ایسے مہذب اور محنتی اساتذہ ملے کہ کالج کو چار چاند لگ گئے۔خاکسار نے 1968 میں اُن سے اردو پڑھا تو ان سے تعارف ہوا۔ان کا پیریڈ بعض اوقات تو میر و غالب کے ایک شعر کی تشریح میں ہی گزر جاتا۔پلک جھپکتے ہی وقت ختم ہو جاتا۔آپ کا مسکراتا چہرہ آج بھی میرے سامنے ہے۔اس قدر پیار اور توجہ سے پڑھاتے کہ ہم ان کے پیریڈ کے شدت سے منتظر رہتے۔اردو پڑھاتے وقت اس رجل رشید کے ہاتھ میں نہ کوئی کتاب، نہ کوئی چٹ ہوتی۔زبانی پڑھائے جاتے۔پانی کی سی روانی تھی ان کے طرز استدلال میں۔ہال میں آتے ہی ایک لمحہ خاموش ایستادہ رہتے تاکہ طلباء کی سر گوشیاں تھم جائیں۔تو پھر پڑھانا شروع کرتے۔شعر کی قرات کچھ اس انداز سے کرتے کہ آدھی تو سمجھ اسی وقت آجاتی۔ہر آن وہ ہمارے دھیان میں رہتے تھے۔جب پڑھاتے تو اردو زبان کے معارف کا دریا بہا دیتے۔انداز بیان سے ہی اشعار کی تفہیم ہو جاتی تھی۔شاعر کا مافی الضمیر بیان کرنے میں عجب کمال رکھتے تھے۔ادب شناسی ان کے خون میں رچی بسی ہوئی تھی۔ہمیں قواعد اردو کی پہچان انہی سے ملی۔چھوٹی چھوٹی باتیں بڑے پیار سے بتایا کرتے تھے۔انہوں نے جاں نثار

شاگردوں کا ایک معقول اور مہذب طبقہ پیدا کیا۔میل جول اور دوستی کو بحال رکھنا ہم نے ان ہی سے سیکھا ہے۔شاگردوں کو دیکھتے ہی خوشی سے مچل جاتے۔سب کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ان کی تحریریں اور لکھی گئی کتب اردو کا شاہکار ہیں۔وہ جہاں بھی گئے ایک داستاں چھوڑ گئے۔اس کالج سے آپ کا تبادلہ بھی کئی جگہ پر ہوا۔وہاں بھی آپ نے کئی یادگار قابل شاگرد چھوڑے ہیں۔دوست بنانے اور اس میں استقلال قائم رکھنے میں بہت ہی خیال رکھتے تھے۔اردو کانفرنسز کا انعقاد بھی ان کی محنت شاقہ کا ایک شاہکار ہیں۔میزبانی میں آپ نے وہ کمال دکھائے کہ سب مہمان آپ کے گرویدہ ہو کر گئے۔احترام،مرتبہ کی پہچان،اور آداب کی ادائیگی میں بھی کمال تھا۔احباب کے دل موہ لینے کے بھی ماہر تھے۔ہم نے کبھی بھی موصوف کو غصے میں نہیں دیکھا۔طلباء کی تعلیم وتربیت،المنار کی تیاری،مشاعروں میں حفظِ مراتب کے مطابق شعراء کو پڑھانا،صورت حال کو کنٹرول کرنا بھی ان کا ایک وصف تھا۔کالج میں کلچرل ایونٹ منعقد کروانا اور ان کو دلچسپ بنانا بھی آپ کا ہی کمال تھا۔تحریر،تقریر اور تدریس میں وہ بلا کے عقیل اور فہیم تھے۔آپ کی تربیت سے درجنوں مقرر تیار ہوئے۔تعلیم الاسلام کالج کے اس زمانے کے مقرر آپ ہی کی تربیت سے ہی فیضیاب ہوتے تھے۔ہمارے کلاس فیلوز لئیق عابد،بشیر طارق،عبدالکریم خالد اور بھی بہت سے بہترین مقرر تیار ہوئے ۔جو ہمیشہ پاکستان کے بین اللکلیاتی مقابلہ جات میں کالج کے لئے فرسٹ کلاس انعامات حاصل کرتے رہے ہیں۔وہ ادب شناس اور ادب آموز نابغہ روزگار تھے،محبتیں تقسیم کرنے والی ، درد بانٹنے والی ہستی تھی۔شفقت پدرانہ اُن کے کردار سے منعکس ہوتی تھی۔اپنے فرائض کی ادائیگی اسقدر تندہی سے انجام دیتے کہ حضرت ناصرؒ دین بھی ان کے معترف ٹھہرے۔ہم نے ان کے کردار میں کوئی لوچ نہیں دیکھی۔مطیع و فرمابردار شاگرد کی طرح ہمیشہ اپنے فرائضِ منصبی کو زندگی بھر بڑی خوش دلی سے نبھایا۔عاجزی اور

خدا ترسی میں کمال متوازن رویہ رکھتے تھے۔ پرویز پروازی صاحب مرحوم ایک فرد نہیں ایک ادارے کا نام ہے۔آج میں ہی نہیں ان کے سب شاگردان کی محبت پر نازاں ہیں۔اطاعت خلافت میں بھی وہ ہمارے لئے ایک مثال تھے۔آپ کا حاصل عمر ''حبل الورید'' قرآن کریم کا اردو ترجمہ (غیر مطبوعہ) ہے۔خودنوشتوں کے تجزیے کا کام آپ نے آخر تک جاری رکھا۔آپ پاکستان سے تیسری ہجرت کے بعد 2003 سے کینیڈا میں مقیم رہے۔آپ بذلہ سنج اور مرنجان مرنج طبیعت کے حامل اور بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔دورِ طالبعلمی سے لے کر آخر عمر تک اپنے دوستوں، قریبیوں اور رشتہ داروں میں ہردلعزیز رہے۔جس محفل میں ہوتے صاحبِ محفل ہوتے۔کالج کے اسٹیج پر ہوتے یا بعد میں کسی تقریب میں آپ کا طرزِ خطابت منفرد ہوتا۔ساتھی طلبہ کو آپ کی ڈیبیٹ کا اچھوتا انداز بہت پسند تھا جس کی وجہ سے آپ جہاں بھی جاتے اور مقابلوں میں حصہ لیتے وہاں سامعین آپ کے منتظر ہوتے۔ آپ بہت ہمدرد اور پیار کرنے والی شخصیت تھے۔دوستوں کے دوست اور غمخوار بھی تھے۔خلافتِ احمدیہ سے ہمیشہ وابستہ رہے اور خوب فیض بھی پایا۔ایسی نستعلیق شخصیت اور نایاب لوگ دیکھنے کو بہت کم ملتے ہیں۔آپ کی وفات کے ساتھ ترقی پسند اردو ادب اور منفرد انداز کا درس وتدریس کا ایک شاندار دور اختتام کو پہنچا۔دنیا بھر میں آپ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔آپ اردو کا گہرا ذوق رکھنے والے قیمتی سرمایہ تھے اس سلسلہ میں آپ کی خدمات یاد رکھی جائیں گی۔آپ کے لواحقین میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے،مغفرت کی چادر میں لپیٹ لے، اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبرِ جمیل سے نوازے۔خاکسار رانا عبدالرزاق خاں ایڈیٹر قندیل ادب انٹرنیشنل لندن کو بھی پروفیسر صاحب مرحوم کا شاگرد ہونے پر فخر ہے۔خدا غریق رحمت کرے عجب آزاد مرد تھا۔خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔آمین۔

پروازی صاحب کی یاد میں

بشیر طارق ۔۔۔سسکٹون کینیڈا

پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد خان پرویز پروازی محض ایک فرد ہی نہیں ایک دبستان علم و ہنر کا عنوان تھے۔ یا یوں کہیئے کہ ایک چلتی پھرتی انجمن اور ادارہ فروغ اردو۔ ایک حربی اصطلاح کو مستعار لیتے ہوئے ہم انہیں One man demolishing squad بھی کہہ سکتے ہیں جو ایک طرف تنگ نظری، جہالت اور تعصب کے خلاف نبرد آزما رہا اور دوسری طرف ہمہ گیر محبت، علم کی روشنی، ترقی پسندانہ سوچ، اعلیٰ انسانی اقدار Inclusivity اور ادبی جواہر پارے بلا تمیز و استثناء اپنوں اور غیروں میں بانٹتا رہا۔ کلاسیکل اور جدید اردو ادب پر ان کو کامل دسترس تھی اور اسکی تعلیم وتدریس کو انہوں نے عظمت کی بلندیوں تک پہنچا دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے نہایت اعلیٰ پائے کا نثری اور شعری ادب تخلیق کر کے عملی طور پر ادب کی اس کھیتی کو اپنے خون جگر سے سیراب کیا۔ یوں وہ صرف ادبی مدرس اور مقلد ہی نہیں ایک نامور ادبی تخلیق کار بھی ٹھہرے جس کی حالیہ مثال خود نوشت سوانح عمریوں پر انکے تنقیدی مضامین ہیں جو پس نوشت کے عنوان سے چار جلدوں پر محیط ہیں۔ ادبی خدمات کے علاوہ وہ بنیادی طور پر ایک استاد Mentor اور گائیڈ تھے جن سے ہزاروں طلباء نے اکتساب فیض کیا جن میں پاکستان کے متعدد شہروں کے طلباء کے علاوہ جاپان اور سویڈن کے طلباء

بھی شامل تھے اور کسی نہ کسی شکل میں یہ سلسلہ ان کے تادم واپسین جاری وساری رہا۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اپنی بھاری بھر کم علمی اور ادبی شخصیت ہونے کے باوجود وہ ایک شگفتہ اور Charming طبیعت کے حامل تھے اور اپنی خوبصورت باتوں اور اپنائیت سے بھرپور Mannerism سے مخاطب کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ خوش شکل، خوش لباس، خوش گفتار اور خوش کردار۔ گویا وہ ہر نوع کی خوبصورتی کا مرقع تھے۔ امتیاز راجیکی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے کہ پروازی صاحب مردانہ وجاہت کا نمونہ اور محفل کی جان تھے۔ ان کے اس Charm offensive کا سب سے زیادہ شکار میرے جیسے ان کے ہزاروں شاگرد ہوتے تھے۔ وہ ایک لبرل سوچ رکھتے تھے اور اپنے عمل سے شاگردوں کو یہ باور کروا دیتے تھے کہ وہ ہر قسم کے غیر ضروری رُعب اور فاصلے کے خلاف ہیں اور استاد اور شاگرد کے درمیان آزادانہ مکالمہ کو پسند کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایسا ایک tool اور حکمت عملی کے تحت کرتے تا کہ ایک آزادانہ فضا میں علم و دانش کے سوتے پروان چڑھیں۔ اور ہم سب نے عملی طور پر اس کا مشاہدہ کیا ان کے شاگردوں میں بہت اعلیٰ پایہ کے شاعر، صحافی اور نثر نگار پیدا ہوئے جو انکی عظمت کی ایک زندہ جاوید مثال ہے۔ مثلاً ہمارے کالج سے داؤد طاہر، مبارک عابد، مجید طاہر، زکریا ورک، طاہر عارف، منور انیس، امتیاز راجیکی، خالد آفاقی، سفیر الحق رامہ، چوہدری نصیر احمد، عاصم صحرائی، عرفان خان، رانا عبدالرزاق خاں اور میرے کلاس فیلو ڈاکٹر عبدالکریم خالد کا نام ذہن میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار اور شاگرد ہیں جو اس علمی و ادبی کہکشاں کے ستارے ہیں جس کی داغ بیل ڈاکٹر پروازی نے ڈالی۔ گزشتہ پروگرام میں گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے ان کے چار شاگرد شامل ہوئے جو سب پی ایچ ڈی اور پروفیسرز ہیں۔ آپ نے

درجنوں شاگردوں کو ایم فل اور پی ایچ ڈی کروائی اور وہ آگے سے درجنوں لوگوں کو پی ایچ ڈی کروا رہے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بطور استاد اور مربی آپ کا اثر اور outreach کس قدر گہری اور کئی نسلوں پر محیط ہے اور یوں ہم اسے ایک معنی میں آفاقی بھی کہہ سکتے ہیں۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں ان سے براہ راست صرف ایف اے کے دو سال یعنی 70-1969 کے دوران ہی پڑھ سکا۔ بی اے کے بقیہ دو سالوں میں بھی میرا ان سے قریبی تعلق رہا۔1972 میں جب میں کالج یونین کا صدر تھا اور یونین کی افتتاحی تقریب تھی تو انہوں نے محمد عارف صاحب چیئرمین پنجاب پبلک سروس کمیشن کو مدعو کیا اور مجھے لاہور ان کو لینے کے لئے بھیجا۔صبح کی گاڑی پر میں لاہور گیا۔واپسی پر پروازی صاحب کی ہدایت کے مطابق میں نے سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ لئے اور بڑے احترام سے انہیں ربوہ لایا جہاں پرنسپل صاحب کی کوٹھی پر انکی رہائش کا انتظام تھا اور صبح انہوں نے کالج ہال میں یونین کی تقریب سے خطاب کیا۔میرا پوائینٹ یہ ہے کہ وہ طلباء کو نمایاں کرتے اور خود پس منظر میں رہ کر ان کی راہنمائی کرتے تا کہ ان کی عملی تربیت ہو کہ کیسے اعلیٰ شخصیات کو deal کرنا ہے اور ان کے پروٹوکول کے معاملات کو ہینڈل کرنا ہے۔

اب کچھ بات ان کے شہرۂ آفاق لیکچرز کے بارہ میں ہو جائے۔فرسٹ ایئر میں ہماری اردو شاعری کی کتاب کا غالباً پہلا chapter میر تقی میر کی شاعری سے متعلق تھا جس کو وہ بڑے چاؤ اور رکھ رکھاؤ سے پڑھاتے اور ان کے اشعار کی نت نئی تشریح کرتے۔خاص طور پر یہ غزل اور اس کے تین اشعار مجھے یاد ہیں جن پر وہ بہت وقت صرف کرتے اور ہمارے دل و دماغ کی کھڑکیاں روشن

ہو جاتیں۔

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میؔر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

اسی طرح میر کا ایک اور شعر مجھے یاد ہے کہ ہمیں سمجھ نہیں آتا تھا اور جس کی تشریح وتوضیح انہوں نے بڑے اچھوتے اور خوبصورت انداز میں کی اور وہ شعر تھا۔

سرہانے میؔر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

اپنے لیکچرز کے دوران کسی نقطہ کو واضح کرنے کیلئے وہ یہ شعر اکثر پڑھتے۔

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

ایک اور خوبصورت شعر جو میں نے ان سے بارہا سنا کہ

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار	جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

ہجو گوئی اور ایک نوع کی عامیانہ شاعری کی روایت بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی اردو شاعری کی اور اس سے بڑے بڑے اساتذہ بھی مستثنیٰ نہیں۔ پروازی صاحب نے اس سے بھی ہمیں

روشناس کرایا۔ وہ اکثر یہ شعر پڑھتے ۔

میں باز آیا محبت سے ۔۔۔اُٹھا لو پاندان اپنا

یا میر کا مشہور شعر جس کا پہلا مصرعہ ہے ’’میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب‘‘

چنانچہ ان کا لیکچر جس سے ہمارا دن شروع ہوتا ایک دلچسپ اور پر لطف تاثر لئے ختم ہوتا جو ہمیں تمام دن تر و تازہ رکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا پیریڈ ہر طرح سے Tension Free ہوتا اور لوگ جوق در جوق اس میں شامل ہوتے ۔ پروازی صاحب کی یادیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ سچ بات تو یہ ہے بقول چوہدری نصیر احمد اردو ادب میں ہماری دلچسپی کا سہرا انہی کے نام ہے۔ 2006 میں خاکسار اپنی اہلیہ مرحومہ کے ہمراہ ٹورانٹو گیا وہاں نسیم مہدی مرحوم نے ہمیں کھانے پر مدعو کیا اور پروازی صاحب سے بذریعہ فون میری بات کروائی۔ جو ان دنوں علیل تھے۔ بڑے خوش ہوئے اور دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے انہوں نے نسیم مہدی مرحوم سے کہا کہ وہ ان کی کتابیں مجھے تحفہ کے طور پر دیں چنانچہ نسیم مہدی صاحب نے مجھے ان کی کتابیں احمدیہ کلچر اور چوہدری ظفر اللہ خان صاحب سے متعلق دو کتابیں دیں جو میرے لئے ایک اعزاز سے کم نہ تھا کہ ایک بلند پایہ استاد اپنی تصنیف کردہ کتابیں اپنے ایک نالائق شاگرد کو بطور تحفہ عنایت کر رہا ہے۔

1989 ـ90 میں پروازی صاحب گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں تعینات تھے اور روزانہ ربوہ سے فیصل آباد آتے جاتے تھے۔ میں بھی حبیب بینک فیصل آباد میں کام کرتا تھا اور روزانہ فیصل آباد کا سفر کرتا۔ اکثر اوقات پروازی صاحب ربوہ کے اڈہ پر بس کے انتظار میں کھڑے ہوتے اور میں وہاں سے گزرتے ہوئے فوراً ان کو اپنی کار میں بیٹھنے کی درخواست کرتا جسے وہ بخوشی قبول کر لیتے جس پر میں بے حد خوش ہوتا۔ سفر کے دوران وہ علم و حکمت کے موتی بکھیرتے اور مجھے لگتا کہ وہی فرسٹ ایئر کا پہلا

پیریڈ شروع ہو گیا ہے۔ میں ان سے طرح طرح کے سوال کرتا۔ مختلف شعراء کے بارہ میں ان سے پوچھتا اور وہ دلچسپ واقعات سناتے۔ اپنے ہم عصر ادبی لوگوں کے علاوہ اپنے اساتذہ کا ذکر بڑے احترام سے کرتے۔ لاہور کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے ادیب سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ احسان دانش، عابد علی عابد، ڈاکٹر ارادت حسین اور اپنے محترم استاد سید وقار عظیم کا ذکر اور ان سے جڑے واقعات بیان کرتے جس سے ہم بہت محظوظ ہوتے۔ میں نے ہم اس لئے کہا ہے کہ میرے دوست اور سینئر کولیگ میاں اسحاق مرحوم بھی اکثر میرے ساتھ ہوتے۔ کچھ واقعات کالج سے متعلق ہوتے جن میں حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کا ذکر بطور پرنسپل اور کبھی خلیفۃ المسیح الثالث ہوتا جو ہمارے لئے از دیاد ایمان کا باعث بنتا۔

حقیقت یہ ہے کہ محترم پروازی صاحب ربوہ اور خصوصاً لاہور کی ادبی دنیا کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے ٹی آئی کالج میں دو اردو کانفرنسیں منعقد کروا کے یہ ثابت کیا کہ لاہور کے علاوہ کراچی سے پشاور تک ادیبوں اور اہل علم تک انکی رسائی ہے۔ وہ ایک عظیم تہذیب اور اُخوت و بھائی چارے کی علامت تھے اور انہوں نے ہم طلباء کی کئی نسلوں اور اہل ربوہ کو عمومی طور پر اس ادبی اور علمی تہذیب سے بہرہ مند کیا جو ان کا ہم سب پر احسان عظیم ہے۔ میں درد دل کے ساتھ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو اور ان کے اہل و عیال کا خود کفیل اور نگران ہو جائے۔ آمین اللھم آمین۔

کچھ ایسے بھی اُٹھ جائیں گے
اس بزم سے جن کو تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے۔

(یہ مضموں محترم عرفان خان صاحب کے زوم پروگرام میں پڑھا گیا۔)

اپنے استاد ڈاکٹر پرویز پروازی کی یاد میں

ناصر عباس نیّر

دو دن پہلے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر پرویز پروازی بھی رخصت ہوئے۔ وہ سویڈن میں ایک خاموش زندگی بسر کر رہے تھے۔ خاموشی سے چلے گئے۔ ان کے جانے کی اطلاع بھی کوئی ایک ہفتہ بعد ملی۔ڈاکٹر پروین کلو ایم اے میں میری کلاس فیلو رہی ہیں، اسی نے مجھے یہ افسوس ناک خبر سنائی۔

مجھے تقدیر گورنمنٹ کالج فیصل آباد لے گئی تھی۔تب اسے یونیورسٹی کا درجہ نہیں ملا تھا۔ میں اور بہت کچھ کرنے کا عزم رکھتا تھا، ایم اے اردو کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔اردو میں افسانے لکھا کرتا تھا جو اس زمانے کے کچھ مقبول عام رسائل میں شائع بھی ہوا کرتے تھے۔ کچھ دوسری نثری تحریریں بھی لکھی تھیں، مگر ایم اے اردو میں جانے کا دور دور تک خیال نہیں تھا۔میں سائنس کا طالب علم رہا تھا اور اسی کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔لیکن کچھ واقعات اس تیزی سے رونما ہوئے کہ مجھے ایم اے اردو میں داخلہ لینا پڑا اور لاہور کے بجائے فیصل آباد میں۔

ڈاکٹر پرویز پروازی نے سال اوّل میں تاریخ کا پرچہ پڑھایا۔ یہ سب سے مشکل پرچہ تھا۔شاید اسی لیے انھیں دیا گیا تھا۔ان کے علاوہ چار اور اساتذہ ہمیں پڑھاتے تھے۔دو کلاسوں میں تو ایک ایک پل کاٹنا، پہاڑ کاٹنے کے مترادف ہوتا۔ وہ تشریف لاتے، اپنے رجسٹر کھولتے اور لکھوانا شروع کر دیتے۔ میں نے کبھی ایک لفظ نہیں لکھا۔بس سر جھکائے، نوٹ بک گود میں رکھے، کچھ لکیریں کھینچتا رہتا یا خود کو کوستا رہتا یا غنودگی میں چلا جاتا۔پہلی نشستوں پر چونکہ لڑکیاں ہوتیں، اس لیے دونوں

اساتذہ کو میری حالت کی خبر نہ ہو پاتی۔

دوسروں کا پتا نہیں، مگر مجھے پروازی صاحب کی کلاس کا انتظار رہتا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ باقی اساتذہ اردو ادب ہی نہیں، خود تعلیمی عمل سے بے رغبتی کا سبب تھے۔ پروازی صاحب ان سب کی تلافی تھے۔

وہ اپنے ساتھ کئی کتابیں اٹھا کر لاتے۔ پہلے موضوع کا تعارف کرواتے۔ پھر اس کی وضاحت کرتے اور ضرورت پڑنے پر متعلقہ کتب سے اقتباس پڑھتے۔ وہ درست معلومات کے ساتھ ساتھ ادب سے متعلق بصیرت بھی بہم پہنچاتے جاتے۔ ادب مسرت اور بصیرت، لذت اور روشنی بہ یک وقت بہم پہنچاتا ہے۔ یہ سچائی، ان کے ایک ایک جملے سے پھوٹی پڑتی۔ وہ ادب پڑھاتے ہوئے، ادب کی روح نہیں کچلتے تھے۔ یعنی وعظ و نصیحت نہیں کرتے تھے۔ ان کی آواز گرج دار تھی، لہجہ نستعلیق تھا اور عمومی رویہ نہایت ہمدردانہ اور مشفقانہ تھا۔ اسی کالج میں پہلی بار یہ انکشاف بھی ہوا تھا کہ ایک استاد، طالب علم کا سچا خیر خواہ ہوسکتا ہے تو دوسری طرف کوئی دوسرا استاد اس کا پکا حریف بھی ہوسکتا ہے اور اس کے درپے بھی! اور یہ سلسلہ کئی برسوں تک بھی چل سکتا ہے۔

پروازی صاحب کا کمرہ ہر وقت طلبا و طالبات سے بھرا رہتا۔ وہ صرف ادب پر گفتگو کیا کرتے۔ وہ اپنے ہر طالب علم کا باقاعدہ استقبال کیا کرتے۔ کھڑے ہو جایا کرتے۔ ہم سب شرمندہ بھی ہوتے اور تفاخر بھی محسوس کرتے۔ اس عمر کا تفاخر، بعد کے اعتماد میں بدل جایا کرتا ہے۔ یہ بعد میں معلوم ہوا۔ میں نے ایک دن کہا کہ میں نے ایک تحریر لکھی ہے۔ اگلے دن دکھائی۔ کہنے لگے کہ یہ تو انشائیہ ہے۔ ان کے کہنے پر اسے اوراق میں بھیج دیا۔ چند مہینوں بعد کہنے لگے: مبارک ہو۔ تمھارا انشائیہ اوراق میں چھپ گیا ہے۔ وہ مجھے حاتم بھٹی کی دکان پر لے گئے۔ وہاں اور رسائل کے ساتھ اوراق کا تازہ شمارہ (

جون ۱۹۸۹ء) بھی موجود تھا۔جس صفحے پرانشائیہ چھپا تھا،اسے کھول کر مجھے اور وہاں موجود باقی لوگوں کو دکھایا۔وہ بہت خوش تھے۔انھوں نے میری کامیابی کا جشن منایا۔بعد میں میری ادبی زندگی،جو بھی ہے،اس میں اس ایک دن کا اہم کردار ہے۔مجھے تنقید کی طرف راغب کرنے میں ڈاکٹر احسن زیدی اوران کا کردار ہے۔اوراق اور آغا صاحب سے تعلق کی بنیاد پروازی صاحب ہی نے رکھی۔

ہم صرف ایک سال ہی ان سے پڑھ سکے۔سال دوم میں پہنچے تو پتا چلا کہ ان کا تبادلہ ہو گیا ہے۔وہ جلد ہی یورپ منتقل ہو گئے۔کافی عرصہ اپسالا یونیورسٹی سویڈن سے منسلک رہے۔اکثر طالب علم صدمے میں تھے۔کچھ کرید نے پر معلوم ہوا کہ ان کی مقبولیت ہی ان کی دشمن ثابت ہوئی۔مذہبی بنیاد پر انھیں اذیت دے کر وہاں سے جانے پر مجبور کیا گیا۔جن لوگوں نے یہ سب کیا،وہ بھی اساتذہ تھے،پنج وقتہ نمازی تھے اور کل وقتی تعلیمی سیاست کا حصہ تھے،مگر طلبا کے لیے نہایت سخت گیر تھے۔مجھے یاد ہے کہ کئی طالبات ان کی کلاسوں میں باقاعدہ رو دیا کرتی تھیں۔

پروازی صاحب،جن کا اصل نام،ناصر احمد خاں تھا،نے اردو افسانے پر پی ایچ ڈی کی تھی۔انھوں نے زیادہ نہیں لکھا۔ایک مختصر ناول لکھا تھا اور خودنوشتوں کے تنقیدی جائزے لکھے تھے۔پس نوشت اور پسِ پس نوشت کے عنوان سے کتاب شایع ہوئی۔اس کتاب میں ایک سو باون خودنوشتوں کا جائزہ شامل ہے۔جن دنوں جاپان رہے تھے،ہائیکو کے تراجم کیے تھے،اوران پر لکھا بھی تھا۔

مشہور ادیب داؤد رہبر کا تبصرہ

حصہ دوم کے دیباچے کے عوض ڈاکٹر داؤد رہبر کے دو خط

پس نوشت چھپنے کے بعد

فلوریڈا

کرم فرما مکرم ڈاکٹر پروازی صاحب

السلام علیکم۔ پس نوشت کا تحفہ موصول ہوا۔ میں نے بہت دلچسپی کے ساتھ اسے دو تین بار پڑھا۔ آپ بیتیوں کا مجھے خاص شوق ہے۔ آپ کی تصنیف میں بہت سی ایسی کتابوں کا ذکر ہے جو میری نظر سے نہیں گزریں۔ اسے پڑھ کر میری معلومات میں اضافہ ہوا۔

تین اہم آپ بیتیوں کا آپ نے ذکر نہیں کیا۔

ذکر میر۔ میر تقی میر اس کا ترجمہ اردو میں دستیاب ہے۔

خاطرات از ظفر حسن آئبیک　　　　نامۂ اعمال از سر محمد یامین خاں

آئیڈیل آپ بیتی کا معیار آپ کے ہاں بہت بلند ہے چنانچہ کم ہی ایسی آپ بیتیاں ہیں جو آپ کی کسوٹی پر پوری اتری ہیں۔ اختر حسین رائے پوری، اختر الایمان، ادا جعفری، ڈاکٹر وزیر آغا، حمید نسیم اور حمیدہ اختر حسین کی خود نوشتوں کو آپ نے پسند کیا۔ چوہدری ظفر اللہ خاں اور سر رضا علی کی بھی تعریف کی ہے۔ یہ دو تو بڑے بزرگ ہیں اور ان کے اسلوب بھی پختہ ہیں۔ چوہدری صاحب کی نثر ستھری اور عمدہ ہے چہل اور بذلہ سنجی کی باتیں اس میں نہیں ہیں۔ البتہ ولولۂ پیہم ہے، سر رضا علی علیگ برادری کے آدمی ہیں ان کا دبستان اور ہے۔

دکھی قلمکار کی آپ بیتی صرف یادنویسی نہیں ہوتی فریادنویسی بھی ہوتی ہے۔فریاد کی کوئی لے نہیں ہوتی۔ نالہ کو اگر پابند نے کیا گیا تو اسے مئے کی ضرورت پڑے گی۔ لکھنے والا کہتا ہے دیکھو مجھ پر کیا بیتی۔اس کی مثال کشور ناہید کی آپ بیتی ہے۔آپ بیتی جس عمر میں بھی بے طرح کسی کا جی چاہے تو وہ اسے لکھنے کو بڑھاپے کی آمد پر کیوں اٹھا رکھے۔قمری اور بلبل اپنا نالہ ملتوی کیسے کریں۔ جز نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے۔جنگل کی کسی ٹہنی پر بیٹھا ہوا کوئی پرندہ صدا زن ہوتا ہے تو اس کا روئے سخن حلقہ ارباب ذوق کی طرف نہیں ہوتا۔ یہ صدائے بیکسی اس امید پر ہوتی ہے کہ کوئی ہم نفس جاندار صدا سن کر ہم سفر ہو جائے اور تنہائی تھوڑی دیر کے لیے دور ہو جائے۔

صداقت کا فرض مؤرخین پر عاید ہوتا ہے۔آپ بیتی لکھنے والوں میں مؤرخ سب نہیں ہوتے۔ آپ بیتی میں صداقت کی کمی ہو تو اسے معاف کر دینا چاہئے۔حیوانِ ملبوس اور سوانگ لازم وملزوم ہیں۔ ینگ نے کہیں لکھا ہے کم ازکم ایک خاص اور بڑا راز اپنے اعمال کا اپنے تک ہی رکھو اور راز داں کو بھی اس میں شریک نہ کرو تو اس سے تمہیں طاقت حاصل رہے گی۔

آپ بیتی لکھنے والوں کے اخفا سے میں تو محظوظ ہوتا ہوں اس لئے کہ میں خود آپ بیتی لکھوں تو اخفا میرا پیچھا نہ چھوڑے گا۔مولانا حالی فرما گئے ہیں

تھے لب پئے اظہار پر اب آ کے کھلا ہے

انسان کو اخفا کے لئے نطق ملا ہے

کوئل کی صدا ہوتی ہے کُوک۔ کبوتر کی غٹرغوں، فاختہ کی کُوکُو، اور پپیہے کی پیو پیو اور کوے کی کاؤں کاؤں۔کوے سے یہ کہنا بے سود ہے کہ کوے جا کسی استاد سے سر لگانا سیکھ۔مولوی نذیر احمد نے اپنے کسی ناول کے اخیر میں ایک ترکیب بند کہہ کر طبع آزمائی کی ہے۔اس کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

طوطی چمن میں ایک ہے کوے ہزار ہیں گر لاکھ میں تو لاکھ میں نوے ہزار ہیں

اگلے وقتوں میں اپنی تصنیف کی طباعت سے پہلے مصنف معاصر بزرگوں سے تقریظیں لکھوایا کرتے تھے اور تقریظ تعارف اور حوصلہ افزائی کے پیرائے میں ہوتی تھی اور دعائے خیر پر ختم ہوتی تھی۔ آپ کے مشاہدات معروفیت اور معقولیت کی راہ سے ہیں۔ میں...... سے رحم دلی اور دعائے خیر کی امید بھی رکھتا ہوں

للہ ہم پہ حملۂ نقد و نظر نہ ہو! ٹپکا ہے جو زبان سے خونِ جگر ہے یہ

زندگی کٹھن چیز ہے۔ متنفس دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے آٹھ نو گھنٹے سوتا ہے پندرہ سولہ گھنٹے جاگتا ہے۔ بیداری کے گھنٹوں میں جھمیلوں سے نپٹتا ہے پھر آپ بیتی لکھتا ہے۔ بہت سے کلاکار برسوں ریاض کرتے ہیں۔ پھر گاتے بجاتے ہیں تو امید رکھتے ہیں کوئی کہہ دے واہ! نادار لیکن مہمان نواز میزبان معمولی روٹی سے مہمان کی تواضع کرے اور مہمان معروفیت کے ساتھ کہہ دے یہ سالن کچھ ایسا اچھا نہیں میں نے اس سے بہتر سالن اپنی زندگی میں کھائے ہیں تو ہر چند مہمان کی طرف سے یہ تبصرہ صداقت پر مبنی ہے لیکن اسے رحم دلی نہیں کہہ سکتے۔

آپ بیتی لکھنے والے رادھا کے ہم نوا ہو کر گاتے ہیں ''میری سنو شام''!

جناب عبدالوہاب خاں سلیم نے مجھے بتایا کہ آج کل آپ کچھ علیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی تندرستی برقرار رکھے۔

آپ کے افادات کا قدردان

داؤد رہبر

ایک نابغۂ روزگار شخصیّت

محترم پروفیسر ناصر احمد پرویز پروازی

محمد کولمبس خاں ایڈووکیٹ ۔ جرمنی

خاکسار نے جون 1965 میں تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لیا تھا اور پھر سلسلہ جاری نہ رہ سکا البتہ فروری 1966 میں مستقل ربوہ منتقلی کے بعد کالج اور فضل عمر ہوسٹل میں روزانہ کی آمدورفت رہی۔ کالج میں ہونے والی عملی ادبی اور ورزشی سرگرمیوں سے باقاعدہ استفادہ کرتا رہا۔ اسی طرح اساتذہ کرام سے بھی نیازمندی کا تعلق تھا۔ ان دنوں اساتذہ کے احترام کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ بعض طلباء انہیں آتے ہوئے دیکھ کر ادھر ادھر ہو جایا کرتے البتہ پروازی صاحب کی طرف کھنچے جاتے تھے۔

محترم پروازی صاحب ایک بڑی متحرک شخصیت تھے جو اپنی بے تکلف رواداری کی بدولت طلباء میں بہت مقبول تھے۔ ادبی پروگراموں کے علاوہ سماجی تعلقات کے معاملہ میں بڑے متحرک تھے۔ انہوں نے ایک طرف ملک کے نامور انتظامی افسران اور ماہرین تعلیم کے ساتھ اچھے روابط بنا رکھے تھے تو دوسری طرف آپ طلباء کی دوسرے تعلیمی اداروں کے مقابلہ جات میں کثرت سے شمولیت کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اس دور کے طلباء کے گھروں میں خاکسار نے جیتے ہوئے میڈلز اور کپوں کی بھرمار دیکھی ہے۔ پروازی صاحب طالب علموں کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ ان کو گھڑتے بھی تھے اور انکے شاگرد دنیا بھر میں ان سے آخری دم تک بڑی محبت سے اپنی وابستگی کا دم بھرتے رہے ہیں۔

پروازی صاحب کا کلام پہلے پہل الفضل میں چھپنے لگا پھر المنار جو تعلیم الاسلام کالج کے میگزین جس کے وہ انچارج بھی تھے اس میں باقاعدگی سے چھپنے لگا۔آپ شاعر ہی نہیں بلکہ شاعر گر بھی تھے۔آپ کے ایک شاگرد مکرم مبارک احمد صاحب عابدؔ جو آجکل کینیڈا میں ہیں انکی نظم۔

ہم بچھڑ جائیں گے

میرے پیشِ نظر، اے میرے ہمسفر ہے یہی ایک غم، ہم بچھڑ جائیں گے
میری افسُردگی، دیکھ کر ہر گھڑی، کہتی ہے چشمِ نَم، ہم بچھڑ جائیں گے
آنسوؤں میں میری عُمر بہہ جائے گی، تُم چلے جاؤ گے، یاد رہ جائے گی
تُم نے یہ کَیا کِیا، مجھ کو بتلا دیا، کُچھ دنوں میں صنم ہم بچھڑ جائیں گے

کالج ہال میں سنائی گئی تو اس وقت دلوں میں پیدا ہونے والی کیفیت اب بھی محسوس ہوتی ہے۔ پروازی صاحب بظاہر لبرل لگتے تھے لیکن دین کے معاملہ میں بڑے غیور تھے اور ان کے غیر از جماعت دوست اس امر سے بخوبی آگاہ تھے۔وہ دَور بھی قدرے رواداری کا دور تھا اور دیگر تعلیمی اداروں کے پرنسپل اور پروفیسر ربوہ آنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتے تھے۔آجکل تو لمز لاہور کے طلباء کے ایک گروپ ک ربوہ وزٹ پر بعض بنیاد پرستوں کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگتے ہیں۔

پروازی صاحب کی ایک تحریر المنار جون 1954 میں بطور ایڈیٹر انہوں نے بعنوان ’’احساس فرض‘‘ رقم کی،آج بھی پڑھنے اور عمل در آمد کے لائق ہے:

’’دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انسان کی بتدریج ترقی انسانوں کی مختلف اوقات میں مختلف کوششوں کی رہین منت رہی ہے۔ ہر زمانے کے مفکرین نے اپنے زمانے کے لحاظ سے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انسانوں کو ایک نئی ڈگر پر گامزن کر کے چند دھندلی منزلوں کے

سراغ دیئے اور پھران کے بعد آنیوالے لوگوں نے ان خیالی منزلوں کو حقیقی منازل کے روپ میں بدل دیا اور پھر نئے لوگوں کو نئی راہیں اور نئے راستے دکھائے۔اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری وساری ہے۔ ایک قوم اپنی انتہائی ترقی کے باوجود ایک منزل تک پہنچی۔لیکن دوسری قوم نے اس منزل سے اپنی زندگی کی جدوجہد شروع کی جس منزل کو اس سے پہلی قوم نے انتہائی عروج کی منزل قرار دیا تھا۔

انسانی جدوجہد نے ہی آج ہمیں پتھر اور دھات کے زمانہ سے نکال کر ایٹم کے زمانہ میں لا کھڑا کیا ہے اور آج ہم اس زمانہ کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔غرض انسانی جدوجہد اور کوشش اور سعی کا یہ میٹھا پھل ہمارے سامنے ہے اور ہم اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

جس طرح انسانی ترقی انسانی جدوجہد کی رہین منت ہے اسی طرح انسانی جدوجہد احساس فرض کی زیر بار ہے۔اگر ہمارے آباءاپنے قلوب میں اس عظیم احساس کو پیدا نہ کرتے کہ انسانیت کی ترقی ان کی جد وجہد کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی تو آج ہم اسی فرسودہ نظام میں جکڑے ہوئے ہوتے۔اس ترقی یافتہ دور میں جب ہم اپنے گردو پیش پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمارے دل میں اور زیادہ ترقی کرنے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔غرض ہمارے دل اب بھی اس ترقی پر مطمئن نہیں ہیں اور ایک انجانی منزل کے لئے بیتاب ہیں ۔ہم اس مثالی (ideal) منزل کو اسی صورت میں حاصل کر سکتے ہیں۔کہ ہم اپنے قلوب میں احساس فرض پیدا کریں۔اگر ہمارے دلوں میں فرض شناسی کا جذبہ پیدا ہوجائے تو دنیا کی کوئی طاقت ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی اور ہم بہت جلد دنیا کو امن اور خوشحالی کا گہوارہ بنا سکتے ہیں۔‘‘

پروازی صاحب نے اردو زبان کی جو خدمت انجام دی ہے یہ اردو کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔اردو کانفرنسوں کا ایک سلسلہ پروازی صاحب نے شروع کیا تھا جس کا حالات نے رخ موڑ دیا۔البتہ آپ کا پیدا کردہ جذبہ دنیا بھر میں اردو کی خدمت میں مصروف ہے۔

آپ کو تعلیم الاسلام کالج سے ہجرت اختیار کرنی پڑی۔ پاکستان سے جاپان، کمالیہ، سویڈن سے ہوتے ہوئے کینیڈا کی سرزمین میں اردو کے کھیت کی سیرابی کرتے اپنے چاہنے والوں کو غمگین چھوڑ کر لیکن اردو کے مقام کو بلندی عطا کرتے ہوئے آپ نے اس جہانِ فانی کو ستمبر 2023 میں الوداع کہہ دیا۔

بلانے والا ہے سب سے پیارا	اسی پہ اے دل تو جاں فدا کر

پروفیسر ناصر احمد پرویز پروازی

چیف سید معین شاہ

علم، ادب اور خلوص کا درخشاں چراغ

کسی بھی قوم کی ترقی کا راز تعلیم میں پوشیدہ ہوتا ہے اور تعلیم کی روح اساتذہ کے کردار اور اخلاص میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ معاشرے زیادہ ترقی کرتے ہیں جہاں اساتذہ کو عزت و وقار حاصل ہوتا ہے اور جہاں استاد اپنے علم کے ساتھ ساتھ اپنے کردار سے بھی طلبہ کی راہنمائی کرتے ہیں۔ ایسے ہی باوقار اور باکمال اساتذہ میں ایک نام پروفیسر ناصر احمد پروازی صاحب کا ہے جنہوں نے اپنی علمی، ادبی بصیرت اور بلند اخلاق کے ذریعہ نہ صرف اپنے شاگردوں کے دلوں میں جگہ بنائی بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں اردو زبان و ادب کی خدمت کا فریضہ بھی سرانجام دیا۔

1963ء میں جب میں نے تعلیم الاسلام کالج میں F.S.C میں داخلہ لیا تو اس زمانہ میں سائنس کے مضامین کے ساتھ ساتھ انگریزی اور اردو پڑھنا بھی لازمی تھا۔ اردو کی تدریس کے لئے کالج میں جس شخصیت کو مقرر کیا گیا وہ پروفیسر ناصر احمد صاحب پروازی تھے۔ اس زمانے کا تعلیمی ماحول سادگی،

سنجیدگی اور احترام سے بھرپور ہوا کرتا تھا۔طلبہ اپنے اساتذہ کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اساتذہ بھی پوری دیانتداری سے اپنے فرائض ادا کرتے تھے۔ جب پہلی مرتبہ ہم نے پروازی صاحب کا لیکچر سنا تو فوراً محسوس ہوا کہ ہم ایک غیر معمولی استاد کے سامنے بیٹھے ہیں۔ان کی گفتگو میں وقار، لہجے میں شائستگی اور اندازِ بیان میں ایک خاص دلکشی تھی جو طلبہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔

پروفیسر ناصر احمد صاحب پروازی کا اندازِ تدریس واقعی منفرد تھا۔وہ اکثر کھڑے ہو کر پورے اعتماد کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مسلسل لیکچر دیتے اور طلبہ خاموشی اور انہماک کے ساتھ انہیں سنتے رہتے۔ان کے لیکچرز میں نہ کوئی بناوٹ ہوتی تھی اور نہ ہی خشک پن۔وہ جس موضوع پر بات کرتے اس کی تہہ تک پہنچ جاتے اور طلباء کو اس کا مفہوم اس انداز میں سمجھاتے کہ بات دل و دماغ میں نقش ہو جاتی۔ وہ صرف کتابی عبارت نہیں پڑھاتے تھے بلکہ اس کے پس منظر اور اس کے ادبی حسن اور اس کے فکری پہلوؤں کو بھی واضح کرتے تھے۔اس لیئے ان کے لیکچرز طلبہ کے لیئے صرف ایک تعلیمی سرگرمی نہیں بلکہ ایک علمی و ادبی تجربہ بن جاتے تھے۔

پروفیسر ناصر احمد صاحب پروازی اردو زبان کے سچے عاشق تھے۔وہ سمجھتے تھے کہ زبان صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ تہذیب، تاریخ اور ثقافت کی نمائندہ ہوتی ہے۔وہ طلباء کو اردو ادب کی خوبصورتی سے روشناس کراتے اور شعراء کے اشعار کی تشریح اس انداز میں کرتے کہ طلباء کے دلوں میں زبان و ادب کے لئے ایک نئی محبت پیدا ہو جاتی۔ان کی گفتگو میں ادبی چاشنی اور فکری گہرائی نمایاں ہوتی تھی۔ پروفیسر ناصر احمد پروازی کا یقین تھا کہ تعلیم کا اصل مقصد صرف امتحان میں کامیابی حاصل کرنا نہیں بلکہ ایک اچھا انسان بننا ہے۔ اس لیے وہ اپنے لیکچرز میں اکثر اخلاقی اقدار، محنت، دیانتداری کے موضوعات پر بھی گفتگو کرتے تھے۔ان کی باتیں طلبہ کے دلوں میں گہرا اثر چھوڑتی تھیں اور انہیں زندگی کے صحیح راستے کی طرف راہنمائی فراہم کرتی تھیں۔

ان کی محنت اور خلوص کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے پڑھائے ہوئے طلبہ امتحانات میں بہترین نتائج حاصل کرتے۔ اردو کا مضمون جسے طلبہ خشک اور مشکل سمجھتے تھے، ان کی تدریس کے باعث نہایت آسان اور دلچسپ محسوس ہوتا تھا۔ بورڈ کے امتحانات میں اکثر طلبہ اچھے اور نمایاں نمبروں سے کامیاب ہوتے۔ یہ کامیابی دراصل ان کی بہترین تدریسی صلاحیتوں کا ثبوت تھیں۔

پروفیسر ناصر احمد پروازی صرف ایک قابل استاد ہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب اور شاعر بھی تھے۔ ان کے خیالات میں وسعت اور احساسات میں لطافت تھی۔ وہ اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے تھے اور اپنی گفتگو میں ادبی مثالوں اور اشعار کے ذریعہ موضوع کو زیادہ دلنشین بنا دیتے تھے۔ ان کی شخصیت علم و ادب کا ایک حسین امتزاج تھی۔ علم کے میدان میں ترقی کے لیے مستقل مزاجی اور محنت ضروری ہوتی ہے۔ محترم پروازی صاحب نے بھی اس جذبے کے ساتھ اپنی علمی جدو جہد جاری رکھی، انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور بالآخر پی۔ ایچ ڈی (PhD) کی ڈگری حاصل کی۔ اس کامیابی نے انہیں تعلیمی حلقوں میں ایک ممتاز مقام عطا کیا۔ ان کی علمی قابلیت اور ادبی مقام کو دیکھتے ہوئے انہیں جاپان کی ایک یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر کے طور پر مقرر کیا گیا۔

جاپان میں انہوں نے نہایت محنت اور اخلاص کے ساتھ اردو زبان و ادب کی تدریس کی۔ جاپانی طلبہ کے لئے اردو زبان ایک نئی دنیا کی طرح تھی اور پروازی صاحب نے انہیں اس دنیا سے روشناس کروایا۔ انہوں نے نہ صرف زبان سکھائی بلکہ برصغیر کی تہذیب، تاریخ اور ادبی روایت سے بھی متعارف کر دیا۔ ان کی محنت اور خلوص کے باعث وہ جاپان میں بھی ایک قابل احترام علمی شخصیت کے طور پر جانے گئے۔ جاپان میں اپنی کامیاب تدریسی خدمات کے بعد انہیں ایک اور اعزاز حاصل ہوا۔ انہیں سویڈن میں بھی اردو زبان پڑھانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ ان کی علمی صلاحیتوں اور عالمی سطح پر ان کے اعتراف کا واضح ثبوت ہے۔ سویڈن میں بھی انہوں نے اردو زبان و ادب کی ترویج کے لئے

بڑی محنت کی۔ وہاں طلبہ کو اردو زبان سے روشناس کرانا اور انہیں برصغیر کی ادبی روایت سے آگاہ کرنا ایک اہم علمی خدمت تھی۔ یوں انہوں نے یورپ میں بھی اردو زبان کی شمع روشن رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ان کی یہ خدمات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو زبان کی خوشبو سرحدوں کی پابند نہیں بلکہ دنیا کے مختلف خطوں تک پہنچ سکتی ہے۔

ایک استاد کی اصل کامیابی اس کے شاگردوں کی زندگیوں میں نظر آتی ہے۔ پروفیسر پروازی کے شاگرد دنیا کے مختلف شعبوں میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ میری اپنی زندگی بھی ان کے اثر سے خالی نہیں رہی۔اگرچہ میں نے دو سال کے بعد اردو کا مضمون چھوڑ دیا تھا مگر ان کی دی ہوئی علمی بنیاد اور زبان سے محبت ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔اس اثر کا نتیجہ ہے کہ میرے اندر بھی اردو میں لکھنے اور شاعری کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ ہماری تہذیب اور مذہبی روایات میں استاد کا مقام بہت بلند ہے۔ استاد وہ شخصیت ہے جو انسان کے ذہن کو علم کی روشنی سے منور کرتی ہے اور اس کے کردار کو سنوارتی ہے۔ ایک اچھا استاد دراصل قوم کے مستقبل کا معیار ہوتا ہے۔

پروفیسر ناصر احمد پروازی انہی عظیم اساتذہ میں سے تھے جنہوں نے اپنی زندگی علم، ادب اور انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔آج جب ہم اپنے تعلیمی سفر پر نظر ڈالتے ہیں تو کچھ اساتذہ کی یادیں دل میں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ پروفیسر پروازی صاحب بھی ایسی ہی قابل احترام شخصیت تھے۔ وہ ایک عظیم استاد، باکمال ادیب اور باوقار انسان تھے۔ان کی شخصیت علم، ادب اور اخلاق کا حسین مزاج تھی۔ان کی زندگی ہمیں یہ سبق سکھاتی ہے کہ ایک سچا استاد صرف سبق پڑھانے والا نہیں بلکہ ایک ایسی شمع ہے جو اپنے شاگردوں کے دلوں میں علم کی روشنی پیدا کرتی ہے اور اس روشنی سے آنے والی نسلیں بھی منور ہوتی رہتی ہیں۔اور یہی روشنی کسی قوم کی روشنی مستقبل کی ضمانت بنتی ہے۔

قہقہوں کے وہ ’’زمانے آج رخصت ہو گئے‘‘

محترم ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب کی وفات پر۔وفات:۲۸؍ستمبر ۲۰۲۳ء

عبدالکریم قدسیؔ۔امریکہ

دے کے اشکوں کے خزانے آج رخصت ہو گئے
قہقہوں کے وہ ’’زمانے آج رخصت ہو گئے‘‘
ڈاکٹر پرویز پروازی گئے تو یوں لگا
حوصلے کے تانے بانے آج رخصت ہو گئے
محفلِ یاراں کو حیران و پریشاں چھوڑ کر
جیسے چائے کے بہانے آج رخصت ہو گئے
ڈھونڈتے ہیں دوست ان کو اور وہ ملتے نہیں
کس طرف کو وہ نہ جانے آج رخصت ہو گئے
اپنے بچھڑے دوستوں کو یاد کرتے تھے بہت
ان کو ہی ملنے ملانے آج رخصت ہو گئے
ہلکے ہلکے قہقہوں کا اک دیا زیرِ زمیں
اپنے ہاتھوں سے جلانے آج رخصت ہو گئے
مسکراہٹ کے پسِ پردہ نہ کوئی جھانک لے
اپنے سارے غم چھپانے آج رخصت ہو گئے

آہ! ناصر احمد خاں پرویز پروازی مرحوم

تحریر میں، تقریر میں، تدریس میں وہ شخص
ایجاد اپنا اک نیا انداز کر گیا
پہلے تو اس کی سوچ تھی لیکن فلک پہ خود
پرویز تھا ادب میں جو پرواز کر گیا
جس کسی کی خودِ نوشت پہ لکھا پس نوشت
لکھا ہے وہ بے دھڑک ہے جھجکا نہ ڈر گیا
الفاظ کی مانگ میں بھی مو تی پرو دیئے
اُردو زباں کی مانگ ستاروں سے بھر گیا
تا ابد اس کے لفظوں میں دھڑکے گی زندگی
کہتا ہے کو ن نا صرِ اردو ہے مر گیا

استاذی المحترم پروفیسر پرویز پروازی صاحب کی یاد میں

منیر احمد باجوہ

تیری الفتوں کو سلام ہے تیری شُہرتوں کو سلام ہے
پرواز تیری کا معترف ہر خاص ہے ہر عام ہے
تو معلم محترم رہا اس درسگاہ عظیم کا
روائتوں کے لحاظ سے جو سب میں سرِنام ہے
اس درسگاہ کی شان کو پہنچایا تونے عروج پر
زیر راہنمائی پرنسپل جسے ملا یہ اونچا مقام ہے
تجھے یاد رکھیں گے دیر تک تیرے چاہنے والے جہان میں
تیرا نام بھی تھا منفرد جو کِیا وہ تیرا ہی کام ہے
تیرا درس ہوتا تھا پُرکشش ہوتے سننے والے تھے خوش بہت
اسے سنتے ایسی لگن سے وہ ملا ساقی سے رندوں کو جام ہے
شاگرد تیرے ہیں غمزدہ تیرے ہجر سے افسردہ دل
ہر اک دلِ حزین پر لکھا آج تیرا ہی نام ہے
جو راہیں دنیائے ادب کی تونے پڑھ کے ان کو بتائی تھیں
تیرے جانثاروں کا اس سمت آج اٹھتا ہر اک گام ہے
تیرا ذکر خیر سنا بہت بڑے پیار بھرے الفاظ میں
تیری کارروائیوں کو دیکھ کر خوش تجھ پہ تیرا امام ہے
رکھے تجھ کو مولا بہشت میں کرے آپ درجے بلند ترے
تیرے واسطے منیر کی یہ دعا ہی صبح و شام ہے

محترم ناصر احمد پرویز پروازی مرحوم

منور احمد کنڈے

فکرو اسلوب کی تصویر تھے پرویز پروازی
کہیں غالب تو کہیں میر تھے پرویز پروازی
ہر کسی حرف سے ہوتے ہیں معنی ظاہر
لفظ کے خواب کی تعبیر تھے پرویز پروازی
بزم اُردو میں اُجالا تھا اک اُن کے دم سے
مختصر پیکرِ تنویر تھے پرویز پروازی
سارے لشکر سے تھا انداز نرالا اُن کا
جنگ کرتے بنا شمشیر تھے پرویز پروازی
سب میں ہوتی ہے کس طرح کی خوبی لیکن
رکھتے کچھ اور ہی تاثیر تھے پرویز پروازی
یوں ہی آتی نہیں اشعار سے خوشبو ہم کو
ہر نفس مائل تدبیر تھے پرویز پروازی
ہر کسی ذہن کو پرواز عطا کرتے تھے
کاٹتے پیروں کی زنجیر تھے پرویز پروازی
ہر سخن فہم کو اتنا ہے منوّرؔ معلوم
کر رہے تھے عہد کی تعمیر پرویز پروازی

محترم ناصر احمد پرویز پروازی مرحوم

ڈاکٹر عبدالکریم خالد

ہے اک نامی گرامی ڈاکٹر پرویز پروازی
تمہیں میری سلامی ڈاکٹر پرویز پروازی
بہت ہی خام تھا مجھ کو سنوارا چاک پر رکھ کر
ہنر سے عرش گاہی ڈاکٹر پرویز پروازی
ادب گاہِ محبت میں تیرا رتبہ بہت اونچا
زمانہ دے گواہی ڈاکٹر پرویز پروازی
اثر انگیز ہیں تیرے مضامین اور روشن ہیں
تیرے حرف و معانی ڈاکٹر پرویز پروازی
سکھائے تو نے مجھ کو زندگی کے راز سارے
حقیقت میں تمامی ڈاکٹر پرویز پروازی
تمہیں میری سلامی ڈاکٹر پرویز پروازی
ہے اک نامی گرامی ڈاکٹر پرویز پروازی

پروازی صاحب کے چند مضامین

قادیان کے بزرگ

ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی

(قادیان کے بزرگوں کے بارے میں برادرم مجیب الرحمٰن ایڈوکیٹ کی تشویق پر جو مضمون لکھا تھا وہ نامکمل حالت میں الفضل کو بھیج دیا۔ مضمون کے چھپنے کے بعد یاد آیا کہ چھپنے والے مضمون میں صرف ہمارے گھر کے بزرگوں کا ذکر تھا۔ اب اس کی تلافی کیلئے کچھ لکھنے بیٹھا ہوں۔)

حضرت میر قاسم علی صاحب

ہمارے پڑوس میں حضرت میر قاسم علی صاحب تھے۔ بڑے کلے ٹھلے کے آدمی تھے۔ ان کے گھر کے باہر ایک تختی پر الفاروق لکھا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں تو اتنی سمجھ نہ تھی کہ یہ کوئی علمی رسالہ ہوگا۔ ہم یہی سمجھتے رہے کہ ان کے کسی عزیز کا یا بیٹے کا نام ہوگا۔ میر صاحب کا کمال یہ تھا کہ سلسلہ کے مخالف اخبارات میں جو مضامین یا نظمیں چھپتی تھیں ان برجستہ جواب دیتے اور چھاپتے تھے۔ مدتوں بعد اپنے روشن دین تنویر نے بتایا کہ میر صاحب کی نظموں میں ایسی برجستگی ہوتی تھی کہ زمیندار جیسے اخبار کے ایڈیٹر بھی ان کے منہ آتے ڈرتے تھے۔ ابھی اسی سال میں نے ظفر علی خاں کی کلیات پاکستان سے منگوائی ہے اس میں ایک حصہ ''ارمغان قادیان'' کے نام کا علیحدہ چھپا ہوا ہے۔ اس میں وہ ساری نظمیں درج ہیں جو ظفر علی خاں نے جماعت احمدیہ کے خلاف لکھی تھیں۔ اس میں ایک نظم میر قاسم علی صاحب کی لکھی ہوئی نظم کا جواب ہے۔ اس کا عنوان ہے فحاش زماں میر قاسم علی قادیانی۔ دو شعر ہیں۔

کہ جس کو قادیان سے دشمنی ہو
کرو سب مل کے اس کا ستیا ناس
ہمارے ہاتھ سے بچنے نہ پائے
کوئی نقاش ہو یا کوئی عکاس

نقاش اور عکاس ظفر علی خاں کے قلمی نام تھے جن سے وہ جماعت احمدیہ کے خلاف نظمیں لکھتے تھے۔ یہ نظم 10 دسمبر 1932 کی لکھی ہوئی ہے۔اس نظم میں ہمیں تو کوئی فحش نظر نہیں آیا خدا جانے میر صاحب کو فحاش کس قصور کی بنا پر لکھا گیا ہے۔

اسی طرح ایک اور نظم ہے جو ساری کی ساری زمیندار اخبار نے نقل کی ہے اور پھر اس کا جواب لکھا ہے۔نظم سے قبل لکھا ہے’’قادیان کے ترجمان الفضل مورخہ 7 نومبر 1921 میں ایک شاعر نے مولانا ظفر علی خاں کو یوں مخاطب کیا ہے۔

بری طرح قادیاں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ظفر علی خاں
سمجھ یہ کیوں پڑ گئے ہیں پتھر یہ کیسے فتنے اٹھا رہے ہیں
جناب محمود کو برا کہہ کے کیا ملے گا سوائے ذلت
یہی نہ جو کچھ رہی ہے عزت اسے بھی دل سے گنوا رہے ہیں
وہ اپنی مسجد الگ چنیں گے ہزار دنیا بنے مخالف
انہیں یہ ضد ہے کہ کیوں مسلماں ایک مرکز پر آ رہے ہیں
نفاق کی آندھیوں سے اک دن مٹا کے رکھ دیں گے قصر مسلم
کسی کو ملحد بنا رہے ہیں کسی کو کافر بنا رہے ہیں

وہ کانگریس پر فدا کریں گے رسول مقبول کی شریعت
وہ اپنے کاندھوں پر آج اسلام کا جنازہ اٹھا رہے ہیں
وہ کانگریس جس کا مقصد اولیں مٹانا ہے نام مسلم
اس کی حرمت پر کٹ رہے ہیں اس کی عزت بڑھا رہے ہیں
بڑے بڑے کانگریس کے ہندو ہیں آج خون مسلم کے پیاسے
یہ گیت ہندو کا گا رہے ہیں یہ الٹی گنگا بہا رہے ہیں

اس نظم پر الفضل اخبار میں شاید لکھنے والے کا نام ہو یہاں درج نہیں مگر لہجہ بتاتا ہے یہ نظم میر صاحب کی ہے۔ اس نظم کا جواب 30 نومبر 1931 کو شائع کیا گیا جس کے چار شعر ہیں اور اپنے کانگریسی ہونے کا اعتراف ہے۔

یہ فتنہ پرداز قادیانی نئے نئے گل کھلا رہے ہیں
ادھر رقیبوں سے مل رہے ہیں ادھر ہمارے گھر آ رہے ہیں
یہ .... سیرت النبی کے یہ زمزمے عشق مصطفی کے
جنہیں سمجھتے ہیں دل سے کافر انہیں کو گھر گھر سنا رہے ہیں
ظفر علی خاں کی آبرو پہ نہ حرف آیا نہ آ سکے گا
خدا نے جب دی ہے اس کو عزت تو آپ کیوں تلملا رہے ہیں
وہ کانگریس کا ہے گرچہ حامی خدا نہیں ہے مگر اس کا ٹامی
یہ وہ خدا ہے کہ قادیانی گن اس کے دن رات گا رہے ہیں

مولانا ظفر علی خاں رہے نہ ان کی عزت افزائی کا چرچا رہا۔ آج ان کو جاننے والے بھی انگلیوں پر

گنے جا سکتے ہیں۔ ان کے اس مصرعہ کی داد دینے والا بھی کوئی کہاں رہ گیا ہو گا کہ مولانا ظفر علی خاں کی آبرو پر نہ حرف آیا نہ آ سکے گا۔ اب وزیر اعلیٰ پنجاب کی سرپرستی میں ظفر علی خاں ٹرسٹ بنا ہے تو کہیں جا کر ان کی تصنیفات کی اشاعت کا اہتمام ہوا ہے ورنہ ان کی آل اولاد تو سب کچھ بھول بھال بیٹھی ہے۔
اولاد کا ذکر آیا تو یاد آیا مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر نے زمیندار سے الگ ہو کر اپنا روزنامہ انقلاب شائع کرنا شروع کیا تو ظفر علی خاں نے انہیں طعنوں پر دھر لیا کہ سب ظفر علی خاں کی تربیت کی برکت ہے کہ سالک و مہر اتنے بڑے صحافی بنے بیٹھے ہیں۔ اگر انہیں ان کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو ان کی پرکاہ جتنی حیثیت نہ ہوتی۔ سالک صاحب نے کچھ دن تو ان کے طعنے سے آخر ایک ایسا فکاہیہ لکھا کہ اب تک کسی سے اس کا جواب نہیں مل سکا۔ سالک صاحب نے لکھا یہ درست ہے کہ مدیران انقلاب کو ظفر علی خاں کے اخبار میں کام کرنے کا موقعہ ملا ہے مگر ان کی صحافت کی اصابت میں مولانا کا کوئی کمال نہیں۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو مولانا کے اپنے صاحبزادے پر ان کا فیض تربیت کیوں اثر انداز نہیں ہوا؟ زمین شور تھی یا تخم ناقص تھا۔ زمیندار کو چپ لگ گئی ورنہ زمیندار ہو اور چپ ہو جائے۔

ہم نے تو اپنی آنکھوں سے لاہور کے YMCA کے ہال وہ جلسہ بھی دیکھا ہوا ہے جس میں مولانا ظفر علی خاں سٹیج پر بت بنے بیٹھے تھے اور خالی خالی نظروں سے سامعین کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی زبان ایک لفظ بھی ادا کرنے سے قاصر تھی۔ استغفر اللہ ربی من کل ذنب۔

ہمیں میر صاحب کا دیکھنا یاد ہے کیونکہ ان کا مکان ہمارے سکول کے عین سامنے تھا بلکہ ہماری کلاس عین ان کے گھر کے سامنے لگتی تھی۔ ان کی شخصیت کا رعب داب اتنا تھا کہ کبھی ان سے سلام کرنے کا بھی حوصلہ نہ ہوا، البتہ ان کی بزرگی کا احترام ہمارے بزرگ بھی کرتے تھے اور ہمارے

اساتذہ بھی۔بس اتنا ہی اپنا مشاہدہ ہے باقی جو کچھ ہے وہ سنا سنایا ہے۔

حضرت مولوی شیر علی

حضرت مولوی شیر علی کا ذکر گھر میں اکثر ہوتا اور وہ بھی اس حوالے سے کہ ہمارے ابا کے بچپن میں قادیان میں بڑے زور کی آندھی آئی تھی۔ ہمارے ابا بچپن میں دبلے پتلے اور کمزور تھے، اتنے دبلے پتلے کہ آندھی انہیں اڑا لے گئی۔آندھی کے بعد حضرت مولوی شیر علی کے صحن کے تن آور درخت کے ساتھ لپٹے ہوئے پائے گئے۔اس زمانہ میں درمیان اور کوئی عمارت نہ ہوگی۔حضرت مولوی شیر علی کے صحن میں تو ہم بھی کھیلے ہیں۔ ہرا بھرا صحن تھا ایک دو بھینس موجود رہتی تھیں۔ہم نے تو نہیں دیکھا مگر بزرگوں سے یہی سنا کہ مولوی صاحب اپنی بھینسوں کی دیکھ بھال خود کرتے تھے اور ان کا دودھ خود دوہتے تھے۔ یہ واقعہ تو ہماری تاریخ میں مذکور ہے کہ ایک بار کسی انگریز نے ایک دیہاتی کے ہاتھوں میں انگریزی کی ضخیم لغت دیکھ کر پوچھا تھا کہ بھلا آپ یہ کتاب کیوں اٹھائے پھرتے ہیں؟ وہ دیہاتی حضرت مولوی صاحب تھے۔ فورمین کرسچین کالج کے گریجوایٹ اور قرآن حکیم کا انگریزی میں ترجمہ کرنے والے۔

دیکھنے میں حضرت مولوی صاحب کی شخصیت بہت ہی سادہ تھی سر پر صافہ باندھتے تھے اور اونچی شلوار پہنتے تھے۔تیز مگر باوقار چال تھی یہ نہیں لگتا تھا کہ جلدی میں ہیں، راہ چلتے ہر ایک کو سلام کہنا ان کا طریق تھا اور سلام میں پہل کرنا بھی ان پر ختم تھا۔ہم نے کئی بار اپنے دوست سعید رحمانی سے مل کر یہ کوشش کہ گلی کی نکڑ پر چھپ کر کھڑے ہو جاتے کہ مولوی صاحب مڑیں گے تو ہم پہلے سلام کر دیں گے۔مگر مولوی صاحب ہمیشہ پہل کر دیتے۔ایک بار ہم نے پوچھ ہی لیا کہ ہم تو چھپ کر کھڑے تھے آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ہم چھپے ہوئے ہیں۔مسکرائے فرمایا بیٹا میں گلی کے موڑ مڑنے سے پہلے سلام کہہ دیتا ہوں کوئی جواب دینے والا نہ ہو تو فرشتے تو جواب دیتے ہیں۔ بچوں پر شفقت بھی بہت فرماتے

تھے ہماری اس حرکت پر خوشی کا اظہار فرمایا کہ ہم سلام میں پہل کرنے کوشش کر رہے تھے۔ بچوں سے ملنا ہوتو ان کے باپ دادا کا نام پوچھتے اور سلام بھجواتے۔

حضرت مولوی شیر علی صاحب، حضرت مصلح موعود کی قادیان سے عدم موجودگی میں قادیان کے امیر بھی مقرر ہوتے تھے مگر امارت کی وجہ سے جہاں ان کی مصروفیت بہت ہی بڑھ جاتی تھی وہاں فروتنی بھی بڑھ جاتی تھی۔ ایسے لگتا تھا امارت کے بوجھ تلے دبے جارہے ہیں، ایسی ہی فروتنی ہم نے بعد کو حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کے ہاں دیکھی وہ بھی امیر مقامی ہوتے تو ان کی عاجزی انکساری دیکھنے والی ہوتی تھی۔ کیسے اللہ والے لوگ تھے۔

بابا جی فضل محمد ہرسیاں والے

ہمارے مکان کے بالکل سامنے بابا جی فضل محمد ہرسیاں والے رہتے تھے۔ بزرگ اور بوڑھے تھے ان کے بیٹوں کی سوڈا فیکٹری تھی کاروبار تو کب کا چھوڑ چکے تھے مگر دکان میں یا دکان کے سامنے بیٹھتے تھے اور محلے کے بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھتے رہتے تھے۔ ہونٹ ملتے رہتے ذکر الٰہی کرتے ہوں گے ہم نے انہیں کسی کو جھڑکتے نہیں دیکھا۔ جب بھی ہم ان کے گھر جاتے تعظیماً انہیں سلام کہتے اور دعائیں لیتے۔ مولوی عبد الغفور صاحب کے بچوں میں ہدایت ہمارا ہم عمر تھا بھائی بشارت بڑے تھے مگر ہمارے ساتھ کھیلتے تھے۔ چچا عبداللہ کاموں میں مصروف رہتے مگر سکول کی چھٹی ہوتی تو جیسے ہر ایک بچے کو گھر بھیجنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ جو بچہ بھی انہیں سکول کے بعد نظر آتا پہلے اسے گھر جانے کا کہتے۔

بابا جی فضل محمد کی بیٹیاں بہوویں سب ہماری پھوپھی جی سے قرآن پڑھی ہوئی تھیں۔ اس لئے ہمیں بہت پیار دیتی تھیں۔ بہت بعد تک ربوہ آجانے کے بعد بھی وہ قادیان کی ہمسائیگی کا پیار قائم رہا۔

ہماری استاد بہن امتہ الباری ناصر نے زندہ درخت کے نام سے اپنے خاندان کی تاریخ لکھی ہے اور خوب لکھی ہے اگر چہ ہمارے تبصرے کا ایک حصہ عزیزہ امتہ الباری کو پسند نہیں آیا، چاہتی تھیں ہم وہ حصہ نکال دیں، ہم نے نہیں نکالا وہ تبصرہ کہیں چھپنے کو نہیں بھیجا۔ جب امتہ الباری کا انقباض دور ہوگا چھپوانے کی اجازت دے دیں گی تو چھپ جائیگا۔ اس تبصرہ کے نہ چھپنے سے کتاب کی افادیت میں کوئی کمی نہیں آئیگی نہ آئی ہے۔ بس بہن بھائی کے ذوقی اختلاف کا معاملہ ہے۔

حضرت میر محمد اسماعیل

حضرت میر محمد اسماعیل صاحب کی کتاب بخار دل کی نظمیں قادیان کے ہر بچے کو حفظ تھیں۔ ان کی نعت مبارک علیک الصلوٰۃ علیک السلام تو آج بھی لوگوں کے ورد زبان ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس جیسی نعت بہت کم لکھی گئی ہے۔ ان کی آپ بیتی کا بھی بہت چرچا تھا۔ ہمارے بزرگوں کا ان سے بہت تعلق تھا۔ ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے شاید نہیں، جماعت کے ایک جید صاحب قلم کی حیثیت میں لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ ہمیں دو تین بار ان کے گھر جانا یاد ہے۔ حضرت میر صاحب بچوں پر شفقت فرمایا کرتے تھے۔ بہت بعد کو ان کے چھوٹے صاحبزادے سید امین احمد ہمارے ساتھ کالج میں رہے۔ امین کی شادی نواب محمد احمد خاں کی صاحبزادی راشدہ سے طے پائی تو ہم نے کہا لو میاں تم سید پہلے ہی تھے اب نواب بھی ہو جاؤ گے۔ امین کہنے لگا دیکھتے رہنا میں نواب بنتا ہوں یا میری بیگم درویش بنتی ہے۔ ہم نے امین کو نواب بنتے تو بہر حال نہیں دیکھا اس کی سادگی اور درویشی اسی طرح قائم رہی جیسی کالج کے زمانہ میں تھی۔ اتفاق ہے کہ ہمیں شادی کے بعد امین کے گھر ایک بار بھی جانے کا موقعہ نہیں ملا۔ اس لیے ہم اس کی بیگم کی درویشی کے باب میں کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔ اب تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں کی مغفرت فرمائے۔

سابق پروفیسر تعلیم الاسلام کالج ربوہ۔ایک احمدی سائنس دان کا اعزاز

ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی

احباب جماعت میں یہ خبر خوشی سے سنی جائے گی کہ ہمارے احمدی سائنسدان پروفیسر ڈاکٹر محمد شریف خاں صاحب مقیم امریکہ کو پاکستان زوالاجیکل سوسائٹی کی جانب سے ان کی اہم سائنسی تحقیقات کے اعتراف میں سال 2014 کے لئے لائف اچیومنٹ ایوارڈ عطا کیا گیا ہے۔(ان کی تحقیقات کی تفصیل کا ہلکا سا خاکہ الفضل مؤرخہ 2 اپریل اور 13 اپریل 2014 میں دو اشاعتوں میں شائع ہو چکا ہے) زوالاجیکل سوسائٹی آف پاکستان کے صدر ممتاز قومی پروفیسر ڈاکٹر اے آر شکوری تمغہ امتیاز نے اس اعزاز کے متعلق ڈاکٹر محمد شریف خاں صاحب کو مطلع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ" مجھے اس بات کا اظہار کرتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے زوالاجیکل سوسائٹی آف پاکستان کی انتظامیہ کمیٹی نے 2014ء کے لئے آپ کو لائف اچیومنٹ ایوارڈ عطا کرنے کی منظوری دی ہے۔یہ ایوارڈ آپ کو بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں 25 فروری 2014 کو پاکستان کانگریس آف زوالوجی کے زیر اہتمام ہونے والی بین الاقوامی زوالاجیکل کانفرنس کے موقع پر عطا کیا جائے گا۔'' ڈاکٹر صاحب موصوف خود تو اس موقعہ پر تشریف نہیں لے جا سکے ان کے ایک احمدی شاگرد وسیم احمد خاں نے یہ اعزاز وصول کیا۔اللہ تعالیٰ اس اعزاز کو ڈاکٹر صاحب موصوف کے لئے اور جماعت کے لئے مبارک کرے۔آمین۔

ایوارڈ عطا کرنے کے موقعہ پر کہا گیا کہ ’’ڈاکٹر (محمد شریف) خان نے پنجاب یونیورسٹی سے 1963ء میں ایم ایس سی کی اور یونیورسٹی میں اول آنے پر ولیم رابرٹس گولڈ میڈل حاصل کیا۔آپ نے 1963 میں ہی تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے لیکچر کی حیثیت سے اپنا کام شروع کیا اور 1999 میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ڈاکٹر خان نے پاکستان کے HERPS پر اپنا تحقیقاتی کام ایسے وقت میں شروع کیا جب ان کے سامنے کوئی مثال موجود نہیں تھی اور ثابت قدمی کے ساتھ اس میدان میں تحقیقات جاری رکھیں۔اب تک ڈاکٹر صاحب 34 نئ اقسام دریافت کر چکے ہیں جن میں 14 سانپ 15 چھپکلیاں اور 8 مینڈک شامل ہیں۔انہیں بین الاقوامی سطح پر اس میدان کا ماہر تسلیم کیا جاتا ہے۔مختلف زبانوں میں ان کی متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں ۔ڈاکٹر صاحب نے کئ بین الاقوامی اداروں کے منصوبوں پر کام کیا ہے ان میں ورلڈ وائلڈ لائف پاکستان اور پاکستان سائنس فاؤنڈیشن کے منصوبے قابل ذکر ہیں۔آپ نے بہت سے ایم ایس سی کے مقالوں کی نگرانی کی اور اب بھی اپنے میدان میں ریسرچرز کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔آپ نے اپنا تمام جمع شدہ نایاب قیمتی سرمایہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کو عطا کر دیا ہے اور وہاں ریسرچرز کے کام آرہا ہے۔اس خاص میدان میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں 2002 میں سال کا بہترین ماہر حیوانیات قرار دیا گیا تھا‘‘۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو بیش از پیش خدمات کی توفیق عطا فرمائے اور وہ اس میدان میں احمدیت کا نام اورزیادہ روشن کرنے والے ہوں۔

سعید انجم۔فلسفی شاعر+افسانہ نگار

پرویز پروازی

سعید انجم نے "سب اچھا ہوگا" کے دیباچہ میں جس کالج اور کالج میگزین کا ذکر کیا ہے میں اس کالج میں اردو ادب کا استاد اور اس کالج میگزین کا نگران مدیر تھا۔ وہ کالج ایک چھوٹے سے قصبہ کا پوسٹ گریجویٹ کالج تھا جو بجائے خود ایک انہونی سی بات لگتی ہے مگر اس قصبہ میں بہت انہونی باتیں ہوا کرتی تھیں۔اس بستی کے باسیوں میں اور کچھ ہو نہ ہو،ایک لگن اور جذبہ ضرور موجود تھا۔اس جذبہ کے باوصف،ایک خاص نظریہ سے وابستگی کے باعث ذہنوں پر ایک خاص قسم کی فضا مسلط تھی جو خاص قسم کی آسودگی سے عبارت تھی۔ایسے ماحول میں ادب پڑھانا کارے دارد تھا اور ادب پڑھنا جان جوکھم کا کام تھا اور ادب لکھنا؟ انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا۔مگر اس کے باوجود پرورش لوح وقلم کرنے والے یہ کام کرتے ہی رہتے تھے۔ لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں۔ ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے!

مجھے یاد ہے کہ فرسٹ ایر کا ایک لڑکا ایک افسانہ لے کر میرے پاس آیا۔میں نے افسانہ لے کر رکھ لیا کہ اطمینان سے پڑھ کر جواب دوں گا کہ چھپ سکتا ہے یا نہیں چھپ سکتا! اس لڑکے کے جانے کے بعد میں نے افسانہ پڑھا تو تذبذب نے گھیر لیا۔افسانہ کسی بھی ادبی پرچے میں چھپ سکتا تھا مگر اس قصباتی ماحول کے کالج میگزین میں شاید اس کا چھنا ممکن نہیں تھا۔اگلے روز وہ لڑکا مجھے کلاس میں ملا۔ میں نے اسے کلاس کے بعد ملنے کو کہا۔ملا تو میں نے اسے افسانہ پر مبارک باد دی اور یہ بھی کہا کہ یہ افسانہ وہ کسی ادبی پرچے میں بھیج دے۔مگر اس کا اصرار تھا کہ وہ اس افسانہ کو کالج میگزین ہی میں چھپوانا

پسند کرتا ہے۔اس لیے ذرا سا رد و بدل کرنے کے بعد اس افسانہ کو معتدل بنایا گیا اور وہ افسانہ کالج میگزین میں چھپا۔اس کے بعد ہر شمارہ میں سعید انجم کا ایک افسانہ چھپنے لگا۔سعید اشاروں میں بات کہنا سیکھ گیا۔

میں نے سعید انجم کی انگلی پکڑ کر اسے افسانہ کی شاہراہ پر رواں کیا تھا مگر اب اس کے سماجی شعور اور ذہنی کینوس میں اتنی وسعت اور تنوع پیدا ہو چکا ہے کہ مجھے یوں لگتا ہے میں اس کی انگلی پکڑ کر علامتی افسانہ کی اونچی نیچی گھاٹیوں میں شعر کہہ رہا ہوں!

سعید نے کمٹ منٹ اپنے باپ سے سیکھی اور بھائیوں سے پڑھی ہے۔اس کا باپ نہایت محنتی اور دھن کا پکا انسان تھا جس نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی حالات سے سمجھوتہ کرنا نہیں سیکھا تھا وہ حالت سے نبرد آزما رہنا جانتا تھا مگر جس بات پر وہ کمٹ کر لیتا اس سے روگردانی اس کی شریعت میں گناہ تھی یہی کمٹ منٹ سعید کی گھٹی میں پڑی ہے۔ادب میں سعید کی کمٹ منٹ عادلانہ منصفانہ سماجی نظام کے ساتھ ہے اور وہ اس باب میں ثابت قدم ہے۔اپنے بھائیوں کی طرح جو اپنی کمٹ منٹ میں پکے ہیں۔

ادب میں ترقی پسند تحریک کے ساتھ وابستگی سعید کی جذباتی ضرورت تھی وہ قصباتی ماحول سے نکل کر لاہور کے وسیع تر سمندر میں پہنچا تو اسے احساس ہوا کہ اس کے ذہن میں جو کرب کا اکھوا ہے وہ پھوٹ کر اذیت کی کونپل بننے لگا ہے اسے اس کونپل کی حفاظت کرنی تھی کیونکہ یہ اذیت کسی خارجی دباؤ کی پیدا کردہ نہیں اس کے اندر کی کسک کی پروردہ تھی۔ یہ کسک کیا تھی؟ وہی کسک تھی جو ہر دردمند اور کمٹ منٹ رکھنے والا دل محسوس کرتا ہے۔اس کسک کے نتیجے میں افلاس، بھوک ناداری سب مرحلے سامنے آتے اور طے کرنا پڑتے ہیں اور اگر کمٹ منٹ خالص ہو تو انسان سب کچھ سہ جاتا ہے۔ بھیک نہیں

مانگتا! سعید نے یہی کچھ کیا اور یہ راستہ اس نے خود چنا! اور اس کے افسانے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے کیے پر کوئی افسوس نہیں۔ ہر داغ ہے اس دل پہ بجز داغ ندامت!!

اردو ادب کی تاریخ میں بہت سے ایسے مقامات آئے جہاں کہنے والے کو اپنی بات کہنے کے لیے استعاروں اور علامتوں کا سہارا لینا پڑا ہے۔ ہماری غزل تو ساری کی ساری ایمائیت اور علامیت سے مملو ہے مگر افسانوی ادب میں علامتی افسانہ کا چرچا بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ ہمارے ہاں یک دم بہت سے علامتی افسانہ نگار پیدا ہو گئے۔ مگر ہر مردے و ہر کارے! یہ منزل سر کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ یہاں بھی وہی کمٹ منٹ درمیان میں در آئی کے حق بات کہی جائے تو کیسے کہی جائے؟ ترقی پسند تحریک کے ساتھ وابستگی سے تائب ہونے والے گروہ کے بہت سے افسانہ نگار ایسے تھے جو راستے کی دھول میں اٹ گئے تھے۔ تحریک نے انہیں ایک بنیاد مہیا کی تھی جب وہ اس بنیاد سے اکھڑ گئے تو ان کا وہی حال ہوا کہ " آگے تھا کڑی دھوپ کا تپتا ہوا صحرا۔ پیچھے تیرے قدموں کی صدا تک بھی نہیں تھی" جب پاؤں اکھڑ جائیں تو پتے کا ہوا کی زد پر ٹھہرنا محال ہوتا ہے۔ علامتی افسانہ نگاروں میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی ''ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ۔ ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے'' کے زمرہ میں آتے تھے۔ سعید انجم، اس مشکل دور میں ثابت قدم رہا کیونکہ اس نے سماجی شعور اور ادیب کا مستحکم رشتہ دریافت کر لیا تھا اور وہ اس جنس متین سے وابستہ تھا۔ جس بستی سے وہ ہجرت کر کے لاہور آیا تھا اس نے اسے یہ دولت تو ضرور دی تھی کہ کمٹ منٹ بڑی مقدس شے ہے اس کی حفاظت کرو۔

ساٹھ کی دہائی برصغیر کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ 1947ء کے قیامت خیز دورہ کے بعد 1965ء کو ایک اور قیامت برپا ہوئی تھی۔ اس دہائی میں سرحد کے دونوں جانب قومیت کے نئے تصور

مضبوط ہوئے تھے مگر وہ مضبوط رشتہ جو ادب کا رشتہ کہلاتا تھا زیادہ واضح ہو کر سامنے آیا تھا۔ پاکستان میں کل کے پاکستانی بنیاد کی سوچ پہلی بار اسی عشرہ میں مستحکم ہو کر اٹھی۔ سعید انجم نے اس سوچ کو اپنی ڈگر بنایا چنانچہ اس کا کہنا ہے کہ بنگالن کی زبان سے سماجی شعور کا سن کر اسے ایک نئے سماجی شعور کا ادراک ہوا۔ وہ دوسرا بازو جس کے ساتھ ہماری غربت اور محرومی مشترکہ تھی، ہم نے بھلایا ہوا تھا۔ استحصال دونوں بازوؤں کا ہو رہا تھا اور استحصالی قوتیں دونوں کو کچلنے پر مستعد تھیں۔ پاکستانی ادب کو اس نے اپنا مطمع نظر بنایا اور اس کرب سے اسے سینچا جو وہ اپنے سینے میں لیے پھرتا تھا۔ ایک نئی کمٹ منٹ وجود میں آئی۔

سعید انجم کی اور پاکستان کی.................اس کے افسانے اس کمٹ منٹ کی ایک نمایاں تصویر ہیں۔ پاکستان سے ہجرت کرنے کے بعد بھی اس کی پاکستان سے کمٹ منٹ، منقطع نہیں ہوئی حالانکہ دوسرا بازو کب کا کٹ کر علیحدہ ہو چکا ہے۔ اب سعید کو دوسرے بازو کی نہیں پہلے بازو کے چار حصوں کی فکر ہے یہ کمٹ منٹ کا ایک نیا انداز ہے۔ وسعت کی حدود سے شناسائی!

ادب میں کمٹ منٹ کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر ہمارے ہاں یہ رجحان رہا ہے کہ جس شخص میں کمٹ منٹ کے جراثیم نظر آئیں اسے سوشلسٹ سمجھ لیا جائے یہ بات یوں بھی درست ثابت ہوتی رہی ہے کہ کمٹ منٹ والے سوشلسٹ ادیبوں نے جس ثابت قدمی کے ساتھ سوشلزم کا ساتھ دیا ہے، غیر سوشلسٹ ادیبوں نے اپنی کمٹ منٹ کے ساتھ اس کے عشر عشیر بھی وفاداری نہیں دکھائی۔ وہ دائیں بازو کے نظریات سے وابستگی کا اظہار تو کرتے رہے ہیں مگر جہاں عملی بنیادوں پر کمٹ منٹ کا مرحلہ آیا وہ ہمیشہ ہی پیٹھ دکھاتے رہے ہیں۔ شومئ قسمت سے ترقی پسند تحریک کی تاریخ بھی اس بات کی گواہ ہے کہ ایک وقت میں وہ لوگ بھی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے جو کسی وقت اس تحریک کے نام پر

باعزت روزیاں کماتے تھے۔ جب زیادہ مناسب روزگار یا زیادہ وافر دولت ملی وہ وفاداریاں تبدیل کر کے دوسروں کے ہو گئے۔ برصغیر میں 1936ء میں جب ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس ہوئی تو پریم چند نے اس کی صدارت کی۔ اب پریم چند کہاں کے سوشلسٹ تھے؟ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ ان کی کمٹ منٹ دیہات کے استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کی تھی۔ جب اس تحریک کی قبولیت عام ہونے لگی تو اس پر کمیونسٹ ہونے کا لیبل لگا دیا گیا اور ہمارے برصغیر میں یہ طریقہ بہت مقبول اور سہل رہا ہے۔ لیبل لگانا۔ میں سمجھتا ہوں ترقی پسند تحریک کا ایک ہی بنیادی ماٹو تھا کہ حقیقت کا اظہار کرو! اگر انسان دشمن سامراج کے نئے ہتھکنڈوں کے خلاف جنگ میں بہت سے لوگ اس تحریک کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ کمیونسٹ بھی سوشلسٹ بھی اور ٹریڈ یونینسٹ بھی۔ سعید نے برملا سبط حسن اور مطلبی فرید آبادی کا ذکر کیا ہے۔ مطلبی فرید آبادی Committed Socialist Realism کی طرف لے جانے والے تھے۔ اس لیے سعید انجم کی کمٹ منٹ کی نوعیت میں کوئی شک اور شبہ باقی نہیں رہتا۔ فیض صاحب کا خیال ہے کہ ہمارے ملک کے مخصوص سماجی اور سیاسی حالات میں ایسا ممکن نہیں تھا ان کا یہ بھی خیال ہے کہ Realism کی معراج Committed Socialist Realism ہے" اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اگر سعید انجم، پاکستان سے ہجرت نہ کرتا تو شاید اس کی کمٹ منٹ ادھوری رہ جاتی۔ اس کی ہجرت محض اقتصادی بہتری کے لیے نہیں تھی اس لیے بھی تھی کہ وہ فیض صاحب کی پہلی بات کو باون تولے پاؤ رتی صحیح سمجھتا تھا۔ سعید نے بہتر روزگار کے لیے اپنی کمٹ منٹ کو ترک نہیں کیا۔ ہجرت اختیار کر لی۔ اس ہجرت نے اس کے افسانوں کو ایک انوکھی جہت عطا کی۔

سعید انجم کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سب اچھا ہوگا'' کے نام سے چھپا۔ 1981ء میں منظر عام پر آنے والے اس مجموعہ کا انتساب حبیب جالب کی اس بچی کے نام ہے جس کے لیے اس نے یہ نظم لکھی

تھی

تیری آشا کی بگیا کھلے گی!

چاند کی تجھ کو گڑیا ملے گی

تیری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں گے

ختم ہوگا ستم کا اندھیرا

آنے والا زمانہ ہے تیرا

میں نے یہ نظم نہ صرف حبیب جالب کی زبان سے سنی ہے بلکہ میں نے اس بچی کو بھی دیکھا ہے جس کے لیے یہ نظم کہی گئی ہے مگر اس بچی کو ملنے کے بعد میں نے بھی وہی کچھ سوچا تھا جو سعیدہ گذور نے کراچی پریس کلب کی طرف سے جالب کو تاعمر رکنیت دینے کی تقریب میں کہا تھا کہ حبیب جالب اپنی بچی سے مخاطب ہوتا ہے تو وہ ننھی سی بچی خود بخود ایک بہت بڑے مظلوم طبقے کی بچی بن جاتی ہے جو آج مستقبل کی آس میں زندہ ہے!"

''سب اچھا ہوگا'' میں اکثر کردار وہی ہیں جو مستقبل کی آس میں زندہ ہیں اور مستقبل کی آس میں زندہ رہنا ہی اس دورِ بے اماں میں بہت مشکل ہے۔ اس مجموعہ کی اشاعت اور سعید کی افسانہ نگاری کے درمیان بیس برس کا عرصہ ہے اور یہ بیس برس جہاں ہماری قومی زندگی کے کڑے برس تھے وہاں ان میں برسوں میں اردو افسانہ نے بھی بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔

مارکسزم اور بعد میں ساختیات، دونوں میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ '' افراد کو ان کے سماجی وجود سے الگ کر کے سمجھا نہیں جا سکتا۔'' یہ رویہ بھی یورپ میں چھٹی دہائی کی پیداوار ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ سعید انجم کے افسانوں کو سمجھنے کے لیے اس رویہ کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔ ''مستقبل کی

آس'' میں مبتلا افراد کو سمجھنے کے لیے ان کے سماجی وجود کا ادراک کرنا بہت ضروری ہے۔ وہ کون سے حالات سے دوچار ہیں؟ ان کی جسمانی مفلسی اس سوال کا جواب نہیں۔ اس سوال کا جواب بلکہ ایسا کہنا چاہیے کہ سوال ہی یہ ہونا چاہیے کہ یہ ہیولے جو مستقبل کی طرف ٹکٹکی لگائے خلاؤں میں گھور رہے ہیں ذہنی طور پر مفلس، ناکارہ یا بے راہ تو نہیں ہو گئے؟ کیا ان کی سوچ زندہ ہے؟ کیا ان کے ذہن آس پاس کی محرومیوں کے باعث شل تو نہیں ہو گئے؟ کیونکہ مردہ سوچ اور شل ذہن "آس" کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے نہ ہی اس کے بل بوتے پر زندہ رہ سکتے ہیں۔ "سب اچھا ہو گا" میں ہمیں ایسے ہی کردار ملتے ہیں جو زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اس اس میں زندہ رہنا چاہتے ہیں کہ ''سب اچھا ہو گا۔"

اس مجموعہ کا پہلا افسانہ "گٹھڑی، ٹرنک، بریف کیس" ایک ایسے فرد کی کہانی ہے جو رزق کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے مگر گھر کی زمین گھر کی محبت، خاندان کی زنجیر اس کے ذہن سے نہیں نکلتی وہ نئے ماحول میں کشادگی تو محسوس کرتا ہے مگر آسودگی سے کہیں دور ہے۔ گٹھڑی اس کے ماضی کی ٹرنک اس کے حال کی اور بریف کیس اس کے مستقبل کی علامت ہے۔ وہ مستقبل جس کی اس میں وہ بھاگ کر گاڑی پر چڑھتا ہے۔ اچھو، ہمارے معاشرے میں تنہا نہیں اس جیسے ہزاروں اچھو موجود ہیں جو تعلیم کے ایک معمولی معیار یعنی میٹرک تک پہنچ کر آگے آنے والے وقت کی سہانی اس کا دامن پکڑ لیتے ہیں مگر کتنے ہیں جو اس ہیلی ہک اپ میں سوار ہو پاتے ہیں؟ اس افسانہ کا تاثر بڑا گمبھیر ہے۔ قاری یہ محسوس کرتا ہے اس نے بھی ''اچھو کی زبانی اور اس کی بھابی جتنی عورت'' کے ساتھ ٹرنک کا دوسرا کنڈا تھام رکھا ہے! روایتوں کا سرا!''

''شابو، شیبی اور شعیب" یہ افسانہ سیدھا سادہ درانتی اور ہتھوڑے کی علامتوں کا افسانہ ہے مگر اس افسانہ کا ہیرو تمام تر استحصالی قوتوں کا شکار ہونے کے باوجود پڑھنے والوں کی ہمدردیاں حاصل نہیں کر

پاتا۔اس کے کردار میں اتنی لچک ہے کہ وہ ذمہ داری کا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتا لچک جاتا ہے اور یہ لچک اس کے موقف کے منافی ہے۔ یہ درست ہے کہ ''صلیب کو ہٹا دیں تو ہتھوڑا اور اٹھا لیں تو صلیب" کا رویہ ہمارے دوغلے معاشرے میں بہت عام ہے مگر اس افسانہ میں گلوب کے گرد لگی ہوئی لیور ریلنگ درانتی سی شباہت رکھنے کے باوجود کسان کے استحصال کی علامت نہیں بن پاتی۔ افسانہ نگار دونوں علامتوں کو گرفت میں نہیں لے سکا۔

''دلاسہ'' اندھی توہم پرستی اور مذہب کے شکنجہ میں پھنسے ہوئے ان پڑھ دیہاتی لوگوں کی خوب صورت کہانی ہے۔ بخشا! جسے بے رحم غربت نے ہمدردی تو ضرور بخشی ہے مگر بے نام، فضول مذہبی روایتوں سے رہائی نہیں بخشی۔ وہ صدق دل سے ملا کو اپنے دکھوں کا منبع بھی سمجھتا ہے اور اس کی ذات کو ان دکھوں سے رہائی حاصل کرنے کا وسیلہ بھی! یہ رویہ، جہالت کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے کہ ایک جاہل کو دوسرے جاہل پر فوقیت مل جاتی ہے۔ جہالت کی جہالت پر فتح۔

''آب شفا'' افسانہ سے زیادہ حقیقت لگتی ہے۔زندگی ایک مکالمہ بھی افسانہ نہیں مکالمہ ہے جس میں افسانہ والی کوئی رمق نہیں۔مگر اس مجموعہ میں دو شاندار افسانے شامل ہیں جنہیں علامتی افسانہ کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔ایک ہے'' دہائیوں کی اکائیاں'' اور دوسرا ہے''سب اچھا ہوگا۔'' کمزور اور طاقتور افسانوں کے درمیان دو خوبصورت افسانے سینڈوچ بن گئے ہیں ''جلتی بجھتیں روشنیاں'' اور'' کیک اور کافی کے لیے وقفہ" چونکہ ان سینڈوچ افسانوں کا موضوع سعید کے پسندیدہ موضوعات سے ہٹا ہوا ہے اس لیے اس کی توجہ بھی بار بار بٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔جلتی بجھتی روشنیاں، مغربی معاشرہ میں ہونے والے اس ڈرامہ کی خوب صورت تصویر کشی ہے کہ بڑی نسل، چھوٹی نسل کو وہ آزادیاں دینے کی آرزومند نہیں، جن آزادیوں سے وہ خود بہرہ مند ہو چکی ہے۔اس افسانہ میں احمد کا

کردار، سہارا دینے کے لیے درمیان میں لایا گیا ہے۔ وہ پاکستانی نہ بھی ہوتا تو کوئی اور مشرقی بھی ہوسکتا تھا۔ کسی بھی کردار کی آنکھوں میں وہی روشنیاں جلتی بجھتیں جو احمد کی آنکھوں میں افسانہ نگار کو نظر آ رہی ہیں۔ احمد کا آنا افسانہ کے تاثر میں کوئی سماجی ارتعاش پیدا نہیں کرتا۔ بیٹی کوریائی ہے، ماں نارویجن ہے یا راطالوی ہے۔ احمد کی جگہ کوئی چینی بھی ہوسکتا تھا۔ جس سماجی تفاوت سے افسانہ نگار نے بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ بذات خود مکمل اکائی نہیں بن سکا۔ ''کیک اور کافی کے لیے وقفہ'' میں اگرچہ ایک پاکستانی مزدور معرض بحث میں آ رہا ہے مگر مزدور اور آجر کے درمیان کی خلیج وہی ہے ازلی ابدی ہے فرق یہ ہے کہ سارے کا سارا معاشرہ اپنے آپ کو آجر سمجھتا ہے اور یہ رویہ سکنڈے نیویا کا مخصوص رویہ ہے۔ آجر مزدور کو مکالمہ کا موقع دے کر اپنی برتری کی تسکین کرنا چاہتے ہیں ان کا مقصد ہمدردی نہیں ذاتی انا کی تسکین ہے۔ وہ امن امن پکارتے تو ضرور ہیں مگر امریکی ایٹمی اسلحہ کی ذخیرہ اندوزی کرنے کے خلاف کوئی بات سن نہیں سکتے! آجر کی منافقت!!

''دہائیوں کی اکائیاں'' اس مجموعہ کا سب سے بہتر علامتی افسانہ ہے۔ ''جب اچانک میں نے اکائی کو دہائی سے ضرب دینا سیکھا تو بہت خوش ہوا۔'' یہ عمل ہر شخص کرتا ہے مگر خوشی کسی کسی کو ہی نصیب ہوتی ہے کیونکہ خوشی کا پیدا ہونا ایک خاص سوچ پر منحصر ہے۔

معاشرے میں ایک بار اکائی کو دہائی سے ضرب دے دی جائے تو پھر ضرب آگے ہی بڑھتی ہے، پیچھے نہیں ہٹتی۔ تقسیم کا عمل، منفی عمل ہے۔ گھٹانا! اور گھٹنے پر کسے خوشی ہوگی!

''راستہ بنانا ہے تو دہائیوں کو راستے سے ہٹاؤ'' مگر دہائی کو راستہ سے کون ہٹائے؟ اوپر جانے کے لیے یہ عمل ضروری ہے مگر زندگی کی تلخ تر حقیقت یہ ہے کہ ترجیحات رمیان میں آ پڑتی ہیں۔ ترجیحات، تفاوت پیدا کرتی ہیں طبقات کو جنم دیتی ہیں، چھوٹے بڑے کا فرق پیدا کرتی ہیں۔ آزادی اور پابندی

کا احساس دلاتی ہیں۔معاشرہ ترجیحات کا شکار ہو جائے تو پھر اسے جس گھٹن اور مجبوری کا شکار ہونا پڑتا ہے۔وہ باہر سے گھبرانے لگتا ہے اور فرد وہ بیچارا تمام تر گھٹن کے باجود اندر کمرے میں سونے لگتا ہے۔ کبوتروں کے پر کٹ جاتے ہیں۔آزاد کبوتر لوٹ کر کا بک پر واپس نہیں آتے۔ضربیں، تقسیمیں ہوتی ہیں اور اس موسم میں ضرب کا عمل نہیں تقسیم کا عمل کامیاب ہوتا ہے۔ہم نے یہ سب کچھ اپنے کانوں سے سنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔صرف افسانہ کو ذرا غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔اس علامتی افسانہ کی یہی ایمائیت اسے غزل کی طرح مختصر مگر جامع بناتی ہے۔

''سب اچھا ہو گا'' مشرق اور مغرب کے تفاوت فکر اور ایک دوسرے کو نہ سمجھنے کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی صورت حال کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔مغرب والوں کے ہاں دو رویے بہت نمایاں ہیں۔ مشرق والوں کو غریب نادار اور ناسمجھ تصور کرنا اور دوسرے اپنی مادی برتری کی بنا پر بزعم خود دوسروں کو حقیر کمتر اور نافہم قرار دے لینا اس تفاوت فکر کے نتیجہ میں تصادم کی صورت پیدا ہوتی ہے یہ تصادم بھی خیر اور شر کے تصادم کی طرح ازلی ہے۔سوشلزم کی ساری فکری تحریکیں اس تصادم کے خلاف نبرد آزما رہی ہیں کیونکہ یہ تصادم انسان کے دوسرے انسان سے ملاپ میں رکاوٹ ہے۔سعید انجم کا یہ افسانہ اس کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔

اور اب اس کا دوسرا مجموعہ ''سوتے جاگتے خواب'' تیار ہے۔اس مجموعے کے افسانے،سعید انجم کے ذہن اور اس کی سوچ کے ایک نئے رخ کی نشان دہی کرتے ہیں مگر سب افسانوں کی بازگشت اس کی وہی پرانی کمٹ منٹ ہے۔پاکستان سے کمٹ منٹ۔اس مجموعہ کے دو حصے ہیں ایک حصہ میں مختصر افسانے ہیں اور دوسرے حصے میں مختصر مختصر افسانے۔دونوں حصوں میں زیادہ تر حصہ علامتی افسانوں کا ہے اور یہاں درمیان میں رام لعل آ پڑتے ہیں۔رام لعل اس کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

سعید انجم کی علامتی کہانیاں "سیدھی سادی اور رواں دواں نثر کے شائقین کو ایک غیر متوقع جھٹکا سا دیتی ہیں جیسے قاری کو بے ربط الفاظ کے جنگل میں لے جا کر کھڑا کر دیا گیا ہو۔" رام لعل کا نام اردو افسانہ کا بہت ہی معتبر نام ہے اس لیے ان کی بات کو یوں آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا مگر اختلاف تو کیا جا سکتا ہے! افسانہ میں رواں دواں نثر کا ہونا ضروری تو ہے لازمی ہرگز نہیں ہے۔ یہ تو افسانہ نگار کی اپنی چوائس کی بات ہے کہ وہ بات کو کس ڈھنگ سے کہنا چاہتا ہے۔ علامتی افسانہ کی ساری عمارت ہی اس بنیاد پر استوار ہے کہ افسانہ نگار ایمائیت کا سہارا لے کر بات کرتا ہے۔ ایمائیت کو لفظوں کا جنگل کہنا کوئی نئی بات نہیں پرانی بات ہے۔ غالب کے زمانے کی بات۔ وہاں ایک نمایاں فرق جو سعید انجم اور دیگر افسانہ نگاروں میں نظر آتا ہے وہ مکالمہ کا فقدان ہے۔ سعید انجم کے ہاں مکالمہ دو افراد کے درمیان نہیں ہوتا اس میں ایک تیسری جہت بھی شامل رہتی ہے۔ اس کے مکالمے سہ رخی مکالمے ہیں اور آپ جانتے ہیں دو رخی تصویر سے زیادہ سہ رخی تصویر زیادہ گہری اور گمبھیر ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے لفظ بے ربط نہیں ہیں۔ یہ سعید انجم کا اسلوب ہے جو اس کے غیر علامتی افسانوں میں بھی اسی طرح موجود ہے۔"

''ادیب بننا ہے تو ادبی پرچے میں چھپو۔'' میرے ایک دوست نے مشورہ دیا۔

''میں نے ادبی پرچوں کے ورق کھنگالے۔ سماجی شعور کے گلے پر کند چھریاں چل رہی تھیں۔"

''دریا میں رہنا ہے تو مگر مچھ سے بیر ممکن نہیں۔" بڑے شہر کا مشورہ چھوٹے قصبے کے لیے۔" (سب اچھا ہوگا صفحہ 12)

سعید کے ہاں اس قسم کے تھری ڈائی مینشنل، سہ رخی مکالمے بہت ہیں اور یہ اس کا خاص انداز ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ اس کے ہاں بے ربط لفظوں کا جنگل کھڑا کر دینے کا رواج ہے کوئی مناسب بات نہیں۔ اس کے دوسرے مجموعہ کا پہلا افسانہ "نیک بندوں کا زیور" دور حاضر کا ممتاز ترین افسانہ کہلانے کا

مستحق ہے اس افسانے کی ساری خوب صورتی ہی اس کے سہ رخی مکالموں کی رہین منت ہے۔سعید انجم ،صرف کرداروں سے ہی مکالمہ نہیں کرواتا ماحول کو بھی بولنے پر آمادہ کر لیتا ہے ’’ کابل کتنی دور رہ گیا ہے؟‘‘ ان گنت فلیش لائٹیں چمکیں ’’جلال آباد میں کیا ہو رہا ہے؟‘‘ بے شمار کیمروں نے سوال کیا۔‘‘(نیک بندوں کا زیور)

’’نیک بندوں کا زیور‘‘ کاؤ بوائے اسلام پرستوں کی اسلام پر لائی ہوئی آفتوں کی کہانی ہے۔ پاکستان میں ضیاء الحق کی لائی ہوئی اسلام پرستی نے جو قبیح شکلیں اختیار کیں وہ اس افسانہ کا موضوع ہیں،فوج کی گھناؤنی بالا دستی نے گلی کوچوں میں جو اسلام نافذ کیا وہ militant اسلام تھا۔’’ کلاشنکوف، وردی،پجیرو یہ نیک بندوں کا زیور ہے ۔‘‘ اور وہ غریب غربا جو اس زیور سے آراستہ نہیں ہیں ان کا پاکستان کے اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ان کا ایمان کمزور ہے۔سعید انجم کے اس افسانہ کو عالمی افسانوں کی صف میں جگہ ملنی چاہیے اور ضرور ملے گی!

’’سوتا جاگتا خواب‘‘ اس موضوع پر زیادہ وسیع کینوس کا حامل افسانہ ہے جس میں مغرب کے ماحول میں بھی اسلام کے بنیادی تصور کو سینے سے لگانے والے محنت کشوں کی ٹریجڈی بیان ہوئی ہے۔وہ جس اسلام کو سینہ سے لگائے بیٹھے ہیں اس اسلام کے نام نہاد اجارہ دار اس اسلام کا جوا کب سے اتار کر پھینک چکے ہیں۔وہ سرزمین جہاں سے اس دین کے سوتے پھوٹے تھے،امریکنوں کی دست برد میں ہے جو وہاں علی الاعلان نمازیوں سے بیئر مانگتے ہیں۔اس دین کے نام نہاد محافظوں نے اپنی سلامتی کے لیے دین کی سلامتی کو قربان کر دیا ہے اور یہ تضاد ارشد کی سمجھ سے بالا ہے۔افسانہ پھر پاکستان کی طرف مراجعت کرتا ہے جہاں کا صدر اسلامی ایٹم بم کے حوالے سے معتبر سمجھا جاتا ہے مگر پاکستان کے رہنے والے ایک بوتل تیل خریدنے کی سکت نہیں رکھتے۔تضادات ہی تضادات !! سوتا جاگتا خواب

ایک خوب صورت علامتی افسانہ ہے۔

اس افسانہ کی بازگشت اس مجموعہ کے دوسرے حصہ میں شامل افسانے" قربانی" میں ملتی ہے،قربانی ان سورماؤں کی کہانی ہے جو اپنے ہی وطن کو فتح کر کر کے ترقیاں حاصل کرتے چلے جاتے ہیں اور انتہا یہ ہے کہ "اب اللہ بخش سوچ رہا ہے اگر میری جان کو خطرہ ہوا تو کسے قربان کروں گا؟ فضا میں ایک دبی دبی گونج ہے۔ پاکستان! پاکستان!! اپنے موضوع پر یہ مختصر مختصر افسانہ، بڑا گمبھیر اور گہرا افسانہ ہے!

"نیا سال، جیل کی یاری، اور اڑان ایک عقاب کی اور خوش قسمت، چاروں افسانے ناروے کے ماحول کے پس منظر میں رکھے گئے ہیں۔ اڑان ایک عقاب کی ایک ایسے پاکستانی کا المیہ ہے جو ناروے میں شادی کرنے کے بعد ادھر کا رہا ہے نہ ادھر کا۔ مغرب کو اپنا لینے کی امنگ اس کی زندگی میں جاری نظر آتی ہے مگر مرنے کے بعد وہ اپنے وطن کی مٹی میں دفن ہونا پسند کرتا ہے۔" جیل کی یاری" دو پاکستانی مزدوروں کی کہانی ہے جو ہر حال میں اپنے وطن کے ساتھ اپنا رشتہ برقرار رکھتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اپنے وطن کے مزدوروں کی بہبودی کے واضح تصورات ہیں مگر وہ ان تصورات میں رنگ بھرنے کی سکت نہیں رکھتے اور وطن میں رہنے والے مزدور مغرب میں رہنے والے ان بے بس مزدوروں کو ہیرو سمجھتے ہیں.................مگر مغرب کے ان مزدوروں کی حیثیت اپنی نگاہ میں بھی مشکوک ہے۔

"خوش قسمت" اس شخص کی روداد ہے جسے وطن سے ہجرت کر جانے کا موقع مل جانے پر خوش نصیب سمجھا جاتا ہے اور مغرب کے تشکیک زدہ معاشرہ میں پہنچ کر اس کی خوش قسمتی اتنی محدود ہو جاتی ہے کہ اگر وہ پولیس کے ہاتھوں ذلیل ہونے کے باوجود پکڑا نہیں گیا تو یہ اس کی انتہائی خوش نصیبی ہے ورنہ اس معاشرہ میں باہر سے آئے ہوئے مزدور کا کوئی مقام نہیں اور امن، آشتی اور آزادی کا پیغام دینے والے

معاشرہ میں اس بے وطن مزدور کے لیے کوئی جائے امان نہیں ہے!

سعید انجم ان چاروں افسانوں میں اپنے ہم وطنوں کو ایک ہی پیغام کی ترسیل کر رہا ہے کہ مغرب کی طرف ایسی حریص نظروں سے نہ دیکھو۔ یہاں کی چکا چوند صرف اوپر کی سطح کی ہے جس کے نیچے گھناؤنے سیاہ حقائق چھپے ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ افسانے بھی سعید کی کمٹ منٹ کا حصہ ہیں کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ وہ لوگ جو اپنے زور بازو سے باعزت روزگار حاصل کر سکتے ہیں وہ مغرب کے معاشرہ میں پہنچ کر اپنے زور بازو سے "بے عزت روزگار" حاصل کریں اور جوش کی نظموں میں "بے پناہ دولت کے پیدا کیے ہوئے بے پناہ افلاس" والے معاشرہ میں تیسرے درجے کے شہری بن کر رہیں۔

سعید انجم کے اتنے افسانوں کا انفرادی تجزیہ کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ

اس کے افسانوں کو تین واضح حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

1۔ وہ افسانے جن کا موضوع پاکستانی معاشرہ ہے۔

2۔ وہ افسانے جن کا موضوع نارویجن معاشرہ ہے۔

3۔ اور وہ افسانے جن کا موضوع ملا کی پھیلائی ہوئی جہالت ہے۔

مگر کتنی بد نصیبی کی بات ہے کہ ملا کی پھیلائی ہوئی جہالت میں پاکستان کی سب سے بڑی اسٹیبلشمنٹ یعنی فوج بھی شامل ہوگئی ہے۔ پہلے اس کا کام اپنے ہی ملک کو فتح کرنا تھا اب اس کے مقاصد میں اپنے ہی ملک کو جاہل لکھنا بھی شامل ہو گیا ہے۔

سعید انجم کے تیسری قسم کے افسانوں میں "ایک مختصر کتاب" اور "دیکھ کبیرا ہنسا" بے پناہ افسانے ہیں۔ دیکھ کبیرا ہنسا کا یہ مکالمہ

کتنا گہرا اور دور رس نتائج پیدا کرنے والا ہے کہ

’’ہمارے پاس تو دوقومی نظریہ تھا۔تمہارے پاس کیا ہے؟‘‘

’’دوفوجی نظریہ! اس ملک میں یہ فوج اور ہم اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ہمیں اپنی الگ فوج بنانی پڑے گی۔‘‘

’’بکواس بند۔ پہرے پر کھڑے باوردی سپاہی نے اپنی بندوق کا بٹ امجد کے منہ پر مارا۔اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور منہ سے خون

بہنے لگا۔‘‘

’’یہ جیل ہے۔موچی دروازہ نہیں۔ملاقات ختم‘‘۔

’’ایک مختصر کتاب میں بھی یہ لوگ سلیمانی ٹوپی پہنے نظر آتے ہیں‘‘(دیکھ کبیرا ہنسا)

’’ان کے پاس الہ دین کا چراغ نہیں ہے لیکن وہ حکم دیتے ہیں تو ایک جن کی بجائے پوری پلٹون متحرک ہو جاتی ہے۔‘‘

سعید انجم واحد افسانہ نگار ہے جس نے بے خوفی کے ساتھ فوجی راج اور مارشل لاء کی لائی ہوئی بدعتوں کو موضوع بنایا ہے۔ایسا کرنا

علامتی افسانہ سے ہٹ کر ممکن نہیں تھا۔اس موضوع پر لکھتے ہوئے سعید انجم کے قلم میں تلوار کی کاٹ نہیں گولی کی سی تیزی اور سمیت پیدا ہو جاتی ہے۔رہ گیا کام ہمارا ہی بغاوت لکھنا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ سعید انجم نے یہ جرات اس لیے کی کہ وہ پاکستان سے باہر تھا مگر یہ بھی تو سوچنے کی بات ہے کہ یہ افسانے پاکستان ہی کے جرائد میں چھپتے رہے ہیں۔ان کڑوے گھونٹوں کو پاکستانیوں کے حلق سے اتارنا بھی سعید انجم ہی کا حصہ ہے۔

''سوتا جاگتا خواب'' کے مختصر مختصر افسانے بہت جامع اور تاثر انگیز ہیں۔''کھیل'' نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔مغربی معاشرہ کی نسلی منافرت کے موضوع پر اس سے بہتر افسانہ میری نظر سے نہیں گذرا

''اس شام میں اپنے کاؤبوائے بیٹے کے ہاتھوں کئی دفعہ قتل ہوا۔''

''کیا اسے نرسری میں کھیلنے کا موقع نہیں ملتا۔'' میں نے بعد میں اپنی بیوی سے پوچھا۔

''ملتا تو ہے'' میری بیوی نے بتایا لیکن نارویجن بچے اسے سارا دن ریڈ انڈین بنائے رکھتے ہیں۔''
(کھیل)

اس معاشرہ میں رہنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ یہاں رہنے والے تمام غیر ملکی ریڈ انڈین ہیں اور انہیں بہرحال کاؤبوائے کے ہاتھوں ریڈ انڈین کی طرح قتل ہونا ہے۔

سعید انجم، فلسفی ہے کیونکہ اس کی سوچ فلسفیانہ ہے، شاعر نہیں اس کے باوجود اس کی ایمائیت اور رمزیت شاعرانہ ہے اس فلسفیانہ سوچ شاعرانہ رمز شناسی اور افسانہ نگار کی ژرف نگاہی نے اسے سہ جہتی فنکار بنا دیا ہے، گہرا۔گمبھیر اور بے خوف!!

باسکٹ بال سے ہدایت اللہ ہادی تک

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی

کینیا کے سالانہ جلسہ میں سب سے پہلے جس شاگرد کا سامنا ہوا وہ باسکٹ بال کا کھلاڑی بھی رہا تھا اس لئے جو یادیں سامنے آئیں ان میں برادرم پروفیسر نصیر احمد خاں مرحوم کا تذکرہ نمایاں رہا۔ پھر عزیزی ڈاکٹر عنایت اللہ منگلا ملے جو نصیر صاحب کے داماد ہیں اور اس کے بعد خالد تاج سے ملاقات ہوئی۔ خالد تاج، احمدی نہیں، مگر تعلیم الاسلام کالج میں نو سال گزارنے کا ریکارڈ رکھتا ہے۔ باسکٹ بال کا نہایت منجھا ہوا، نرا چھلاوہ۔ کورٹ میں بھی اس کی پھرتی کے سبب اسے روکنا مشکل ہو جاتا تھا۔ کھلاڑی تھا اس لئے پڑھائی میں ویسا ہی تھا جیسا اچھے کھلاڑی کو ہونا چاہئیے۔ یعنی پھسڈی! اس لئے ہر سالانہ امتحان کے موقع پر میں امتحان میں ڈال دیتا تھا اور ہمیں خوشی ہے کہ ہم نے خالد تاج کی خاطر بہت سے معرکے سر کئے تھے۔

برادرم عزیزم زکریا ورک، کنگسٹن سے اپنے وعدہ کے مطابق میں سیر کروانے آیا ہوا تھا۔ میٹرو ٹورانٹو ریفرنس لائبریری میں دو تین گھنٹے گزارنے کے بعد ہم لوگ کھانا کھانے کے لئے ایک انڈین یا پاکستانی ریسٹورنٹ میں بیٹھے تو زکریا کو یاد آیا کہ خالد تاج بھی یہیں کہیں آس پاس رہتا ہے۔ اس نے فون کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں خالد تاج آ گیا۔ اس کا آنا گویا بھونچال کا آنا تھا۔ وہ اتنا جذباتی ہو رہا تھا کہ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ اتنا ریشہ خطمی کیوں ہو رہا ہے؟ مگر شاگردوں اور پھر ایسے شاگردوں کا جو دوست بھی رہے ہوں معاملہ ہی عجب ہوتا ہے وہ تمام محبتیں یکدم نچھاور کر دینا چاہتا تھا۔ زبان لڑکھڑا

رہی تھی، ہاتھ کانپ رہے تھے۔ آنکھیں گیلی تھیں! خدا معلوم وہ محبت کے کس مقام پر تھا! ہمیں شرم آ رہی تھی کہ ہم اتنی محبتوں کے حق دار کہاں ہیں! بہر حال وہاں سے نکلے تو سی۔ این۔ ٹاور پر چڑھنے کے لئے پہنچے تو وہاں معلوم ہوا کہ شام تک باری نہیں آ سکتی۔ ایک اور ریستوران میں جا کر بیٹھے چائے پی۔ خالد تاج نے اگلے روز کا وعدہ لے لیا کہ وہ ہمیں، بقلم خود، سیر کروائے گا۔ زکریا کو بیک بینی و دو گوش واپس کر دیا کہ واپس کنگسٹن سدھارے۔ خالد تاج سے رہائی ملے گی تو اسے بلا لیا جائے گا۔ اگلے روز صبح سے لے کر رات دس بجے تک خالد تاج کی مہربانیوں کے مورد رہے۔ دوستوں اور بزرگوں کے تذکرے بھی ہوئے! نصیر صاحب مرحوم کا بار بار ذکر آیا۔ تب معلوم ہوا کہ اپنی وفات سے قبل جب نصیر صاحب، کینیڈا آئے تھے تو خالد تاج کو ان کے ورود کی خبر ان کے جانے کے بعد ملی تھی۔ اس لئے ہمارے ساتھ جو خلوص برتا جا رہا تھا اس میں زیادہ حصہ نصیر صاحب مرحوم کے ساتھ برتے جانے والے خلوص کا تھا! اللہ تعالیٰ قبول کرے۔

سارا دن سیر کرتے کرتے اور کھاتے کھاتے اتنی تھکاوٹ ہو گئی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ رات دس بجے گھر واپس پہنچے اور اپنی انسولین کا ٹیکہ لگایا اور سو گئے۔ صبح تک گہری نیند سوئے۔ صبح دس بجے پھر خالد تاج کا فون آیا کہ ''آپ خیریت سے تو ہیں؟''۔ تب اس نے ہمیں بتایا کہ واپس چھوڑتے وقت اسے ہماری حالت دیکھ کر بہت تشویش ہوئی تھی اور وہ بے چارہ رات بھر اس فکر میں رہا کہ ہم خدا نخواستہ کہیں انتقال ہی نہ کر جائیں! جب ہم نے بتایا کہ ہم ٹھیک ٹھاک ہیں تو اس کی جان میں جان آئی کہ ہم اس کے خلوص کی تاب نہ لا کر جہاں بحق نہیں ہوئے!

باسکٹ بال نے یہیں پر بس نہیں کی۔ برٹش کولمبیا کے صدر مقام وینکوور سے عزیزم برادرم ادریس احمد شاہین نے ہوائی ٹکٹ بھیج دیا کہ کینیڈا کا سب سے خوبصورت علاقہ ہے اسے دیکھے بغیر کینیڈا

سے واپس جانا گناہ ہے! یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ کینیڈا سے واپس جانا گناہ تھا یا نہیں البتہ ادریس شاہین کے پاس نہ جانا واقعی گناہ تھا۔سو اگلے روز صبح صبح ہوائی جہاز پر بیٹھے اور وینکوور پہنچ گئے۔ادریس شاہین کو دیکھ کر ہم حیران رہ گئے! پتلا، چھریرے بدن والا، پھرتیلا سا لڑکا ہوتا تھا مگر جس شخص نے ہمیں وینکوور ایر پورٹ پر وصول کیا وہ کھچڑی بالوں اور حلوہ خور ملاؤں جیسی توند والا منحنی سا شخص تھا۔مگر توند اس کی مسکراہٹیں چھیننے میں ناکام ہوگئی تھی۔گھر پہنچے تو سب سے پہلے جس تصویر پر نظر پڑی وہ باسکٹ بال ٹیم کی تصویر تھی۔ 1960-61ء کی درمیان میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ تشریف فرما ہیں۔ساتھ پروفیسر نصیر احمد خاں ہیں۔خالد تاج ہے، نصیر بندہ ہے۔سعید ہے، لطیف جمٹ ہے، اور ادریس شاہین ہے! وہی فرسٹ فائیو! تعلیم الاسلام کالج کی پہلی فائیورٹ ٹیم۔جس کے سارے ہی اراکین پنجاب کی ٹیم کے اراکین تھے!

کہاں گیا وہ زمانہ کہاں گئے وہ لوگ!

ادریس شاہین نے ہماری خدمت کے لئے اپنی بیوی اور آٹھ بچوں سے پوری چھٹی لے رکھی تھی۔اس کی بیوی رفعت نے، جسے بیاہ کرلانے والی برات ہم بھی تھے، کھانے پکانے میں ہمارے پرہیز کے مطابق سب کچھ پکایا اور خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور ادریس نے سوکی ناپنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ ہم آٹھ دن زمین کا گز بنے رہے اور ان آٹھ دنوں میں ہم نے برٹش کولمبیا کا کونہ کونہ چھان مارا، چپہ چپہ دیکھ لیا اور جو کچھ ہم نہیں دیکھ سکے، وہ دیکھنے کے قابل نہیں تھا کیا کچھ دیکھا، اس سوال کا جواب بہت محنت چاہتا ہے۔پہلے سارا لٹریچر پڑھ کر اپنی معلومات تازہ کریں تو عرض کریں! وینکوور جزیرے پر گئے بوشرٹ گارڈن دیکھا۔یہ باغ دنیا بھر میں منفرد ہے کہ اس میں ہر ملک کے ہر آب و ہوا کے رنگ برنگے پھول موجود ہیں۔باغ کیا ہے جنت کا نمونہ ہے! جنت کے پھلوں کا بہت ذکر سنا ہے اگر وہاں پھول ہوئے تو یقیناً ایسے ہی ہوں گے! ملک ملک کے

بھانت بھانت کے لوگ دیکھنے آتے ہیں۔سارا جزیرہ، وکٹوریہ شہر سمیت بہت خوبصورت ہے! الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کا ایک اور خوبصورت مقام دیکھنے کی توفیق بخشی! علاوہ ازیں وینکوور شہر کی بلندیاں، پستیاں سب دیکھیں، بندرگاہ بھی عجوبہ سمجھی جاتی ہے وہ بھی دیکھی۔ پہاڑی راستوں پر ڈرائیو بھی کی۔البتہ اپنے عزیز شاگرد، عزیزم طاہر محمود باجوہ کی وہ خواہش پوری نہ کر سکے جس میں اس نے ہمیں کیبل ٹرین پر بٹھانے اور سکی جمپ تک لے جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا! مگر ہم نے پھلوں کی سو میل لمبی وادی، روکانا گن ویلی کی سیر کر کے اپنی جنت کا تصور پورا کرلیا!

عزیزی طاہر محمود باجوہ، اللہ تعالیٰ اسے صحت دے، نہایت پر خلوص اور ہمدرد لڑکا ہے۔ بے چارا مرورِ زمانہ کا شکار ہو کر ذہنی دباؤ کا مریض بن گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے نہایت خدمت گزار بیوی بھی دی، اولاد بھی عطا کی۔مگر وہ بے چارہ اپنی آگ میں جل کر خاک ہو رہا ہے! اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے۔ جتنا وقت اس نے ہمارے ساتھ ہوش کے عالم کے گزارا وہ ہمیں ذرا ذرا یاد ہے مگر خود فراموشی کے عالم میں بھی ہمارے ساتھ اس کے برتاؤ میں کوئی کجی یا اقدام میں کوئی کمی نہیں آئی۔اللہ تعالیٰ اسے ہر آزمائش سے بچائے۔تمام احمدی دوست خاص طور پر ادریس اور ادریس کی بیوی اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔آمین

ٹورانٹو سے وینکوور کوئی تین ہزار میل کے فاصلہ پر ہے۔اندرون ملک پرواز ہے مگر ساڑھے چار گھنٹے لگتے ہیں۔وینکوور ایر پورٹ کے قریب پہنچتے پہنچتے اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں پر سے گزرنا پڑتا ہے کچھ امریکہ میں ہیں کچھ کینیڈا میں۔ہم خاصے پریشان ہوئے کہ ہم گرم کپڑے ساتھ نہیں لائے اور یہاں پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی ہیں ہوسٹس اعلان کر رہی ہے کہ ہم ذرا ہی دیر میں وینکوور کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں مگر رکھ لی میرے خدا نے میری بیکسی کی شرم! وینکوور اترے تو درجہ حرارت ...... معقول تھا۔کسی گرم کپڑے کی ضرورت نہیں تھی۔معلوم ہوا کہ بحرالکاہل کے

ساحل پر ہونے کی وجہ سے آب و ہوا معتدل ہے اور سارا سال تقریباً معتدل رہتی ہے! کہیں ایک آدھ بار ادھر ادھر کی دیکھا دیکھی درجہ حرارت صفر تک جاتا ہے اور بس! وہ ...... یا ٹورانٹو والا حال نہیں کہ اب کے منفی چالیس پینتالیس درجے تک سردی پہنچ گئی تھی!

وینکوور میں بہت سے عزیزوں دوستوں نے کھانے کی دعوت دی مگر ہمیں سیروں سے فرصت ہوتی تو دعوتیں کھاتے! ادھر جب سے انسولین لگانے کی نوبت آئی ہے دعوتوں کی طرف رغبت بھی کم ہوگئی ہے۔ بھلا میٹھا نہ کھایا جائے تو دعوت کیا ہوئی؟ اور میٹھا کھایا جائے تو انسولین کیا ہوئی، میں اسی ہونے نہ ہونے نے ڈبویا ہے! مگر یوسف ایاز کا قرض سر پر تھا۔ وہ یوں کہ کوئی دو تین ماہ بیشتر یوسف ایاز تک کہ ہمارے پرانے دوست شناسا تھے یہ خبر پہنچی کہ ہمارا1992ء میں دل کا بائی پاس آپریشن ہوا تھا۔ یوسف نے نہایت محبت کے ساتھ عیادت نامہ لکھا اور نیچے لکھ دیا۔ ''آپ کا بھائی یوسف! ہمارے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم نے فوراً جواب لکھا کہ عیادت اپنی جگہ! مگر ہم ہرگز ہرگز آپ کے بھائی نہیں! کیا آپ نے ہمیں ''برادر یوسف'' سمجھ رکھا ہے؟ ٹورانٹو کے جلسہ پر یوسف ایاز سے ملاقات بھی ہوگئی! یوسف نے بے دلی سے دعوت دے ڈالی کہ اگر وینکوور کی طرف آنا ہو تو خدمت کا موقع دیں! ان کا خیال تھا کہ یہ ''برادر یوسف'' اتنی لمبی مار کہاں کرے گا! مگر ادریس شاہین درمیان میں آ گیا! وینکوور میں جمعہ پڑھنے کے لئے مسجد میں گئے تو ہمیں دیکھ کر یوسف ہکا بکا رہ گیا! اس تقریب میں ہمیں یوسف ایاز کے ہاں دعوت بہر حال کھانی پڑی! برادرم مکرم خالد محمود باجوہ اور عزیزہ کٹی کی دعوت تو خیر گھر کی بات تھی کیونکہ سالی کو آدھی گھر والی کہا جاتا ہے۔ اس کی دعوت رد کر کے ہم کہاں جاتے؟ بہر حال وینکوور کی یادیں دل میں سمیٹے بیٹھے ہیں!

واپسی ہوئی تو کنگسٹن سے زکریا ورک پھر آ موجود کہ چلیں آپ کو آٹوا پھرا لائیں۔ کینیڈا کا دارالحکومت ہے۔ ہم نے ضمناً انگلستان کا ویزہ بھی لگوانا تھا کیونکہ تیس کو واپسی تھی اور ہم جلسہ سالانہ

برطانیہ کے درمیانی دن وہاں بھی حاضری لگوانا چاہتے تھے۔ چلے۔ رات کنگسٹن میں زکریا کے ہاں گزاری، اس کی بیوی بشریٰ اور بچوں نے خوب خدمت کی۔ اگلے روز آٹوا گئے۔ عزیزی بصیرحیؔ کے ہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ گروپ کیپٹن حیی صاحب کی عیادت کی! گروپ کیپٹن عبدالحئی صاحب سے ربوہ سے شناسائی اور دوستی تھی۔ دونوں میاں بیوی مثالی جوڑا کہلاتے تھے۔ ہر جگہ اکٹھے نظر آتے۔ مسجد میں، بازار میں، دعوتوں میں، سفر میں حضر میں مگر اب ......کی بیوی کا انتقال ہوا اور......بچارے......کا شکار ہو کر بستر پر پڑ گئے! ہم نے جس گروپ کیپٹن حیی کو دیکھ رکھا تھا وہ موجود نہیں تھے۔ چار پائی پر ایک نہایت کمزور، نحیف اور بے ہوش وجود کو پڑے ہوئے دیکھا۔ سو رہے تھے۔ ہم نے جگانا مناسب نہ جانا۔ انہیں دیکھا زیر لب دعائیں کیں کچھ دیر بصیر کی معیت میں بیٹھے اور پھر اجازت لی! زندگی کتنی عجیب ہے۔ اللہ تعالیٰ صحت وسلامتی سے رکھے تو اس سے بڑی نعمت کوئی نہیں اور کسی آزمائش میں ڈالے تو اس سے بڑی آزمائش کوئی نہیں! اللہ تعالیٰ معاف فرمائے!

ویزہ لگوانے، کھانے اور عیادت کے بعد جو وقت بچا تھا اس میں کینیڈا کی پارلیمنٹ دیکھنے کا ارادہ تھا۔ عزیزی نسیم مہدی نے وزیر اعظم کے پارلیمنٹری اسسٹنٹ کا نام دیا تھا کہ ان سے مل لیں وہ سیر کروادیں گے اور خود انہیں فون کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ مگر وہ وعدہ تو حسب دستور نقش ونگار طاق نسیاں ہو گیا۔ ہم کوئی پونے پانچ بجے پارلیمنٹ ہاؤس پہنچے تو عزیزم زکریا نے ریسپشن سے مسٹر''لے'' کو فون کیا۔ لپک جھپک وہ آ گئے اور نہایت گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ بہت سے دوسرے لوگ اور گروپ ''ہاؤس آف کامنز'' اور ہاؤس آف لارڈز یعنی سینٹ دیکھنے کے منتظر تھے مگر یہ مسٹر''لے'' ہمیں لے چلے۔ سب لوگ منہ دیکھتے رہ گئے۔ ایک گھنٹے تک ہم نے وی آئی پی مہمان کی حیثیت سے سیر کی اور پھر ان صاحب کا شکریہ ادا کر کے رخصت لی!

دوسری رات بھی بشریٰ اور زکریا ورک کی مہمانی میں گزاری۔ اگلے روز زکریا نے بحری جہاز میں

ایک ہزار جزیروں کی سیر کروائی۔ پچھلے پہر میاں بیوی ہمیں واپس ٹورانٹو لے آئے کیونکہ اس شام کو عزیزی ہدایت اللہ ہادی نے دعوت کر رکھی تھی اور ہم بہت دیر سے اپنے اس نہایت عزیز شاگرد اور دوست کی دعوت کو ٹالتے چلے آ رہے تھے۔ مزید ٹال مٹول کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ ہادی سے زیادہ عزیزہ طاہرہ کے ناراض ہونے کا خطرہ تھا کیونکہ وہ میری بیگم کی شاگرد تھیں۔ اور ادھر اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے مشہور زمانہ بہاری کبابوں سے محرومی کا احساس بھی تھا! خیر گزری کہ ہم وقت پر پہنچ گئے۔ مہمانی کا خوب لطف اٹھایا اور جیسا ہم نے اپنی بیگم سے سن رکھا تھا کہ طاہرہ خوب چٹ پٹے اور مزیدار کھانے پکاتی ہیں ہم نے بالکل ویسا ہی پایا۔ اب ان کا ذکر کر کے سرخرو ہو رہے ہیں۔ اگرچہ تھوڑی سی سرخروئی ان کی تتیا مرچ کی وجہ سے پہلے بھی ہو چکی تھی!

عزیزی ہدایت اللہ ہادی کے ذکر کی بات چلی تو یاد آیا۔ کہ اس نے ہائی سکول کے زمانہ میں کالی عینک لگائی تھی، بے چارہ غربت میں بھی لباس کا شوقین تھا۔ ادبی محفلوں میں شیروانی اور شلوار پہنا کرتا تھا۔ ہم نے اس کو جب بھی دیکھا داڑھی مونچھ کے بغیر ہی دیکھا۔ جلسہ سالانہ پر جب بھی کراچی سے ربوہ آتا تو مجھے ضرور ملتا بلکہ بڑے ادب اور پیار سے ملتا۔ لیکن جب میں یہاں آیا تو دوستوں نے مجھے بتایا کہ یہ پہلے پہل نائیجیریا سے کینیڈا تشریف لائے تو کالی عینک بھی پہنتے تھے، کالی داڑھی بھی چھوڑ رکھی تھی! اچکن اور پاجامہ بھی زیب تن فرماتے تھے! رفتہ رفتہ اچکن اتری پھر کالی ڈاڑھی غائب ہوئی پھر آپ نے کالی عینک اتار دی! ہمارے بیٹے عزیزی ماہر احمد نے لقمہ دیا ''یہ سب کچھ اتارنے کے بعد آپ نے اپنے نام سے کالی ڈاڑھی غائب ہوئی پھر آپ نے کالی عینک اتار دی! ہمارے بیٹے عزیزی ماہر احمد نے لقمہ دیا ''یہ سب کچھ سن کر میری حیرانگی کی انتہا نہ رہی اب ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ عزیزی ہدایت اللہ ہادی کے ذکر کے بعد ٹورانٹو میں ملنے والے اور کسی دوست کا ذکر کیا کریں۔

(احمدیہ گزٹ کینیڈا۔ اکتوبر 1994ء صفحہ 16 تا 18)

شعر و سخن

بحضور سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ

ناصر احمد صاحب پرویز پروازی

لب پہ آیا ہے صبح کے ہنگام	ابنِ ابنِ مسیح وقت کا نام
ناصرِ دیں تری خلافت سے	ہے مقدر اشاعتِ اسلام
تیری خواہش اشاعتِ قرآں	تیرا مقصد ہے خدمت اسلام
جو تری بات ہے سو ہے وہ بات	جو ترا کام ہے سو ہے وہ کام
تو نے ہر دل میں بھر دی ہے گویا	آگ بہر اشاعت اسلام
اے کہ نصرت ترا مقصدر ہے	اے کہ ناصر ترا مقدس نام
تو ہی مصداق اس کا ہے الحق	ہے کہ بشریٰ لکم کا جو الہام
کون ہے جو نہیں ہے منت کش	ہے مسلم وہ وقت کا ہے امام
تو غلامِ غلام احمد ہے	میں ہوں تیرا غلام ابنِ غلام
داورِ حشر سے یہ کہہ دوں گا	میں ہوں تیرے حبیب کا ہم نام
جو ترے ساتھ گزرا دن وہ دن	جو ترے پاس گزری شام وہ شام
اک نظر اس طرف کہ میں بھی ہوں	ایک امیدوار رحمتِ عام
میرے الفاظ دے نہیں سکتے	میری خواہش کو صورتِ ارقام
یہ دعا ہے خدائے جلّ و علیٰ	تجھ کو رکھے ہمارے سر پہ مدام

(الفضل ۶ جنوری ۱۹۶۷)

ناصردین بھی ہے حافظ قرآن بھی ہے

آج کے دور میں نمرود کا سامان بھی ہے	رسم فرعون بھی ہے ورثہ ہامان بھی ہے
کفر و الحاد کے نرغہ میں ہے ساری دنیا	موت کے کھیل میں الجھا ہوا انسان بھی ہے
نشہ کبر میں سر مست ہے ہر فرد بشر	شرط ابلیس بھی ہے، غرّہ شیطان بھی ہے
ڈوبتی ناؤ، تلاطم کی جنوں خیز فضا	چار سو پھیلا ہوا حشر کا طوفان بھی ہے
کشتی نوح میں آ جاؤ کہ اس ور میں بھی	موت کے ہاتھ سے بچ جانے کا امکان بھی ہے
ارض ربوہ میں چلے آؤ کہ اس بستی میں	جلوہء حسن بھی ہے، جذبہ احسان بھی ہے
وہ مسیحائے زمانہ ہے یہاں پر موجود!	جس کے سانسوں میں شفا بخشی ایمان بھی ہے
جن کی آنکھوں میں ہے تنویر خلیل الٰہی	جس کے ہاتھوں میں موسیٰ عمران بھی ہے
وہ خدا ساز، خدا کوش، خدا کا محبوب	عظمتِ دین محمدؐ کا نگہبان بھی ہے

’’ناصردین بھی ہے، حافظِ قرآن بھی ہے‘‘

(۱۰ ستمبر ۱۹۶۷ الفضل ربوہ)

دلوں کو تسخیر کرنے والا دلوں کو تسخیر کر رہا ہے

دلوں کو تسخیر کرنے والا دلوں کو تسخیر کر رہا ہے
وہ ناصرِ دیں، ندائے بُشریٰ لکم کی تفسیر کر رہا ہے
فضائے مغرب کی ظلمتوں میں چمک رہا ہے نیا سویرا
دیارِ مشر سے جانے والا، سحر کی تدبیر کر رہا ہے
یہ مسجدِ نصرتِ جہاں وہ محمد مصطفیٰ کا خادم
خدا کی توحید پیش کر کے، بتوں کو تکفیر کر رہا ہے
بنائے الحاد گر رہی ہے خرد بھی دیتی ہے یہ دہائی
مگر وہی قادر و توانا! کہ حسبِ تقدیر کر رہا ہے
وہ کشتی نوح لے کے پہنچا، کہ سر پہ طوفان آ گیا ہے
مگر زمانہ کی بدنصیبی! کہ پھر بھی تاخیر کر رہا ہے

(الفضل ۱۹۔اگست ۱۹۶۷)

غزل

خوشبو کی طرح پیرہن گل سے جدا ہیں
ہم لوگ کہ شہروں میں بھی جنگل کی ہوا ہیں
تم لوگ گئے دور کی دہلیز پہ خم ہو
ہم لوگ نئے دور کا نقشِ کفِ پا ہیں
سینوں میں سلگتے ہوئے نغموں کا دھؤاں ہے
آنکھوں میں چھلکتے ہوئے طوفانِ بلا ہیں
تم داغ ہو نو خیز بہاروں کی جبیں پر
ہم صحنِ گلستان میں باَنذازِ صبا ہیں
مژگاں کی صلیبوں کی طرح دل میں گڑی ہیں
آنسو کہ مسیحا کی طرح حلقہ نما ہیں
رقصاں ہیں مرے ہاتھ میں سائے کے ہیولے
لپٹی ہیں مرے پاؤں سے دیوار کی باہیں

غزل

جو زخم بھر چکا ہے وہی پھر ہرا نہ ہو	اب سوچتا ہوں تو بھی کہیں بے وفا نہ ہو
آنکھوں میں رنگ و نور کے جلوے سمیٹ لو	شاید یہ حشر دید کبھی پھر بپا نہ لو
کودا ہے کون آتشِ نمرود میں، مگر	وہ دل کہ جس میں تیرے سوا دوسرا نہ ہو
وہ شخص جس کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں چارسو	وہ شخص میرے دل میں ہی بیٹھا ہوا نہ ہو

نغمہ، بہار، چاندنی، خوشبو، کرن، کلی

از بس کہ تیری یاد کا کوئی بہانہ ہو

غزل

خاکِ ہوائے دشتِ وفا مل گئی مجھے	چاہا تھا، چاہنے کی سزا مل گئی مجھے
تو مطمئن ہے دولتِ دنیا تجھے ملی	میں مطمئن ہوں اس کی رضا مل گئی مجھے

قرباں ہوا اس مسیحا نفس پر مرا وجود

جس کی گلی میں خاکِ شفا مل گئی مجھے

غزل

ر سنگ سنگ ہے مگر آتش بجان ہے	ہر پھول پھول ہے مگر حرماں نصیب ہے
دیکھو تو دلنواز ہے اس بے وفا کی دھار	سوچو تو رنگ و نور کا خنجر مہیب ہے
ہر شخص شہر داد کا عبد اللطیف ہے	ہر شاخِ گل مسیحِ نظر کی صلیب ہے
غنچہ رموزِ دستِ صبا کا نقیب ہے	لب بستہ ہی سہی مگر کیا خوش نصیب ہے
پت جھڑ کا شور، ڈوبتی نبضیں، خموش پیڑ	ہر مرحلہ شکستِ صدا کا عجیب ہے

لپٹی ہوئی ہے سانس کے پردوں میں تیری یاد
میں جانتا نہ تھا کہ تو اتنا قریب ہے

غزل

حلقہء چشم تحیر سے رہائی دیتا	وہ اگر پاس تھا میرے تو دکھائی دیتا
چار سو اونچی فصیلوں کے سوا کوئی نہ تھا	نوحہء دل زدگان کس کو سنائی دیتا
ظلم جو غیر نہ کر سکتے وہ اپنے کرتے	زہر جو کوئی نہ دے سکتا وہ بھائی دیتا
رات کا پچھلا پہر، چاند، سلگتے لمحے	ایسے عالم میں اگر تو بھی دکھائی دیتا
ان فسوں کار چمکتی ہوئی آنکھوں کے عوض	میں خدا ہوتا تو یہ ساری خدائی دیتا
بند تھے سارے دریچے کہاں دستک دیتے	شہر میں کون سخی تھا جو گدائی دیتا

چاند کی سمت لپکتی ہیں کشیدہ شاخیں
کون ہوتا ہے جو انہیں اِذن رسائی دیتا

غزل

اندھے، گونگے ہیں اور بہرے ہیں	شہر کے لوگ کتنے گہرے ہیں
سوچ پر مصلحت کا پردہ ہے	ذہن پر آہٹوں کے پہرے ہیں
زرد پتوں سے اَٹ گئے رستے	یہ مسافر کہاں پہ ٹھہرے ہیں؟
یہ اُداسی نہیں تبسم ہے	پھول پیلے نہیں سنہرے ہیں
آب ہوتے نہیں جو ظلمت سے	یہ انہی سر پھروں کے زہرے ہیں

گندگی ذہن و دل کی دوہری ہے!
پیرہن جسم پر اکہرے ہیں!

غزل

شہر میں ایک تو ہو میرے علاوہ کوئی	جس پہ اُترا ہو کبھی غم کا صحیفہ کوئی
راستہ چلتے جو مُڑ مُڑ کے تمہیں دیکھتا ہے	غور سے دیکھ کہ شاید ہو شناسا کوئی
کاٹتا پھرتا ہے وہ فصل نئے چہروں کی	جسم پر لے کے نہ نکلے ابھی چہرہ کوئی
روشنی ہے تو ترے ساتھ ہیں سائے کی طرح	بجھ گیا چاند تو پھر ساتھ نہ ہو گا کوئی
لوگ سڑکوں پہ نکل آئے صلیبیں لے کر	جیسے اس راہ سے گزرے گا مسیحا کوئی
دل میں بستا ہے جو اک چاند سا کومل چہرہ	پھر نظر آیا نہ اس چہرہ کے جیسا کوئی
لفظ عاجز ہیں تو اے کوزہ گر عرضِ ہنر	کسی خوشبو سے بنا اس کا سراپا کوئی

یوں سرِ بزم جنوں حرفِ صداقت نہ کہو
بھر کے لے آئے گا پھر زہر کا پیالہ کوئی

غزل

اس شخص کے سینے میں وفا تک بھی نہیں تھی	وہ حبس تھا کمرے میں ہوا تک بھی نہیں تھی
تخلیق کی سولی پہ مجھے کھینچا گیا کیوں؟	میری تو کوئی ایسی خطا تک بھی نہیں تھی
کیا میرے مقدر میں نہ تھا زہر کا پیالہ	کیا جُرم محبت کی سزا تک بھی نہیں تھی

آگے تھا کڑی دھوپ کا تپتا ہوا صحرا
پیچھے ترے قدموں کی صدا تک بھی نہیں تھی

غزل

دل پہ یوں نقش کیا نقشِ وفا کو میں نے	گویا اس گھر میں اُتارا ہے خدا کو میں نے
اب کے برسات میں سب ڈھل گئے یادوں کے نشاں	آشنا سمجھا تھا ساون کی گھٹا کو میں نے
لاکھ کوشش سے اُٹھایا نہ اُٹھا پر نہ اٹھا	چُوم کر چھوڑ دیا سنگِ وفا کو میں نے
جھوم کر رحمتِ یزداں مرے گھر تک پہنچی	اس طرح ہاتھ اُٹھائے تھے دعا کو میں نے
اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا کبھی خود کو لیکن	اپنے کانوں سے سنا اپنی صدا کو میں نے

آئی آواز سردار تو بولے منصور
کون ہے کس نے پکارا ہے خدا کو؟ میں نے!!

غزل

چہرے سجے ہوئے ہیں نظر میں جلا نہیں	کیا سارے شہر میں کوئی درد آشنا نہیں
سوچو تو دھڑکنوں میں بھی شامل ہے اس کی یاد	دیکھو تو دور دور تک اس کا پتہ نہیں
ساحل سے دور موجۂ طوفان کے رُوبرو	لنگر اُٹھا چکا ہوں، مگر ناخدا ہیں
بیلیں جھکی ہوئی ہیں، دریچے اداس ہیں	چہرہ وہ پھول جیسا یہاں پر جو تھا، نہیں
دل میں گڑی ہوئی ہے ترے حسن کی صلیب	لیکن مسیح کوئی مرے درد کا نہیں!
اڈی ہوئی ہے غم کی گھٹا دل کے آس پاس	بادل برس چکا مگر اب تک کھلا نہیں

گزری ہے آرزو کے جھمیلوں میں ساری عمر
میں کس کو ڈھونڈتا ہوں مجھے کچھ پتہ نہیں

غزل

معجزہ دیکھ لیا دل کی شکیبائی کا	پانچواں دور مسیحا کی مسیحائی کا
خوف کے بعد دلوں پر وہ سکینت اتری	کوئی کھٹکا نہ رہا ذلت و رسوائی کا
جیسے اک بارش انوار دلوں پر برسی	جیسے اک ابر کرم برسا توانائی کا
باغ احمد میں نیا پھول کھلا ہے ایسا	چار سو چرچا ہے اس پھول کی رعنائی کا
وقت نے پھینک دئے گوشۂ گمنامی میں	شوق تھا جن کو بہت انجمن آرائی کا

خوش نصیبی ہے کہ ہم دیکھنے والے ٹھہرے
ہر طرف جلوہ خلافت کی پذیرائی کا

غزل

سوچ کے گہرے سمندر میں اُترنا ہو گا	زندگی ڈھونڈتے پھرتے ہو تو مرنا ہو گا
کیسے بے وقت چلے آئے ہو اس کوچہ میں	وقت کالج کا ہے اس وقت وہ گھر نہ ہو گا
کبھی اے دل زدگاں دل تو دکھاؤ اس کو	کیا وہ پتھر ہے کہ پتھر پہ اثر نہ ہو گا
دھول کے ڈر سے نہ یوں چہرے پہ رومال رکھو	اتنے حساس بنو گے تو سفر نہ ہو گا
رات جو شکل بنائے گی وہ صورت ہو گی	دھوپ جو رنگ بھرے گی وہی بھرنا ہو گا
زرد چہرے یہ نہ یوں نقش بناؤ اتنے	تیز بارش میں کوئی رنگ وگرنہ ہو گا

رات یوں سوچتے گزری تو یہ حالت ہو گی
صبح دم سر کو اُٹھاؤ گے تو سر نہ ہو گا

غزل

دل مبتلا ہے اک وفا نا آشنا کے ساتھ	کیسی گرہ لگی ہے ہوا کی ہوا کے ساتھ
مہکا ہوا ہے صبح سے آنگن خیال کا!	آئی ہے تیرے جسم کی خوشبو صبا کے ساتھ
برسا ہے اب کے آنکھ کا بادل کچھ اس طرح	ہر نقش دل سے مٹ گیا نقش وفا کے ساتھ
دل خون خون ہے مگر کیا کیجئے اسے	نسبت ہے اس کو بھی کسی دست حنا کے ساتھ

بھرے پڑے تھے زرد رو پتے حواس کے
آندھی چلی تو لے گئی ان کو اڑا کے ساتھ

(المنار۔جنوری، مارچ 1968ء صفحہ 94)

رہ طلب کا مسافر

رہ طلب کا مسافر تھا اور یگانہ تھا	گدائے عشق بہ انداز خسروانہ تھا
اس احمدی سے تعلق برادرانہ تھا	مرا سلام کا رشتہ بڑا پرانا تھا
وہ شخص بو علی سینا تھا اس زمانہ کا	وہ شخص دانش و حکمت کا اک خزانہ تھا
وہ کائنات کے اسرار کھولنے والا	غلامِ حکمتِ حکمت گر زمانہ تھا
اسے وطن کی ہر اک چیز سے محبت تھی	مگر وطن کا رویہ مخالفانہ تھا
بس اس لئے ہی کہ وہ شخص احمدی کیوں تھا	بس اسی لئے کہ عمل اس کا قادیانہ تھا
وہ بد نصیب نہیں جانتے کہ اس میں بھی	زیاں خود ان کا تھا دوسرے کسی کا نہ تھا

سلا دیا جسے مٹی میں ہم نے پچھلے پھر
وہ ایک شخص نہ تھا پورا اک زمانہ تھا

غزل

خزاں رسیدہ بہاریں، ستم رسیدہ چمن	عیاں ہے دشتِ جنوں میں قدم قدم پہ تھکن
کسے سنائیں کہ دنیا ہے عشرتوں کا فریب	کسے پکاریں کہ الفت کی منزلیں ہیں کٹھن
تمہاری زلف سے باقی ہے بوئے مشکِ ختن	تمہارے حسن سے زندہ بہرِ سر و سمن
افق سے پھوٹی غموں کی بجھی بجھی سی کرن	کچھ اور بڑھ گئی زخم دل و جگر کی جلن

بچھا رہا ہوں تری رہ میں آنسوؤں کی بساط
پلا رہا ہوں جہاں کو مئے سرور و نشاط

(المنار جون 1956ء)

غزل

جو شمع ہم نے جلائی جَلا سکا نہ کوئی	خدا کا نور ہیں ہم کو بجھا سکا نہ کوئی
اُٹھے تھے قیصر و کسریٰ ہمیں مٹانے کو	مٹے خود ایسے کہ ان کو بچا سکا نہ کوئی
رُکیں تو کوہِ گراں ہیں، بڑھیں تو سیل رواں	ہماری راہ میں اب تک تو آ سکا نہ کوئی
دیا ہے ہم نے زمانے کو نور بطحا کا	جو شمع ہم نے جلائی جَلا سکا نہ کوئی
ہمارے دل میں محمدؐ، نگاہ میں اللہ	سوائے ان کی نظر میں سما سکا نہ کوئی
یہ قوم موت کی آغوش میں پنپتی ہے	نڈر وہ ہے اسے اب تک ڈرا سکا نہ کوئی
لَبوں پہ نشھد ان لا الہ الا اللہ	سبق جو ہم نے سنایا سنا سکا نہ کوئی
خدا، خدا ہے وہ قادر بھی ہے توانا بھی	جو اس کے ہو گئے ان کو جھکا سکا نہ کوئی

غزل

آئی سحر تو رات کے سائے ہوا ہوئے	بس اک نظر سے سوختہ جاں کیا سے کیا ہوئے
گریاں ہوئے تو شدت احساس مٹ گئی	چپ ہو گئے تو پنجۂ دست حنا ہوئے
پھرتے ہیں تیری یاد کی خوشبو لیے ہوئے	آوارگانِ شوق بھی باد صبا ہوئے
ہم کارواں سے گرد کی صورت بچھڑ گئے	سیل ہوا نما تھے ہوا کی غذا ہوئے

اک عمر سے تھی درد کی زنجیر پاؤں میں

تیرے اسیر ہو کے ہم گویا رہا ہوئے

غزل

انی معک یا مسرورشہر بنا ہے کوہ طور	چاروں جانب نور ہی نور
نور ہی پاس اور نور ہی دور	انی معك یا مسرورانی معك یا مسرور
تاج خلافت سر پہ تمہارے	ہم بیٹھے ہیں در پہ تمہارے
ہم ہوں تم سے کیسے دور؟	انی معك یا مسرورانی معك یا مسرور
تیرا ہمارے دیس میں آنا	نہیں کسی پر دیس میں آنا
کینیڈا پیار سے ہے معمور	انی معك یا مسرورانی معك یا مسرور
اهلاً سهلاً سب کہتے ہیں	ہم کہتے ہیں جب کہتے ہیں
مرحبا! یا ابن منصور	انی معك یا مسرورانی معك یا مسرور

غزل

آئی سحر تو رات کے سائے ہوا ہوئے	بس اک نظر سے سوختہ جاں کیا سیکیا ہوئے
گریاں ہوئے شدتِ احساس مٹ گئی	چپ ہو گئے تو پنچہ ٔدستِ حنا ہوئے
پھرتے ہیں تیری یاد کی خوشبو لئے ہوئے	آوارگانِ شوق بھی بادِ صَبا ہوئے
ہم کارواں سے گرد کی صورت بچھڑ گئے	سَیل ہوا نما تھے ہوا کی غذا ہوئے

ایک عمر سے تھی درد کی زنجیر پاؤں میں

تیرے اسیر ہو کے ہم گو یا رہا ہوئے

(المنار۔جولائی،ستمبر1965، صفحہ 47)

غزل

کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے؟	اے اسیرانِ حرص و ہوس کچھ کہو
یہ کوئی دجل ہے یا کوئی عدل ہے	باندھ کر ہاتھ مظلوم کو ماردو
کوئی دجل ہے یا کوئی عدل ہے	لوگ مرتے رہیں، بم برستے رہیں،
گھر اجڑتے رہیں، گھر سلگتے رہیں	اک طرف بیٹھ کر غور کرتے رہو
یہ کوئی دجل ہے یا کوئی عدل ہے	بستیاں، بستیاں نہ رہیں

ان میں آباد آبادیاں مٹ گئیں
قہر ہے پھر بھی الزام ان پر دھرو

غزل

کہاں کہاں سے چلی لے کے نذرِ جاں پہنچی	درِ حبیب پہ دنیا کشاں کشاں پہنچی
بنامِ ابنِ مسیح محمدی آئی!	بفیض امرِ مسیحائے دو جہاں پہنچی
یہ آبجوئے غلامِ محمد عربی!	ہے کیو بمرتبہ بحرِ بیکراں پہنچی
وہیں وہیں سے اذانوں کی گونج اٹھی ہے	ندائے اہلِ مسیحا جہاں جہاں پہنچی
رقم ہے مہر و مہ و کہکشاں پہ نام ترا	مری وفا کی حکایت کہاں کہاں پہنچی

ہمارے دل سے نہ یوں کھیلئے حذر کیجئے
ہماری آہ اگر تا بہ آسمان پہنچی

(الفضل 9 فروری 1967ء)

اے محسنِ زمانہ

(پرویز پروازی)

آنکھوں کا نور لے کر، دل کا سرور لے کر
تشنہ لبوں کی خاطر، جامِ طہور لے کر
مرکز میں آ رہا ہے، وہ محسنِ زمانہ
اے محسنِ زمانہ

وہ دین کا فدائی! وہ وقف آشنائی!
پیغامِ وصل لایا، کٹتی ہے اب جدائی!
آنکھوں کے سامنے ہے، وہ جمالِ خسروانہ
اے محسنِ زمانہ

اہل وفا کی خاطر، دینِ خدا کی خاطر
سارا سفر کیا ہے، اس کی رضا کی خاطر
یورپ کو اک لگا ہے، عبرت کا تازیانہ
اے محسنِ زمانہ

دل میں اسے بٹھائیں، قربان ہو ہو جائیں
آنکھوں میں اس کو رکھیں، ہر سانس میں بسائیں
پھر تازہ کر دکھائیں، وہ رسمِ عاشقانہ
اے محسنِ زمانہ

رستہ دکھا کے آیا! اپنا بنا کے آیا!
سوئے ہوئے جہاں کو، آخر جگا کے آیا!
مہمان ہے دو گھڑی کا، دینِ فرنگیانہ
اے محسنِ زمانہ
قرآن کے محافظ! انسان کے محافظ
اس دورِ کج روی میں، ایمان کے محافظ
کبھی میرے حال پر بھی، وہ نگاہِ مشفقانہ
اے محسنِ زمانہ

(الفضل ربوہ 26۔اگست 1967)

رباعی

کیا خوف مجھ کو روزِ جزا کے حساب کا
ہم نام ہوں میں ناصرؔ عالی جناب کا
آنکھیں وہ جیسے نور کی ندی چڑھی ہوئی
چہرہ وہ جیسے، پھول کھلا ہو گلاب کا

پھر فرماتے ہیں: پروفیسر ناصر احمد پرویز پروازی

کٹھن ہیں مرحلے گو ہجر کی فصیلوں کے
بڑے ہیں حوصلے لیکن ترے قتیلوں کے
کبھی تو رحمتِ بارانِ اشک ہوان پر
ترس گئے ہیں کنارے اُداس جھیلوں کے
دلیل بن گیا ان کے لئے ترا چہرہ
اگرچہ لوگ تو قائل نہ تھے دلیلوں سے

غزل

یہ کوئی دجل ہے یا کوئی عدل ہے
کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے
تم کو معلوم ہے سب کو معلوم ہے
پھر بھی اظہار حق میں تساہل کرو
یہ کوئی دجل ہے یا کوئی عدل ہے
روکتے ہی رہو راہ مظلوم کی!
پیش جائے نہ کچھ آہ مظلوم کی
مجلس امن کے پیشہ ور ظالمو!
یہ کوئی دجل ہے یا کوئی عدل ہے

پروازی صاحب کے اشعار کا نمونہ درج ہے۔

جام ایسا پلایا دیا مجھ کو
مر رہا تھا جلا دیا مجھ کو
تری آنکھوں کی جگمگاہٹ نے
اک تماشہ بنادیا مجھ کو

(جنوری تا جون 1965ء، المنار صفحہ 85)

غزل

لگا لو قیمتِ دل تم کڑی کڑی کر کے
متاعِ جاں ہے لُٹے گی دھڑی دھڑی کر کے

رُکے نہیں ہیں کبھی قافلے محبت کے
عدو نے دیکھ لیا ہے بڑی بڑی کر کے

وہ آنکھ چشمِ فلک کو رُلا کے رہتی ہے
جو آنکھ رات کو برسے جھڑی جھڑی کر کے

تمہاری یاد کے بکھرے ہوئے گہر ہم نے
پروئے تارِ نفس میں لڑی لڑی کر کے

سمجھ رہے ہو مرا نطق چھین لو گے تم؟
تو چھین دیکھو مری ہتھکڑی کڑی کر کے

اُڑیں گے وصل کے لمحے سبک سبک ہو کر
کٹیں گی ہجر کی گھڑیاں گھڑی گھڑی کر کے

(الفضل 18اپریل 1997ء صفحہ 4)

اجنبی

اک زمانہ ہوا
ایک گمنام سی
راہ کے موڑ پر
دو مسافر ملے!
چند لمحے رُکے
اور پھر چل دیئے
اجنبی ہو گئے
ان کے دل میں مگر
ایک بے نام سی
آرزو کی کلی
کھل اٹھی!
بات کچھ بھی نہ تھی
اک فسانہ ہوا
اک زمانہ ہوا

ذِکرِ اُردُو

اردو کانفرس

۱۹۶۴ء

شاملین کے اسماء

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

مرزا ناصر احمد

وزیر آغا

سہیل بخاری

وحید قریشی

سجاد باقر رضوی

ممتاز حسین

نسیم سیفی

اردو کانفرنس ۱۹۶۴ء

انتساب

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کے نام

؎ شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

حرف آغاز

سرمۂ مفت نظر ہوں میری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احسان میرا

18اکتوبر1964ءکوتعلیم الاسلام کالج ربوہ کی پہلی کل پاکستان اردوکانفرنس انعقاد پذیر ہوئی۔اس کانفرنس میں ملک کے بعض نامورادباءاورشعراء نے شرکت فرمائی۔جومقالے اس کانفرنس میں پڑھے گئے ان کی افادیت کے پیش نظرانہیں یکجا کر کے شائع کرنے کی سعادت حاصل کرر ہاہوں۔

اردوکانفرنس کے انعقادکامقصد یہ تھا کہ ہم اپنی قومی زبان کی ترویج وترقی کے مسائل پرتعمیری نقطۂ نظرسے سوچ بچارکرسکیں۔مجھے مسرت ہے کہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہماری یہ کانفرنس انتہائی کامیاب رہی۔ہم نے یک گونہ احساس خلوص کے ساتھ ٹھنڈے دل سے اہم مسائل پر خالصۃً علمی نقطۂ نظرسے بحث کر کے اہل فکر کے لئے نئی راہیں متعین کی ہیں۔امید ہے کہ علمی حلقوں میں ہماری یہ کوشش سعیٔ مشکور کا مرتبہ حاصل کرے گی اورارباب نظرکو نئے اندازنظرسے اردو کے مسائل پرغور کرنیکی طرف متوجہ کرسکے گی۔وما توفیقنا الا باللہ العلی العظیم۔

میں صمیم قلب سے ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جواس کانفرس میں حاضرانہ یا غائبانہ شریک ہوئے اوراسے کامیاب بنایا۔فجزاھم اللہ احسن الجزاء

ناصراحمد پروازی

معتمدمجلس استقبالیہ اردوکانفرنس

تعلیم الاسلام کالج ربوہ یکم نومبر ۱۹۶۴ء

خطبہ استقبالیہ

حضرات!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تعلیم الاسلام کالج کی پہلی اردو کانفرنس کی تقریب سے پر میں تعلیم الاسلام کالج اور اپنی طرف جملہ سے مہمان حضرات کا اس تکلیف فرمائی پر تہ دل ادا کرتے ہوئے خوش آمدید کا ہدیہ پیش کرتا ہوں۔

نیز حرف آغاز کے طور پر یہ وضاحت ضروری خیال کرتا ہوں کہ اس کانفرنس کے مقاصد خالصتاً تعمیری اور مثبت ہیں۔ ہم اردو کا مینار تخریب کی منفی اقدار پر استوار نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارے نزدیک سلبی انداز فکر ذہنی افلاس کی علامت ہے۔ زندہ قوموں کی ہزار پہلو ضروریات اپنے اپنے مقام اور محل پر سب کی سب اہم اور ناقابل تردید حیثیت کی حامل ہوا کرتی ہیں۔ لیکن ہمارا موقف یہ ہے کہ ان جملہ قومی تقاضوں کو ضروری خیال کرتے ہوئے بھی میزان عدل کا توازن برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ اور اردو کو وہ ارفع مقام دیا جا سکتا ہے جو اسکا واجبی حق ہے۔

یہ ایک عظیم قومی حادثہ ہے کہ زبان کا مسئلہ جو خالصۃً قومی اور علمی سطح پر حل کیا جانا چاہئے تھا۔ سیاسی نعرہ بازی اور مہمل جذبات کا شکار ہو کر رہ گیا۔ اور سترہ سال کا طویل عرصہ بے کار مباحث اور مجرمانہ غفلت کے ہاتھوں ضائع ہو گیا۔ ہم تو سنتے آئے تھے۔ کہ ہمارے معروف ''ساغر'' کا ایک دور ''صد سالہ دور چرخ'' کہ ہم پلہ ہوا کرتا ہے۔ اور رند جب میکدہ سے نکلتے ہیں تو دنیا بدلی ہوئی پاتے ہیں۔

لیکن یہاں سترہ سال کے بعد بھی ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی اسلئے ضرورت اس امر کی ہے کہ سہل انگاری اور خوش فہمی کے گنبد سے نکل کر ہم حقائق کی دنیا میں قدم رکھیں۔ٹھنڈے دل سے اپنی مشکلات کا جائزہ لیں اور سنجیدگی سے اپنے تعلیمی، تدریسی، علمی، ادبی، لسانی اور طباعتی مسائل کا حل تلاش کریں۔زبان و بیان تلخیص و ترجمہ، رسم الخط اور اسی قسم کے دیگر عقدوں کی گرہ کشائی کی کوشش کریں۔ایسا لائحۂ عمل بنائیں اور اسکی تشکیل ایسے خطوط پر کریں۔جس سے یہ گومگو کی کیفیت ختم ہو اور اس ذہنی دھند سے نجات ملے۔جو قومی افق پر عرصہ سے چھائی ہوئی ہے۔

اس جگہ اس امر کا اظہار بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ اردو کے ساتھ جماعت احمدیہ کا ایک پائدار اور روحانی رشتہ بھی ہے۔حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ علیہ السلام کی اکثر تصنیفات اردو ہی میں ہیں۔اس لئے اردو زبان عربی کے بعد ہماری محبوب ترین زبان ہے۔اسی لئے ساری دنیا میں جہاں جہاں احمدیہ مشن یا احمدی مسلمان موجود ہیں۔وہاں اردو سیکھی اور سکھلائی جا رہی ہے۔زبان اردو کی یہ وہ ٹھوس اور خاموش خدمت ہے۔جو جماعت احمدیہ دنیا کے گوشے گوشے میں کر رہی ہے۔اردو ہماری مذہبی زبان ہے۔یہ ہماری قومی زبان ہے یہ ہماری آئندہ نسلوں کی زبان ہے۔یہ وہ قیمتی متاع ہے جو ہمیں ہمارے اسلاف سے ورثے میں ملی ہے۔اسے اس قابل بنائیے کہ ہماری آئندہ نسلیں اس ورثہ کو سرمایۂ افتخار تصور کریں اور اس پر بجا طور پر ناز کر سکیں۔اور ہماری طرح گونگی اور ''بے زبان'' ہو کر نہ رہ جائیں۔

اردو ایک زندہ قوم کی زندہ زبان ہے۔ادبیات کی اہمیت مسلم۔لیکن یہ نہ بھولئے کہ اردو زبان کا یہ بھی حق ہے کہ شعر و ادب کے روایتی اور محدود دائرے سے باہر نکلے اور زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہو جائے۔ساری دنیا کے دنوں پر اس کی حکومت ہو۔قومیں اسے لکھیں، بولیں اور اس پر فخر کریں اور بین الاقوامی زبانوں کی محفل میں اردو بھی عزت کے بلند مقام پر سرفراز ہو۔

ان دعائیہ الفاظ کے ساتھ میں ایک بار پھر اپنے دوستوں اور بزرگوں کو **اھلاً و سھلاً و مرحباً** کہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے حضور دست بدعا ہوں کہ وہ ہم سب کو ایسا انداز فکر عطا فرمائے اور اس نہج پر کام کرنے کی توفیق دے جو نہ صرف زبان اردو کے لئے بلکہ ہمارے لئے اور ہماری آنیوالی نسلوں کے لئے خیر و برکت کا باعث ہو۔ **اللّٰھم آمین**

مرزا ناصر احمد

ایم اے (آکسن)

پرنسپل تعلیم الاسلام کالج ربوہ

خطبۂ افتتاح

اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے یوں تو بہت اقدامات ضروری ہیں لیکن اس سلسلے میں اردو کانفرنسوں کا انعقاد ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے ملک میں بالعموم ہر تحریک نہ صرف بعض بڑے ثقافتی مراکز سے جنم لیتی ہے بلکہ پروان چڑھنے کے بعد وہیں کی ہو کر بھی رہ جاتی ہے۔ اس سے تحریک میں وہ کشادگی اور وسعت پیدا نہیں ہوتی جو اس کی پوری کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اردو زبان کی ترویج کے سلسلے میں جو تحریکات وجود میں آئیں وہ عام طور سے لاہور اور کراچی ایسے مراکز ہی سے وابستہ رہیں۔ تعلیم الاسلام کالج ربوہ نے اس انجماد کو توڑا ہے اور اردو کانفرنس کے انعقاد سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ اب اردو کے لئے محبت اور اردو کو قومی زبان کا درجہ دینے کی آرزو بڑے بڑے مراکز تک ہی محدود نہیں رہی۔ گویا اس خوشبو کی طرح جو دیوار چمن کو پار کر جاتی ہے اردو زبان کی ترویج و اشاعت کی تحریک بھی اونچی اونچی دیواروں کو پار کر کے افق کے پہاڑوں سے آ ٹکرائی ہے۔ مجھے یقین

ہے کہ آپ نے جو مبارک قدم اٹھایا ہے اس کی ملک کے طول وعرض میں عام طور سے تقلید ہو گی اور ہم اردو زبان کو ملک کے دور دراز گوشوں تک پہنچا سکیں گے آپ کی یہ اردو کانفرنس اس لئے بھی اہم ہے کہ اس کے پس پشت اردو زبان کے لئے بے پناہ محبت کے سوا کوئی اور جذبہ موجزن نہیں۔ اور آپ نے اسے پنجاب کے دیہاتی علاقہ میں منعقد کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو زبان پنجاب کے دور دراز گوشوں میں بھی ویسی ہی مقبول ہے جیسی کہ اردو کے بڑے بڑے مراکز میں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے اردو کانفرنس کے منعقد کرنے کی جو روایت قائم کی ہے اسے ہمیشہ جاری رکھیں گے اور مجھے امید ہے کہ ہمارے ملک کے دوسرے ادارے اس سلسلے میں آپ کے نقش قدم پر چلنے کی پوری کوشش کریں گے۔

وزیر آغا

ایم اے، پی ایچ۔ڈی

پیغامات

اختر حسین

صدر انجمن ترقی اردو۔ پاکستان۔ کراچی

مجھے یہ جان کر بے انتہا مسرت ہوئی ہے کہ آپ ربوہ میں کل پاکستان اردو کانفرنس منعقد کر رہے ہیں۔ اس قسم کے اجتماعات زبان و ادب کے حق میں بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں اہل فکر و نظر کو یکجا ہو کر اہم مسائل پر غور و فکر کرنے کا موقع ملتا ہے اور زبان و ادب کی ترویج کے نئے نئے راستے سامنے آتے ہیں۔

اردو کو اس وقت جو مسائل درپیش ہیں وہ گوناں گوں نوعیت کے ہیں۔ ہماری ایک قدیم کمزوری یہ

ہے کہ ہم ہر معاملے کا جو حل بھی تلاش کرتے ہیں اس میں حکومت سے چند مطالبات ضرور شامل کئے جاتے ہیں اور گا ہے گا ہے انہیں دہرایا جاتا ہے لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اس سلسلے میں کچھ ہمارے بھی فرائض ہیں جن پر ہمیں عمل کرنا چاہیئے۔ مثلاً ہم یہ تو کہہ دیتے ہیں کہ حکومت کی فلاں کارروائی اردو میں نہیں ہوئی، لیکن یہ کبھی نہیں سوچتے کہ خود ہم نے اردو کو کس حد تک اپنایا ہے، اور اسے کس انداز سے اپنی ذات کا ایک جزو بنایا ہے، اردو کے سلسلے میں ہم دوسروں کا محاسبہ تو کر لیتے ہیں لیکن کبھی کبھی اپنا محاسبہ بھی کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس طرح حقوق و فرائض کے معاملے میں ایک خوشگوار توازن پیدا ہو جائے گا۔

آج ہمارا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ اردو کو پاکستان کی دوسری علاقائی زبانوں سے زیادہ سے زیادہ قریب کس طرح لایا جائے۔ میری خواہش ہے کہ اس کانفرنس میں جو اہل علم شریک ہو رہے ہیں وہ اس مسئلے پر پوری طرح سوچ بچار کریں، کیوں کہ ہماری قومی ترقی کے لئے اردو اور علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا بہت ضروری ہے، جو لوگ اردو اور علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے کا حریف سمجھتے ہیں، وہ نہ اردو کے خیر خواہ ہیں نہ علاقائی زبانوں کے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اردو اپنے مزاج و منہاج اور رسم الخط کے اعتبار سے مغربی پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں سے مکمل مماثلت رکھتی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مماثلت کو مزید بڑھایا جائے مجھے توقع ہے کہ آپ اس سلسلے میں ضرور کوئی عملی اقدام کریں گے۔

میں آپ کی کانفرنس کی کامیابی کے لئے دست بدعا ہوں۔

اختر حسین

(صدر)

اشتیاق حسین قریشی

وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی کراچی

مکرمی، زاد عنایتکم

اردو کانفرنس میں شرکت کی دعوت کا شکریہ، میں مشاغل کی کثرت کے باعث شرکت سے معذور ہوں امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔

میرے لئے یہ امر باعث طمانیت ہی کہ مغربی پاکستان میں اپنی قومی زبان کی طرف سے بیداری بڑھتی جاتی ہے آپ کی کانفرنس بھی اسی بیداری کی ایک علامت ہے یہ ظاہر ہے کہ اگر ہم نے جلد از جلد اپنی زبان کو اولیت نہ دی اور اسے تعلیم، تحریر اور تقریر کا ذریعہ نہ بنایا تو نہ ہم کسی قسم کی علمی یا ثقافتی ترقی کر سکتے ہیں اور نہ دنیا کی سرفراز اقوام میں شمار ہو سکتے ہیں۔ ترقی تو در کنار ہمارا احساس کمتری اور گہرا ہوتا جائے گا اور ہم نہ اپنی ثقافت کو بچا سکیں گے نہ اپنی دینی روایات کو برقرار رکھ سکیں گے۔ میری دلی تمنا ہے کہ آپ کی کانفرنس کامیاب ہو اور اردو کی مشعل کو کسی قدر اور بلند کر سکے۔

مخلص۔

اشتیاق حسین قریشی

اردو رسائل زبان کی کس طرح خدمت کرسکتی ہیں

حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب

امام جماعت احمدیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے کہ ہی نغمہ زن و زمزمہ خوان اردو
اے کہ ہے صبح و مسا محو بیان اردو
اس کی پہلے سے ترقی تو مسلم لیکن
بات جب ہے کہ بڑھے اور بھی شان اردو

آج سے تینتیس برس پہلے حضرت امام جماعت احمدیہ ایدہ اللہ تعالیٰ نے ''اردو رسائل زبان کی کس طرح خدمت کر سکتے ہیں''

کے اہم موضوع پر ایک قیمتی مضمون سپرد قلم فرمایا تھا۔ جسے برصغیر پاک و ہند کے نامور ادیب مولانا احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادی نے اپنے رسالہ ''ادبی دنیا'' (مارچ ۱۹۳۱ء) میں آپ کا فوٹو دے کر شائع کیا اس زمانہ میں رسالہ ''ادبی دنیا'' کے نگران اعلیٰ سر عبدالقادر مرحوم تھے اور مدیر مولانا تاجور نجیب آبادی!

علامہ تاجور نے حضور کے مضمون کے ساتھ درج ذیل ادارتی نوٹ تحریر فرمایا اور حضرت امام جماعت احمدیہ کی اردو نوازی اور ادبی خدمات کو شاندار خراج تحسین ادا کیا:

''حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب امام جماعت احمدیہ کی توجہات بیکراں کا میں سپاس گزار ہوں کہ وہ ادبی دنیا کی مشکلات میں ہماری عملی امداد فرماتے ہیں۔

میں نے ان کی جناب میں امداد کی نہ کوئی درخواست کی تھی نہ مجھے احمدی ہونے کا شرف حاصل ہے اور نہ ''ادبی دنیا'' کوئی مذہبی پرچہ ہے مگر حضرت مرزا صاحب اپنی عزیز مصروفیتوں میں سے علم وادب اور علم وادب کے خدمت گزاروں پر توجہ فرمائی کے لئے بھی وقت نکال لیتے ہیں ملکی زبان وادب سے جناب موصوف کا یہ اعتنا ان علماء کے لئے قابل توجہ ہے جو اردو ادب کی خدمت کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔'' (ادبی دنیا مارچ 1931ء)

پھر لکھا: ''امام جماعت احمدیہ مرزا غلام احمد صاحب کے خلف الرشید اور ان کے خلیفہ ہیں مرزا صاحب مرحوم کی تصانیف اردو ادب کا ایک ذخیرہ بیکراں ہیں الولد سر لأ بیہ کے مطابق ان کے نامور فرزند کے دل میں اردو زبان کے لئے ایک لگن اور اردو کے خدمت گزاروں سے ایک لگاؤ موجود ہے۔'' (ادبی دنیا اپریل 1931ء)

(مرتبہ مولانا دوست محمد صاحب شاہد)

اردو رسائل زبان کی کس طرح خدمت کر سکتے ہیں

اردو زبان کی بڑی دقتوں میں سے ایک دقت یہ ہے کہ اس کی لغت کتابی صورت میں پوری طرح مدون نہیں ہے اور نہ اس کے قواعد پورے طور پر محصور ہیں اور نہ مختلف علمی مضامین کے ادا کرنے کے لئے اصطلاحیں مقرر ہیں۔ مولوی فتح محمد صاحب جالندھری نے قواعد کے بارے میں اچھی خدمت کی ہے اور مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق صاحب نے ان کے کام کو جلا دینے میں حصہ لیا ہے۔ لغت کا کام

مولوی نذیر احمد دھلوی نے کیا ہے۔اور اصطلاحات کے لئے ہم عثمانیہ یونیورسٹی کے ممنون ہیں۔انجمن ترقی اردوانہی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بہت کچھ کررہی ہے۔لیکن کام اس قدر ہے کہ کسی ایک شخص یاایک انجمن یاایک ادارہ سے یہ ہوناناممکن ہے۔

اردو کے بھی خواہوں نے میرے نزدیک بعض مشکلات کو جواردوزبان سے مخصوص ہیں نظرانداز کردیاہے۔مثلاً

(۱) وہ سب زبانوں میں عمر میں چھوٹی ہے۔

(۲) حقیقی شاہی گود میں پلنے کا اسے کبھی موقعہ نہیں ملا۔جو زبان کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔

(۳) اصل میں تو تین لیکن کم سے کم دو مائیں اس کی ضرور ہیں اور مصیبت یہ ہے کہ دونوں سگی ہیں۔ہرایک اپنی تربیت کا رنگ اس پر چڑھانا چاہتی ہے۔اور جب ان کا آپس میں اتحاد نہیں ہوسکا تو دونوں اپنا غصہ اس معصوم پر نکالتی ہیں۔میں نے تو جہاں تک غور کیا ہے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس وقت جھگڑا یہ نہیں کہ اہل سنسکرت اردو کو اپنا بنانے کو تیار نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ اسے صرف اپنا ہی بنائے رکھنے پر مصر ہیں اور عربی فارسی والوں کے سایہ سے اس نونہال کو دور رکھنا چاہتے ہیں۔اور یہی حال ان کا بھی ہے۔

(۴) ہمارا علمی طبقہ غیرزبانوں میں سوچنے کا عادی ہوگیا ہے۔اوراس وجہ سے اس کی تحقیق وتفتیش سے اردو نفع نہیں اُٹھاسکتی۔

(۵) ٹائپ نہ ہونے کے سبب آنکھوں کواس کے حروف سے وہ موانست نہیں پیدا ہوتی جو ٹائپ پر چھپنے والی زبانوں کے حروف سے ہوجاتی ہے اوراس وجہ سے لوگوں میں شوق تعلیم سرعت سے ترقی نہیں کرسکا اور کتابوں کی اشاعت وسیع پیمانے پر نہیں ہوسکی۔انسان بارہ تیرہ قسم کے ٹائپوں کا عادی تو

ہوسکتا ہے لیکن ہزاروں قسم کا نہیں اور اردو زبان کے جتنے کاتب ہیں گویا اتنے ہی ٹائپ ہیں جس کی وجہ سے طبیعتوں پر ایک غیر محسوس بوجھ پڑتا ہے اور تعلیم کا ذوق کم ہوجاتا ہے۔

ان مشکلات کی وجہ سے اُردو کی ترقی کے رستے میں دوسری زبانوں کی نسبت زیادہ مشکلات حائل ہیں مگر میرے نزدیک وہ ایسی نہیں کہ دور نہ کی جاسکیں۔ اب تک نقص یہی رہا ہے کہ مرض کی تشخیص نہیں کی گئی اور اس کی وجہ سے لازماً علاج بھی صحیح نہیں ہوا اگر اردو عمر میں اپنی بہنوں سے چھوٹی تھی تو اس کے لئے اس قسم کی غذا کا بھی انتظام ہونا چاہیے تھا۔ اور اگر وہ شاہی گود سے محروم تھی تو کیوں نہ اسے جمہوریت کی گود میں ڈال دیا گیا جس کی حفاظت شاہی حفاظت سے کسی صورت میں کم نہیں۔ بلکہ اصل بادشاہت تو اس کی ہے۔ اگر اس کی تربیت کے متعلق اختلاف تھا تو یہ صورت حالات پیدا کرنے کی بجائے کہ جس کا بس چلا وہ اسے اپنے گھر لے گیا وہی کیوں نہ کیا گیا جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے اس وقت کیا تھا جب خانہ کعبہ کی تعمیر جدید کے موقعہ پر حجر اسود کو اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھنے کے سوال پر مختلف قریش خاندانوں میں جھگڑا پیدا ہوگیا تھا۔ اور انہوں نے ایک چادر بچھا دی اور اس پر حجر اسود اپنے ہاتھ سے رکھ کر سب قوموں کے سرداروں سے کہا کہ وہ اس چادر کے کونے پکڑ لیں۔ اور اس طرح سب کے سب اس کے اٹھانے میں برابر کے شریک ہوجائیں۔ اسی طرح اگر اردو، سنسکرت اور عربی کی مشترک تربیت میں دے دی جاتی تو یہ جھگڑا ختم ہوسکتا تھا۔

ٹائپ کا سوال مختلف قسم کا سوال ہے لیکن اگر مذکورہ بالا باتوں کی طرف توجہ ہوتی تو بہت سے لوگ اسے حل کرنے کی طرف بھی مائل ہوجاتے۔ اور الحمد للہ کہ اس وقت حیدرآباد میں بہت سے ارباب بصیرت اس کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔

میری ان معروضات کا مطلب یہ ہے کہ اردو کی ترقی کے لئے ایسے ذرائع اختیار کرنے چاہئیں کہ

ایک محدود جماعت کی دلچسپی کا مرکز بننے کی بجائے جمہور کو اس سے دلچسپی پیدا ہو۔ خالص علمی رسائل صرف منتخب اشخاص کی توجہ منعطف کرا سکتے ہیں۔ اور زبانیں چند آدمیوں سے نہیں بنتیں خواہ وہ بہت اونچے پایہ کے کیوں نہ ہوں۔ قاعدہ یہ ہے کہ زبان عوام الناس بناتے ہیں اور اصطلاحیں علماء۔ اردو بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتی۔

پس اگر ہم اردو کی ترقی کے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو اس کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ ہمارے ادبی رسالوں میں اس کے علمی پہلوؤں پر بحثیں ہوں تا کہ صرف پیش آنے والی مشکلات کے علاج کا ہی سامان نہ ہو بلکہ عوام الناس بھی ان تحقیقات سے واقف ہوتے جائیں۔ اس وقت خدا تعالیٰ کے فضل سے کئی اردو رسائل کامیابی سے چل رہے ہیں۔ اگر ان رسائل میں چند صفحات مستقل طور پر اس بات کے لئے وقف ہوجائیں کہ ان میں اردو زبان کی لغت یا قواعد یا اصطلاحوں وغیرہ پر بحثیں ہوا کریں گی تو یقیناً تھوڑے عرصہ میں وہ کام ہوسکتا ہے جو بڑی بڑی انجمنیں نہیں کرسکتیں۔ اور بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جو نئی نئی اختراعیں ہوں گی یا الفاظ کے استعمال یا قواعد زبان کے متعلق جو پہلو زیادہ وزنی معلوم ہوگا عام لوگ بھی اس کو قبول کرلیں گے۔ کیونکہ دلچسپ اردو رسائل میں چھپنے کی وجہ سے وہ سب مضامین ان کی نظروں سے بھی گذرتے رہیں گے۔ ہاں یہ مدنظر رہے کہ مضمون ایسے رنگ میں ہو کہ سب لوگ اسے سمجھ سکیں۔ اس قسم کے مضامین کی اشاعت کا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہمارے ہندو بھائی بھی ان بحثوں میں حصہ لے سکیں گے اور اس میں کیا شک ہے کہ بغیر ان کی مدد کے ہم یہ کام نہیں کرسکتے۔ کیونکہ اردو میں بہت سے لفظ سنسکرت اور ہندی بھاشا کے ہیں اور ان کی اصلاح یا ان میں ترقی بغیر ہندوؤں کی مدد کے نہیں ہوسکتی۔ ان کی شمولیت کے بغیر یا تو وہ حصہ زبان کا نامکمل رہ جائیگا۔ یا اسے بالکل ترک کر کے اس کی جگہ عربی الفاظ اور اصطلاحیں داخل کرنی پڑیں گی اور یہ دونوں باتیں سخت مضر

اور اردو کی ترقی کے راستہ میں روک پیدا کرنے والی ہونگی۔

اس تمہید کے بعد میں ایڈیٹر صاحب ادبی دنیا اور دوسرے ادبی رسائل سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ ان باتوں میں مجھ سے متفق ہوں تو اپنے رسائل میں ایک مستقل باب اس غرض کے لئے کھول دیں لیکن انہیں ان مشکلات کا بھی اندازہ کر لینا چاہیے جو اس کام میں پیش آئینگی۔ مثلاً یہ کہ جو سوالات اٹھائے جائیں گے انہیں حل کون کرے گا؟ بالکل ممکن ہے کہ جواب دینے والے ایسے لوگ ہوں جن کا کلام سند نہ ہو یا جن کے جواب تسلی بخش نہ ہوں۔ یا کوئی شخص جواب کی طرف توجہ ہی نہ کرے۔ اگر صرف رسالہ کے ادارہ نے جواب دیئے تو پھر اول تو اصل مطلب فوت ہو جائیگا۔ دوم ممکن ہے کہ اس سے وہ اثر پیدا نہ ہو سکے۔ جو اصل مقصود ہے لہذا اس مشکل اور اس قسم کی دوسری مشکلات کے حل کے لئے میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ جو رسالہ اس تحریک پر عمل کرنا چاہے اس میں ایک ادبی کلب قائم کر دی جائے۔ ادارہ کی طرف سے متعدد بار تحریک کر کے رسالہ کے خریداروں کے نام ظاہر کریں جو خریدار مستند ادیب ہیں ان سے اصرار کر کے اپنا نام پیش کرنے کے لئے کہا جائے۔ ایسے تمام خریداروں کے نام ایک رجسٹر میں جمع کر لئے جائیں۔ اور انہیں ادبی کلب کا ممبر سمجھا جائے چونکہ بالکل ممکن ہے کہ بہت سے ادیب اور علماء جن کی امداد کی ضرورت سمجھی جائے رسالہ کے خریدار نہ ہوں۔ اس لئے ایسے لوگوں کی ایک فہرست تیار کی جائے اور رسالہ کے مستطیع خریداروں کی امداد سے ان کے نام رسالہ مفت ارسال کیا جائے۔ اور ان کا نام اعزازی ممبر کے طور پر کلب کے رجسٹر میں درج کر لیا جائے۔

تمام ممبروں سے امید کی جائے کہ جب کبھی کوئی سوال (۱) اردو لغت کے متعلق۔ (۲) نحوی قواعد کے متعلق (۳) بعض علمی خیالات کے ادا کرنے میں زبان کی دقتوں کے متعلق (۴) محاورات کے متعلق (۵) تذکیر و تانیث اور جمع کے قواعد کے متعلق۔ (٦) پرانی اصطلاحات کی تشریح یا نئی

اصطلاحات کی ضرورت کے متعلق پیدا ہو تو بجائے خود حل کر کے خود ہی اس سے لطف حاصل کرنے کے وہ اس سوال کو رسالہ کے ادبی کلب کے حصہ میں شائع کرائیں۔خواہ اپنا حل بھی ساتھ ہی لکھ دیں یا خالی سوال ہی لکھ دیں۔ان سے یہ بھی امید کی جائے کہ جب کوئی ایسا سوال شائع ہو تو وہ اس کا جواب دینے کی کوشش کیا کریں۔

ملک اردو علم و ادب کے لحاظ سے چند حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔مثلاً (1) دھلی اور اس کے مضافات (2) لکھنؤ اور اس کے مضافات (3) پنجاب (4) رامپور اور اس کے مضافات (5) بھوپال اور اس کے مضافات (6) آگرہ اور اس کے مضافات۔ (7) اعظم گڑھ اور الہ آباد اور اس کے مضافات۔(8) بہار۔(9) حیدر آباد۔

اس طرح علمی لحاظ سے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

(1) اسلامی یعنی عربی اور فارسی اثر۔(2) ہندو یعنی سنسکرت اور ہندی بھاشا اثر۔

جب سوالات رسالہ کے دفتر میں آئیں تو ادارہ انہیں مختلف حصوں میں تقسیم کر دے مثلاً جو سوال کسی لفظ کے استعمال اس کی شکل۔اس کی تذکیر و تانیث کے متعلق ہوں انہیں ایک جگہ جمع کر کے شائع کرے اور ان کے متعلق مذکورہ بالا حلقوں کے احباب سے درخواست کرے کہ وہ نہ صرف اپنی علمی تحقیق بتائیں بلکہ یہ بھی بتائیں کہ ان کے علاقہ میں وہ لفظ اردو میں استعمال ہوتا ہے یا نہیں۔اگر ہوتا ہے تو کس شکل میں۔اور کن کن معنوں میں؟ اس طرح دو فائدے حاصل ہونگے ایک تو اس امر کا اندازہ ہو جائے گا کہ اس خاص لفظ یا محاروہ کے متعلق اردو بولنے والوں کی اکثریت کس طرف جا رہی ہے۔ اور اس سے اردو کی ترقی کی رو کا اندازہ ہو سکے گا۔دوسرے علمی تحقیق بھی ہو جائیگی اور پڑھنے والوں کی طبائع فیصلہ کر سکیں گی کہ اس بارہ میں اردو کے حق میں کونسی بات مفید ہے۔آیا تحقیق کی پیروی کرنی

چاہیئے یا غلط العام کی تصدیق کہ یہ دونوں باتیں اپنے اپنے موقع پر زبان کی ترقی کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اسی طرح جس لفظ کے متعلق بحث ہو اگر سنسکرت یا ہندی بھاشا اس کا ماخذ ہو تو اس کے علماء کو اور عربی فارسی ماخذ ہو تو اس کے علماء کو اس پر روشنی ڈالنے کی طرف توجہ دلائی جائے۔ اس طرح اور بہت سی تقسیمیں کی جاسکتی ہیں جو اس کلب کو زیادہ دلچسپ بنانے کا باعث ہوسکتی ہیں کلب کا کام فیصلہ کرنا نہ ہو بلکہ ہر پہلو کو روشنی میں لانا ہو۔

اسی طرح جدید اصطلاحات کی ضرورتوں کو کلب کے صفحات میں شائع کیا جائے اور بحث کی طرح اس طریق پر نہ ڈالی جائے کہ خالص عربی یا خالص سنسکرت اصطلاحات لے لی جائیں بلکہ تحریک یہ کی جائے کہ وہ خیال جس کے ادا کرنے کی ضرورت پیدا ہوئی ہے۔ اس کے متعلق کلب کے ممبر پہلے یہ بحث کریں کہ اس خیال کا کس اردو لفظ سے تعلق ہے۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ وہ لفظ کس زبان کا ہے اور آیا اس لفظ سے جدید اصطلاح کا بنانا آسان ہوگا۔ اگر عام رائے اس کی تائید میں ہو تو پھر اس زبان کے ماہروں سے درخواست کی جائے کہ وہ اس کے متعلق اپنا خیال ظاہر کریں۔ کیونکہ جس زبان کا لفظ ہو اس کے ماہر اس کے صحیح مشتقات پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ اردو رسائل کے ادارے تو پہلے ہی بوجھوں تلے دبے پڑے ہیں وہ اتنی پیچیدہ سکیم پر کس طرح عمل کر سکتے ہیں۔ لیکن اول تو یہ سکیم عمل میں اسقدر پیچیدہ اور توجہ طلب نہ ہوگی جس قدر کاغذ پر نظر آتی ہے۔

دوسرے اس قسم کے کلب جیسا کہ یورپ کا تجربہ ہے ہمیشہ رسائل و اخبارات کی دلچسپی اور اور خریداری بڑھانے کا موجب ہوتے ہیں اس لئے جو رسالہ اس کام کو شروع کرے گا وہ میرے نزدیک مالی پہلو سے فائدہ میں رہے گا۔ تیسری یہ بھی ضروری نہیں کہ فوراً اس ساری سکیم پر عمل کیا جائے ہوسکتا

ہے کہ کلب جاری کر کے صفحات مقرر کئے بغیر اور اس طرح مضامین تقسیم کئے بغیر جس طرح میں نے بیان کیا ہے کام شروع کر دیا جائے۔ پھر جوں جوں ادارہ اور کلب کے ممبروں کو مشق ہوتی جائے کام اصول کے ماتحت لایا جائے تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے اور بس۔ ادبی دنیا کے لئے اور اگر کوئی اور رسالہ اس تحریک پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ضرورت ہو تو میں اس بحث کو واضح کرنے کے لئے اور اس تحریک سے لوگوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے بشرط فرصت اور مضامین بھی لکھ سکتا ہوں۔''

(رسالہ ادبی دنیا مارچ ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۸۶ تا ۱۸۸)

ادب اور زندگی کا رشتہ۔ سجاد باقر رضوی

اگر کوئی سکہ کثرت استعمال سے اتنا گھس جائے کہ اس پر کوئی نشان باقی نہ رہے یا کوئی نوٹ پرانا ہو جائے اور پھٹ جائے تو ہم ایسے سکوں اور نوٹوں کو اوّل تو قبول نہیں کرتے اور اگر قبول کرتے ہیں تو بہ جبر واکراہ اور پھر انہیں جلد از جلد اپنی جیب سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ کچھ اسی قسم کا رویہ موضوعات اور تصورات کے ساتھ بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ ہم ایسے موضوعات کے بارے میں جو روزمرہ کے لین دین کی وجہ سے پرانے نوٹوں کی طرح میلے اور بدنما ہو جاتے ہیں یا تو سوچتے نہیں اور اگر مجبوراً سوچنا پڑے تو جلد ہی انہیں ذہن سے خارج کر دیتے ہیں۔

''ادب برائے زندگی'' اور ''ادب برائے ادب'' کے بارے میں اردو کا تنقیدی سرمایہ کسی حیثیت

سے کم نہیں ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ان موضوعات پر اتنا زیادہ سوچا اور لکھا گیا ہے کہ اب ان میں اضافے کی کوشش کا مطلب بے جا تکرار ہوگا۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ جن موضوعات کی ذیل میں میری ذہنی نشوونما ہوئی ہے ممکن ہے وہی موضوعات مجھ سے کم عمر طالب علموں اور دانشوروں کے لئے نئے ہوں اور ایسے میں محض پچھلی باتوں کو دھرا دینا بھی کوئی عیب نہ ہوگا۔ مگر اب جبکہ اس احساس کے تحت میں چند باتیں کہنے کھڑا ہوا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے اردو کے سارے جانے پہچانے ادیب صف آرا ہو گئے ہیں جنہوں نے اس مسئلہ پر بلا واسطہ یا بالواسطہ کوئی نہ کوئی بات ضرور کہی ہے۔ اور جب میں ان سے آنکھیں چراتا ہوں تو اردو ادب کی دو بڑی تحریکیں سامنے ابھر آتی ہیں۔............ ''ترقی پسند تحریک'' اور ''ارباب ذوق'' کی تحریک۔...... یہ دونوں تحریکیں انہیں دو موضوعات کی بنیاد پر ایک مدت تک آپس میں دست و گریبان رہی ہیں۔

لیجئے ایک لمحہ کے لئے میں اپنی آنکھیں بند کرتا ہوں اور اندھیرے میں ایک خاص زاویئے سے روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس طرح اس بات کا امکان ہے کہ حقائق، جو ہر جانب بکھرے پڑے ہیں کسی خاص ترتیب سے میرے سامنے آ جائیں۔............ آخر آپ اپنے سکوں اور نوٹوں کو بینک سے تبدیل بھی تو کر سکتے ہیں .... پرانے موضوعات پر نئے زاویوں سے نگاہ ڈالنا ....انہیں نئے سرے سے مرتب کرنا، ان کا ازسرنو تجزیہ کرنا، اور اس طرح انہیں نئے مفاہیم سے روشناس کرنا بھی تو کسی قدر اور اہمیت کا کام ہے؟ ذرا غور کیجئے تو پتہ چلے گا کہ زمانۂ قدیم سے لیکر آج تک اکثر مسائل عہد بہ عہد اپنا سر اٹھاتے رہے ہیں، عہد بہ عہد اکثر سوالات کی نوعیت ایک ہی رہی ہے البتہ ہر عہد میں مسائل کے حل اور سوالات کے جواب، عہد کے تقاضوں کے مطابق مختلف ہو جاتے ہیں۔ گویا سونا ہر عہد میں ایک ہی ہوتا ہے مگر ہر زمانہ اپنے اپنے فیشن اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق

زیورات ڈھالتا ہے۔ لیجئے، میں بھی اس پرانے سوال کا، کہ ادب اور زندگی کے درمیان کیا رشتہ ہے، آج کے تقاضوں کے مطابق، جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تاہم، آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں ذرا اس سوال کو الٹ پلٹ کر دیکھ لوں۔

اب آپ بھی میرے اس کام میں میرا ہاتھ بٹائیں اور اس سوال کو دو مختلف سمتوں سے دیکھیں (۱) زندگی کی طرف سے۔ اس سوال کو زندگی کی طرف سے دیکھئے تو ضمنی سوالات یہ ہوں گے:۔

(۱) ادب کی تخلیق میں زندگی کا کیا رول ہوتا ہے؟

(۲) زندگی کس طرح ادبی تخلیق کے لئے محرکات و موضوعات فراہم کرتی ہے؟

(۳) معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات ادب کی تخلیق پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں؟

(۴) زندگی میں ادب کا کیا مقصد ہے اور اس کی افادیت کیا ہے؟

آپ یہ بات نہ بھولئے کہ آپ زندگی کی طرف کھڑے ہیں اور جب زندگی کی طرف رہ کر آپ ان ضمنی سوالات کے جواب دیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ادب کو بھی زندگی کے دوسرے عوامل کی طرح ایک عمل سمجھیں گے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ادب تجارت، سیاست، قانون اور انجینیر نگ کی طرح فعال عمل نہیں ہے اور جب آپ اس عمل کا مقابلہ دوسرے عوامل سے کریں گے تو پھر ادبی تخلیق کے عمل کو شک کی نظر سے دیکھیں گے۔ ادب سیاست اور معاشی سرگرمیوں کی طرح زندگی پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتا اور شاید اسی لئے آپ اس عمل کو دیگر عوامل کی طرح سنجیدہ عمل نہیں سمجھیں گے۔ آپ کے ذھن میں ایک موٹا سا، سامنے کا سوال پیدا ہوگا کہ زندگی میں کونسا عمل بنیادی اہمیت کا حامل ہے! ماچس بنانے کا عمل جس کی غیر موجودگی میں بے شمار گھروں میں آگ نہیں سلگے گی یا شعر کہنے کا عمل جس کا بظاہر زندگی پر کوئی اثر نہیں ہوتا یا کم از کم اتنا فوری اور روشن اثر نہیں ہوتا جتنا کہ ماچس کی

ایک تیلی کا ہوتا ہے۔

اب آپ تھوڑی سی زحمت اٹھائیں اور دوسری طرف آ کر اسی سوال کو ادب کی طرف سے پرکھیں دیکھا، آپ نے رخ بدلا تو اب آپ کے ضمنی سوالات کی نوعیت بھی بدل گئی (کیا آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ دنیا کے متعلق بلکہ دنیا کی ہر چیز کے متعلق آپ کے تصورات کا تعین وہ سمتیں کرتی ہیں جنکے مطابق آپ ان چیزوں کو دیکھتے ہیں) لیجئے، اب آپ کے ضمنی سوالات یہ ہو گئے:

(۱) ادب کا زندگی پر کیا اثر ہوتا ہے اور وہ زندگی پر کیسے اثر انداز ہوتا ہے؟

(۲) معاشرے کے طرز احساس کی تربیت میں ادب کا کیا حصہ ہے اور طرز احساس کی بدولت معاشرے کا فکری وشعوری

نظام کس طرح متاثر ہوتا ہے؟

(۳) معاشرے کے افراد کی جذباتی تنظیم اور تزکیہ نفس کے لئے ادب کیا کام سرانجام دیتا ہے۔

(۴) اگر کسی قوم کی تخلیقی قوتیں اس کے افراد کے جذبات واحساسات تخیل اور وجدان، قوت مشاہدہ اور عرفان کی بدولت رونما ہوتی ہیں، تو ادب ان قوتوں کو تیز تر کرنے اور ان صلاحیتوں کی جلا کے لئے کیا کرتا ہے؟

اور اب اگر آپ ان ضمنی سوالات کے جوابات دیں تو ایسا معلوم ہوگا گویا ادب اور فن کو زندگی پر فوقیت حاصل ہے اس لئے کہ زندگی کو نکھارنے اور اسے اعلیٰ سطحوں پر لے جانے کا کام ادب ہی سرانجام دیتا ہے۔ یورپ میں جب ''ادب برائے ادب'' کے دعویداروں نے اس زاویہ سے زندگی کو دیکھا تو انہیں زندگی ادب کے مقابلے میں پست وحقیر نظر آنے لگی۔ ادبی سرگرمی زندگی کی دوسری سرگرمیوں کے مقابلے میں اعلیٰ وارفع معلوم ہوئی اور پھر کسی نے ادب کی بلندیوں سے زندگی کی پستیوں

کو دیکھا تو یہ محاکمہ صادر کیا کہ ''اگر یہی زندگی ہے تو ہمارے ملازم بھی ہمارے لئے جی لینگے''

آپ نے دیکھا، ادب اور زندگی کے رشتوں کو زندگی اور ادب کی دو مختلف سمتوں سے دیکھنے کا نتیجہ دو مختلف نظریات کی صورت میں رونما ہوا۔ جنہوں نے ادب کو زندگی کی طرف سے دیکھا وہ زندگی کو مقصد اور ادب کو ذریعہ سمجھنے لگے، اور ''ادب برائے زندگی'' کے قائل ہوئے۔ اس کے برخلاف وہ جنہوں نے زندگی کو ادب کی طرف سے دیکھا وہ ادب کو مقصد اور زندگی کو ذریعہ سمجھنے لگے اور ''ادب برائے ادب'' کے قائل ہوئے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر دو نقطہائے نظر کے لوگ زندگی اور ادب کی دوئی کے قائل ہیں اور اسی لئے ان میں تضاد دیکھتے ہیں۔ دراصل ایسا نہیں ہے اگر وہ فی الواقعی زندگی اور ادب کی دوئی کے قائل ہوتے تو زندگی کو زندگی اور ادب کو ادب رہنے دیتے۔ وہ ادب اور زندگی میں تضاد تو ضرور دیکھتے ہیں مگر تضاد کو حل کرنے اور دوئی کو اکائی میں ضم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادب برائے زندگی والے ادب کو زندگی بنانے کی سعی کرتے ہیں اور ادب برائے ادب والے پوری زندگی کو ادب بنا دینا چاہتے ہیں۔ تضادات کو حل کرنے اور دوئی کو اکائی میں تبدیل کرنے کی کوشش رومانوی ذہن کی خصوصیت ہے۔ ''ادب برائے زندگی'' کا نظریہ رومانوی حقیقت پسندی (Romantic Realism) کا نتیجہ ہے اور ''ادب برائے ادب'' کا نظریہ رومانوی عینیت پرستی (Romantic Idealism) پیداوار ہے۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے اور شاید آپ بھی اس بات میں میرے ہم خیال ہوں کہ زندگی اور ادب دونوں اپنی اپنی جگہ علیحدہ علیحدہ واضح حقیقتیں ہیں، جن میں آپس کے لین دین اور مماثلتوں کے باوجود تضاد موجود ہے، اور جو ایک دوسرے کا بدل نہیں ہوسکتیں۔ ان دو حقیقتوں کے تضاد کو حل کرنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے روشنی اور اندھیرے کے تضاد کو حل کرنے کے لئے روشنی اتنی تیز کردی جائے کہ آنکھیں

چندھیا جائیں۔ مجھے معاف کیجئے، میں نے زندگی اور ادب کے تضاد کو واضح کرنے میں ذرا جلد بازی سے کام لیا ہے۔ دراصل یہ بات آج کی نہیں ہے۔ زندگی اور ادب کی کشمکش بہت پرانی ہے اور اس کی جڑیں عہد قدیم تک جاتی ہیں۔ مختلف زمانوں میں ادب اور شاعری کے خلاف احتجاج بلند ہوتے رہے ہیں۔ کبھی فلسفہ کے نام پر، کبھی اخلاقیات کے نام پر، کبھی سیاست کے نام پر اور کبھی عملی زندگی کے نام پر۔............اور یہ بات کہ ''ادب برائے ادب'' کے مبلغین نے مدافعتی کارروائی کو ترک کر کے زندگی پر براہ راست حملہ شروع کر دیا تو یہ بات اردو ادب میں تو بالکل ہی نئی ہے اور یورپ میں انیسویں صدی کے اواخر سے شروع ہوئی۔

ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ زندگی اور ادب کے تضاد کی بنیاد عقل اور جذبہ کے تضاد پر ہے۔ یوں کہیے کہ ایک طرف تو عقل و شعور، فکری اور تنظیمی اصول زندگی ہے اور دوسری طرف جذبہ، تخیل، وجدان اور تخلیقی اصول زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفہ، اخلاقیات اور سیاست نے جو فکری و تنظیمی اصول زندگی کے تابع ہیں، ادب و فن کو، جن میں جذبہ، تخیل، وجدان یا تخلیقی اصول زندگی کا بھرپور اظہار ہوتا ہے، ہمیشہ اپنا حریف گردانا۔ اور یہی وجہ ہے کہ افلاطون اور مولانا حالی دونوں تخلیقی اصولوں سے خائف سے نظر آتے ہیں اور انہیں تنظیمی اصولوں کے تابع بنانا چاہتے ہیں۔ اور اب اگر آپ جذبہ کو عقل کا حریف مانتے ہوئے، جذبے کی طرف آ گئے تو آپ صوفی ہو جائیں گے اور اگر دوسری طرف چلے گئے تو نیچری یا کم از کم عقلیت پرست ہو جائیں گے اور پھر سید احمد خان کی طرح یہ کہیں گے کہ الفاظ کو محض مطالب و مفاہیم کی ادائیگی کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ یعنی استعارے کا خوف۔ اور اگر سید احمد خان کے برخلاف استعاروں اور علامتوں کے گورکھ دھندے میں پھنس گئے اور انہیں مقصود بالذات سمجھنے لگے تو جدید ترین شاعری پیدا ہوگی۔ یعنی مطالب و مفاہیم سے عاری۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ ہوا۔ میں تو اس تضاد کی بات کر رہا تھا جو ایک طرف جذبہ، تخیل اور وجدان اور دوسری طرف عقل و فکر کی صورت میں موجود ہے اور اسے میں ادب اور زندگی کے تضاد کی بنیاد بتا رہا تھا یوں کہ زندگی کو منظم کرنے اور اسے سمجھنے کا کام عقل و فکر اور خیالات و نظریات کرتے ہیں، جنہیں میں زندگی کے "تنظمیں اصول" کا نام دیتا ہوں۔ ادب کے اساسی عناصر، جذبہ، تخیل اور وجدان ہیں اور انہیں میں "تخلیقی اصول زندگی" سے موسوم کرتا ہوں۔ اور اب آپ جذبہ اور عقل کے تضاد اور کشمکش کو، ادب اور زندگی کے تضاد اور کشمکش کو "تخلیقی اصول زندگی" اور "تنظیمی اصول زندگی" کا تضاد اور کشمکش سمجھ لیں۔

میں نے خواہ مخواہ مسئلے کو پیچیدہ بنا دیا ہے، میں آپ سے اس کی معافی چاہتا ہوں۔ دو سیدھے سادے جملوں میں بات اتنی سی ہے کہ ادب اور زندگی کے رشتہ کا ایک پہلو منفی ہے یعنی تضاد اور کشمکش۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ میں آپ کو ایک اور الجھن میں ڈالنے چلا ہوں اور وہ یوں کہ اب میں ایک بالکل مختلف بات کہنے لگا ہوں۔ آگے بڑھنے سے پہلے پانچ باتیں ذہن نشین کر لیجئے۔

(۱) کسی چیز کی تشکیل و تخلیق میں یعنی ہر اس چیز میں جس کی کوئی متعین صورت اور ہیئت (Form) ہو تنظیمی اصول ذریعہ اور تخلیقی اصول مقصد ہوتا ہے۔

(۲) عملی زندگی میں اشیا بطور ذریعہ استعمال ہوتی ہیں اس لئے اس میں تنظیمی اصول کی برتری لازم ہے۔

(۳) ادب و فن اور دیگر تہذیبی سطحوں پر اشیا میں (یعنی شاعری، مصوری، اور رسومات (Rituals) وغیرہ میں) ذریعہ اور مقصد یکجا ہو جاتے ہیں۔

(۴) ہر تخلیق میں (جس کی کوئی صورت و ہیئت (Form) ہو) تنظیمی و تخلیقی اصولوں کا اختلاط اور ارتباط ضروری ہے۔

(۵) جس چیز کو جتنا زیادہ بطور ذریعہ استعمال کیا جائیگا اس میں اتنا ہی تنظیمی اصول حاوی ہوگا اور جتنا اسے مقصود بالذات سمجھا جائیگا اتنا ہی تخلیقی اصول حاوی ہوگا۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں اب ایک مختلف بات کہنے جا رہا ہوں۔ زندگی اور ادب دونوں ہی میں ہمیں مختلف شکلیں، مختلف صورتیں اور ہیئتیں (Forms) نظر آتی ہیں ہر صورت اور ہیئت کی تخلیق چاہے وہ زندگی میں ہو یا ادب میں، تنظیمی و تخلیقی دونوں اصولوں کے اختلاط اور ان کی مکمل ہم آہنگی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ تنظیمی و تخلیقی اصولوں کا رشتہ مرد اور عورت کا رشتہ ہے اور زندگی اور ادب دونوں میں ہر نئی صورت اور ہر نئی ہیئت ان دو اصولوں کے اختلاط کا نتیجہ ہے(* میں نے اپنی اکثر مضامین میں تنظیمی اصول زندگی کو ''پدری اصول'' اور تخلیقی اصول زندگی کو ''مادری اصول'' بھی کہا ہے۔ اکثر احباب کسی نفسیاتی الجھن (COMPLEX) کے باعث ان اصطلاحات سے خوفزدہ رہتی ہیں۔) آپ کو یاد ہوگا میں پہلے یہ کہہ چکا ہوں کہ ادب اور زندگی کا رشتہ، تخلیقی اور تنظیمی اصول زندگی کا رشتہ کشمکش اور تضاد پر مبنی ہے۔ اور اب میں یہ کہہ رہا ہوں کہ مختلف ہیئتوں (Forms) کی تشکیل و تخلیق میں یہ دو اصول ہم آہنگ ہوجاتے ہیں۔ اب آپ ان دونوں باتوں کو یکجا کرلیں۔ یعنی اب پوری بات یہ ہوئی کہ ادب اور زندگی کے رشتہ کا ایک پہلو منفی ہے اور ایک مثبت۔ منفی پہلو کے اعتبار سے ادب اور زندگی کا رشتہ آپس کے تضاد اور کشمکش پر قائم ہے۔ مثبت پہلو کے اعتبار سے یہ رشتہ ہم آہنگی اور اختلاط پر مبنی ہے۔

اب میں اس نظریاتی بحث سے ہٹ کر دو چار سیدھی سادی باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ بالعموم ادب کی تعریف کرتے ہوئے ہم اسے زندگی کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بات میں چنداں قباحت نہیں۔ لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہم زندگی کو ادب کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ دراصل ادب اور زندگی کے رشتے کو بخوبی سمجھنے کے لئے یہ دونوں طریقے بیک وقت ضروری ہیں۔ اب تک یہ

ہوتا آیا ہے کہ جب زندگی کے حوالے سے ادب کو سمجھنے کی کوشش کی گئی اور اسے ادب کے مقابلہ میں اہم سمجھا گیا تو اکثر ادب پروپگنڈے کے حدود میں داخل ہو گیا۔ اور جب زندگی کو ادب کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش ہوئی اور ادب کو زندگی پر مقدم سمجھا گیا تو ادب زندگی سے علیحدہ ہو کر تجریدی شکل اختیار کر گیا۔ زندگی ادب سے بے نیاز ہو تو بنجر اور غیر تخلیقی ہو جاتی ہے۔ ادب زندگی سے ماورا ہو تو بے جان ھیئت اور مردہ لاش بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں زندگی اور ادب دونوں بے معنی ہوں گے۔ آیئے اب ہم یہ دیکھیں کہ ادب اور زندگی دونوں ایک دوسرے کو کیا دیتے ہیں اور ایک دوسرے سے کیا لیتے ہیں۔

ہر دور اور ہر عہد میں دو قسم کی تاریخیں رقم ہوتی ہیں کسی معاشرے کی عقلی و فکری تاریخ اس کی سیاست، اس کے قوانین، اخلاقی ضابطوں اور معاشی عوامل سے اخذ کی جاتی ہے۔ لیکن احساس کی تاریخ اس معاشرے کے مذہب، ادب اور فن میں مضمر ہوتی ہے۔ عقل و فکر کی تاریخ دور کے خاتمے اور معاشرے کی بے ترتیبی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ سیاست، قانون، اخلاقی ضابطے اور معاشی عوامل محض یادداشت کی صورت میں باقی رہتے ہیں۔ لیکن احساس ادب و فن کے حوالے سے زندہ رہتا ہے اور ہر عہد میں موثر اور محرک ثابت ہوتا ہے۔ ایک اور طرح دیکھئے تو عقلی و شعوری تاریخ کے پیچھے بھی احساس اور جذبے کی قوت ہوتی ہے۔ جب عقل و شعور اور جذبہ و احساس کا تضاد شدید ہو جاتا ہے تو افراد کی ذات کی طرح معاشرہ بھی ٹوٹنے اور بکھرنے لگتا ہے۔ افراد کی ذات میں جذبے اور عقل کی کشمکش اور ان کا شدید تضاد ان کی مجتمع شخصیت کے دو ٹکڑے کر دیتا ہے اور اس طرح ان کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ معاشرے میں بھی یہی ہوتا ہے کہ جب اجتماعی شعور اجتماعی لاشعور سے، اجتماعی عقل اجتماعی احساس سے ہم آہنگ نہیں رہتی تو پورا معاشرہ پاگل ہو جاتا ہے، اس کا توازن بگڑ جاتا ہے۔

معاشرے میں ادب کا رول یہ ہے کہ وہ اجتماعی شعور اور اجتماعی لاشعور کے درمیان رابطہ اور یگانگت قائم رکھتا ہے۔معاشرے کی صحت کے لئے اس کے نظم وضبط اور توازن کو برقرار رکھنے کیلئے ادب وہی کام سرانجام دیتا ہے جو فرد کی زندگی میں خوابوں کا ہوتا ہے۔افراد کی زندگی میں خواب تنظیم ذات کا کام کرتے ہیں اور معاشرے کی زندگی میں یہ کام ادب کرتا ہے گو یا ادب معاشرے کا خواب ہے۔

آپ نے ادب کی ایک تعریف جو زندگی کے حوالے سے کی جاتی ہے بارہا سنی ہوگی اور وہ یہ کہ ادب زندگی کا عکاس ہے یا یہ کہ ادب فطرت کی تقلید ہے۔اس کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ ادب اپنے وجود اور اپنی بقا کی خاطر زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔فطرت کی تقلید کرتا ہے۔ممکن ہی کہ یہ کسی حد تک صحیح ہو مگر صرف کسی حد تک، ایک اور زاویہ سے دیکھئے تو اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ زندگی اور فطرت دونوں اپنی اعلیٰ ترین سطحیں اور اپنے اعلیٰ ترین قوانین کو معین صورت میں دیکھنے کے لئے خود کو ادب میں پیش کرتے ہیں۔ادب عملی طور پر فعال نہیں ہوتا، وہ صرف اپنے بخشے ہوئے تاثرات کے ذریعے عمل کی صورتیں پیدا کرتا ہے بالکل ایسے جیسے آئینہ عملی طور پر فعال نہیں ہوتا۔ادب کا آئینہ زندگی اور فطرت کی عکاسی کے لئے نہ تو خود ان کے پاس جاتا ہے اور نہ آپ ہی آپ وجود میں آتا ہے۔زندگی اور فطرت خود اپنی اعلیٰ و حسین صورتیں ادب کے آئینے میں دیکھنے کے لئے خود کو اس آئینہ میں پیش کرتی ہیں اور اس طرح اپنی رونمائی کرتی ہیں۔

ادب میں زندگی کا انتشار منظم اور منضبط صورت میں رونما ہوتا ہے۔یہ ایک تخلیقی کام ہے اس لئے کہ اس سے سانچے اور ہیئتیں وجود میں آتی ہیں۔اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہوتا ہے کہ پرانے بے جان سانچے ادب میں نئے سرے سے ترتیب پاتے ہیں۔اور اب مجھے وہ مغربی ناقد یاد آرہا ہے جس نے یہ کہا تھا کہ ادب تنقید حیات ہے۔آپ نے دیکھا، تنقید صرف حسن و قبح کی دریافت اور قدر کے تعین کا

نام نہیں ہے، تنقید عمل تخلیق کو آگے بڑھانے کا نام بھی ہے۔

ایک رائج الوقت غلط فہمی یہ بھی ہے کہ ادیب معاشرے کا آلۂ کار ہوتا ہے۔ میں خود بڑی حد تک اس غلط فہمی میں شریک ہوں۔ مگر ادیب معاشرے کا آلۂ کار محض ان معنوں میں ہوتا ہے جن معنوں میں معاشرہ خود شاعر اور ادیب کا آلہ کار ہوتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ شاعر اور ادیب معاشرے کے مروجہ طرز احساس سے اپنا طرز احساس بناتے ہیں۔ معاشرہ انہیں واقعات وحقائق، تاثرات و واردات، یعنی ادب کے لئے خام مواد مہیا کرتا ہے۔ یہاں تک تو مسئلہ سیدھا سادہ ہے۔ اس کے آگے ایک پیچیدہ بات ہے اور وہ یہ کہ سیاسی، معاشی، معاشرتی تبدیلیاں یا نظام مقدار کی تبدیلیاں تیزی سے ہوتی رہتی ہیں لیکن معاشرے کا نظام اقدار اتنی سرعت سے تبدیل نہیں ہوتا۔ اس طرح معاشرے کے مقداری نظام اور اقداری نظام میں ایک بعد پیدا ہو جاتا ہے اس بعد کو کم کرنے اور نظام اقدار و نظام مقدار کو ہم آہنگ کرنے کا کام فلسفی، معلم اخلاق اور شاعر و ادیب کرتے ہیں۔ فلسفی صداقت کے نام پر، معلم اخلاق، اخلاقیات کے نام پر اور ادیب حسن اور توازن کے نام پر اس ہم آہنگی کے لئے جدو جہد کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ادیب، یعنی معاشرے کے حساس ذہن، اس طرز احساس میں جو وہ معاشرے سے حاصل کرتے ہیں آہستہ آہستہ تبدیلی بھی کرتے جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو مقداری اور اقداری نظام میں توازن وتناسب قائم رکھنے کا کام ناممکن ہو جائے گا۔

طرز احساس کی یہ تبدیلی بالآخر تاریخی تبدیلی میں منتج ہوتی ہے۔ جس طرح مقداری تبدیلیاں اقدار اور طرز احساس پر اثر انداز ہوتی ہیں اسی طرح طرز احساس کی تبدیلی بھی معاشرے کو اس بات کے لئے مجبور کر دیتی ہے کہ وہ مقداری نظام کو طرز احساس کے ساتھ، اقدار کے ساتھ ہم آہنگ کرے اور اس کوشش سے تاریخی واقعات جنم لیتے ہیں۔ لیجئے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم محض ایک دائرے میں گھوم

رہے ہوں۔ شاید کچھ ایسی ہی بات ہے۔ بہرکیف مجھے تو صرف اتنی سی بات کہنی تھی کہ اگر یہ صحیح ہے کہ شاعر اور ادیب معاشرے کے آلۂ کار ہوتے ہیں تو یہ بھی صحیح ہے کہ معاشرہ خود شاعروں اور ادیبوں کا آلۂ کار ہوتا ہے معاشرے نے علامہ اقبال کو پیدا کیا اور علامہ اقبال نے معاشرے کو پیدا کیا۔

ایک اور طریقہ سے دیکھئے تو ادب اور زندگی کا ایک رابطہ زبان کے ذریعے ہوتا ہے۔ زبان، معاشرے میں استعمال ہونے والے آلات و اوزار کی طرح معاشرے کی تخلیق بھی ہے اور معاشرے کی خالق بھی۔ ادب اپنا اظہار زبان کے واسطے سے کرتا ہے اور اسی واسطے سے وہ معاشرے کی تخلیق بھی ہوتا ہے اور اس کا خالق بھی۔ زبان ایک طرف تو اجتماعی شعور کو فطرت کے ساتھ مربوط کرتی ہے اور دوسری طرف اجتماعی لاشعور (داخلی فطرت؟) اور اجتماعی شعور کے درمیان سفارت کا کام کرتی ہے۔ دراصل کسی معاشرے کے وجود کی بنیادی شرطیں آلات و اوزار اور زبان ہیں۔ آلات و اوزار انسان کو محض مقداری و مادی زندگی سے متعلق کرتے ہیں لیکن زبان کا عمل دوگونہ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے معاشرے کے افراد کا تعلق مقدار اور اقدار دونوں سے قائم رہتا ہے۔ زبان کا مقداری رابطوں کے لئے استعمال اسے عامیانہ اور سطحی بنا دیتا ہے۔ شعوری اور فکری سطح پر زبان ساکن منجمد اور محدود ہو جاتی ہے، ''علامت'' کے بجائے محض ''نشان'' بن جاتی ہے۔ اس کے برخلاف جذبہ، احساس، تخیل اور وجدان کی سطح پر یا بہ الفاظ دیگر ادبی و شعری سطح پر زبان متحرک رہتی ہے اور اس میں معانی و مفاہیم کی مختلف سطحیں قائم رہتی ہیں۔ اس طرح ادب زبان کو وسیع، عریض، رفیع و دلکش بنانے کا کام سرانجام دیتا ہے۔ سائنس اور فلسفہ میں، ساتھ ہی معاشرے کے روزمرہ کے کاموں میں زبان مقررہ مفاہیم اور معین اشاروں کے لئے استعمال ہوتی ہے، اس طرح وہ منجمد ہو کر گھس پٹ جاتی ہے، فرسودہ ہو جاتی ہے۔ ایک اور بات اور وہ یہ کہ سائنس اور فلسفہ میں زبان کا استعمال محض خاص مفاہیم کے لئے ہوتا ہے اور اسی

لئے لفظوں کو ان کے صوتی وصوری تاثرات اور استعاراتی سطح سے ہٹا کر صرف معنی اور مفہوم کی سطح پر استعمال کیا جاتا ہے۔یعنی یہ کہ لفظوں کا تعلق ٹھوس اشیا سے منقطع ہو جاتا ہے اور انہیں تجریدی طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ادب لفظوں کے لئے زندگی بخش یوں ہوتا کہ وہ الفاظ اور ٹھوس اشیا کے رابطے کو استوار کرتا ہے۔کسی مغربی ادیب نے کہا ہے کہ الفاظ روزمرہ کے استعمال سے اسی طرح میلے اور بھدے ہو جاتے ہیں جس طرح سکے اور نوٹ مختلف ہاتھوں سے گذر کر ٹوٹ جاتے ہیں، میلے ہو جاتے ہیں۔پس ادب وہ بینک ٹھہرا جہاں سے الفاظ تازے اور نئے ہو کر نکلتے ہیں۔لیجئیے بات جہاں سے شروع ہوئی تھی پھر وہیں آ گئی۔نوٹ، سکے، اور بینک۔آپ نے دیکھا مقداری زندگی کے تقاضے بھی کتنے شدید ہیں۔

اردو بحیثیت قومی زبان

ڈاکٹر وحید قریشی

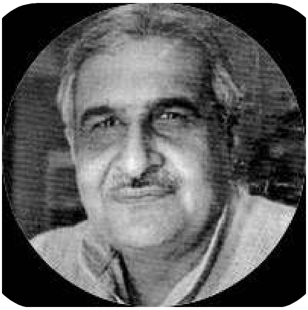

پاک و ہند میں اردو زبان کا مسئلہ انیسویں صدی میں زبان سے گزر کر سیاسی مسئلے کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے۔اردو ہندی کی سیاسی گروہ بندیوں میں زبان کسی نہ کسی حیثیت سے سیاسی سطح پر باہمی آویزش کا سبب رہی۔سرسید کے زمانہ میں اردو ہندی کے مسئلے کی شکل وصورت واضح طور پر سامنے آئی۔پھر دو قوموں کے نظریئے نے ہندو پاکستان میں سیاسی حالات کو ایک نئی شکل میں ڈھال دیا۔ہندی ہندوستانی اور اردو کے الفاظ محض لسانی مسائل نہ تھے۔ان کے پیچھے بعض دوسرے سیاسی اور تمدنی مسائل بھی کارفرما تھے۔پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد مغربی پاکستان میں اردو کی حیثیت کو متعین کرنے کا سوال بار بار اٹھتا رہا۔پاکستان کی تاسیس نظریاتی بنیادوں پر ہوئی۔اور اب

زبان کا مسئلہ بھی اسی نقطہ نظر کی روشنی میں ہمارے سامنے آیا۔اردو کی قومی زبان کے بارے میں ابتدا ہی سے ایک دو باتوں کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔اول یہ کہ پاکستان کی مملکت ان جغرافیائی بنیادوں پر استوار نہیں جو قومیت کے مغربی تصور نے پیش کیا ہے۔اسلام میں لسانی، نسلی اور علاقائی وحدت کا وہ تصور موجود نہیں ہے۔جسکی بناء پر ہندی، چینی، انگریز، جرمن، فرانسیسی اور امریکی اقوام جداگانہ قومی حیثیتیں رکھتی ہیں۔دوم یہ کہ اسلام میں زبان، نسلی امتیاز اور ایسی ہی دوسری وحدتیں کوئی اعتقادی درجہ نہیں رکھتیں۔یوں حب الوطنی کا جذبہ اپنی نفسیاتی اور انسانی سطح پر برمحل اور بجا ہے۔لیکن اسلام جس ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل کرتا ہے۔اس میں وطنیت کے اس مغربی تصور کے لئے کوئی جگہ نہیں۔جو مذہبی بنیادوں پر ملت کو ایک لڑی میں پرونے سے روکتا ہو۔گویا قومیت کا تصور جب سیاسی نظریہ بنتا ہے تو اسکا براہ راست تصادم اسلامی طرز حیات اور اسلامی طرز فکر سے ہوتا ہے۔ملت اسلامیہ مذہبی بنیادوں پر معاشرے کی تشکیل وتعمیر کی ضامن ہے۔مختلف علاقوں کے افراد کی پہچان اور ایک جغرافیائی اصطلاح کے طور پر قوم کا لفظ اسلام سے تو متصادم نہیں۔وطن کی محبت ایک فطری جذبہ ہے۔لیکن جہاں وطن جغرافیائی اصطلاح سے گزر کر سیاسی تصور کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔اسلام کے اصولوں سے براہ راست اس کا تصادم ہو جاتا ہے۔اس لحاظ سے پاکستان میں اردو زبان کی قومی حیثیت کا دائرہ عمل بھی بدل جاتا ہے۔یہ تذکرہ بھی شائد بے موقع نہ ہوگا کہ زبانوں کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ کیا رہا ہے۔مسلمانوں کے نزدیک زبان اظہار کا وسیلہ ہے۔دنیائے اسلام کے مختلف خطوں میں مختلف زبانیں رائج رہی ہیں اور آج بھی ہیں۔کلام پاک عربی زبان میں نازل ہوا۔اس لحاظ سے مسلمانوں کی علمی اور مذہبی زندگی کے لئے اسکی اہمیت ہر زمانے اور ہر دور میں قائم رہی۔جب ایران میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا تو خود عربی علم وادب میں ایرانیوں نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے کہ اگر آج ان

کی تحریروں کو عربی ادب سے خارج کر دیا جائے۔تو اس کا سب سے اہم اور قابل قدر حصہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔جب مسلمانوں کے قدم ہندو پاکستان کی سرزمین پر پڑے تو یہاں بھی دینی علوم کی ترویج میں عربی زبان کو تفوق اور برتری حاصل رہی۔لیکن تاریخ اسلام کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم اسلام کے مختلف حصوں میں کبھی بھی لسانی بنیادوں پر کوئی سیاسی مسئلہ نہیں اٹھا۔ ایران میں عربی کی علمی برتری کے باوجود فارسی زبان کی ترقی ہوتی رہی۔اور اس کے جلو میں مختلف مقامی بولیاں پنپتی رہیں۔لیکن زبان کی بنیاد پر عصبیت کا کوئی اظہار نہیں ملتا اسی طرح ماوراء النہر اور ترکی میں ترکی زبان کو عربی کے بعد اہمیت حاصل ہوئی۔ ہندوستان میں بھی عربی کے دوش بدوش ابتداء ہی سے فارسی دفتری، سرکاری اور بول چال کی حیثیت سے رائج رہی۔ پھر اردو زبان کا بول بالا ہوا۔مقامی بولیاں اور مقامی زبانیں بھی اپنے اپنے طور پر ترقی کرتی رہیں زبان مسلمانوں کے لئے کسی عصبیت یا محدود جغرافیائی وطنیت کا وسیلہ نہیں رہی۔اسلام نے ہمیشہ اس طرح کی محدود ذہنیت اور تنگ نظری کی مخالفت کی ہے۔ ہر علاقے کے اعتبار سے زبانوں کا مسئلہ درجہ بندی کے ایک مقررہ اصول کے مطابق طے ہوتا رہا ہے۔مذہبی لحاظ سے عربی زبان کی تعلیم اور ترقی ہمیشہ مسلمانوں کے نزدیک بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔اسکے بعد عالم اسلام میں علمی اور ادبی زبان کے طور پر فارسی کو اہمیت دی گئی۔اس کے بعد ہر ملک کے اعتبار سے اس ملک کی زبان کا درجہ آتا ہے۔جس میں کاروباری، دفتری معاشرتی اور تعلیمی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔علاقائی زبانوں کا نمبر اس کے بعد آتا ہے۔مسلمانوں کی تاریخ کو ابتدا سے لیکر آج تک دیکھ جایئے۔زبانوں کی یہ درجہ بندی ہر دور میں قائم رہی ہے۔ جب اردو کو بحیثیت قومی زبان اپنانے کا سوال اٹھتا ہے۔تو اس میں یہی بنیادی نقطہ نظر سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ اسلام نے مختلف ملکوں کی زبانوں کو برقرار اور بحال رکھا۔لیکن اسے اسلامی معاشرے کے بنیادی

رجحانات سے متصادم ہونے سے روکا۔قومی زبان کو جب مغربی قومیت کی بنیاد بنا کر نسلی اور جغرافیائی بنیادوں پر استوار کیا جاتا ہے۔تو یہ مسئلہ محض زبان اور اس کے استعمال کا مسئلہ نہیں رہتا۔اس کی براہ راست زد اسلام کی ہیئت اجتماعیہ پر پڑتی ہے۔اسی طرح جب لسانی بنیادوں پر قومی اور ملکی زبانوں کی جگہ علاقائی زبانوں کو لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔تو اس سے علاقائیت کا وہ فتنہ برآمد ہوتا ہے جو قومی یکجہتی ہی کے منافی نہیں بلکہ اسلام کی فکری اساس کو بھی متزلزل کر دیتا ہے۔زبان اگر اظہار کا وسیلہ ہے۔ تو اسلام اس کے رستے میں حائل نہیں بلکہ اسکی ترویج وترقی اور اسے ملی زندگی کی تشکیل میں پوری طرح بروئے کار لانے کی تدبیریں کرتا ہے۔لیکن اگر نظریاتی اعتبار سے لسانی مسائل ملت اسلامیہ کی یکجہتی پر اثر انداز ہوں۔تو پھر زبان کی حیثیت ایک سیاسی آلۂ کار کی ہو جاتی ہے۔اور اسلام ایسے نظریات کے خلاف ہے۔اردو زبان کو جب ہم قومی حیثیت دینا چاہتے ہیں۔تو اسے وطنیت کے تصورات اور علاقائی عصبیت سے الگ کر کے دیکھنا نہایت ضروری ہے۔شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی اور لسانی امتیازات اسلام کی روح کے خلاف ہیں۔زبانوں کا مسئلہ اگر اس پس منظر سے ابھرتا ہے۔تو وہ اسلام کے پیش کردہ قومی تصور سے ہم آہنگ نہیں۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ زبانوں کی اس درجہ بندی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے بھی ہم اردو زبان کی ترویج وترقی کے لئے جدوجہد نہ کریں ہماری جدوجہد آزادی میں زبان کا مسئلہ کسی مخصوص خطے کا مسئلہ نہ تھا۔ بلکہ اردو کو ہم نے ایک زندہ حقیقت کے طور پر قبول کیا ہے دو قوموں کے نظریے کو اپناتے ہوئے ہم نے پاکستان کے لئے زبان کے مسئلے کو ایک جداگانہ زاویے سے دیکھا ہمارے لئے اردو زبان ہمارے ملی افکار کی ترویج کا ذریعہ اور پاک و ہند کے مسلمانوں میں اسلامی تعلیمات کی ترقی کا ایک بڑا وسیلہ تھی۔ پاکستان کے لئے اردو زبان کی قومی حیثیت جدوجہد آزادی کے لئے بنیادی مقاصد میں شامل تھی۔اردو زبان کی اس سیاسی حیثیت میں اور

مغرب کے لسانی وحدت کے تصور میں بین فرق ہے۔عالم اسلام کے پس منظر میں اور پاک و ہند کی جہد و جہد آزادی کے تناظر میں اردو کی قومی حیثیت کا مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔اردو کو قومی زبان قرار دیگر مغرب کے تصور قومیت کو رائج کرنا یا اسکی داغ بیل ڈالنا ملی عزائم اور اسلامی تصور حیات کے بالکل خلاف ہوگا۔اردو کو بحیثیت قومی زبان ہمیں جو درجہ دینا ہے۔اس میں اردو کی حیثیت ایک ایسی قومی زبان کی ہے۔جس میں مسلمانوں کا بیشتر علمی اور فکری سرمایہ محفوظ ہے۔جس جس ملک میں اسلام پہنچا وہاں کاروباری،معاشرتی،دفتری،تعلیمی اور ادبی مسائل میں قومی زبانوں ہی کو اہمیت دی گئی۔

اردو کو بحیثیت قومی زبان رائج کرنے کے لئے ان تمام حیثیتوں سے اسے اس کا مناسب حق دینے کی ضرورت ہے۔اس مرحلے پر مادری زبان کی ترکیب کا تذکرہ بھی شائد بے موقع نہیں ہوگا۔کیونکہ ادھر چند برس سے جہاں قومیت کا مغربی تصور فکری وحدتوں کو پارہ پارہ کرنے کے لئے برسر عمل تھا۔وہاں خود قومیت کے تصور کو مزید چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے لئے علاقائیت کا تصور ابھرا۔جغرافیائی اور لسانی وحدتیں بھی مضبوط سلطنتوں کا پیش خیمہ بنتی جارہی تھیں۔ان وسیع حلقوں کو اور زیادہ تنگ کرنے کے لئے علاقائیت کے تصورات جاگے۔ان چھوٹی وحدتوں کے لئے نسلی اور جغرافیائی حدبندیاں کارآمد نہیں ہوسکتی تھیں۔اس لئے لسانی بنیاد کو ایک نئی شکل میں پیش کیا گیا۔پاکستان کو جہاں ایک طرف مغربی قومیت کے تصور سے خطرہ لاحق ہے۔دوسری طرف علاقائیت کے تصورات بھی اس کے لئے حد درجہ خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔زبان کے اس قومی تصور کی روشنی میں جو تاریخ اسلام ہمیں عطا کرتی ہے۔علاقائی زبانوں کی حیثیت اپنی جگہ پر محفوظ ہے۔بشرطیکہ ان کی مدد سے کوئی سیاسی کام نہ لیا جائے۔نیز زبانوں کی اس درجہ بندی کو ضعف پہنچانے کی کوشش نہ کی جائے۔جو اسلام نے ہر ملک اور ہر علاقے میں قائم رکھی سے ہے۔عالم اسلام میں عربی کی برتری کو بھی اس لحاظ مختلف علاقوں پر

مسلط نہیں کیا گیا کہ وہ ملکی زبان کی جگہ لے لے۔ زبانوں کا اپنا فطری عمل ہمیشہ بروئے کار رہا۔ اسلام نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ عربی کو ایک علمی اور دینی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ لیکن برتری کے کسی مریضانہ احساس کے زیر اثر کسی علاقہ میں بھی عربی کو جبراً بول چال کی زبان نہیں بنایا گیا۔ ایران میں عربی علمی و ادبی زبان تھی۔ لیکن کاروباری، دفتری اور دوسری شعبہ ہائے زندگی میں فارسی ہی کو اہمیت دی گئی۔ گویا ملکی زبانوں کو بول چال اور تعلیم و تعلم کا وسیلہ بنایا گیا۔ عربی کے ساتھ ایک تقدس کا پہلو البتہ ضرور قائم رہا۔ لیکن زبانوں کے فطری عمل اور ان کے نشوونما کے خلاف اسے کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔

مغربی پاکستان کے باشندوں کے لئے اردو کی حیثیت قومی زبان کی ہے۔ اس لئے اسے ذریعہ اظہار کا وسیلہ ہونا چاہیئے۔ قومی زبان کے بعد ہماری فکری زندگی کے لئے جن زبانوں کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ان میں عربی اور فارسی کی اہمیت مسلم ہے۔ ہم مغربی علوم اور مغربی زبانوں سے بھی روگردانی نہیں کر سکتے۔ اب یہ ہماری ماہرین تعلیم کا کام ہے کہ ہماری تعلیمی زندگی میں زبانوں کے توازن کو برقرار رکھتے ہوئے عربی اور فارسی کو ان کا حق عطا کریں۔ اس سے اردو کی حیثیت بھی مضبوط ہوگی۔ اور پاکستان کے باشندوں کی ذہنی تربیت بھی صحیح خطوط پر ہو سکے گی۔ جب ہم اردو کو قومی زبان کا درجہ دلانا چاہتے ہیں۔ تو ہمارے نزدیک اردو کے لئے وہ مقام ہے۔ جو اب تک انگریزی نے حاصل کر رکھا تھا۔ کاروباری، معاشرتی، دفتری، تعلیمی اور ادبی معاملات میں انگریزی کی جگہ اردو کو حاصل ہونی چاہیئے، لیکن اردو کو اس کا جائز حق اس وقت ملے گا جب ہماری ذہنیت بدلی گی۔ ہم نے نیا ملک تو حاصل کر لیا ہے۔ لیکن تین سو برس کی غلامی نے ذہنوں میں تقلید کا جو بیج بو دیا ہے۔ وہ ابھی تک پھل لا رہا ہے۔ بعض لوگ اردو میں اپنا نام تک لکھنا گوارا نہیں کرتے۔ معاشرتی زندگی میں ہر وہ آدمی جو انگریزی

میں خط و کتابت نہیں کرتا شائستہ مجالس میں انگریزی بولنے سے گریز کرتا ہے۔اسے غیر مہذب سمجھا جاتا ہے۔کاروباری زندگی میں بھی تمام خط و کتابت انگریزی میں کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔انگریزی لکھنا پڑھنا شائستگی کی علامت ہے۔اس کے مقابلے میں اپنی زبان کو گھٹیا سمجھا جاتا ہے۔دوکانوں پر سائن بورڈ بھی انگریزی ہی میں لکھے جاتے ہیں۔ چاہے گاہکوں میں صرف دس فیصدی ان بورڈوں کا مفہوم اور مطلب سمجھتے ہوں۔غلامی کی زندگی اپنی ہر چیز کو گھٹیا اور آقا کی ہر چیز کو گراں قیمت بنا دیتی ہے۔اس کے لئے عام معاشرتی سطح پر پوری جدو جہد کی ضرورت ہے۔کیونکہ اس طرح کے رجحانات کے برقرار رہنے سے آزادی کے صحیح نتائج مرتب نہیں ہوسکتے۔نجی اور گھریلو زندگی میں بھی ہمیں اپنی ملکی زبان کو اس کا مناسب مقام دینا چاہیئے کیونکہ یہ ہر ملکی زبان کا فطری حق ہے۔اسی طرح تعلیم میں بھی اردو کی قومی حیثیت کو برقرار اور بحال کرنے کی ضرورت ہے۔اس بات کا زبانی اقرار کافی نہیں۔ بلکہ عملی طور پر بھی نظام تعلیم میں اردو کو رائج کرنے سے ہمارے دفتری نظام کی بڑی حد تک اصلاح ممکن ہے۔ اس مرحلے پر یہ بات بھی شائد بے موقعہ نہیں ہوگی کہ انگریزی اور دوسری آریائی زبانوں میں سائنسی موضوعات، ادب اور معاشرتی علوم میں بے اندازہ ترقی ہوئی ہے۔ہمیں اس سے بھی پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔انگریزی زبان کی تدریس بہرحال باقی رہنی چاہیئے۔اردو کی حمایت میں جب کچھ کہا جاتا ہے۔ تو اسے لازماً انگریزی کی مخالفت سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ صورت حال نہیں۔ ہم انگریزی کو یہاں ذریعہ تعلیم رکھنے کے مخالف ہیں۔لیکن انگریزی کی تعلیم کے مخالف نہیں ہیں۔کسی زبان کی تدریس اور بات ہے۔لیکن اسے ذریعہ تعلیم بنالینا بالکل جدا چیز ہے۔ یہ تبدیلی ظاہر ہے بعض مسائل سے دوچار کرتی ہے۔اصطلاحات کا مسئلہ، نصابی کتب کا مسئلہ، ٹائپ کا مسئلہ، رسم الخط کا مسئلہ، یہ سبھی مسائل اپنی جگہ اہم ہیں اور اردو کو ذریعہ تعلیم بنائے وقت ان مسائل پر بھی غور وفکر ضروری ہے۔لیکن اب تک یہ

معاملات ٹلتے رہے ہیں۔انہیں عذر کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔اور ملکی زبان کو اس کا جائز حق دینے کے راستے میں بہانے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔اس لئے ملکی زبان کے حامی ان مسائل کے اٹھانے والوں کی طرف سے کچھ بدظن سے ہو گئے ہیں۔

اردو کو دفتری حیثیت دینے کے لئے بھی ایسے بھی حیلے بہانے تراشے جاتے ہیں۔عدالتی زبان کے طور پر اردو مدتوں سے رائج ہے۔صرف اسے اعلیٰ عدالتوں تک لے جانے کی ضرورت ہے۔دیہات میں پولیس اور دوسرے محکموں کا کاروبار اردو میں چلتا ہے۔دفتری اصطلاحات کا مسئلہ ایک بڑی حد تک حل ہو چکا ہے۔اب ضرورت ہے کہ اس تمام مواد سے کام لیا جائے اور سرکاری سطح پر دفتروں میں اردو زبان کو رائج کر دیا جائے۔

اردو زبان میں دخیل الفاظ کا مسئلہ

سہیل بخاری (ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی)

دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں کسی دوسری زبان کے الفاظ نہ پائے جاتے ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دو قوموں میں ملاپ ہوتا ہے تو ان کی زبانیں بھی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کے ذخیرے سے تھوڑے بہت الفاظ ضرور لے لیتی ہیں جو اپنے بیگانہ ماحول میں دخیل کہلاتے ہیں۔ان کی اہمیت اس لئے مسلم ہے کہ یہ ہمیں دو قوموں کے تعلقات اور ان کی نوعیت (مذہبی،سیاسی،فوجی،سماجی،وغیرہ) سے آگاہی بخشتے ہیں جو ماضی کے کسی عہد میں استوار ہوئے تھے اور یوں تاریخ عالم کے ان گوشوں کو روشن کرتے ہیں جو ابھی تک پردۂ تاریکی میں ہیں اور جن تک ہماری رسائی کے تمام وسائل ختم ہو چکے ہیں۔چنانچہ اس اعتبار سے کہ ازمنہ قدیم کے حالات کا سراغ

لگانے کے لئے زبان اور زبان کے الفاظ ہی ہمارا واحد وسیلہ اور آخری سہارا میں دو قوموں کے ارتباط باہمی سے متعلق معلومات حاصل کرنے کیلئے دخیل الفاظ کی قدر و قیمت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔

ماضی کے کسی دور میں ہندوستان پر موجودہ روسی ترکستان کے آریہ قبائل کی ترک تاز اس برصغیر کی تاریخ کا وہ اہم واقعہ ہے جس کے باعث دو قوموں (آریہ اور دراوڑ) میں ایک ایسا تصادم ہوا تھا کہ اس کے اثرات زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح آج ہندوستانی لسانیات میں بھی اچھی طرح محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب اردو زبان نے ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح پہلی بار آریوں کی آبائی زبان (اصطلاحاً اوستائی) کے حلقہ اثر میں آکرو، ہ اوری کی آوازیں قبول کی تھیں جو بادی النظر میں اس کا گوشت و پوست معلوم ہوتی ہیں لیکن ذرا سے تامل پر یہ بات کھل جاتی ہے کہ آریوں کے حملہ سے پہلے ہمالیہ کے اس پار کی زبانوں میں جنہیں بجا طور پر دراوڑی کہا جاسکتا ہے یہ آوازیں نہیں ملتی تھیں۔ چنانچہ آج بھی ہماری زبانوں کا تلفظ جو ہزاروں سال سے زبانوں پر کمال صحت کے ساتھ منتقل ہوتا چلا آیا ہے پکارے گلے بتا رہا ہے کہ یہ آریائی ملمع ہماری آواز کی ہلکی سی آنچ سے صاف اتر جاتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اسی زمانے میں اردو زبان نے بہت سے آریائی الفاظ بھی مستعار لے لئے ہونگے کیونکہ زبانوں میں آوازوں کے لین دین کا نمبر الفاظ کے لین دین کے بعد آتا ہے لیکن اس زمانے کی ایسی کوئی دستاویزی شہادت اس وقت سامنے نہیں ہے جس سے اردو میں دخیل الفاظ کی قطعی تعداد کا اندازہ لگایا جاسکے۔ اردو اور اس کی معاصر زبانوں میں آج جو سنسکرت الفاظ پائے جاتے ہیں وہ آریوں کی بول چال سے نہیں آئے بلکہ ان کی تحریری زبان سنسکرت سے لئے گئے ہیں اس لئے ان کا جو تلفظ آج عام طور پر کیا جا رہا ہے ساقط الاعتبار ہے کیونکہ سنسکرت اور ویدک کی تحریروں میں قدیم ایرانی

اور مختلف دراوڑی بھاشاؤں (بول چال کی زبانوں) کے الفاظ کتابت کے مخصوص اصولوں کے تحت درج کئے گئے اور اصول اولین شارح رگ وید باسک متی کی تحریر کے مطابق زیادہ سے زیادہ چھ سو سال قبل مسیح تک عالموں کے احاطہ علم سے باہر ہو چکے تھے حالانکہ ان زبانوں میں یہ الفاظ حقیقت میں وہی ہیں جو آج ترکستان میں بولے جا رہے ہیں یا پاک و بھارت کی مختلف زبانوں میں رائج ہیں مثلاً

سرجنہار = فارسی سرزن، اردو علامت فاعلی آر، پیدا کرنے والا۔ آشا اردو آس۔ اوستائی علامت تانیث آ۔

جیون = ایرانی زیون۔ سنگم = ایرانی ہم بمعنی ساتھ۔ گم بمعنی چلنا = ہمقدمی۔ گیان = ایرانی زان، دان بمعنی علم۔ ایشور = ایرانی ایزور بمعنی معبود۔ گیانیشور۔ دانشور وغیرہ

اردو کے دخیل الفاظ پر دوبارہ غور کرنے کیلئے ہمیں اس زمانے کا انتظار کرنا پڑتا ہے جبکہ دسویں صدی عیسوی کے لگ بھگ مسلمانوں نے ہندوستان پر درہ خیبر کی راہ سے حملہ کیا اور ایرانی بول چال کی زبان دوبارہ ان کی ہم رکابی میں یہاں پہنچی۔ یہ حملہ آور اپنے سے ہزاروں سال پہلے کے آریوں کی طرح زبان کے علاوہ اپنی لپی بھی ساتھ لائے تھے جس میں آگے چل کر یہاں کے مختلف علاقوں کی مقامی زبانیں قلم بند ہونے لگیں اور یوں اردو زبان بھی جو ان کی آمد سے قبل دیونا گری ہی میں لکھی جاتی تھی ایرانی لپی کے لباس میں آ گئی۔ اور چونکہ فارسی ہند شمالی میں مسلمان حکمرانوں کی مادری زبان ہونے کے لحاظ سے سرکار دربار میں ۱۸۳۲ء تک مسند نشین رہی یہاں کی دوسری مقامی زبان میں بھی بیشمار فارسی اور فارسی کی وساطت سے عربی الفاظ داخل ہو گئے۔

اس کے برعکس ہند جنوبی میں فارسی کو راج پاٹ کا کبھی موقع نہیں ملا بلکہ ابتدا ہی سے دکنی زبان اس منصب پر بڑے اطمینان و اعتماد کے ساتھ براجمان رہی جو اس کا پیدائشی حق تھا اس لئے دکن میں دخیل

الفاظ کی تعداد، تلفظ اور املا وغیرہ مقامی اصول وقواعد کے پابند رہے جبکہ شمال میں اردو زبان عربی فارسی سے اس حد تک دب گئی کہ اس میں دخیل الفاظ کا تناسب دکنی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو گیا اور تلفظ و املا بھی قریب قریب اسی طرح جاری رہے جس طرح عربی فارسی میں تھے بلکہ ان زبانوں نے اردو میں اپنی بہت سی آوازیں بھی داخل کر دیں اور اس کے بہت سے الفاظ کو یوں تبدیل کر دیا کہ وہ اپنی ہی زبان میں دخیل نظر آنے لگے مثلاً پٹخنا (اصل پٹکنا)۔چٹخنا (اصل چٹکنا)۔اخروٹ (اصل اکھروٹ)۔ شراٹا (اصل سراٹا) زناٹا (اصل جھناٹا)۔زپاٹا (اصل جھپاٹا)۔خصم (اصل کھسم)۔زق زق بق بق (اصل جھک جھک بک بک) وغیرہ

عربی فارسی کے دخیل الفاظ کے متعلق اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اردو کی بہت سی مروجہ فرہنگوں اور تحریروں میں دیسی الفاظ کے مقابلے میں دخیل الفاظ کی تعداد آٹے میں نمک کے بجائے نمک میں آٹے کے مصداق نظر آتی ہے۔ انشاء اللہ خاں کی ''رانی کیتکی کی کہانی'' اور آرزو لکھنوی کے دیوان ''سریلی بانسری'' کو چھوڑ کر جن میں دخیل الفاظ سے جان بوجھ کر اور کوشش کر کے دامن بچایا گیا ہے اور جنہیں دیسی زبان کی صلاحیتوں کو روشن کرنے کے لئے نمونہ بنا کر پیش کیا گیا ہے اردو زبان کے اس سرمائے کو جو فارسی لپی میں ہمارے سامنے موجود ہے اول سے آخر تک دیکھ جایئے تو یہی گمان گزرے گا کہ اردو زبان فارسی عربی سے نہیں تو کم از کم ان کی وساطت سے ضرور پیدا ہوئی ہے۔ اس صورت حال سے زبان اردو کے بعض مورخین کی معذوری کا بھی پہلو نکلتا ہے جنہوں نے بول چال کی زبان کے بجائے اسی ادبی سرمائے پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھی ہے۔

اس سلسلے میں ادب اردو کے چند نامور شعراء نے جن کی ابتدا حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں سے ہوتی ہے اپنے اپنے زمانے میں جو کوششیں اصلاح زبان کے نام سے کی ہیں حقیقۃً اور عملاً تفریس

شاعری کے نام سے موسوم ہونا چاہییں کیونکہ فارسی لپی میں منتقل ہونے کے بعد اردو شاعری دیسی عروض سے کٹ کر مکمل طور پر ایرانی شاعری کی لونڈی بن گئی تھی اور تفریس شاعری کو زیادہ سے زیادہ کامیاب اور مکمل بنانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ زبان کے دیسی الفاظ نکال نکال کر ان کی جگہ عربی فارسی کے زیادہ سے زیادہ لغات داخل کر دیئے جائیں۔ چونکہ شاعری ایک موثر پیرایہ بیان ہے اس لئے شعراء کی ان کوششوں سے اردو کے پڑھے لکھے طبقے کا اثر قبول کرنا ناگزیر تھا نتیجہ یہ ہوا کہ جس انشا پرداز نے بھی قلم ہاتھ میں اٹھایا اس نے اپنے پیش رو سے زیادہ عربی فارسی الفاظ اردو زبان میں داخل کر دیئے اور اب یہ حال ہے کہ ہم کٹھن سے کٹھن موقع پر بھی دخیل لفظ پیش کر سکتے ہیں لیکن دیسی لفظ پوچھیئے تو بغلیں جھانکنے لگیں گے۔

اردو کی تیسری بار ٹکر انگریزی زبان سے ہوئی جو مسلمانوں کے حملے کے تقریباً پانچ چھ سو سال کے بعد سات سمندر لانگھ کر انگریزوں کے ساتھ سورت کے بندرگاہ پر اتری۔ اگر چہ ولندیزی، پرتگالی اور فرانسیسی زبانیں انگریزی سے پہلے یہاں آ چکی تھیں جن کے چند الفاظ اردو میں آج بھی ملتے ہیں پھر بھی اردو سے ان کا اتنا بلاواسطہ اور گہرا تعلق قائم نہیں ہوا جتنا انگریزی زبان سے۔ اس لئے دخیل الفاظ کے سلسلے میں ان کی اتنی اہمیت بھی نہیں ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کا دور حکومت تقریباً دو سو سال تک جاری رہا جس میں انہوں نے اپنی زبان کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچانے اور پھیلانے کی جان توڑ کوشش کی بلکہ ۱۸۳۲ء میں فارسی کی گدی چھین کر بظاہر جو انہوں نے اردو کو سرکاری زبان بنایا تھا اس میں بھی یہ مصلحت پوشیدہ تھی کہ اردو کی آڑ میں انگریزی کو راج سنگھاسن پر بٹھا دیں اور اس میں وہ اتنے کامیاب رہے کہ انہیں ہمارا ملک چھوڑے ہوئے سترہ سال ہو چکے ہیں لیکن انگریزی ابھی تک جہاں کی تھاں جمی ہوئی ہے۔ اس اتصال سے انگریزی کے بہت سے جو آج خواص سے گزر کر عوام کی

زبانوں پر بھی جاری ہیں۔

غرض اردو دیوناگری لپی میں سنسکرت سے الفاظ لیتی رہی۔ایرانی لپی میں فارسی عربی لغات جذب کرتی رہی اور آخر میں آ کر انگریزی سے بھی خوشہ چینی کرنے لگی۔اس طرح ہماری زبان میں بے شمار دخیل الفاظ جمع ہو گئے ہیں۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے فارسی عربی یا انگریزی کا بہت زیادہ مطالعہ کیا ہے وہ ان زبانوں میں بڑی آسانی کے ساتھ اظہار خیال کر سکتے ہیں۔جب وہ اردو میں لکھنے بیٹھتے ہیں تو وہی الفاظ جو ان کے ذہن میں گردش کرتے رہتے ہیں اپنی تحریروں میں درج کر دیتے ہیں اور یوں اردو زبان کے الفاظ تلاش کرنے کی زحمت سے بچ جاتے ہیں۔یہ تن آساں لوگ عادتاً دخیل الفاظ استعمال کرتے اور قصداً کدوکاوش سے کتراتے ہیں۔اسی جماعت میں ان لوگوں کا بھی شمار ہے جن کو اردو کم آتی ہے۔وہ اپنی کمی کو اردو کے مزید مطالعے کے بجائے دخیل الفاظ پورا کر کے کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

بعض لوگ صرف اس لئے دخیل الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ دوسروں پر اپنے علم وفضل کی دھاک بٹھائیں۔یہ لوگ غیر زبانوں کی فرہنگوں سے تلاش کر کر کے بڑے بڑے ثقیل اور نامانوس الفاظ لاتے ہیں اور چٹانوں کی طرح اپنی تحریروں میں لڑھکا دیتے ہیں اور پھر ان تحریروں کو انشا پردازی اور ادب کے بہترین نمونوں اور شاہکاروں کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ان کے نزدیک دوسروں کے آسان، ہلکے پھلکے اور بول چال کے لفظ گنوار اور غیر فصیح ہوتے ہیں اور مصنفین کی کم علمی اور بدذوقی پر دلالت کرتے ہیں۔غرض ان کا رویہ احساس کمتری کا غماز ہے۔پھر کچھ لوگ عربی الفاظ کی طرف اس لئے زیادہ مائل ہوتے ہیں کہ عربی ہماری مذہبی زبان ہے اور قرآن اس میں نازل ہوا ہے۔بعض فارسی سے بھی کچھ ایسی ہی شدید وابستگی محسوس کرتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی تہذیبی زبان ہے اور پھر کچھ ایسے بھی

ہیں جو انگریزی زبان سے مرعوب ہیں کہ یہ ان کے نزدیک بین الاقوامی زبان ہے۔ چنانچہ اس جماعت والے بھی کسی نہ کسی غیر زبان کے شیدائی نظر آتے ہیں۔

بہر حال دخیل الفاظ سے کچھ فائدے بھی ہوتے ہیں۔ان کی مدد سے خیالات کا ذرا ذرا سا فرق بڑی آسانی سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ان کے استعمال سے خیالات کے حدود قطعی اور خطوط واضح ہو جاتے ہیں۔دوسرا فائدہ یہ ہے کہ لکھنے والا ایک ہی لفظ کو بار بار دھرانے سے بچ جاتا ہےاور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دخیل الفاظ سے زبان کے سرمائے میں اضافہ ہوتا ہے۔جس زبان میں دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ الفاظ پائے جاتے ہیں وہ باثروت سمجھی جاتی ہے۔اس لحاظ سے اردو زبان اس برصغیر کی تمام زبانوں پر سبقت لے گئی ہے کہ کسی زبان کا اثاثہ اس کے ذخیرہ الفاظ کے سامنے نہیں ٹھہرتا بلکہ ہم اس کے سرمائے کو نہایت فخر کے ساتھ دنیا کی کسی بھی زبان کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔

ان تمام فائدوں کے ہوتے ہوئے جن کا ذکر اوپر کیا گیا دخیل الفاظ کے استعمال میں کچھ نقصانات بھی مضمر ہیں بلکہ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ نقصانات کی تعداد اور اہمیت فوائد سے زیادہ ہے۔کسی زبان میں الفاظ کی تعداد زیادہ ہو جانے سے بولنے والوں کے حافظے پر غیر معمولی بار پڑ جانا ہے۔ چنانچہ ہم لوگوں کو اردو الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کو بھی یاد کرنا پڑتا ہے جو سنسکرت فارسی عربی اور انگریزی سے مستعار لئے جا چکے ہیں اور جب تک مستعار لینے کا یہ سلسلہ جاری رہے گا ہمارے حافظے پر بوجھ بھی برابر بڑھتا رہیگا۔یہ صورت حال حد درجہ مصنوعی اور محنت طلب ہے۔

دخیل الفاظ کے باعث زبان میں بہت سے مقامات پر الجھنیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ان میں سے بعض ایسے ہیں جن میں اردو زبان کے لب و لہجہ کے باعث ابہام آ جاتا ہے مثلاً سحر اور صہر۔ثواب اور

صواب بہر (واسطے) اور بحر (سمندر وزن فخر) وغیرہ۔ بعض ایسے ہیں جو ہماری زبان کے لب ولہجہ سے میل ہی نہیں کھاتے مثلاً شمع طرح، صبح وغیرہ کہ عربی میں ان کا درمیانی حرف ساکن اور آخری متحرک ہوتا ہے اور اردو کا لہجہ اس کو قبول نہیں کرتا۔ بعض دخیل الفاظ ایسے ہیں جن کی مکتوبی اور ملفوظی صورت مختلف زبانوں میں ایک ہی ہے لیکن معنی جدا جدا ہیں مثلاً کسر (اردو کمی۔ عربی ٹکڑا)۔ سل (اردو پتھر کا ٹکڑا۔ عربی دق کی بیماری)۔ کوٹ (اردو قلعہ۔ انگریزی ایک لباس) بر (اردو بھڑ بمعنی زنبور۔ فارسی اوپر۔ عربی خشکی)۔ چال (اردو رفتار فارسی گڑھا)۔ بال (اردو رواں۔ فارسی پر۔ انگریزی گیند) وغیرہ۔

تیسرا نقصان یہ ہے کہ دخیل الفاظ کیلئے زبان میں ایک ترجیحی رجحان پیدا ہو جاتا ہے اور لوگ ان کے حق میں اپنی زبان کے الفاظ سے دست کش ہو جاتے ہیں۔ یوں متروکات کی تعداد روز بروز بڑھتی اور زبان کی پونجی گھٹتی چلی جاتی ہے مثلاً جب اردو والے نکاس کی جگہ سرچشمہ یا منبع، ٹھیٹھ کی جگہ خالص، سامنے کی جگہ روبرو یا مقابل، آنگن کی جگہ صحن، اوجھل کی جگہ پوشیدہ، پکڑ کی جگہ گرفت، لگا تار کی جگہ متواتر یا علی التواتر یا علی الاتصال لکھتے پڑھتے رہیں گے تو ایک دن ایسا آجائے گا کہ اردو کے الفاظ حافظے اور علم سے بھی محو ہو جائیں گے۔ آج بھی اردو میں جتنے دخیل الفاظ استعمال ہو رہے ہیں ان میں سے کچھ ایسے اصل ہیں جن کے ٹھیٹھ مترادفات کی اب شناخت بھی مشکل ہو گئی ہے مثلاً فطرت یا قدرت یا نیچر تہذیب یا کلچر۔ حرف۔ تلفظ۔ کاغذ۔ دوات۔ روشنائی دروازہ یا دوار۔ الماری۔ برج یا گمبند وغیرہ

دخیل الفاظ زبان کی بالیدگی میں بھی حارج ہوتے ہیں۔ جب وقت کی تبدیلی کے ساتھ کوئی نیا خیال یا نئی چیز کسی زبان کے بولنے والوں کے سامنے آتی ہے تو یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جاہل اور بے پڑھے انسان بھی اس کے لئے لفظ سازی کے انہیں اصولوں پر جو اس زبان میں پیشتر سے موجود ہوتے ہیں اپنے ہی کسی مروجہ لفظ سے ایک نیا لفظ گھڑ لیتے ہیں لیکن جب غیر زبان کے بنے بنائے لفظ سے

ضرورت رفع کر لی جاتی ہے تو اہل زبان کو اپنی زبان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ لہذا اردو زبان میں دوسری زبانوں سے جتنے زیادہ الفاظ داخل ہوتے رہیں گے اس کی ترقی کے امکانات اتنے ہی کم ہوتے چلے جائیں گے کیونکہ زبان اپنی ہی داخلی قوت سے فروغ پاتی اور آگے بڑھتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو زبان میں بعض دخیل الفاظ کا استعمال ہمارے لئے ضروری ہے مثلاً مسلمانوں کی مذہبی اصطلاحات اور ان کی معاشرت کے لوازمات (کھانوں اور کپڑوں وغیرہ) کے ایرانی و عربی نام جو ہماری یومیہ زندگی کا جزو ہیں یہ چیزیں مسلمانوں سے مخصوص ہیں اور ان کے ساتھ ہی ہندوستان میں داخل ہوئی ہیں۔ ایجادات کے نام جو مغرب سے اپنے موسومات کے ساتھ ہمارے ملک میں آئے ہیں اور سائنسی اصطلاحات جو دنیا میں عام ہو چکی ہیں۔ لیکن سنسکرت الفاظ کو استعمال کرنا اردو زبان میں بناوٹی پن کو فروغ دینا ہے کیونکہ ان کے مکتوبی اور ملفوظی روپوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ چونکہ ایک خاص سطح تک سائنسی معلومات بھی دنیا کی روزانہ زندگی میں داخل ہو چکی ہیں اس لئے اس حد تک ہمیں اپنی ہی زبان سے سائنسی اصطلاحات وضع کر کے کام چلانا چاہئے کہ وہ زیادہ عام فہم ہونگی اور ان کے ذریعے روزمرہ کی سائنس تک ہماری قوم کے ہر فرد کی رسائی بآسانی ہو سکے گی۔ البتہ اعلیٰ تحقیقات کی سطح پر جب تک ہمارے یہاں سائنسی اصطلاحات مکمل طور پر نہ بن جائیں انہیں انگریزی اصطلاحات کو استعمال کر سکتے ہیں جو بیشتر یونانی و لاطینی زبانوں کی تحریروں سے اخذ کی گئی ہیں اور جن کے صحیح ملفوظی روپ ہمیں قدیم و جدید فارسی سے ایک نہ ایک دن ضرور دستیاب ہو جائیں گے کیونکہ یہ سب زبانیں باہم رشتہ دار ہیں اس وقت ہم پاکستانیوں کے سامنے ایک اور بھی تجویز موجود ہے۔

جب یہ مسلم ہے کہ دخیل الفاظ ہر زبان کا ایک ناگزیر جزو ہوتے ہیں اور ہمیں بھی اردو زبان کیلئے

ان کی ضرورت واہمیت سے انکار ممکن نہیں تو بہتر یہ ہے کہ ہم بدیسی الفاظ کی جگہ پاکستان کی ہی علاقائی زبانوں کے لغات سے کام لیں کہ ان کا حق بدیسی الفاظ پر مرجح ہے اور اس لئے مرجح ہے کہ اردو اور علاقائی زبانوں میں مشترکہ دراوڑی خاندان کے باعث بنیادی اور مزاجی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جبکہ فارسی، آریائی، عربی، سامی اور انگریزی اینگلوسیکسن خانوادے سے تعلق رکھتی ہے اور لسانی خاندانوں کا بنیادی فرق اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اردو اور سندھی یا اردو اور پنجابی میں اتنا فرق نہیں ہے جتنا اردو اور فارسی یا اردو اور انگریزی میں پایا جاتا ہے اور اس فرق کا دخیل الفاظ کی موزونیت یا ناموزونیت میں بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔

الغرض دوسری زبانوں سے بے تامل الفاظ پر الفاظ لیتے چلے جانا نہ صرف غیر ضروری بلکہ اردو کے لئے الٹا نقصان دہ ہے اس لئے ہمیں سب سے پہلے یہ چاہیئے کہ اپنی زبان کے بنیادی ذخیرے اور اس کی صلاحیتوں کا بھرپور جائزہ لے کر اس کی توانائی پر اپنا اعتماد بحال کریں اور اردو کی کم مائگی کا مفروضہ قائم کرنے والوں کے پروپگنڈے میں نہ آئیں۔ دخیل الفاظ کی تعداد کو ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھنے دیں۔ موجودہ دخیل الفاظ کے استعمال میں احتیاط اور اعتدال سے کام لیں اور آئندہ جب کسی لفظ کی ضرورت پڑے تو بدیسی زبانوں کی جگہ اپنی ہی علاقائی زبانوں سے امداد طلب ہوں کہ اس سے اردو کے سمجھنے والوں کا دائرہ وسیع ہوگا اور تمام اہل وطن اس کے واسطے سے اتحاد و یگانگت کی ایک ہی لڑی میں منسلک ہوجائیں گے۔

اردو میں سائنسی تدریس کے امکانات

ممتاز حسین ۔صدر شعبہ اردو زرعی یونیورسٹی لائلپور

حقیقت تو یہ ہے کہ اردو میں سائنسی تدریس کے امکانات اس قدر روشن ہیں کہ اس پر کسی مقالہ کی ضرورت نہیں ۔ یہ احساس کمتری آخر کیوں ہے کہ ہماری زبان علمی طور پر اس قدر پس ماندہ ہے کہ اس کے ذریعہ سائنس یا ادب کی تدریس ممکن نہیں ۔ زبانیں کم مایہ نہیں ہوتیں بلکہ ان زبانوں کے بولنے اور لکھنے والے علمی اور ذہنی طور پر کم مایہ ہوتے ہیں ۔ جب انہیں علوم وفنون میں پوری دسترس حاصل ہو جاتی ہے تو ان کے اظہار خیال میں خود بخود وسعتیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔

اردو مغربی پاکستان کے ہر گوشے میں سمجھی جاتی ہے ۔ پاکستان بھر میں کوئی اور زبان ایسی نہیں جو ہماری قومی زبان بننے کی اردو سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہو۔ ادبی اور سائنسی مضامین کی تعلیم کا ذریعہ بننے کی بھی اس میں پوری صلاحیت ہے ۔ مدرسین اس میں آسانی سے اپنا مطلب واضح کر سکتے ہیں اور درس پانے والے اس زبان کے مقابلہ میں بھلا کس زبان کو بہتر سمجھ سکتے ہیں ۔ مجھے بحیثیت مشیر ترقیات پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصوں میں کاشتکاروں مزدوروں اور تاجروں کو خطاب کرنے کا موقع ملا ۔ میں نے ہر جگہ اردو میں تقاریر کیں اور سامعین نے مجھے پوری طرح سمجھا۔ مغربی پاکستان میں تو یہی ایک زبان ہے جو سارے علاقوں میں کم وبیش بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔

اہل علم اصحاب کا فرض ہے کہ اسے ہر طرح مکمل کریں کیونکہ زبان جب تک قومی زندگی کے تمام

تقاضوں اور مطالبوں کو پورا نہ کرے قومی زبان کے منصب اعلیٰ کی حق دار نہیں بن سکتی۔ ہمیں اردو کو عہد حاضر کی سائنسی ترقی کا ساتھ دینے اور جدید علوم وفنون کے صحیح اظہار کا ذریعہ بنانے کے لئے تیار کرنا ہے۔قومی نقطۂ نگاہ سے کسی ملک میں تعلیم کے فروغ سے مراد باشندگان ملک کو علوم وفنون سے واقف کرنا اور انہیں ان کے عملی فیوض و برکات سے استفادہ کے قابل بنانا ہے۔ اگر تمام علمی اور سائنسی معلومات ہمارے قومی کتب خانوں اور چند علماء اور ماہرین کے دماغوں میں محفوظ رہیں تو ہمارے ملک کے لئے بیکار ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ علمی، ادبی، صنعتی اور زرعی معلومات ہمارے شہریوں، دیہاتیوں، کاریگروں اور کاشتکاروں تک اس شکل میں پہنچ سکیں کہ وہ ان پر عمل پیرا ہو کر ملکی معیشت اور اقتصادی حیثیت کو بہتر بنانے کی قابل ہو جائیں۔اس توسیعی کام کیلئے بھی ہمارے پاس آسان ترین ذریعہ اردو زبان ہی ہے۔سائنسی تدریس کی راہ میں سب سے بڑی مشکل اردو میں تعلیم دینے کے قابل اساتذہ کی کمی اور سائنس کی درسی کتابوں کمیابی ہے۔

سائنس کے موجودہ اساتذہ نے ابتدائی تعلیم انگریزی میں حاصل کی اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد انگریزی زبان میں ہی پڑھانے کی مشق کی۔ انگریزوں نے اپنی انتظامیہ اور تاجرانہ مصلحتوں کے پیش نظر نصاب تعلیم کو اس طرح ترتیب دیا کہ سائنسی مضامین میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنیوالے طلباء کو اسکول کی نویں جماعت سے ہی اردو عربی فارسی وغیرہ زبانوں سے محروم کر دیا اسلئے ان میں اردو زبان میں سائنسی تدریس تو کیا خیالات کے اظہار کی صلاحیت بھی پیدا نہ ہو سکی۔

تقسیم سے قبل برصغیر ہندو پاکستان میں بھی یہ احساس موجود تھا کہ حکمران قوم نے یہ مخصوص نصاب تعلیم انگریزی زبان میں بالقصد اختیار کیا ہے۔اس سے نجات حاصل کرنیکی کہیں کہیں کوششیں بھی ہوتی

رہیں۔ پاکستان بننے کے بعد یہ احساس شدید تر ہو گیا اور ارباب فکر و نظر نے جہاں نصاب میں تبدیلی ضروری سمجھی وہاں ذریعہ تعلیم کو بدلنا بھی ناگزیر خیال کیا ان کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ مختلف علوم و فنون کو اپنا کر اہل ملک کے سامنے پیش کریں تا کہ پاکستانی باشندے ان سے مستفید ہو سکیں۔

اردو زبان کئی زبانوں کا مجموعہ ہے اس میں وسعت اور لچک ہے۔ایک جائزہ کے مطابق اس میں عربی کے ۴۵ فارسی کے ۴۰ سنسکرت کے ۱۵ انگریزی کے ۵ ترکی کے ۲ اور یونانی کے ۲ فیصد الفاظ موجود ہیں اس کے علاوہ اور کئی زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہیں اس میں مزید ملکی اور غیر ملکی الفاظ کو سمیٹ لینے کی گنجائش ہے۔ جب سے مغربی پاکستان ایک صوبہ بنا ہے اور وسیع بنجر علاقے زیر کاشت آئے میں بہت سی علاقائی زبانوں کے الفاظ اردو میں جذب ہو رہے ہیں۔ مشینی کاشت اور صنعتی فروغ سے بہت سے غیر ملکی الفاظ ہماری روزمرہ گفتگو میں اس طرح شامل ہوئے ہیں کہ جزو زبان بن گئے ہیں۔ ھاری۔ مقاطعہ۔ اگیتی۔ پچھیتی۔ فیکٹری۔ فیملی۔ مشین۔ فارم۔ ٹریکٹر۔ ریکارڈ ٹیم۔ فینسی۔ فلم۔ تھرمامیٹر۔ انجن۔ ایکسیلیٹر۔ سوسائٹی۔ فیول پمپ۔ اکوئنٹنٹ۔ ایکٹر۔ بیم اور لیور وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ اردو ایک علمی زبان ہے اس میں الفاظ اصطلاحات اور اسالیب بیان کا وافر ذخیرہ موجود ہے اور مزید اضافہ کی بہت گنجائش ہے اس لئے اس میں سائنس کے لئے تدریسی زبان بننے کے امکانات بہت روشن ہیں۔

سائنس کو اردو میں پڑھانے کا تجربہ پہلی بار ۱۸۴۲ء میں دھلی کالج میں کیا گیا جو کامیاب ثابت ہوا۔ چنانچہ وہاں کے انگریز پرنسپل سی ایف اینڈریوز نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں اعتراف کیا کہ سائنس کی تعلیم میں وہ طلباء زیادہ کامیاب ہوئے جن کو اردو میں تعلیم دی گئی تھی۔ منشی ذکاء اللہ صاحب نے جو اس کالج سے فارغ التحصیل ہوئے تھے ۱۵۰ کتابیں لکھیں ہیں جن میں ۸۷

ریاضی کے موضوع پر تھیں۔دلی کالج اور سائینٹفک سوسائٹی نے سائنسی کتابوں کے ترجمے شروع کئے اور سائنسی مضامین پر کافی کتابیں لکھیں۔ایک تحقیق کے مطابق انیسویں صدی کے اواخر تک ۶۱۸ ایسی کتابیں لکھی گئی تھیں۔ ۱۹۲۷ء کی ایک سروے رپورٹ کے مطابق اردو میں سائنس۔جغرافیہ۔ حکمت۔فلسفہ۔ریاضی۔فنون لطیفہ اور دیگر مضامین پر ۱۷,۱۹۹۷ کتابیں اس سال تک لکھی جا چکی تھیں۔ان کی تالیف میں انگریزی کتابوں سے کافی امداد لی گئی تھی۔اب ۳۷ برس گزرنے کے بعد تو ان کی تعداد یقیناً بہت زیادہ ہوگئی ہوگی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کو اردو زبان کی علمی اور درسی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔اس یونیورسٹی نے بنیادی سائنسوں کے علاوہ انجینرنگ۔اقتصادیات۔طب انگریزی۔بیطاری۔طبقات الارض۔ہندسی مناظر۔پرورش حیوانات زراعت اور دیگر مضامین میں قابل قدر تصنیفات کیں اور ان کو تدریس کا ذریعہ بھی بنایا۔اس طرح جو سائنسی علوم انگریزی زبان میں محفوظ تھے انہیں اردو میں منتقل کر کے اس قومی زبان کو شعروشاعری اور فسانہ نویسی کی گلکاریوں سے نکال کر ٹھوس علمی بنیادوں پر کھڑا کردیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں زیادہ تر تراجم پر زور دیا گیا تھا لیکن تجربہ سے ثابت ہوا کہ تراجم سے تالیفات بہتر ہیں۔ترجمہ شدہ کتاب میں ایک ہی مصنف کی معلومات منتقل ہوتی ہیں لیکن تالیف اس مضمون کی ان تمام کتابوں کا نچوڑ ہوتی ہے جن کا مصنف نے اس کتاب کی تیاری میں مطالعہ کیا ہو۔اس کے علاوہ اس کی شخصیت اور ذاتی تجربات کی جلوہ گری بھی ہوتی ہے۔ترجمہ کا طریقہ دیر طلب اور خرچ طلب بھی ہے تقسیم ملک سے پہلے کا کام اس لئے قابل ستائش ہے کہ وہ ناسازگار حالات اور سرکاری مخالفت کے باوجود کیا گیا۔آزادی کے بعد سے مختلف ادارے اس قومی خدمت میں مشغول ہیں ان میں کراچی

یونیورسٹی مغربی پاکستان بورڈ۔ انجمن ترقی اردو کراچی ۔مغربی پاکستان اردو اکیڈمی۔مغربی پاکستان زرعی یونیورسٹی لائل پور۔ اردو اکادمی بہاول پور اور مغربی پاکستان مرکزی اردو بورڈ لاہور قابل ذکر ہیں۔ان اداروں میں اردو اصطلاح سازی اور سائنسی کتابوں کے تراجم اور تالیف وتصنیف کا کام ہو رہا ہے۔ ہماری گورنمنٹ کی اصابت رائے کی بدولت یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ چنانچہ انٹر یونیورسٹی بورڈ نے بااتفاق رائے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ سنہ ۱۹۶۹ء تک اردو ذریعہ تعلیم بنادی جائے۔اس ضمن میں حکومت نے یہ احکام صادر کئے ہیں کہ سنہ ۱۹۶۷ء تک سرکاری دفاتر میں تمام خط وکتابت اردو میں ہونی چاہیئے۔ یونیورسٹی کو نصابی کتابیں تیار کرنے اور اساتذہ کو اردو میں درس دینے کی مہارت حاصل کرنے کے لئے سنہ ۱۹۶۹ء تک کی مہلت دے دی گئی ہے۔

سائنس کے اساتذہ اردو زبان میں تدریس کی صلاحیت پیدا کرنے میں مشغول ہیں اور متذکرہ بالا ادارے ان کی سہولت کے لئے سائنس کے فرہنگ جدید اور کتابیں اردو میں شائع کر رہے ہیں۔ سائنس دانوں میں اہل قلم حضرات اور محققین یونیورسٹی کے مقرر کردہ نصاب کے مطابق کتابیں لکھنے میں مشغول ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی نے بی۔ اے۔ اور بی۔ ایس۔سی کے امتحانات تک انگریزی کے سوا سب مضامین کے سوالات اردو میں دینے کی اجازت دے دی ہے۔اردو اکیڈمی مغربی پاکستان نے ان طلباء کی سہولت کے لئے اردو کالج اور مرکزی امدادی ادارے بنادیئے ہیں جو انہیں امتحانوں کی تیاری کے لئے مواد بہم پہنچاتے ہیں۔مغربی پاکستان کا مرکزی بورڈ مترجمین اور مصنفین کی حوصلہ افزائی کے لئے گراں قدر معاوضہ دے رہا ہے۔اچھی کتابوں کی مانگ بڑھ رہی ہے اور غیر معیاری کتابوں کو تعلیمی ادارے ترک کررہے ہیں۔کراچی یونیورسٹی نے اردو کو مکمل طور سے ذریعہ تعلیم کردیا ہے اساتذہ اپنے

روزانہ درس اردو میں لکھ کر دیتے ہیں اور یہ درس کتابچوں کی شکل میں طلباء میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح دوسری یونیورسٹیاں اس سلسلے میں قابل قدر کام کر رہی ہیں۔ مغربی پاکستان کی زرعی یونیورسٹی نے کراچی یونیورسٹی کے طریقہ تالیف کو اختیار کیا ہے اور اب تک ابتدائی تعلیم کے لئے زراعت۔ نباتات۔ باغبانی۔ حشریات۔ پرورش حیوانات کے مضامین پر چھ نصابی کتابیں تیار کی ہیں ان کے علاوہ چھ اور کتابیں سبزیات۔ زراعت۔ تنظیم نوجوانان۔ امداد باہمی۔ میکانکی آلات زراعت اور جنگلات پر زیر تالیف ہیں۔ اس کے علاوہ زرعی یونیورسٹی نے بی ایس سی کے معیار کی کتابوں کی تیاری کے لئے مستند انگریزی کتابوں کے ترجمے اور دیگر نصابی کتابوں کی تصنیف کا کام شروع کرنے کا پروگرام بھی بنایا ہے۔ اس کام کے لئے ہر شعبہ میں سے ایک ایک ماہر مامور کیا گیا ہے جو اپنے دوسرے رفقائے کار کی معاونت سے اس کام کو سرانجام دیگا۔

زرعی یونیورسٹی کا اردو ادارہ تصنیف و تالیف کے کام میں ان مصنفین کی ہر طرح مدد کرے گا۔ اس طرح اساتذہ بتدریج اردو زبان میں سائنسی مضامین کی تشریح کرنے میں مہارت حاصل کر لینگے۔ مغربی پاکستان کے مختلف ادارے جن میں کراچی یونیورسٹی پیش پیش ہے مختلف ادبی اور سائنسی فرہنگ تیار کر رہے ہیں۔ زرعی یونیورسٹی کے شعبہ تالیف و تصنیف نے زراعت اور متعلقہ سائنسوں کی اصطلاحات کے فرہنگ تیار کرنے شروع کر دئے ہیں اور اب تک زراعت۔ معاشیات۔ حشریات۔ نباتیات۔ کیمیا۔ طبعیات۔ حیاتیات۔ تناسلیات۔ بیطاری۔ انجنیرنگ۔ مائیات۔ موسمیات۔ دیہی عمرانیات۔ ارضیات۔ پرورش حیوانات اور تعمیرات کی تقریباً ۴۰۰۰۰ اصطلاحات جمع کر لی ہیں جن میں سے تقریباً ۲۰۰۰۰ اصطلاحات کا ترجمہ انگریزی کے حرف ''آئی'' تک کیا جا چکا ہے۔ اس ترجمہ پر مغربی پاکستان اردو اکیڈمی اور یونیورسٹی کے ماہرین نظر ثانی کرتے ہیں جسے تصدیق کے بعد لغت کی

شکل میں شائع کیا جائے گا۔اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت اس بات کا بطور خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ اردو مترادف الفاظ دینے کے ساتھ ساتھ طلباء کے فائدہ کیلئے اصطلاحات کی تشریح بھی کر دی جائے۔ پرانے ترجموں اور دوسرے اداروں کی مطبوعات سے حاصل کردہ اصطلاحات میں زرعی فن کے نقطہ نگاہ سے حسب ضرورت اضافہ اور تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔

نصابی کتابوں کے ترجمے اور تصنیف اور فرہنگوں کی ترتیب میں کراچی یونیورسٹی کے دستور کی پیروی کی جا رہی ہے۔ نصابی ترجموں اور تصانیف میں بین الاقوامی سائنسی اصطلاحات مثلاً کیمیائی عناصر کی علامتوں۔ کیمیائی عناصر اور مرکبات کے ناموں۔ مشہور ادویہ اور ان کے ناموں علم حیاتیات کے لاطینی ناموں۔ علم ریاضی کی علامتوں وغیرہ کو اسی طرح رکھا جاتا ہے۔ نیز بیماریوں۔ بدیشی درختوں۔ جھاڑیوں اور گھاس کے ناموں کو اپنی اصلی شکل میں رکھا جاتا ہے۔ کیمیائی عناصر اور مرکبات مثلاً لوہا۔ نیلا تھوتھا۔ گندھک وغیرہ جن کے اردو نام رائج ہیں اردو زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ دیگر مرکبات اور ادویہ وغیرہ کے انگریزی نام مثلاً نسولین۔ پنسلین ۔ ایکٹینیم ۔ ڈوالیہ۔ پنیزی۔ للّی وغیرہ برقرار رکھے جاتے ہیں لیکن اردو رسم الخط میں لکھے جاتے ہیں۔ جن انگریزی اصطلاحات کے موزوں متبادل بن چکے ہیں ان کو تصانیف میں اردو ناموں کے ساتھ خطوط وحدانی میں لکھ دیا جاتا ہے تاکہ طلباء اور اساتذہ ان سے پوری طرح مانوس ہو جائیں۔

زراعت اور اس سے متعلق علوم کے فرہنگ عام سے امتیازی شکل کے ہوتے ہیں۔ زراعت نے موجودہ زمانہ میں ایک فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اس میں تمام بنیادی سائنسوں کے علاوہ تکنیکی علوم اور ان کی اصطلاحات بھی رواج پا گئی ہیں اس کی زبان کا دامن بتدریج وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ مختلف علوم کے ماہرین اپنی نئی نئی سائنسی تحقیقات اور تجربوں کے دوران کئی ایک نئے الفاظ وضع کر لیتے ہیں

جواس سائنس کی زبان کا جزو بن جاتے ہیں۔اس لئے اس کا فرہنگ عام لغات سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک ہی لفظ اس کی مختلف شاخوں میں مختلف معانی کا اظہار کرتا ہے مثال کے طور پر ماہرین حشریات کیڑوں کے حملہ سے مردہ شگوفوں کیلئے (DEAD HEARTS) کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں جس کا مطلب ایک عام زبان دان کے خیال سے کچھ اور ہی ہے۔اسی طرح (CUT) کے چھوٹے سے لفظ کے معنی قطع۔کٹائی۔تراش۔ضرب چبھتا طعنہ وغیرہ ہیں۔زرعی زبان میں اس لفظ سے مراد گوشت کا ٹکڑا۔ گھوڑے کا اپنی ٹانگوں کو رگڑنا۔گلہ یا ریوڑ سے جانور کا علیحدہ کرنا۔پودے سے کسی حصہ کا علیحدہ کرنا۔ زخم۔کٹاؤ۔جراحت۔اور مالی حصہ وغیرہ ہیں۔ہم عموماً ان علوم کی اصطلاح سازی پر توجہ دیتے ہیں جن کا تعلق زرعی تعلیم سے ہے۔دیگر اصطلاحات وضع کرتے ہوئے مروجہ مقامی ناموں اور مطالب کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے مثلاً (BLIGHT) کے معنی روکھ جون۔پت روگ۔اور فصلوں کا یرقان ہیں۔

حضرات۔اردو زبان کے قومی حیثیت پا جانے سے عوام وخواص اسکی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ اس کی حدود اور جملہ توانائیوں کا اندازہ کیا جا رہا ہے۔اس کے دامن کی وسعت اور معنوی گہرائیوں کے متعلق سوچ بچار ہو رہا ہے اسکی علمی اور عملی استطاعت پر غور کیا جا رہا ہے اور اس طرح اس قومی زبان کو فی الحقیقت قومی بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔اخبارات۔رسائل صوبائی اور قومی اسمبلیوں۔ملکی ریڈیو کی نشریات۔قومی رہنماؤں کی تقاریر اور بڑے بڑے تعلیمی اداروں کے انداز فکر وعمل سب پر اردو کا سحر آفرین اثر نمایاں ہے۔گھروں میں پنجابی اور دیگر علاقائی زبانیں بولنے والے والدین بھی اپنے نونہالوں سے اس زبان میں گفتگو کرتے ہیں یہ سب علامتیں ہمیں اس زبان کے شاندار مستقبل کی گواہی دیتی ہیں۔

سائنسی تدریس کے لئے اس زبان کو روز بروز زیادہ سے زیادہ موزوں بنایا جا رہا ہے یہی وجہ ہے

کہ ہماری ماہرین تعلیم اردو زبان کی تدریسی وسعتوں سے مطمئن نظر آتے ہیں۔

بہرحال اردو میں سائنسی تدریس کے امکانات درخشاں ہیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں جرأت مندانہ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین ثم آمین)

غیر ممالک میں احمدی اردو کی ترویج و اشاعت میں کیا حصہ لے رہے ہیں۔نسیم سیفی

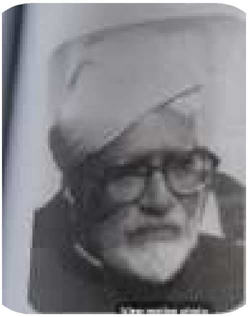

۱۹۵۰ء میں میں نائیجیریا مغربی افریقہ سے پاکستان واپس آرہا تھا۔راستے میں عدن میں مجھے چند روز قیام کرنے کا موقع ملا۔وہاں میرے میزبان ڈاکٹر بشیری صاحب مرحوم تھے جو احمدیہ جماعت کے ایک نہایت مخلص اور سرگرم کارکن تھے۔سیاسی حلقوں میں بھی ان کی اچھی خاصی رسائی تھی۔جس روز میں عدن پہنچا ہوں اس سے اگلے ہی دن وہ مجھے ایک دوست شیخ محمد عبداللہ صاحب سے جو ان دنوں وہاں کی حکومت کے ایک نہایت معزز عہدیدار تھے ملانے کے لئے لے گئے۔شیخ صاحب سے ابھی گفتگو بھی شروع نہ ہوئی تھی کہ ڈاکٹر بشیری صاحب کہنے لگے سیفی صاحب ہماری جماعت کے مبلغ ہیں اور شاعر بھی۔اور پھر میری طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے سیفی صاحب شیخ صاحب کو کوئی نظم سنائیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ میں یہ بات سن کر ہکا بکا رہ گیا۔اس میں کچھ شک نہیں کہ میں شعر کہتا ہوں لیکن نہ صرف یہ کہ میں مشاعروں کا شاعر نہیں بلکہ اگر صرف یار و احباب ہی کی مجلس ہو تو پھر بھی مجھے شعر سنانے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔مجھے ہمیشہ اپنے متعلق اس بات کا احساس رہتا ہے کہ میں ایک غیر شاعر شاعر ہوں لیکن یہاں ایک طرف تو ڈاکٹر

بشیری صاحب جو میرے میزبان تھے اورنہایت ہی مہربان میزبان اور دوسری طرف شیخ محمد عبداللہ صاحب جن کے بشیری صاحب سے بہت ہی اچھے تعلقات تھے۔ میں نے انتہائی استعجاب اور حیرت کے باوجود اپنے ہینڈ بیگ میں سے ایک نوٹ بک نکالی اور چنداشعار انکی خدمت میں پیش کر دیئے۔

یہ واقعہ بذات خود کسی اہمیت کا حامل نہیں لیکن میرے مقالہ کا عنوان ہے بیرونی مما لک میں احمدیہ جماعت اردو کی کیا خدمات سرانجام دے رہی ہے اور یہ واقعہ میری موضوع سخن کو تصویری رنگ میں پیش کرنے کی بہترین مثال کہا جا سکتا ہے۔

ہمارے پاکستانی احمدی دوست جہاں بھی ہیں اردو کے ساتھ نہ صرف رابطہ قائم رکھتے ہیں بلکہ اسے فروغ دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔جس واقعہ کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اس سے مکرم ڈاکٹر بشیری صاحب کے اردو کے ساتھ لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔لیکن دو چار روز ہی کے بعد وہ اس سے بھی ایک قدم آگے نکل گئے۔اور عدن میں با قاعدہ ایک مشاعرہ کروادیا گیا۔

بشیری صاحب اس مشاعرہ کی روح رواں تھے خود بھی شعر کہتے تھے اور بہت اچھا شعر کہنے والے تھے اس کے بعد گاہے گاہے ایسے مشاعرے ہوتے رہے اور اب تو عدن میں با قاعدہ مشاعرے ہوتے ہیں۔ میں اس سال نائیجیریا سے دوبارہ واپس آتے ہوئے عدن ٹھہرا تو مجھے پتہ چلا کہ اب مشاعرے نہائت با قاعدگی کے ساتھ ہوتے ہیں اور ہماری جماعت کے دوست ان میں کافی دلچسپی لیتے ہیں۔

عدن میں تو مشاعرے غالباً اس لئے بھی با قاعدگی کے ساتھ ہوتے ہیں کہ عدن پاکستان سے بہت ہی قریب ہے۔لیکن لندن میں بھی با قاعدہ مشاعرے ہوتے ہیں اور وہاں بھی ہماری جماعت کے دوستوں نے میری ان مشاعروں کی طرف رہنمائی کی۔جبکہ ہمارے مبلغین ہی مجھے ان مشاعروں میں

لے جاتے رہے۔ اور میں نے دیکھا کہ وہاں بھی ہمارے مبلغین ان مشاعروں کے انعقاد میں نہایت دلچسپی سے حصہ لیتے ہیں۔ اگر چہ ان مشاعروں کا معیار تو بہت زیادہ بلند نہیں لیکن پاکستان سے ہزاروں میل دور اردو زبان میں دلچسپی قائم رکھنے کا ایک ذریعہ تو ہیں۔ میں نے ایسے ہی ایک مشاعرہ پر ایک نظم پڑھی تو اس کے اگلے روز مجلس مشاعرہ کے سیکرٹری صاحب نے مجھے ٹیلیفون پر پوچھا کہ اس نظم کا مطلب کیا تھا۔ کہنے لگے کہ میں روداد لکھ رہا ہوں اور مجھے اس نظم کے متعلق کچھ ذرا تفصیل سے لکھنا ہے۔ دراصل اس نظم میں جس خیال کو پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک سپاہی جنگ پر جاتے وقت گھر سے نکلتے ہی اپنی رفیقۂ حیات کے متعلق سوچنے لگتا ہے اور اسکی خیالی تصویر اس کے ذہن میں رقص کرنے لگتی ہے۔ اس طرح لندن ہی میں یوم اقبال پر پاکستان ہائی کمیشن نے ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ میں تو لندن میں اپنے مشن کا مہمان ہی تھا کیونکہ میری منزل نائیجیریا تھی اور لندن میں عارضی قیام تھا۔ وہاں بھی مجھے ہمارے مشن کے مبلغ ہی اپنے ساتھ لے کر گئے۔ اور اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مشاعروں میں شرکت کرنا یقیناً ایک رنگ میں اردو زبان کی خدمت کرنا ہے۔

اس موقعہ پر میں نے علامہ اقبال مرحوم پر ایک نظم کہہ لی تھی جو وہاں پیش کی گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ آج سے بیس سال قبل جب میں نائیجیریا میں تبلیغ اسلام کے لئے جانے کی تیاری کر رہا تھا تو میرے بعض کرم فرماؤں کا خیال تھا کہ مجھے وہاں بھیجنے کا کیا مطلب ہے۔ ایسے ہی کرم فرماؤں میں سے ایک سردار دیوان سنگھ صاحب مفتون تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب، نا قابل فراموش، میں میرے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ تحریر کئے ہیں جو میں سمجھتا ہوں کہ موضوع کے لحاظ سے آپ حضرات کی دلچسپی کا باعث ہونگے۔

''تبادلۂ آبادی سے پہلے ایک احمدی نوجوان گورنمنٹ آف انڈیا کے دفتر میں سرکاری ملازم

تھے۔ جن کا نام نسیم سیفی تھا۔ یہ وہاں اڑھائی تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے اور ہفتہ میں ایک دو بار دفتر ریاست میں ضرور تشریف لاتے کیونکہ ان کی نظمیں ریاست میں شائع ہوتیں یہ بہت اچھی نظمیں کہتے تھے اور میرا یقین تھا کہ انکا مستقبل بطور ایک شاعر کے بہت ہی شاندار ہے چند ماہ یہ دفتر ریاست میں آتے رہے تو اس کے بعد آپ نے ایک روز فرمایا کہ اب سرکاری ملازمت ترک کر کے افریقہ جا رہے ہیں اور وہاں یہ بطور ایک احمدی مبلغ کے اسلام کی تبلیغ کریں گے میں نے پوچھا کہ وہاں کیا تنخواہ ملیگی تو انہوں نے بتایا کہ ساٹھ روپیہ ماہوار۔ ان کے اس جواب کو سن کر میں نے ان سے کہا کہ تم بہت ہی بے وقوف ہو جو اڑہائی تین سو روپیہ ماہوار کی مستقل سرکاری ملازمت چھوڑ کر ساٹھ روپیہ ماہوار کی غیر سرکاری ملازمت اختیار کر رہے ہو مجھے اب تک یاد ہے میرا جواب سن کر یہ مسکرا دیئے اور غالباً اسی ہفتہ یہ ملازمت چھوڑ کر افریقہ چلے گئے۔ ان مسٹر نسیم سیفی سے اس کے بعد کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا اور پندرہ سولہ برس تو ان کا کوئی خط بھی نہیں ملا اور مجھے یہ علم بھی نہیں کہ یہ آج کل کہاں ہیں مگر یہ واقع ہے کہ جب بھی کوئی احمدی مجھ سے ملتا ہے تو میں اس سے ان کی خیریت کے متعلق دریافت کر لیتا ہوں اور میرے دل میں اس شخص کے لئے نہ صرف انتہائی عزت و احترام بلکہ کچھ محبت کے جذبات بھی موجود ہیں اور میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کی قربانی کی سپرٹ افریقہ میں کتنے لوگوں کو احمدیوں کے حلقہ میں لانے کا باعث ہوتی ہوگی‘‘۔

بہر حال یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ مجھے ایک لمبے عرصہ تک تبلیغ اسلام کا موقعہ ملا ہے اور اس کے ساتھ ہی پاکستان اور اردو کی بھی کسی نہ کسی رنگ میں خدمت کا موقع ملتا رہا ہے۔ پاکستان کی آزادی کے معاً بعد نائیجیریا میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ وہاں کی ایک سیاسی پارٹی نے پاکستان کے لفظ کو برے معنوں میں استعمال کرنا شروع کر دیا بلکہ ایک انٹی پاکستان مومنٹ نے بھی وہاں جنم لے لیا۔

ان حالات میں مجھے سالہا سال تک پاکستان کے نظریہ کو واضح کرنے کے لئے اور لوگوں کے غلط خیالات کو درست کرنے کے لئے اخباروں میں مضامین لکھنے پڑے۔ ایسوسی ایشن آف ورلڈ افیرز سٹوڈنٹس کے پلیٹ فارم سے میں نے ''ہندوستان کا ماضی اور حال'' کے عنوان پر تقریر کی۔ ریڈیو پر ''پاکستان میں زندگی'' کے عنوان پر ایک تقریر نشر کی۔ اخبارات میں ''ہندوستان میں دو قوموں کا نظریہ'' کے عنوان سے خاصے طویل مضمون لکھے اسی طرح ''مسلمانوں کی خدمات'' پر بھی ایک مضمون لکھا۔ ان کے علاوہ ایک اخبار میں اردو کے متعلق بعض غلط باتیں شائع ہو گئیں تھیں ان کی درستی اخبار ہی کے ذریعہ کروائی۔ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جن میں اردو کا زیر بحث آنا لازمی تھا۔ چنانچہ اس طرح لوگوں کو اردو سے روشناس کروایا۔

پاکستان کے متعلق تو میں نے اپنے مضامین۔ اخباروں کے ایڈیٹوریل اور قارئین کے خطوط پر مشتمل ایک کتاب بھی مرتب کی ہے جس کا نام ہے۔

"IN DEFENCE OF PAKISTAN"

حضرات جہاں تک اردو کی خدمت کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ جن باتوں سے یہ فریضہ سرانجام دیا جاسکتا ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) زبان کو قائم رکھنا اور بیرونی ممالک میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زبان کا بولنا۔ پڑھنا اور لکھنا کسی نہ کسی رنگ میں جاری رکھنا۔

(۲) زبان کی تعلیم دینا یعنی بیرونی لوگوں کو زبان سے روشناس کرانے کے لئے اردو زبان سکھانا۔

(۳) اس زبان میں مضامین لکھنا یا شعر کہنا۔ بیرونی ممالک میں یہ بات نہائت محدود طریق پر ہی میسر آسکتی ہے لیکن بہر حال جہاں بھی میسر آسکے وہاں اس سے فائدہ اٹھانا اردو کی خدمت ہی کے ضمن

میں شامل ہوگا۔

(۴) اچھے نثر نگاروں یا شعراء کا لوگوں سے تعارف کرانا۔

(۵) اردو کی کتابوں کو ترویج دینا۔

(۶) لائبریریاں قائم کرنا۔ (۷) مذاکرات یا مشاعرے منعقد کرنے۔

بے شک ان باتوں کے علاوہ بھی کئی ایک ایسی باتیں ہیں جو خدمت اردو کے پروگرام میں شامل کی جاسکتی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو باتیں میں نے پیش کی ہیں یہ اس سلسلہ کی سب سے اہم کڑیاں ہیں۔

میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے اس سے بیرونی ممالک میں اپنی جماعت کے ممبروں مشاعروں میں دلچسپی کا اظہار رہتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ہماری جماعت کے افراد صرف اور صرف مشاعروں ہی میں شمولیت کرتے ہیں اور ان کی اردو کی خدمت کی پونجی صرف یہی ہے ہمارے بڑے مشن اردو کی کلاسیں جاری کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے خود نائیجیریا میں اردو کی کلاس جاری کی اور اگر چہ یہ کلاس بہت عرصہ تک تو جاری نہ رکھی جاسکی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا نہایت خوشگوار اثر پڑا اور کم از کم وہ لوگ جو اس کلاس میں شامل ہوئے ذہنی طور پر پاکستان کے زیادہ قریب ہو گئے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ غانا میں بھی اکا دکا لوگوں کو ہمارے مبلغین اردو پڑھاتے ہیں۔

جہاں تک اردو کے اچھے مصنفین اور شعراء کا بیرونی ممالک کے لوگوں سے تعارف کا تعلق ہے۔ ہمارے بہت سے مشنوں میں CRIES IN THE NIGHT جو اردو کے جدید شاعروں کی نظموں کا انگریزی ترجمہ ہے اور صوفی عبدالقدیر نیاز کی کوششوں کا مرہون منت ہے۔ ہمارے مبلغین نے اپنے اپنے ملک کے ادیبوں اور شعراء کو تحفتاً دیا میں نے خود نائیجیریا میں بعض ادیبوں کو یہ ترجمہ دیا اور اسکا

نہائت ہی اچھا اثر ہوا۔

لیکن اس سے بھی زیادہ جو چیز بیرونی ممالک کے لوگوں کو اردو کے مصنفین سے روشناس کراتی ہے اوران کو اردو اور پاکستان کے قریب لاتی ہے وہ ہے احمدیہ لٹریچر۔ ہمارے بانیٔ سلسلہ حضرت احمد علیہ السلام کی اکثر تصانیف اردو میں ہیں اور بیرون ممالک میں نہ صرف ہماری جماعت کے افراد بلکہ دوسرے ایسے لوگ بھی جو احمدیہ جماعت کے متعلق مزید واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اگرچہ اردو تو وہ لوگ نہیں پڑھ سکتے لیکن جب ان کتابوں یا ان کتابوں کے بعض حصوں کا انگریزی ترجمہ پڑھتے ہیں تو انہیں اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ یہ اردو زبان کا ترجمہ کیا ہوا ہے۔اور حقیقت یہ ہے کہ بیرونی ممالک اردو کی سب سے بڑی خدمت تو اردو لٹریچر کو بیرونی ممالک کی زبانوں میں ترجمہ کر کے ہی کی جاسکتی ہے اس سلسلہ میں ہماری جماعت ایک منفرد حیثیت کی مالک ہے کیونکہ ہماری سب سے بڑی خواہش یہ رہتی ہے کہ حضرت احمد علیہ السلام کی تصانیف کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ہم سمجھتے ہیں کہ اس زمانے میں حقیقی اسلام کو پیش کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے حضرت احمد علیہ السلام کی کتب اور یہ لوگ جو اسلام کی خدمت کے لئے باہر جاتے ہیں۔حضرت اقدس کی کتب کے ترجمے ہی لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ایک نہایت ہی وسیع میدان ہے اردو کی خدمت کی۔ہم نے لوگوں کے دلوں میں ایک لگن لگادی ہے کہ حضرت احمد علیہ السلام کی جملہ کتب کے بیرونی ممالک کی زبانوں میں جلد از جلد ترجمہ ہونا چاہیئے۔جس قدر زیادہ ان کتب کا ترجمہ ہوتا چلا جارہا ہے اتنا ہی زیادہ بیرونی ممالک کے لوگ اردو سے روشناس ہوتے جارہے ہیں بلکہ ترجمے پڑھ کر ان کے دل میں تڑپ پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ اصل کتاب بھی پڑھنے کے قابل ہوجائیں تو اچھا ہے۔چنانچہ میں یہ کہتے ہوئے ایک گونہ خوشی اور فخر محسوس کرتا ہوں کہ دنیا میں صرف اور صرف ہمارا ہی

ایک مرکز ہے جس نے دنیا بھر میں اردو کی خدمت کے سامان مہیا کئے ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ ربوہ میں جامعہ احمدیہ کے زیر اہتمام اردو کا ایک الگ شعبہ قائم ہے جہاں بیرون ممالک کے طلباء کو اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اردو کی اس کلاس میں یورپ کے مختلف ممالک کے لوگ چین کے لوگ۔ انڈونیشیا کے لوگ۔ مشرقی اور جنوبی افریقہ کے لوگ، امریکہ کے لوگ غرضیکہ دنیا کے ہر علاقے کے لوگ اردو کی تعلیم پاتے ہیں یا پا رہے ہیں۔ یہ بات کہتے ہوئے میں اس لئے بھی خوشی محسوس کرتا ہوں کہ بیرون ممالک کے لوگوں کو اردو کی تعلیم کا کام جامعہ احمدیہ میں میرے والد بزرگوار کے سپرد ہے اور باوجود اس کے کہ وہ ساری عمر سکولوں میں پڑھانے ہی کا کام کرتے رہے ہیں ان کے لئے تعلیم و تعلم کا حاصل زندگی اردو اور اسلام کی یہ خدمت ہے جو وہ اب سرانجام دے رہے ہیں اور جب ان کے طلبا اپنے ممالک میں واپس جا کر اردو میں خط لکھتے ہیں تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

اگر آپ مغربی افریقہ میں بیٹھے ہوں اور وہاں کے ایک باشندے سے اردو میں باتیں کر رہے ہوں یعنی وہ بھی اردو ہی میں آپ سے بات کر رہا ہو تو آپ کو ایک لازوال خوشی حاصل ہوگی۔

مجھے بارہا یہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ وہاں کے ایک ہونہار طالبعلم یہاں سے اردو پڑھ کر گئے ہیں۔ اور اب خدا کے فضل سے نہایت شستہ اردو میں گفتگو کرتے ہیں اور پاکستانی دوستوں کو خط بھی اردو زبان ہی میں لکھتے ہیں۔

ہماری جماعت کی یہ خدمت جس کا سرچشمہ تو مرکز میں ہے۔ لیکن جس کا سہرا بیرونی جماعتوں کے سر بھی ہے۔ ایک ایسی خدمت ہے۔ جو ہماری جماعت کو باقی ہر ایسے ادارے سے جو اردو کی خدمت کر رہا ہے۔ ممتاز کر دیتی ہے۔ اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ ہماری ان حقیر خدمات کو اردو کے بھی خواہ نیک نیتی سے سراہتے بھی ہیں۔ بیرونی ممالک میں ہماری جماعت کی خدمات کا تو غالباً بہت سے

لوگوں کو کوئی علم نہیں۔لیکن ہندو پاکستان کے متعلق انجمن ترقی اردو پاکستان کے میگزین قومی زبان کے مدیر مشفق خواجہ صاحب کے یہ الفاظ پڑھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔آپ نے ہماری جماعت کے ایک ادارے کی طرف سے شائع ہونے والے ایک مجلہ کے متعلق اس مجلہ کے مدیر کو خط لکھا۔تو اس میں یہ بھی فرمایا ''ایک بات مجھے اور عرض کرنی ہے۔بابائے اردو مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ جماعت احمدیہ نے اردو زبان کی جس قدر خدمت کی ہے۔وہ کسی دوسری جماعت نے نہیں کی۔ان کا ارادہ تھا کہ جماعت احمدیہ اور اردو کے عنوان سے ایک مقالہ لکھوایا جائے گا۔''

اردو کی خدمت کے سلسلہ میں ایک اور بات جس میں ہماری جماعت دوسرے تمام اداروں سے ممتاز ہے۔یہ ہے کہ ہم نے دنیا کے سوسوا سو بڑے بڑے شہروں میں اردو کی لائبریریاں قائم کر دی ہیں۔اور ان لائبریریوں میں سینکڑوں کی تعداد میں اردو کی کتابیں موجود ہیں۔یہ تمام لائبریریاں ہمارے مشنوں کے ساتھ ملحق ہیں۔اور ہر وہ شخص جوان لائبریریوں سے فائدہ اٹھانا چاہے اس کے لئے یہ لائبریریاں ہر وقت کھلی رہتی ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ ہم ہر وقت اس کوشش میں رہے ہیں کہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان لائبریریوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔لیکن جیسا کہ یہ بات ظاہر ہی فی الحال ان لائبریریوں سے صرف مستشرق ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔اور انکی تعداد بہت ہی کم ہے۔لیکن حضرات کیا یہ بات اپنی ذات میں ایک خاص اہمیت کی حامل نہیں کہ اردو زبان کی لائبریریاں دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں قائم کر دی جائیں کسی زبان کی کتابوں کی لائبریری قائم کر دینا غالباً اس زبان کی سب سے بڑی خدمت ہوتی ہے۔یہ محض اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔کہ اس نے ہماری جماعت کو اس بات کی توفیق دی ہے کہ ہم نے بیرونی ممالک میں اردو کی کتابیں مہیا کی ہیں اور ان کی لائبریریاں قائم کر دی ہیں۔

میں اپنے ان مشنوں کا ذکر کئے بغیر اس مقالہ کو ختم نہیں کر سکتا جو اپنے اپنے ملکوں میں اردو جاننے والوں کیلئے اردو زبان میں نیوز بلیٹن جاری کرتے ہیں۔ایسے مشنوں میں مشرقی افریقہ اور فجی کے جزائر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔زبان کو زندہ رکھنے اور ترویج دینے کیلئے اخبارات یا بلیٹن کی اشاعت ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہماری جماعت کے بیرونی مشنوں میں بعض کو یہ خدمات بجالانیکی بھی توفیق مل رہی ہے۔

الغرض ہماری جماعت نے نہ صرف ہندو پاکستان میں اردو کی خدمت کی ہے۔بلکہ بیرونی ممالک میں بھی ہر رنگ میں اردو زبان کو قائم رکھنے اور لوگوں سے روشناس کرانے اور اس کی مزید ترقیات کے دروازے کھولنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے۔اور ہم اس کا جتنا بھی شکریہ ادا کریں کم ہے۔میں آپ حضرات کا بھی ممنون ہوں کہ آپ نے میری گذارشات کو نہایت صبر اور خندہ پیشانی سے سنا ہے۔جزاکم اللہ

مطبوعہ نصرت آرٹ پریس ربوہ

نومبر ۱۹۶۴ء

رپورٹ

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی دوسری کل پاکستان اردو کانفرنس

اردو کے ساتھ بیگانگی نے ہماری تعلیم کو بے منہاج بے مقصد بے اثر اور بے نتیجہ بنا دیا ہے۔علمی لحاظ سے باعزت مقام حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار تک قومی زبان میں تعلیم دینا ازبس ضروری ہے۔

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی دوسری کل پاکستان اردو کانفرنس میں
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا خطبہ افتتاح
کانفرنس میں مغربی پاکستان کی تین یونیورسٹیوں اعلیٰ تعلیمی اداروں اور ادبی تنظیموں کے 84 مندوبین کی شرکت

ربوہ۔ 14 اکتوبر کو محترم جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی وائس چانسلر کراچی یونی ورسٹی نے تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی دوسری کل پاکستان اردو کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے اس امر پر تاسف کا اظہار کیا کہ ہم لوگ احساس کمتری کے ماتحت اردو کے ساتھ بے گانگی کا سلوک کر رہے ہیں اور اسی بیگانگی نے ہماری تعلیم کو بے منہاج، بے مقصد، بے اثر اور بے نتیجہ بنا دیا ہے۔آپ نے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار تک اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرمایا۔جب تک اعلیٰ سے اعلیٰ معیار تک قومی زبان کے ذریعے تعلیم نہیں ہوگی اس وقت تک ہمارا شمار علمی حیثیت سے کبھی صفحہ اول کی اقوام میں نہیں ہوسکے گا ڈاکٹر صاحب موصوف نے خبردار کیا کہ اگر ہم نے اپنی قومی زبان کے سلسلہ میں اپنے احساس کمتری کو فوری طور پر دور نہ کیا تو یہ احساس کمتری ہمارے عقائد کو برباد کردے گا۔

ہمارے دین سے ہمارا علاقہ توڑ دے گا اور ہمیں اسلام کی نعمت سے محروم کر دے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کریں۔ اور اپنی چیزوں سے محبت کرنا سیکھیں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی اس کانفرنس کا افتتاح کرنے کے لئے کراچی سے ربوہ تشریف لائے تھے۔ کانفرنس میں جو دو روز تک جاری رہی۔ مغربی پاکستان کی تین یونیورسٹیوں اور متعدد تعلیمی اداروں اور ادبی تنظیموں کے 84 خصوصی مندوبین نے شرکت کی کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب کے علاوہ زرعی یونیورسٹی لائل پور کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر ظفر علی ہاشمی صاحب بھی کانفرنس میں شریک ہوئے اور آپ نے سائنسی تدریس کے مذاکرہ کی صدارت فرمائی۔

یونیورسٹی مندوبین میں میجر آفتاب حسن صاحب (کراچی یونیورسٹی) پروفیسر سید وقار عظیم، ڈاکٹر سید نذیر احمد اور ڈاکٹر محمد عبد العظیم (پنجاب یونیورسٹی) جیسے نامور اہل علم شامل تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور، گورنمنٹ کالج سرگودھا، گورنمنٹ کالج لائل پور، گورنمنٹ کالج جھنگ، گورنمنٹ کالج راولپنڈی اور یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور نے اپنے خصوصی مندوبین شرکت کے لئے بھجوائے۔ ان تعلیمی اداروں کے علاوہ انجمن ترقی اردو لائل پور، بزم ترقی اردو ملتان اور بزم فکر و نظر گجرات کے مندوب بھی شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کی افادیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی کانفرنس کے ایام میں ربوہ میں ہی قیام فرما رہے اور اکثر اجلاسوں میں بنفس نفیس شرکت فرماتے رہے۔

کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں محترم پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب پرنسپل تعلیم الاسلام کالج نے خطبہ استقبالیہ پڑھتے ہوئے اس امر کو واضح کیا کہ تعلیم الاسلام کالج میں اردو کانفرنس اس لئے منعقد کی جا رہی ہے کہ ہمیں اردو کے ساتھ بڑی محبت ہے اور ہم اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے اور اعلیٰ تعلیم

کے ماحول کواردو کا رنگ دینے کے لئے نہایت سنجیدگی سے کوشش کررہے ہیں۔اور ملک میں اردو کے فروغ کے لئے جوکوششیں بھی ہوں گی ہم ان میں پیش پیش ہوں گے۔

محترم پرنسپل صاحب کے ارشادات کا عملی ثبوت اس رنگ میں ظاہر ہوا کہ اس دوروزہ کانفرنس میں زبان، ادب، ....اور تدریس کے پچاس موضوعات پر نہایت اعلیٰ پایہ کے 43 مقالے پڑھے گئے۔اور باقی سات مقالے اشاعت کے لئے پیش کئے گئے۔ کانفرنس میں دو مذاکرے بھی منعقد ہوئے۔ان میں ایک مذاکرہ اردو میں سائنسی تدریس کی مشکلات اوران کا حل کے موضوع پر منعقد ہوا۔جس کی صدارت جناب ڈاکٹر ظفر علی ہاشمی صاحب وائس چانسلر زرعی یونیورسٹی لائل پور نے فرمائی۔ دوسرے مذاکرہ کا موضوع ''جدید اردو شاعری کے رجحانات'' تھا۔اس میں صدارت کے فرائض سید وقار عظیم صاحب صدر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی نے ادا کئے کانفرنس کا ایک اجلاس محسنین اردو کے تذکرہ کے لئے وقف تھا اس میں حضرت مرزا سلطان احمد صاحب،حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب،علامہ نیاز فتح پوری اور مولانا صلاح الدین احمد کی خدمات اور کارناموں پر ٹھوس اور فکر انگیز مقالے پڑھے گئے۔ان اجلاسوں کے علاوہ ملک کے نامور شاعر جناب سید عابد علی عابد کی صدارت میں ایک محفل شعر وسخن کا انعقاد بھی عمل میں آیا۔جس میں مقامی شعراء کے علاوہ لاہور، لائل پور، ملتان، سرگودھا اور راولپنڈی کے نامور شعراء نے شرکت کرکے اپنا کلام پیش کیا۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اس کانفرنس کے لئے جناب جسٹس اے آر کارنیلئس چیف جسٹس پاکستان، جناب اختر حسین صدر انجمن ترقی اردو پاکستان، جناب ممتاز حسن صاحب سابق مینجنگ ڈائرکٹر نیشنل بنک آف پاکستان اور جناب پروفیسر حمید احمد خان وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے اپنے خصوصی پیغامات ارسال فرمائے جو معتمد مجلس استقبالیہ نے کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں پڑھ کر

سنائے۔

دارالضیافت صدر انجمن احمدیہ پاکستان کی طرف سے 14 اکتوبر کی شام کو کانفرنس کے مندوبین کے اعزاز میں ایک عشائیہ ترتیب دیا گیا جس میں سیدنا حضرت امام جماعت احمدیہ خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ نے بھی شرکت فرمائی۔ اور دیر تک بعض چیدہ مندوبین سے مصروف گفتگو رہے۔ 15 اکتوبر کی شام کو مشہور نقاد اور ادیب جناب ڈاکٹر وزیر آغا نے مندوبین کو اپنے گاؤں وزیر کوٹ میں مدعو کر کے وہاں ان کے اعزاز میں پُرتکلف عشائیہ کا اہتمام کیا۔

یہ کانفرنس جو 14 اکتوبر کی صبح کو شروع ہوئی تھی دو روز جاری رہنے کے بعد 15 اکتوبر کو 2 بجے بعد دوپہر نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

(الفضل 17 اکتوبر 1967ء)

احمدیہ کلچر

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی

احمدیہ کلچر

اور

دوسرے مضامین

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی

اورینٹل پبلشرز ٹورنٹو

انتساب

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے اساتذہ، طلبا، کارکنان اور درودیوار کے نام!

کہ

اس ادارہ سے وابستگی نہ ہوتی تو اتنی بھرپور زندگی کا ہے کو نصیب ہوتی۔

فہرست مضامین

	احمدیہ کلچر	
	میرامرشد	
	تازہ بستیاں آباد	
	خاموش علما	
	اپنے اساتذہ کے بارے میں	
	کچھ بےنفس لوگ	
	گودڑ میں کے لعل	
	رشتۂ مودت	
	خدا کے کچھ متوکل بندے	
	سرخ رومال والاصوفی	
	مددگارکارکن	
	اگرچہ سر بتراشد	
	خاموش کارکن	
	ہمارامکتب عشق	
	ہمارے دکاندار	

	جلسہ سالانہ اور آب خورے	
	ادب	
	مالک رام کی احمدیت	
	پاکستان میں اردو ادب اور جماعت احمدیہ	
	ربوہ کے احمدی شعراء	
	وفیات	
	جانے والے کا جانا	
	ایک عالی دماغ تھا نہ رہا	
	قدم قدم تیری یادیں	
	ایک ایک کرکے ہوئے کتنے ستارے رخصت	
	ہوا بھی تند و تیز لیکن۔۔۔	
	سفرنامچے	
	جادہ جادہ جادہ پیمائی	
	ذرا اوسلو تک	
	سربریدہ کی واپسی	

اظہارِ سپاس

اس کتاب کی تیاری کے مختلف مراحل میں عزیزی نسیم مہدی، مکرم ملک لال خان صاحب، استاذی المکرم مبارک احمد انصاری، کرنل راجہ محمد اسلم، جناب عبدالماجد صدیقی، عزیزی ہدایت اللہ ہادی، جناب نبیل رانا، عزیزی شفیق اللہ اور ڈاکٹر بشارت منیر نے میرا ہاتھ بٹایا۔ ربوہ سے کچھ مضامین کی نقول منگوانا مطلوب تھیں میں نے استاذی صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب مدظلہ کے ذریعہ عزیزی حبیب الرحمن زیروی سے درخواست کی انہوں نے الفضل والوں سے کہا ہوگا الفضل والوں کی طرف سے وہ مضامین ای میل کے ذریعہ موصول ہوئے۔ عزیزہ ساجدہ جوئیہ نے ان مضامین کی کمپیوٹر پر دوبارہ کتابت کر کے میری مشکل کو آسان کر دیا۔ میں ان سب کا از حد شکر گزار اور احسان مند ہوں۔

میرے اپنے کمپیوٹر نے قدم قدم پر میری لاعلمی کی وجہ سے مشکلات کھڑی کیں تو میرے دامادوں عزیزان عرفان احمد، خالد داؤد اور ثمر احمد چوہدری نے وقتاً فوقتاً آ کر اور اپنے اوقات صرف کر کے اس کو درست کیا۔ وجزاہم اللہ احسن الجزاء۔ میری بیوی اور میرے بچے تو ظاہر ہے اس کتاب کی تیاری کے دوران ہمیشہ کی طرح میری دیکھ ریکھ میں ہمہ تن مصروف رہے اللہ ان کو بھی جزا دے۔

قارئین کا بھی شکریہ کہ انہوں نے یہاں تک پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے تو امید ہے باقی کتاب بھی ان کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگی۔ اللہ ان کے ساتھ ہو۔

دیباچہ

احمدیہ کلچر کے موضوع پر شاید یہ پہلی کتاب ہو! اس کتاب میں آخر کے چند مضامین کے سوا جتنے مضامین بھی شامل ہیں ان کا کسی نہ کسی طریق سے احمدیہ کلچر سے تعلق ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لکھنے والا اللہ تعالیٰ کے فضل سے احمدی ہے اور یہی پہچان اس کو بس ہے!

میں قادیان میں پیدا ہوا، ربوہ میں پلا بڑھا اور پھر ربوہ میں ہی لمبے عرصہ تک خدمت کا موقع ملا۔ کلرک، سکول میں استاد، کالج میں لیکچرر رہا اور پھر کالج میں پروفیسر۔ اس دوران اپنے ماحول کو دیکھنے سمجھنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ قادیان کی باتیں اگرچہ پختہ طور پر یاد ہیں مگر عین ممکن ہے ان میں ایسی باتیں بھی شامل ہو گئی ہوں جو میں نے حدیث متواتر کے طور پر اپنے بزرگوں اور بزرگ دوستوں سے سنی ہوں۔ میں نے التزام کے ساتھ ایسی باتوں کی تصدیق بزرگوں سے کروائی ہے مثلاً لالہ ملاوامل صاحب کو میں نے قادیان میں دیکھا تھا۔ قبلہ وکعبہ مولانا محمد احمد جلیل مدظلہ سے میں نے تصدیق کروائی کہ یہ وہی ملاوامل صاحب تھے جو حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں زندہ تھے۔ اسی طرح بعض باتوں کی تصدیق قبلہ محترم سید محمود احمد صاحب نے بھی بلا واسطہ فرمائی آپ جرمنی کے جلسہ پر تشریف لائے ہوئے تھے میں حاضر نہ تھا میں نے فون کر کے انہیں اہلاً وسہلاً کہا۔ فرمانے لگے ”آپ جو باتیں سن کر کہہ رہے ہیں وہ باتیں ہم نے دیکھی ہوئی ہیں مگر آپ باتیں ٹھیک بیان کر رہے ہیں۔“ میں نے ان سے کہا تھا ”قبلہ آپ نے یہ قول تو سنا ہوگا کہ جب دیکھنے والے چپ سادھ لیں تو سننے والے بولنے لگتے ہیں“۔ میں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے صحت دی، وسائل مہیا کئے، لکھنے کی توفیق دی اور اب وہ چیزیں جو تقریباً تین سو مضامین کی صورت میں سلسلہ کے مختلف

رسالوں اخباروں میں بکھری پڑی تھیں کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہیں۔ **وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا**! اللہ تعالیٰ نے ادبی موضوعات پر جو مضامین اور کتابیں لکھنے کی توفیق دی وہ مستزاد ہے! الحمدللہ علیٰ ذالک۔

پاکستان سے میری دوسری ہجرت کا دور بڑی مشکل کا دور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سویڈن میں ٹھکانا مہیا کیا مگر تنہائی اور بیماری نے دھڑ توڑ دیا۔ اس کا علاج میرے نزدیک یہی تھا کہ قلم پکڑ لوں اور اس طرح اپنی تنہائیوں کا ازالہ کروں۔ الحمدللہ، الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے لکھنے کی توفیق دی اور پڑھنے والوں کے دلوں میں میرے لکھے کو پڑھنے کی تحریک بھی کی چنانچہ بہت سے بزرگوں دوستوں شاگردوں اور دوستوں کی جانب سے تحسین سخن شناس کا اظہار ہوتا رہا۔ سانگھڑ جیسے دور افتادہ شہر میں ایک اجنبی غیر احمدی دوست میرے کسی ایک مضمون کو پڑھ کر ایک احمدی دوست کے ہاں تشریف لائے اور اس جیسے دیگر مضامین کے مطالعہ کا شوق ظاہر کیا اور مہیا کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس میں میری کوئی خوبی نہیں جو کچھ ہے وہ سلسلہ عالیہ احمدیہ سے وابستہ رہنے کی برکت ہے۔

حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد کے انتقال پر میں نے ایک مضمون الفضل میں لکھا۔ وہ چھپا تو حضرت صاحبزادہ مرزا مسرور احمد صاحب (اب حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز) کا خط آیا جس میں آپ نے تحریر فرمایا کہ ”ابا کے بارے میں آپ کا خاص اسلوب میں لکھا ہوا مضمون پڑھا ہے۔ جزاکم اللہ“۔ اسی طرح ایک روز ایک صاحب بر سبیل اتفاق ملے۔ کہنے لگے اگر آپ کے مضامین پر آپ کا نام نہ بھی لکھا ہو تو میں پہچان لیتا ہوں کہ یہ آپ کا مضمون ہے۔ میں نے ان سے تو کچھ نہ کہا اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوا کہ انہیں بھی میرے اسلوب میں سیدی حضرت اقدس خلیفۃ المسیح الخامس کی طرح کوئی خاص بات نظر آئی۔ اگر میری تحریر میں کوئی خوبی ہے تو وہ میرے اساتذہ کی

جوتیوں کا صدقہ ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولیت عطا فرمائے آمین۔

ڈاکٹر پرویز پروازی

مسی ساگا کینیڈا

28 فروری 2005

احمدیہ کلچر

کسی قوم کے اجتماعی رہن سہن اور تمدن کے نتیجہ میں جو رسوم و عادات ان کے معاشرے میں راسخ ہو جاتی ہیں وہ اس قوم کا کلچر کہلاتی ہیں۔ہم لوگ غیر منقسم ہندوستان میں تھے تو ہمارے معاشرے میں ہند اسلامی کلچر کا دور دورہ تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لمبے راج کے بعد سارے ہندوستان میں ایک خاص قسم کا کلچر رواج پا رہا تھا جس میں اسلامی روایات کا پرتو بھی تھا اور مقامی ہند کلچر کی باتیں بھی ....کلچرل سمجھوتے کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کے دور تک السلام علیکم کہنے کے بجائے ’’آداب عرض‘‘ یا ’’تسلیمات‘‘ کہنے کا رواج تھا حتیٰ کہ صاحب امیر الروایات کے مطابق شاہ ولی اللہ کے خاندان میں بھی سلام کہنے کا رواج تک نہیں تھا۔ وہ بھی یہی کہتے تھے ’’عبد القادر تسلیمات عرض کرتا ہے‘‘ یا ’’رفیع الدین تسلیمات عرض کرتا ہے‘‘۔اسی قسم کے ثقافتی سمجھوتوں میں کنول کے پھول کی منبت کاری بھی تھی۔کنول کا پھول ہندوؤں کا مقدس پھول ہے مگر مسلمان اپنی مسجدوں یا امام بارگاہوں یا مقبروں میں اس پھول کی منبت کاری کرتے تھے۔ مصافحہ ترک کرنے اور جھک کر آداب بجالانے یا کورنش بجالانے کی رسوم بھی اسی ثقافتی سمجھوتے کے نتیجے میں مروج ہوئیں۔ اردو زبان بجائے خود ایک ثقافتی سمجھوتا ہے۔علیٰ ہذا القیاس بہت سی ایسی ثقافتی باتیں تھیں جو ہندو مسلم افہام و تفہیم کے سلسلے میں در آئیں اور ہمارے کلچر کا حصہ بنیں۔ جماعت احمدیہ کی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ لکھا ہے جس کی ثقافتی اہمیت سے نئی نسل شاید واقف نہ ہو۔ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الاول حضرت حکیم نور الدینؓ جب حصول تعلیم کے لئے لکھنؤ پہنچے تو سیدھے حکیم علی حسین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکیم صاحب اپنے دیوان خانے میں تشریف رکھتے تھے۔ سفید براق چاندنی بچھی تھی۔ حاضرین اپنی اپنی

نشست پر حسب مراتب گاؤ تکیوں سے لگے بیٹھے تھے۔نشست و برخاست پر لکھنوی تمدن کی چھاپ تھی۔ بات بات میں تکلف،حرکات وسکنات ایک کڑے ثقافتی بندھن میں جکڑی ہوئی۔ جھک جھک کر آداب وتسلیمات کہنے کا رواج۔ سیدنا نورالدینؓ مجلس میں داخل ہوئے تو پکار کر السلام علیکم کہنے کے بعد آگے بڑھے۔آپ اس تکلف اور تصنع سے بالکل ناآشنا تھے۔ پاؤں دھول میں اٹے ہوئے تھے سو سفید براق چاندنی پر جو نقش ونگار بنے وہ مستزاد سیدھے اپنے استاد کے سامنے پہنچ گئے۔اس محفل میں جہاں پکار کر سلام کہنا تو کجا اونچی آواز میں بات کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا اور بات چیت میں ایک تکلف روا رکھنا لابدی تھا حضرت حکیم صاحب کا سلام سن کر سب حاضرین سن سے رہ گئے۔ ایک جو زیادہ نک چڑھے اور متکلف تھے بول ہی اٹھے ''آپ کس مہذب ملک سے تشریف لائے ہیں اور سلام کہنے کا یہ انداز آپ نے کہاں سے سیکھا ہے؟''۔ حضرت حکیم صاحب نے جھٹ بلا تکلف کہا ''سلام کہنے کا یہ طریقہ اور بے تکلفی کا یہ انداز رسول عربی وامی کا سکھایا ہوا ہے''اس جواب سے معترض کے چہرے پر عرق انفعال کے قطرے نمودار ہو گئے۔حکیم علی حسین صاحب نے ان سے کہا ''آپ بڑے بڑے بادشاہوں کے درباروں میں بھی رہے ہیں کیا آپ نے ایسا مسکت جواب پہلے کبھی سنا ہے؟''۔ یہ بات ہمارے پڑھنے والوں کو عجیب لگی ہوگی کہ اس دربار میں اتنا رکھ رکھاؤ کیوں تھا۔اس لئے کہ یہی لکھنؤ کا تمدن تھا دہلی والے اگرچہ تکلف اور تصنع سے کہیں دور تھے پھر بھی ان کے ہاں بھی غالب نے گھر کو گھر نہیں 'محل سرا' ہی کہا ہے۔ بیٹھک کو دیوان خانہ کہا جاتا تھا۔ بات بات میں کورنش بجالانا اور مجرا کرنا ان کا طریق تھا۔اب یہ مجرا کرنا بھی ہمارے نئے قارئین کے لئے نئی بات ہوگی۔ جھک کر سلام کرنے کو مجرا کرنا کہتے تھے مجرے کے وہ معنی نہیں تھے جو ہمارے عام معاشرے میں مروج ہیں۔

ہم نے قادیان اور ربوہ میں اپنی ثقافت کے جو نمونے دیکھے اس مضمون میں انہیں بیان کرنا مقصود ہے دیکھنے اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہمارا کلچر عام کلچر سے کوئی مختلف چیز تھا اور ہے یا محض ہمارا گمان ہے؟ قادیان میں ہمارا ماحول ملا جلا ماحول تھا جس میں ہندو بھی تھے سکھ بھی تھے اور مسلمان بھی۔ حضرت مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کے زمانے تک رئیسانہ رہن سہن کا دور دورہ تھا اور وہی طریق مروج تھا جو عام رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر ہوتا تھا۔ عام طریق یہ تھا کہ رئیس خاندان کے علاوہ دوسرے تمام لوگ رعایا کہلاتے تھے اور رعایا کی تعریف میں وہ تمام لوگ بھی آجاتے تھے جو رئیس نہیں تھے۔ اس ماحول میں رہنے والے دوسرے چھوٹے زمیندار اور معززین بھی رعایا ہی شمار ہوتے تھے مگر ان پر رئیس کا تفوق حکم چلانے کا نہیں تھا۔ صرف نام کی رئیسی چلتی تھی جو نسلاً بعد نسل چلتی تھی۔ میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ جب اس خاندان کے تصرف میں نوّے گاؤں کی جاگیر ہوگی تو اس خاندان کی نشست و برخاست اور بود و باش کیا ہوگی۔ حضرت مرزا غلام احمد تک پہنچتے پہنچتے وہ رئیسی ختم ہو چکی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ دنیاوی رئیسی کے تمام آثار مٹا کر ایک نئی روحانی مملکت کی بنیاد رکھنے والا تھا۔ اس لئے اس کی مصلحتوں کو کون جان سکتا تھا۔ حضرت مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کی ساری زندگی اپنی دنیاوی شان و شوکت اور دنیاوی ریاست کی بازیافت کی کوشش میں بسر ہوئی مگر اس میں انہیں ان کی توقعات کے مطابق کامیابی نہ ہوئی اور حضرت مرزا غلام احمد صاحب کی زندگی ہی میں اس دنیاوی ریاست کے آثار مٹ گئے۔ ازبسکہ خاندانی امارت کے آثار نہ تھے مگر قادیان میں اس خاندان میں اس کے ظاہری آثار قائم رہے مدتوں تک حضرت صاحب کے مضامین کے ساتھ ''رئیس قادیان'' کے الفاظ چھپتے رہے۔

قادیان کا معاشرہ اوسط درجے کا اسلامی رنگ کا معاشرہ تھا۔ ہم نے وہ زمانہ نہیں دیکھا مگر اس

زمانے کے حالات کتابوں میں پڑھے ہیں۔ ہمیں اس معاشرے میں سب لوگ ہی مل جل کر رہتے نظر آتے ہیں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کا اٹھنا بیٹھنا، باہم مل جل کر ایک دوسرے کی مدد کرنا اس معاشرے میں جاری وساری نظر آتا ہے۔ خود حضرت صاحب کے دوستوں میں بہت سے ہندو شامل تھے اور کئی مقامات پر حضرت صاحب کے ہندو ساتھیوں نے ان کی پاکیزہ زندگی کی گواہی دی ہوئی ہے۔ بعض تو حضرت صاحب کی بعض پیشگوئیوں کے بھی گواہ ٹھہرے۔ ہم نے ملاوامل صاحب کو دیکھا ہوا ہے۔ اب معلوم نہیں وہی ملاوامل صاحب تھے یا ان کی اولاد میں سے کوئی تھے مگر قادیان میں ان کی بڑی عزت تھی۔ مضمون کا یہ حصہ قبلہ محترم مولانا محمد احمد جلیل مدظلہ کی نظر سے گذرا تو حضرت مولوی صاحب نے فرمایا کہ وہی ملاوامل صاحب تھے۔

ہم نے اس معاشرے کے بارے میں جو کچھ دیکھا اور پڑھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قادیان میں آداب عرض کہنے کا رواج نہیں تھا۔ ہندو مسلمان سکھ آپس میں ملتے تو صرف 'سلام' کہتے تھے پھر ہمارے سامنے جو معاشرہ تھا وہ حضرت خلیفہ ثانیؓ کے زمانے کا معاشرہ تھا اس میں بھی ہم نے ہندوؤں اور سکھوں کو صرف سلام کہتے ہی سنا۔ ابا جی کے سکھ دوستوں میں سے ہزارہ سنگھ ہمارے یہاں آتے تو ہم انہیں چاچا جی سلام کہتے اور وہ ہمیں دعا دیتے 'جیتے رہو بیٹا'۔ اسی طرح بازار سے گذرتے ہوئے کئی بار ہندو دکاندار ابا جی کو سلام کہتے 'مولوی جی سلام' اور ابا جی جواب میں یہی کہتے 'لالہ جی سلام' یا 'سردار جی سلام' مگر اس کلچر میں اور اس کلچر میں جسے ہم احمدیہ کلچر کہتے ہیں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ قادیان اور ربوہ میں نہ صرف السلام علیکم کہنے کا رواج تھا بلکہ تاکید کی جاتی تھی السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ کہا جائے۔ اس بات کی اتنی عادت پڑی ہوئی تھی کہ لاہور پڑھنے کے لئے گئے تو رستے میں جو بھی ملتا اسے السلام علیکم ضرور کہتے۔ سیر کے دوران ایک صاحب سے روزانہ ہی آمنا سامنا ہوتا تھا۔ ہم

انہیں السلام علیکم کہتے تھے وہ جواب تو دیتے مگر ایک روز انہوں نے ہمیں روک لیا کہ معاف کیجئے میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ ہم نے کہا ہماری شناسائی تو ہے ہی نہیں آپ پہچانتے کیسے؟ ہم تو محض مسلمان جان کر اپنی عادت کے بموجب السلام علیکم کہہ دیتے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ آپ جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس صاحب تھے جو ہائی کورٹ کے جج تھے۔ جج صاحب اللہ بخشے بہت ملنسار آدمی تھے مگر ان کے بعض عدالتی فیصلے کافی متنازعہ رہے۔ (ججی سے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے عدالت میں ایک درخواست دی تھی کہ 1973 کا آئین کفریات کا پلندہ ہے اس لئے اسے منسوخ کیا جائے)۔ برادرم عزیزم خلیفہ صباح الدین احمد نے بھی کسی دوست کا حال لکھا ہے کہ اسلام آباد میں آپ ہر روز ان سے السلام علیکم کہتے تو ایک روز انہوں نے روک ہی لیا کہ آپ بہت السلام علیکم کہہ چکے اب مطلب کی بات بھی کہہ دیجئے۔ جب خلیفہ صاحب نے سلام برائے ثواب کا فلسفہ چھانٹا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ السلام علیکم کہنا ہمارے معاشرے کے پلے ہوئے بچوں کی عادت ثانیہ بن جاتا ہے گویا احمدیہ کلچر کا پہلا جزو السلام علیکم کہنا ہے مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ اب اگر کوئی احمدی کسی کو السلام علیکم کہہ دے تو وہ قانون کی گرفت میں آجاتا ہے جیسا کہ اس ایف آئی آر میں درج ہے جو سارے ربوہ شہر کے خلاف درج کی گئی تھی کہ احمدی لوگ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے لئے جان بوجھ کر السلام علیکم کہہ دیتے ہیں حالانکہ وہ صرف اپنے کلچر کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ احمدیہ کلچر کی یہی چیز سب سے پہلے ربوہ یا قادیان میں نوواردوں کو حیرت میں ڈالتی تھی۔ دوسرے معاشروں میں اکثریت نام کے مسلمانوں کی بستی ہے مگر یوں سرعام اور علی الاعلان بلاتخصیص ہر سامنے آنے والے کو سلام کہنے کا رواج ان میں تھا، نہ ہے۔ اسی طرح پرسش احوال کے جواب میں الحمد للہ کہنے کا رواج بھی احمدیہ معاشرہ سے مخصوص یا چند ایسے لوگوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے جو اسلامی اقدار سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ ہم اوساکا یونیورسٹی

آف فارن سٹڈیز اوسا کا جاپان میں اردو کے استاد تھے۔ ہمارے فرائض میں یہ بات بھی شامل تھی کہ طلباء کو پاکستانی معاشرے کے آداب بھی سکھائیں۔ ہم نے اس سلسلے میں جو آڈیو کیسٹ تیار کیا اور بچوں کو سکھایا وہ یہ تھا سوال: ''آپ کا کیا حال ہے؟'' جواب: ''الحمد للہ میں اچھا ہوں۔'' ہمارے شاگرد اسی کے مطابق جواب دیتے تھے۔ ان میں سے کئی ایک پاکستان گئے۔ واپس آ کر ان میں سے ایک بچہ کہنے لگا سر آپ نے جو کچھ پڑھایا ہے وہ ٹھیک ہی ہوگا مگر ہم نے عام پاکستانیوں کو الحمد للہ کہتے نہیں پایا وہ صرف یہ کہتے ہیں ''ٹھیک ہوں''۔ ہم نے اس بچے کو یہی جواب دیا کہ ''بیٹا ہم نے شرفاء کی زبان سکھائی ہے اور شرفاء یہی زبان بولتے ہیں''۔ اب ہماری جگہ ہمارے ہی ایک پاکستانی دوست ہیں وہ ہماری ہی تیار کی ہوئی آڈیو کیسٹ سے کام چلا رہے ہیں۔ ان سے ایک بار اتفاق سے پاکستان میں ملاقات ہوگئی۔ کہنے لگے ''یار یہ تم جاپانیوں کو کس الحمد للہ پر لگا آئے ہو؟''۔ ہم نے کہا ''کیوں کوئی غلط بات کی؟''۔ فرمانے لگے ''نہیں غلط تو نہیں مگر میں خود الحمد للہ کہنے کا عادی نہیں تھا اس لئے اول اول بہت دقت ہوئی''۔ با ایں ہمہ احمد یہ کلچر میں الحمد للہ کہنا اجنبی لگتا ہے نہ ایسا کہنے کے لئے مشق کرنا پڑتی ہے۔ اسی طرح 'انشاء اللہ' ماشاء اللہ کے الفاظ ہمارے ہاں بغیر کسی تکلف کے استعمال ہوتے ہیں۔ دوسرے پاکستانی معاشرے میں ایسا نہیں ہے۔ ہاں جہاں کہیں کوئی شخص 'انشاء اللہ' کہتا ہے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا ارادہ وہ کام کرنے کا نہیں۔ ہماری ایک شاگرد باجی ساں جو آج کل جاپان کی پولیس سروس میں اونچے عہدے پر ہیں پاکستان سے واپس گئیں تو ہمیں کہنے لگیں ''میں انشاء اللہ نو بجے یونیورسٹی نہیں آ سکوں گی گیارہ بجے آؤں گی''۔ ہم چونکے اور اس سے پوچھا ''بیٹی یہ تم انشاء اللہ کا نیا استعمال کہاں سے سیکھ آئی ہو؟''۔ کہنے لگی ''پاکستان سے۔ وہاں تو جو کام نہ کرنا ہو اس کے ساتھ انشاء اللہ بولتے ہیں''۔

بات احمدیہ کلچر کی تھی۔ قادیان میں ہم نے ہر کہہ و مہہ کو سر ڈھانپے دیکھا۔ ربوہ میں کچے کوارٹروں میں جو دو چار حکمت کی باتیں دیواروں پر لکھی ہوتی تھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ’’ ننگے سر پھرنا آوارگی کی علامت ہے‘‘۔ ہمارے احمدیہ کلچر میں ننگے سر پھرنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور ہے۔ بڑوں کے سامنے تو ننگے سر آنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہمارے ہند اسلامی معاشرے میں ایک روایت سر ڈھانپنے کی بھی تھی حتیٰ کہ ہندو عورتیں بھی اپنے سے بڑوں کے سامنے جاتے ہوئے سر ڈھانپ لیتی تھیں اور مسلمان عورتیں تو ہر نامحرم سے پردہ کرتی تھیں۔ زیادہ آزاد خیال لوگ بھی ’ کا نا پردہ‘ ضرور رکھتے تھے۔ قادیان میں ہم نے یہی دیکھا کہ سب لوگ سر پر پگڑی یا ٹوپی رکھتے ہیں۔ یہ جو عام مسجدوں میں تنکے کی بنی ہوئی یا کپڑے کی بنی ہوئی ٹوپیاں پڑی ہوتی ہیں کہ نمازی نماز کے وقت سر پر اوڑھ لیں نہیں ہوتی تھیں۔ جسے سر ڈھانپنا ہوتا تھا وہ نماز کی نیت سے گھر سے چلتا تو سر ڈھانپ کے چلتا تھا۔ نماز میں سر ڈھانپنا تہذیبی مسئلہ ہے۔ شرق اوسط میں یا ایران عراق شام مصر مراکش وغیرہ میں لوگ ننگے سر نماز پڑھتے ہیں مگر احمدیہ معاشرہ میں سر ڈھانپنے کی روایت رہی ہے اور یہی روایت جاری و ساری ہے کیونکہ خلفاء کا اسوہ بھی یہی ہے۔ ہمارے علما اب بھی کلاہ پر پگڑی باندھتے ہیں اگرچہ عام معاشرے سے یہ رواج رفتہ رفتہ مٹتا چلا جا رہا ہے۔ قادیان میں اکثر بزرگوں کو ہم نے پگڑی باندھے ہوئے دیکھا خود ہمارے ابا کسی زمانے میں پگڑی باندھتے تھے ٹوپی تو آپ نے بہت بعد میں شروع کی۔ ہمیں یاد ہے جو مبلغ باہر کے ممالک میں تبلیغ کے لئے جاتے یا واپس آتے ان کے استقبال و الوداع کے لئے سارا شہر اسٹیشن پر امڈ پڑتا تھا۔ مبلغ سر پر سبز عمامہ باندھتے جس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ تبلیغ کے لئے باہر جا رہے ہیں یا تبلیغ کا فرض ادا کر کے واپس آئے ہیں۔ مبلغین کا آنا جانا، جانا زیادہ، آنا کم کیونکہ جماعت کا جو مبلغ ایک بار باہر چلا جاتا تھا اس کے واپس آنے میں مدتیں گزر جاتی تھی کیونکہ جماعت کے پاس

وسائل نہیں تھے ابتدا میں جماعت کے جو مبلغین باہر گئے ان میں سے حضرت حکیم فضل الرحمن صاحب، مولانا جلال الدین شمس صاحب، مولانا عبدالرحیم نیر صاحب، مولانا نذیر احمد علی صاحب بہت لمبا لمبا عرصہ باہر رہے۔ ابھی حال ہی میں مولانا نذیر احمد مبشر صاحب کا انتقال ہوا ہے آپ نکاح کے بعد تبلیغ کے لئے چلے گئے اور دس برس کے بعد واپس آ کر رخصتی لی۔ یہ تو جملہ معترضہ درمیان میں آ گیا ورنہ ذکر سر ڈھانپنے کا تھا۔

قادیان اور ربوہ میں کسی مبلغ کا آنا جانا باقاعدہ ایک جشن کا حکم رکھتا تھا۔ حضرت صاحب خود بھی اسٹیشن پر تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک استقبال کے موقعہ پر ہم نے اسٹیشن پر جھنڈیاں لگی ہوئی بھی دیکھیں مگر یہ یاد نہیں کس کا استقبال تھا۔ بہرحال استقبال اور مشایعت ہمارے کلچر کا حصہ تھا اور اب بھی ہے اگرچہ آجکل یہ فرض دفاتر کے احاطہ میں ادا ہوتا ہے۔ اسی الوداع یا استقبال کا ایک حصہ دعا تھی۔ سفر شروع کرنے سے پہلے دعا کرنے کا عام رواج تھا۔ قادیان کے زمانے سے ہی ہمیں یاد ہے کہ گھر کا کوئی فرد سفر پر روانہ ہونے لگتا تو پھوپھا جی حضرت مولوی غلام نبی صاحب مصری سے درخواست کی جاتی کہ وہ دعا کروا دیں اور دعا کے بعد مسافر سفر پر روانہ ہوتا۔ دیگر لوگوں میں ایسا رواج نہیں تھا۔ وہ لوگ بازو پر امام ضامن باندھ کر نکلتے تھے۔ امام ضامن کا مطلب یہ تھا کہ سفر پر روانہ ہونے سے قبل مسافر کے بازو پر سونے یا چاندی کا کوئی سکہ باندھ دیا جاتا تھا کہ سفر بخیر تمام ہونے پر وہ صدقے میں دے دیا جائے۔ بعض لوگوں کے ہاں باقاعدہ تعویذوں کا رواج بھی تھا اور ہے مگر ہمارے ہاں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ نہ ہوتا ہے۔ دعا ہی سب کچھ سمجھی جاتی ہے۔ مسافر سفر پر روانہ ہوتا ہے تو دعا کر کے چلتا ہے سارے رستے میں دعائیں کرتا ہے کہ مسافر کی دعائیں زیادہ قبول ہوتی ہیں بلکہ دوسرے لوگ بھی مسافر کو سفر میں دعائیں کرنے کی باقاعدہ درخواست کرتے ہیں۔ ہم نے کئی جگہ پڑھا ہے کہ حضرت

صاحب نے مسافر کو سفر پر روانہ ہوتے وقت دعا کرنے کی نصیحت فرمائی اور رستے میں کثرت سے استغفار کرنے کی تلقین بھی فرمائی۔ حضرت مولانا راجیکی صاحب نے سفر میں استغفار پڑھنے کی بہت فضیلت بیان فرمائی ہے۔ ہمارے معاشرے میں استغفار ہی امام ضامن کا نعم البدل تھا اور ہے۔ ہمارے ہاں تعویذ گنڈے کا رواج نہیں نہ ہمارے ہاں اس کو کوئی اہمیت دی جاتی ہے۔

استقبال و مشایعت کے علاوہ عیادت بھی احمدیہ کلچر کا حصہ ہے۔ بیمار کی عیادت کرنا ثواب سمجھا جاتا ہے دوسرے لوگ بھی عیادت کے لئے جاتے ہیں مگر شاید ان کی نیت عیادت سے ثواب کی نہیں ہوتی یا شاید ہوتی ہو مگر بظاہر دکھاوا زیادہ در آیا ہے۔ احمدیہ کلچر میں عیادت دیگر فرائض کی طرح ایک فرض کے طور پر ہے۔ ہم نے حضرت صاحب کو کئی بار مریضوں کی عیادت کے لئے لوگوں کے گھروں میں جاتے ہوئے دیکھا۔ قادیان میں حضرت صاحب ایک بار ہمارے محلے میں کسی کے گھر عیادت کے لئے آئے ہوئے دیکھے تو ان کی علالت پر بہت رشک آیا اسی طرح حضرت اماں جانؓ تو ہر بیمار کی عیادت کے لئے دور دراز کے محلوں میں بھی تشریف لے آتی تھیں اور جب تک عمر اور قویٰ نے ساتھ دیا اس پر پابندی سے عمل پیرا رہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ ہمارے دوست عبدالسلام اختر کی عیادت کے لئے ہسپتال تشریف لائے تو ہم بھی اس وقت حاضر تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ تو اکثر مریضوں کی عیادت کے لئے آتے جاتے تھے۔ بلکہ یہاں تک التزام تھا کہ ہم ہسپتال میں تھے تو لندن سے امیر صاحب سویڈن کو ہدایت فرمائی کہ وہ گوٹن برگ سے آ کر حضرت صاحب کی طرف سے ہماری عیادت کریں۔ عیادت بھی اسلامی معاشرت کا لازمی حصہ تھی مگر اس میں بھی دکھاوا در آیا اور بہانہ بن گیا کہ خالی ہاتھ عیادت بھی کوئی عیادت ہے؟

یہ تو خیر ہمارا کلچر کیا ساری دنیا کا کلچر ہے کہ کسی سے ملنے جاؤ تو کوئی چھوٹا موٹا تحفہ لے کر جاؤ مگر اس

تحفے کو لازم کر لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیادت بھی بوجھ بننے لگی اور رفتہ رفتہ اس کا رواج ہی کم ہو گیا۔ ہمارے دوست پروفیسر نصیر احمد خاں پر پہلی بار دل کا حملہ ہوا تو ہسپتال میں ڈاکٹروں نے سختی سے منع کر دیا کہ کوئی ملاقاتی نہ آئے۔ چنانچہ ان کے کمرے کے باہر ایک کاپی رکھ دی گئی کہ عیادت کے لئے آنے والے دوست اس میں اپنا نام لکھ دیں جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ نصیر صاحب ہسپتال سے گھر واپس آئے تو اس کاپی کو دیکھ کر بہت مایوس ہوئے کیونکہ اس پر کسی ایک نام کا اندراج بھی نہیں تھا کیونکہ کوئی شخص محض کاپی پر اپنا نام لکھ کر اپنی محبت کی تخفیف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ سادہ سی بات تھی کہ مریض کا مفاد متقاضی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ آرام کرنے دیا جائے مگر ہوتا یہ تھا کہ جو 'چوہدری' تھے وہ مریض سے ملے بغیر ٹلتے نہیں تھے اور انہیں واپس بھیج دیا جاتا تھا وہ لواحقین کو کوستے ہوئے لوٹتے تھے کہ انہیں مریض کی عیادت کا موقع کیوں نہیں دیا۔ یہاں ہسپتال میں عیادت کرنے کے لئے آنے والوں پر کوئی پابندی نہیں مگر کوئی عیادت کرنے والا خود آنے کی زحمت نہیں کرتا۔ عیادت کی انتہا یہ سمجھی جاتی ہے کہ اپنے گھر سے پھول والوں کو ٹیلیفون کر دیا کہ فلاں ہسپتال میں فلاں نام کے مریض کو فلاں وارڈ میں فلاں بستر پر یہ پھولوں کا تحفہ ان کی طرف سے پہنچا دیا جائے اور جسے پھولوں کا تحفہ مل جائے وہ پھولے نہیں سماتا۔

اور تو اور لوگ مرنے والوں کی تعزیت کے لئے آنے کی تکلیف بھی نہیں کرتے۔ ہم ہسپتال میں تھے کہ ہمارے ساتھ کے ایک مریض کا انتقال ہو گیا۔ بیچارا کئی دن سے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا نرس آئی تو ہم نے بہت افسوس کا اظہار کیا۔ کہنے لگی بڑا خوش قسمت مریض تھا اس کے بیٹے نے ایک ہزار میل دور سے اس کے لئے پھولوں کا تحفہ بھیجا ہے۔ اب بھی اس کی میت پر دھرا ہے سرد خانے میں۔

عیادت کے ساتھ ہی یہ امر بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ دعا بھی احمدیہ کلچر کا ضروری حصہ ہے۔ یوں

تو ہمارے سارے معاشرے میں دعا کا لفظ رچا بسا نظر آتا ہے مگر یہ ’’آپ کی دعا ہے‘‘ یا ’’آپ کی دعا سے‘‘ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ کہنے والا دعا کا طلبگار ہوتا ہے نہ سننے والے کو دعا سے کوئی سروکار ہوتا ہے۔ بس روزمرہ کا ایک فقرہ ہے جو یونہی بول دیا جاتا ہے۔ مگر احمدیہ کلچر میں دعا محض ایک لفظ نہیں ایک پورا تہذیبی رویہ ہے پرانی تاریخوں میں پڑھا ہے کہ دکن کے فرمانروا دعاؤں کو باقاعدہ ملازم رکھتے تھے اور ان کا کام ہی یہ تھا کہ وہ مختلف عرسوں اور بارگاہوں پر باقاعدگی سے حاضر ہو کر دعائیں کرتے رہیں۔ ان پیشہ ور دعا گوؤں میں یہ خدمت وراثتاً چلتی تھی۔ شاہان مغلیہ میں یہ دعا گوئی اس حد تک تھی کہ دعا گو حضرات کو باقاعدہ وظائف دئے جاتے تھے مگر اس کے صلے میں ان سے یہ توقع بھی رکھی جاتی تھی کہ وہ حکومت وقت کے فرمانبردار رہیں۔ بعض بادشاہوں کے بارے میں درگاہوں پر جانے کے واقعات بھی درج ہیں مگر جماعت احمدیہ درگاہوں یا مزاروں پر منت مانگنے کے لئے نہیں جاتی۔ جماعت احمدیہ کے ہاں خدا کا تصور زندہ خدا کا تصور ہے۔ احمدیہ کلچر میں خدا سے تعلق کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہر احمدی خدا سے براہ راست تعلق پیدا کرتا اور اسی سے مانگتا ہے۔ زندہ خدا کا زندہ تصور جماعت احمدیہ کے کلچر کا بنیادی حصہ ہے۔

دراصل عام مسلمان اللہ تعالیٰ کا محدود تصور رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک خدا بولتا تھا۔ سنتا تھا۔ کلام کرتا تھا اب نہیں کرتا۔ جماعت احمدیہ سمجھتی ہے خدا بولتا بھی ہے سنتا بھی ہے جواب بھی دیتا ہے۔ دعاؤں کی اجابت کا یہی یقین دعا کی افادیت کا ضامن ہے۔ یہ ٹھیک ہے جماعت کے افراد جماعت کے بزرگوں یا خلفاء سے دعا کی درخواست کرتے رہتے ہیں مگر ایسا کرنا اپنی دعاؤں کو تقویت دینے کے لئے ہوتا ہے۔ احمدیہ کلچر میں پلے ہوئے لوگ جب دعا کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو محض اوپر سے طور پر ایسا نہیں کرتے ان میں سے ہزاروں لوگوں نے خدا کی قدرتوں کا خود تجربہ کیا ہوتا ہے۔ ہم نے

اپنی ہوش میں ہزار ہا ایسے لوگ دیکھے جو مکالمہ ومخاطبہ الہیہ سے مشرف تھے۔ہم نے دعاؤں کے ذریعہ معجزے رونما ہوتے دیکھے اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ معجزے اب بھی ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ایک بار پاکستان کے آمر مطلق نے یہ بیان داغ دیا کہ ''اب معجزے رونما نہیں ہو سکتے۔ وہ وقت گذر گیا''۔تب خدا نے اسی شخص کو اپنے ایک انذاری معجزہ کا نشانہ بنایا۔احمدیہ کلچر میں دعا اور خدا کے ساتھ زندہ تعلق اور خدا کی طرف سے دعاؤں کی اجابت کا یقین شامل ہے۔دوسروں کو ایسا ایقان میسر نہیں اسی لئے وہ دعا کو محض ایک ''بے جان لفظ'' جانتے ہیں احمدی اسے لفظ نہیں جانتے ایک پورا رویہ سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ان سے سلوک بھی اسی کے مطابق ہے۔

احمدیہ کلچر میں دعا کرنا دوسروں کو دعا کے لئے کہنا دعاؤں کی انفرادی اور اجتماعی تحریک کرنا بہت اہم امور ہیں۔ہمیں یاد ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی بیماریوں کے دوران ساری جماعت درد والحاح اور زاری سے دعائیں کیا کرتی تھی اور یہ دعائیں انفرادی طور پر بھی ہوتی تھیں اجتماعی طور پر بھی۔نماز میں بھی نماز کے بعد بھی مگر جماعت احمدیہ کے کلچر میں نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا شامل نہیں۔ جماعت کا خیال یہ ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا لینا ایسے ہی ہے جیسے آدمی اللہ تعالیٰ کے دربار سے باہر آ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا لے نماز بجائے خود ایک دعا ہے اس لئے جماعت احمدیہ کے افراد نماز کے اندر ہی دعا کو روا جانتے ہیں۔ جماعت احمدیہ کے کلچر میں یہ بات بھی انوکھی ہے کہ جماعت کے اخباروں میں دعا کی تحریک کے لئے باقاعدہ اعلان چھپتے ہیں لوگ اپنے تکلیف میں مبتلا یا بیمار بھائیوں کے لئے دعائیں کرتے اور ان کی بھلائی چاہتے ہیں۔دوسرے اخبارات آپ کے سامنے ہیں آپ کو کوئی ایسا اعلان کسی اور اخبار میں نظر نہیں آئے گا۔کہیں کہیں اخباروں میں تعزیتی شذرے نظر آ جائیں گے مگر ان کی حیثیت محض تعزیتی

ہو گی کسی کے ارتحال پر پسماندگان کی طرف سے دعائیں کرنے کی درخواست نظر نہیں آئے گی۔ احمدیہ کلچر کی یہ بات دوسروں سے منفرد ہے۔ یہ کلچر زندگی اور موت دونوں کیفیتوں میں دوسروں سے جداگانہ ہے۔ اس لئے جب ملا یہ کہتے ہیں کہ احمدیوں کا کلچر دوسروں سے جدا ہے تو کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں کہتے۔ احمدیوں کا کلچر اسلام کے ابتدائی دور کا کلچر ہے دیگر مسلمان اپنے کلچر سے چودہ سو سال آگے نکل گئے ہیں اس تیز بھاگنے والے کی طرح جو اپنی منزل مقصود کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہو اور بگٹٹ بھاگے چلا جا رہا ہو اور نہ جانتا ہو کہ وہ سعیٔ رائگاں میں مبتلا ہے۔ احمدیہ کلچر میں ہر وقت دعا کی گنجائش اور موقع موجود ہے جلسہ سے پہلے۔ جلسہ کے بعد۔ دعوت سے پہلے۔ دعوت کے بعد۔ غرض ہر موقع پر۔ جلسہ سالانہ جب ختم ہوتا تھا تو لاکھوں کا مجمع نہایت تضرع سے دعائیں کرتا تھا اور رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیتا تھا ہمارے کئی غیر از جماعت دوست جلسہ میں آتے تھے اور اس نظارہ کو دیکھ کر پریشان ہو جایا کرتے تھے کہ لاکھوں لوگ کیوں رو رہے ہیں؟ کیا انہیں واقعی اس بات کا یقین ہے کہ ان کی دعائیں قبول ہو جائیں گی؟ 1974ء کے جلسہ پر میرے ایک نہایت سینئر سی ایس پی دوست جو اس وقت ایک ڈویژن کے کمشنر تھے میرے ذاتی مہمان کے طور پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ جلسہ کا افتتاح ہوا۔ جماعت نے پہلی بار جلسہ گاہ میں ایف ایس ایف کے سپاہیوں کو مورچہ بند دیکھا۔ جلسہ گاہ کے لئے جو سٹیڈیم تیار کیا گیا تھا اس کے ہر ستون پر ایک ایک مسلح سپاہی ایستادہ تھا۔ بہ ظاہر بھٹو صاحب یہ دکھانا چاہتے تھے کہ ان کے پاس کتنی مسلح طاقت ہے۔ حضرت صاحب کی افتتاحی تقریر شروع ہوئی۔ ساری کی ساری تقریر قرآنی دعاؤں پر مشتمل تھی۔ ایک دعا بار بار دہرائی گئی کہ ’’اے خدا ہمارے دشمنوں پر گرفت فرما اور ہماری زندگیوں میں ہمیں ان کا انجام دکھا‘‘۔ کمشنر صاحب عربی نہیں جانتے تھے مگر دعائیں تو قرآن کی تھیں اور اردو میں دہرائی جا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کمشنر صاحب کانپنے لگے

میں ان کے ساتھ کی کرسی پر بیٹھا تھا انہیں باہر لے آیا۔ میں نے کہا کیا ہوا؟ کہنے لگے جلدی یہاں سے چلو یہ شخص تو دعاؤں سے آسمان کو ہلا دے رہا ہے ایسا نہ ہو آسمان ٹوٹ پڑے۔ بھٹو صاحب کا زوال ہوا تو انہی کمشنر صاحب نے مجھے جاپان میں خط لکھا کہ تمہارے خلیفہ کی دعائیں قبول ہوگئیں۔ میں نے انہیں لکھا کہ آپ نے ایک کمزور جماعت کی طاقت دیکھی؟

دعاؤں کی قبولیت کا یقین جماعت کے کلچر کا حصہ ہے۔ لاکھوں واقعات ہیں جن میں بیماروں کو شفا ملی انہونی ہونی ہوگئی۔ ناممکن ممکن میں بدل گئے اور یہ سب کچھ احمدیوں کے دیکھتے دیکھتے ہوا۔ دو چار برس پہلے سٹاک ہالم کے ایک فورم نے مجھے جماعت احمدیہ کے عقائد کے بارے میں اظہار خیال کی دعوت دی بعد میں ایک صاحب نے سوال کیا ''کیا آپ ایک دو لفظوں میں جماعت احمدیہ اور دیگر مسلمانوں کا فرق بتا سکتے ہیں؟''۔ میں نے کہا ''جی ہاں''۔ جماعت احمدیہ خدا کو زندہ مانتی ہے دوسرے نہیں مانتے۔ کہنے لگے یہ کیا جواب ہوا؟ میں نے کہا یہی جواب ہے۔ دوسروں کو خدا کے زندہ ہونے کا یقین ہو تو وہ اس کے الہاموں سے انکار کیوں کریں؟

احمدیہ کلچر خدا کے زندہ ہونے کا تصور پیش کرتا ہے اسی لئے دعاؤں کی قبولیت پر بھی یقین رکھتا ہے۔ دعا کا ایک مکمل تشخص احمدیہ کلچر میں موجود ہے۔ دعا کے ساتھ ہی نماز کا ذکر آتا ہے۔ نماز ہر مسلمان پڑھتا ہے احمدی بھی پڑھتے ہیں۔ نماز بھی وہی۔ سجود و قیام بھی وہی۔ مگر ایک فرق اور ہے وہ یہ ہے کہ احمدیہ کلچر میں نماز فرض جان کر ادا کی جاتی ہے محض رسم کے طور پر ادا نہیں کی جاتی۔ قادیان اور ربوہ میں نماز کے اوقات میں تمام دکانیں بند ہو جاتی تھیں۔ کاروبار معطل ہو جاتے تھے کیا برصغیر کے کسی اور مسلمانوں سے بھرے شہر میں بھی ایسا ہوتا ہے؟ یہ سب کچھ خود نمازیوں کی مرضی سے ہوتا تھا۔ ہمارے کالج میں غیر از جماعت طلباء کی تعداد بہت تھی انہیں ہمیشہ ہی دکانداروں سے یہی شکایت رہتی تھی کہ

نماز کے وقت نماز کے لئے دکانیں بند کر دیتے ہیں اگر اس وقت کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ نہیں دیتے بلکہ نماز ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ قادیان میں بھی یہی طریقہ ہم نے دیکھا تھا بازار میں ہندو دکاندار بھی تھے وہ نماز کے اوقات میں پردہ گرا دیتے تھے۔ ربوہ میں تو ایسا عام ہوا کہ دکانداروں نے نماز کے اوقات میں چائے تک دینے سے انکار کر دیا اگر کسی نے کہا بھی کہ یہ مہمان ہیں انہیں جلدی جانا ہے تو ٹکا سا جواب ملا تو پھر کیا؟ کیا میں ایک پیالی چائے کے لئے اپنی عاقبت خراب کر لوں؟ نماز کے ساتھ یہ تصور کہ نماز کے وقت دکان بند کر دینا کسی پر احسان نہیں اپنی ہی عاقبت سنوارنے کا سامان ہے۔ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ یہاں ایک بات یاد آئی ایک بار لاہور کے ایک ڈپٹی کمشنر صاحب نے اعلان کیا کہ ''آئندہ سرکاری اہلکار اس بات کا خیال رکھا کریں گے کہ لوگ نماز کے وقت نماز پڑھا کریں اور یوں ہی وقت ضائع نہ کریں''۔ خدا معلوم ڈی سی صاحب کو یہ خیال کیوں اور کیسے آ گیا تھا سارے ملک میں ہاہا کار مچ گئی کہ حکومت کو لوگوں کی نمازوں سے کیا غرض ہے؟ نماز ہر انسان کا اپنا ذاتی فعل اور معاملہ ہے حکومت کو اس سے کیا سروکار ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان دنوں پاکستان ٹائمز لاہور میں انور نامی ایک کارٹونسٹ ہوا کرتے تھے ان کا کارٹونی کردار ننھا تھا۔ پہلے صفحے پر ننھے کا کارٹون ہوتا تھا۔ اس خبر کے چھپنے کے اگلے روز ننھے کا کارٹون چھپا۔ ننھے میاں سجدہ میں پڑے ہیں اور کن اکھیوں سے آتی ہوئی کار کو دیکھ رہے ہیں اور ساتھی سے پوچھ رہے ہیں ''غور سے دیکھ لو ڈی سی صاحب کی کار ہی ہے نا کوئی اور تو نہیں؟''

دراصل یہ سب کچھ گھروں کے اندر سے شروع ہوتا تھا احمدیہ کلچر کا اہم حصہ اولاد کی تربیت ہے۔ ماں باپ اپنی اولاد کی تربیت ایسے رنگ میں کرتے تھے کہ بچے ایک خاص رنگ میں رنگے جاتے تھے ہر احمدی گھرانے میں گھر کے بڑے نماز کے لئے خاص اہتمام کرتے تھے اور بچوں کو بچپن ہی سے نماز

کی عادت ڈالتے تھے۔ پھر اکثر افراد تہجد کے عادی تھے۔ تہجد کی نماز پڑھتے۔ پھر بچوں کو فجر کی نماز کے لئے جگاتے ، خود نماز کے بعد بچوں کو درس دینے کے لئے بیٹھ جاتے اور یہ درس قرآن حدیث یا بانیِ سلسلہ احمدیہ یا ان کے خلفاء کی کتابوں یا ارشادات پر مشتمل ہوتا اس طرح بچے ابتدا ہی سے اس رنگ میں رنگین ہو جاتے جسے احمدیہ کلچر کا رنگ کہا جا سکتا ہے یہ رنگ چڑھانا بہت مشکل کام تھا اور ہے کیونکہ جب تک ماں باپ خود اس رنگ میں رنگین نہ ہوں بچوں پر یہ رنگ نہیں چڑھتا اور چڑھ جائے تو چھٹائے نہیں چھٹتا ہم لوگوں نے اپنے گھروں میں یہی ماحول دیکھا اور یہ ماحول صرف قادیان یا ربوہ تک محدود نہیں تھا جہاں جہاں احمدی گھرانے تھے ان کا یہی رنگ تھا اور اس میں شہر یا گاؤں کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔

ہمارے ہاں بیسویں صدی کے تیسرے چوتھے عشرے تک یہ رواج تھا کہ لوگ سفر پر جاتے تو ہوٹلوں میں ٹھہرنے کی بجائے اپنی جان پہچان کے لوگوں کے ہاں ٹھہرتے تھے گاؤں میں چونکہ ہوٹلوں کا رواج نہیں تھا اس لئے مسافر گاؤں کی مسجد میں ٹھہرتے تھے اور نمازی دیکھتے کہ مسجد میں کوئی مسافر موجود ہے تو اس کے لئے کھانے اور سونے کا بندوبست کر دیتے۔ یہ ہندوستان کا عام کلچر تھا۔ احمدیوں میں یہ ہوا کہ اگر کوئی مسافر سفر پر روانہ ہوتا تو کسی احمدی دوست کا پتہ حاصل کر لیتا اور بغیر کسی جان پہچان کے صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہوتا کہ وہ احمدی ہے اور لو گھر کا سا ماحول پیدا ہو جاتا یہ اخوت احمدیت کی پیدا کی ہوئی تھی۔ قادیان یا ربوہ میں مہمان خانہ موجود تھا دوسرے شہروں میں بھی مہمان خانے یا لنگر موجود ہوں گے مگر ہمارے ہاں کی روایت وہ ہے جسے شرفاء کی روایت کہیئے۔ اب بڑے زمینداروں کے ہاں بھی مہمان خانوں کا وجود موجود ہے مگر وہاں ایک دو وقت کا کھانا دے دیا جاتا ہے اور بس مہمان کو مہمان نہیں بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ احمدیہ کلچر میں مہمان کو خاص طور سے احمدی مہمان کو بڑا

اہم فرد سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ربوہ میں ہمارے غیر احمدی دوستوں کا کثرت سے آنا جانا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کشائش بھی دے رکھی تھی اس لئے بہت مہمان آتے تھے اور اکثر ایسے مہمان تشریف لاتے تھے جن کا جماعت سے تعلق نہیں تھا ایک دو بار ایسا ہوا کہ مہمان نے صبح اٹھ کر شکایت کی کہ تم لوگ آرام سے سونے کیوں نہیں دیتے ہو؟ صبح صبح کھٹ کھٹ شروع ہو جاتی ہے پھر محلے والے بچے سحری کے وقت ہی صل علی نبینا۔ صل علی محمد۔ کے نعرے لگا لگا کر نیند سے چونکا دیتے ہیں تم کوئی ایسا انتظام نہیں کر سکتے کہ ایسا نہ ہو۔ ہم نے کہا کیوں نہیں ہو سکتا ہے تمہیں چنیوٹ چھوڑ آتے ہیں جہاں دوپہر تک پڑے سوؤ گے کوئی جھانک کے بھی نہیں دے گا۔ یہ اجتماعی طریق ایک صدی میں پیدا ہوا تھا۔ ہر احمدی اس طریق سے آشنا تھا اس لئے احمدی احمدی گھروں میں مہمان ہوتے تو انہیں کوئی اجنبیت نہ ہوتی دوسرے آجاتے تو اجنبیت محسوس کرتے۔

ہمارے دوست مسٹر جسٹس سجاد احمد جان مرحوم ہائی کورٹ کے پھر سپریم کورٹ کے جج رہے پھر چیف الیکشن کمشنر ہوئے۔ ہائی کورٹ کی ججی کے دوران آپ ربوہ تشریف لائے مگر قیام چنیوٹ کے سرکٹ ہاؤس میں فرمایا۔ ایک رات وہاں گزاری۔ اگلے روز شام کے وقت ربوہ کالج میں تقریر کے لئے تشریف لائے یہ غالباً 1963 یا 64 کی بات ہے۔ ربوہ میں چند گھنٹے قیام فرمایا۔ شہر میں تھوڑا سا گھومے۔ واپسی پر میں انہیں چنیوٹ تک چھوڑنے گیا۔ فرمانے لگے ''چنیوٹ اور ربوہ میں صرف چھ میل کا فاصلہ ہے مگر دونوں شہروں کے کلچر میں چھ صدیوں کا فرق ہے''۔ پھر بعد کو میرے جاپانی دوستوں نے بھی جو جاپان سے ربوہ آئے اور چنیوٹ میں لکڑی کی مصنوعات خریدنے کے لئے تشریف لے گئے یہی محسوس کیا کہ دونوں شہروں کے کلچر میں بہت تفاوت ہے۔ دراصل یہ تفاوت احمدیہ کلچر کا پیدا کیا ہوا ہے۔ چنیوٹیوں کے بارے میں جناب مشتاق احمد یوسفی کا فرمودہ حرفِ آخر ہے کہ ''چنیوٹی یا

میمن پاگل بھی ہو جائے تو دوسرے کی پگڑی اتار کر اپنے ہی گھر میں پھینکتا ہے''۔ یہی چنیوٹ کا کلچر ہے۔

ہم احمدیہ کلچر کے اس حصہ کا ذکر کر رہے تھے جس کا تعلق تربیت سے ہے اس تربیت کا ایک حصہ بچوں کی تعلیم سے متعلق تھا ہر احمدی بچہ سکول شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید ناظرہ ضرور پڑھ لیتا تھا ذرا حرف شناسی کی عمر کو پہنچتا تو ماں باپ خود قرآن پڑھانا شروع کر دیتے یا کسی دوسرے کے پاس چھوڑ آتے ہماری پھوپھی بیگم جی قرآن پڑھانے میں بہت مشہور تھیں۔ مشہور تھا کہ غبی سے غبی بچے کو بھی قرآن پڑھنے میں طاق کر دیتی ہیں۔ ہم نے بھی انہی سے قرآن مجید ناظرہ پڑھا ہے۔ سارے محلے کے بچے ان سے قرآن پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ ہمارے گھر کا سارا ماحول ہر وقت قرآن کی تلاوت سے گونجتا رہتا تھا کیونکہ ہر وقت کوئی نہ کوئی بچہ قرآن پڑھنے کے لئے حاضر رہتا تھا وقت کی تخصیص یا پابندی نہیں تھی بچے اپنی سہولت کے مطابق آتے تھے۔ یہی حال دوسرے محلوں کا بھی تھا کوئی نہ کوئی ایسا شفیق وجود موجود ہوتا جو بچوں کو بلا معاوضہ قرآن پڑھاتا رہتا۔ بچوں کو ملا ملوانوں کے پاس نہیں بھیجا جاتا تھا یہ خدمت محلے کی بڑی بوڑھیاں کرتی تھیں اور خندہ پیشانی سے کرتی تھیں۔ قادیان کا کوئی بچہ ہی ایسا رہا ہوگا جس نے ہماری پھوپھی جی سے قرآن نہ پڑھا ہو۔ ربوہ میں بھی جب تک بینائی اور صحت نے اجازت دی یہ خدمت کرتی رہیں۔

اس قرآن شناسی کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ احمدی بچے بلا تخصیص دوسروں سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ ہم ایک بار حیران رہ گئے کہ ہمارے ایک دوست جو بعد کو بڑے سینئر اور عالم فاضل پروفیسر کہلائے ایک بار ہمارے ہاں مہمان تھے۔ صبح صبح آپ نے گھر کے اندر سے ایک چھوٹے سے بچے کی تلاوت کرنے کی آواز سنی تو دنگ رہ گئے۔ پوچھنے لگے ''یہ اتنا چھوٹا سا بچہ کون ہے جو قرآن پڑھ رہا ہے؟''۔ ہم نے کہا

’’ہمارا چھوٹا بھائی ہے نسیم مہدی‘‘۔ کہنے لگے یار تم عجیب لوگ ہو۔ میں اب تک قرآن نہیں پڑھ سکتا کہ ماں باپ نے بچپن میں پڑھایا ہی نہیں۔ بچوں کو قرآن سکھانا احمدیہ کلچر کا حصہ تھا اور ہے۔ ربوہ اور قادیان کی گلیاں صبح صبح قرآن کی تلاوت سے گونجا کرتی تھیں۔

سکول میں میٹرک تک قرآن کا ترجمہ پڑھا دیا جاتا تھا یہ تعلیم لازمی تھی ورنہ بچے کو میٹرک کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ قادیان میں تو سکول کے وجود سے پہلے مدرسہ احمدیہ کا وجود تھا جس میں قادیان کے اکثر بچے پڑھتے تھے اور آخر مولوی فاضل کا امتحان پاس کر کے نکلتے تھے۔ مولوی فاضل کا امتحان صرف ان لوگوں کے لئے لازمی نہیں تھا جو مبلغ بننے والے ہوتے تھے شرفا بھی مولوی فاضل کا امتحان پاس کرنا اپنے لئے باعثِ عزت جانتے تھے۔ مولوی فاضل کے امتحان کو آج کل عربی فاضل کا امتحان کہتے ہیں۔ اے وائے مولویانِ قوم۔ مولوی کا لفظ اتنا بدنام ہو گیا کہ اب یونیورسٹی بھی اسے اپنا کسرِ شان سمجھتی ہے۔ مدرسہ احمدیہ کوئی مولویوں کا مدرسہ نہ تھا یہ جنرل اختر حسین ملک، جنرل عبدالعلی ملک اور بریگیڈئر وقیع الزمان اسی مدرسے کے پڑھے ہوئے ہیں۔ ہاں اس مدرسے کا یہ تخصص تھا کہ اس میں احمدیہ کلچر کا جزوِ بدن بنا دیا جاتا تھا۔

مولوی فاضل کا امتحان پاس کرنے والے شخص کی معاشرے میں قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی تھی ربوہ میں ہمارے دوست سید عبدالحیٔ پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل کے امتحان میں اول آئے تو شہر میں ان کا دور دور تک چرچا ہوا اور لوگ انہیں دور دور سے دیکھنے کو آئے (وہ تو اب بھی آتے ہیں)۔ پھر ہم نے تو وہ زمانہ دیکھا ہوا ہے جب غیر احمدی اور احمدی مناظروں میں زور شور سے مناظرے ہوا کرتے تھے۔ دونوں طرف سے پڑھے لکھے لوگ اکٹھے ہوتے اور خالص علمی ماحول میں مناظرے ہوتے۔ غیر احمدی مناظر اگر بدزبانی پر اترتے تو ہمارے مناظر ملک عبدالرحمن خادم مرحوم انہیں انہی

کے سکے میں نقد ادائیگی کر دیتے تو بہت لطف رہتا۔ان کے مناظروں کو لوگ دور دور سے سننے کے لئے آتے تھے پھر مخالف علماء کی بدزبانیاں بڑھنے لگیں تو مناظروں کا رواج بھی کم ہو گیا۔اور اب۔اب تو یہاں تک زباں بندی ہے کہ لوگ جو چاہتے کہتے ہیں بدزبانی بدگوئی کرتے چلے جاتے ہیں مگر احمدیوں کو ان کا جواب دینے کی اجازت نہیں اعتراض کا جواب دینا خلافِ قانون ہے۔ یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں۔ یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری۔اب جو کلچر تشکیل پذیر ہو رہا ہے وہ نیا صحافتی کلچر ہے کہ جسے بتیس دانتوں میں رہنے والی زبان کا کلچر کہئے۔وہ زمانے لد گئے جب لوگ باگ مسئلے مسائل جاننے کے لئے بحث کیا کرتے تھے۔ایک بار ہمارے دوست محمد اسلم سجاد، پھالیہ سے ایک مولوی صاحب کو ربوہ لائے۔ پہلے انہیں حضرت مولانا شمس صاحب سے ملایا پھر حضرت قاضی محمد نذیر صاحب لائلپوری سے ملایا ان کی تشفی نہ ہوئی تو انہیں لے کر ہمارے گھر آ گئے۔ ہمارے ابا اللہ بخشے تہمد باندھتے اور دیہاتی لباس میں رہنا پسند کرتے تھے کیونکہ ان کی ساری تگ و تاز دیہی علاقوں تک ہی محدود تھی۔اسلم سجاد ان مولانا کو لے کر آئے۔ بیٹھک میں بٹھائے گئے۔ابا جی مرحوم اسی طرح تہمد باندھے اوپر بنیان پہنے بیٹھک میں آ گئے پوچھا کیسے تشریف لانا ہوا۔سجاد صاحب کہنے لگے یہ مولانا پھالیہ سے تشریف لائے ہیں۔نڈر آدمی ہیں اگر انہیں کسی بات کی سمجھ آ جائے تو کسی سے نہیں ڈرتے۔ابا جی نے پہلی بات کہی ''درست فرمایا۔ پھالیہ سے تشریف لائے ہیں تو ڈریں گے کیوں؟ یہ لوگ تو راتوں کو نہیں ڈرتے تو دن میں کیا ڈریں گے؟'' پھر مولانا سے ان کا مدعا پوچھا۔انہوں نے کہا کہ میں جید علماء سے مل کر آ رہا ہوں میری تسلی نہیں ہوئی۔ابا جی نے کہا پھر بھی کیا الجھن ہے؟ کہنے لگے ''وفاتِ مسیح کے ثبوت میں کوئی آیت درکار ہے؟''۔ابا جی نے کہا ''کیا باقی انبیاء آپ نے آیتوں سے مارے ہیں کہ عیسیٰ کی وفات کے لئے آیت ضروری ہے؟''۔مولوی صاحب ایک تو ''رات کو نہ ڈرنے والے''

کے خطاب سے جھینپے ہوئے تھے اب تو ایسے چپ ہوئے کہ پھر بول تک کہ نہ دیا۔ سجاد صاحب انہیں لے گئے۔ دراصل جو لوگ تحقیق کی نیت سے آتے تھے وہ تمسخر یا استہزاء نہیں کرتے تھے نہ کج بحثی میں الجھتے تھے جسے حق کی تلاش ہوتی تھی وہ تلاش میں کنارے لگ جاتا تھا۔

احمدیہ کلچر میں عربی کی اہمیت کا ذکر ہو رہا تھا بات دور نکل گئی۔ ہمیں عربی زبان سے واجبی سی دلچسپی تھی اور ہے ہم نے بی اے آنرز البتہ عربی ہی میں کیا اور صوفی بشارت الرحمن صاحب کے چہیتے ''عربی دانوں عالموں فاضلوں'' کی کلاس میں سے ہم تنہا عربی آنرز میں کامیاب ہوئے تھے باقی سب رہ گئے تھے مگر اس کے باوجود ہمیں عربی میں دلچسپی پیدا نہ ہوئی۔ بات عربی کی نہیں ایک خاص زاویہ نگاہ کی ہے احمدیہ کلچر میں عربی جاننے کی بہت اہمیت رہی ہے اور ہے۔

ہمارے ماحول میں عالموں کا احترام ایک خاص وصف ہے۔ بچوں کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو کسی بھی علم کے عالم ہوں ان کا احترام کیا جائے۔ قادیان میں یا ربوہ میں لوگ علماء کی خدمت میں حاضر ہونا اپنے لئے سعادت کی بات جانتے تھے۔ علماء کی محفلوں میں بیٹھنا بچوں کے ذہن میں کشادگی پیدا کرتا تھا۔ ہمیں بچپن ہی سے سکھایا گیا تھا کہ علماء کی محفلوں میں جانا اور بیٹھنا چاہیئے۔ چنانچہ ہم لوگ بہت نوعمری ہی سے بزرگوں کی محفلوں میں جانے لگے تھے۔ حضرت مولوی شیر علی صاحبؓ۔ حضرت سید سرور شاہ صاحبؓ کی خدمت میں حاضری دینا ہمیں یاد ہے۔ اسی طرح دوست ہمارے پھوپھا حضرت مولوی غلام نبی صاحب مصریؓ کی خدمت میں باقاعدگی سے حاضر ہوا کرتے تھے۔ ہمیں یہ تو یاد نہیں ہم نے ان بزرگوں سے کیا سیکھا مگر ان کی پاکیزہ صحبتوں کی یاد ذہن میں مستحضر ہے اور یہی کیا کم ہے؟ ربوہ میں ہم حضرت حافظ مختار احمد شاہجہان پوریؓ کی خدمت میں اور حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکیؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ جلسہ سالانہ پر تو لوگ بزرگوں کے گھروں پر ضرور

حاضر ہوتے۔ دروازے کھلے رہتے۔لوگ آتے جاتے رہتے دعا کا دربار عام جاری رہتا۔فیضان کی باتیں ہوتی رہتیں۔ بچے بھی بیٹھے رہتے ان کے کانوں میں بھی دین کی باتیں پڑتی رہتیں۔ یہ جماعت احمدیہ کا خاص کلچر تھا۔ ہمارے ہاں علماء کا ایک خاص مرتبہ تھا اور اس زمرہ میں ہر علم کے عالم شامل تھے۔

احمدیہ کلچر میں ایک بات جزاکم اللہ کہنے کی ہے۔ دوسرے لوگ صرف رسمی شکریہ ادا کرتے ہیں ہمارے ہاں شکریہ ادا کرنا ہو یا احسان مندی کا اظہار کرنا ہو تو جزاکم اللہ احسن الجزاء کہا جاتا ہے۔ دوسرے بھی ایسا کہتے ہوں گے مگر ایسا الشاذ کالمعدوم کے حکم میں ہے۔ہم نے تو سوائے احمدیوں کے کسی اور کو جزاکم اللہ کہتے نہیں سنا۔جس طرح الیس اللہ بکاف عبدہ والی انگوٹھی احمدیوں کا امتیازی نشان بن گئی ہے اسی طرح جزاکم اللہ کہنا بھی احمدیوں کی امتیازی نشانی ہے۔ احمدی احسان مند لوگ ہیں احسان ناشناس یا ناشکرے لوگ نہیں حالانکہ جماعت کو جماعتی طور پر ایسے ایسے احسان ناشناس لوگوں سے پالا پڑ چکا ہے کہ الامان والحفیظ کہئے۔ ہمارے ہاں انفرادی اور اجتماعی طور پر احسان مندی کا اظہار کرنا کلچر کا حصہ ہے۔ہم نے اپنے ایک دو مضمونوں میں اپنے ایک دو شاگردوں کے احسانات کا تذکرہ کیا تو ایک صاحب معترض ہوئے کہ ہم نے ایسا کیوں کیا؟ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم نے اپنے بزرگوں سے یہی سیکھا ہے کہ کوئی ذرا سا بھی احسان کرے تو اس کے احسان کا تذکرہ کرو فَاَمَّا بِنِعْمَتِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ ۔ یہ اللہ کا احسان ہی تو ہے کہ وہ لوگ ہمیں دور دراز کے ملکوں میں مشاعروں یا ملاقاتوں کے لئے بلاتے اور خدمت کرتے ہیں اس میں ہماری کون سی خوبی ہے؟ بلانے والوں کی خوبی ہی تو ہے۔ہم خود تو اتنے لمبے لمبے سفروں کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ اب آپ کہتے ہیں کہ ہم ان کے احسانوں کا تذکرہ تک نہ کریں؟ ہمارے سامنے حضرت مولوی غلام نبی مصری ؓ کا اسوہ ہے۔ان کا کوئی شاگرد انہیں

کوئی چھوٹا سا تحفہ بھی دیتا تو اس کے لئے دعائیں بھی بہت کرتے اور بار بار اس کا تذکرہ بھی کرتے کہ دوسروں کو بھی دعاؤں کی تحریک ہو۔محترم ملک عمر علی صاحب ان کے خاص شاگرد تھے وہ انہیں ملتان بلاتے۔اپنے ہاں مہمان رکھتے ان کی خدمتیں کرتے نہ تھکتے تھے اور پھوپھا جی بھی ان کا تذکرہ اسی محبت اور دلی لگاؤ سے کیا کرتے تھے اور ان کے لئے راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں کیا کرتے تھے۔

پھر حضرت مولانا راجیکی صاحب کا اسوہ بھی ہم نے دیکھا ہے۔ان کے صاحبزادے برکات احمد راجیکی نے ایک بار دفترِ خدمتِ درویشان سے درخواست کی کہ ان کی جانب سے مبلغ دس روپے ان کے والد صاحب کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کردئے جائیں وہ یہ رقم قادیان میں ادا کر دیں گے۔ ہم حضرت میاں بشیر احمد صاحب کی ہدایت پر دس روپے کی وہ رقم لے کر خود حضرت مولانا راجیکی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔حضرت مولانا نے وہ دس روپے لے کر اپنے بیٹے کو اتنی دعائیں دیں اتنی دعائیں دیں کہ کیا بیان کروں۔آپ نے اسی وقت ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور ہمیں بھی اس دعا میں شامل کر لیا۔اتنے تضرع اور ابہتال سے آپ نے دعا کی گویا آستانہ الٰہی کو جھٹلا دیں گے۔حالانکہ دیکھا جائے تو ایک بیٹے کی طرف سے باپ کو ایک حقیر سا نذرانہ تھا مگر ہمیں یہ سبق ملا کہ اپنے بیٹے بھی خدمت کریں تو ماں باپ کا فرض بنتا ہے کہ وہ ان کے اس احسان کا تذکرہ ہی نہ کریں ان کے لئے دعائیں بھی کریں اور ماں باپ بڑھاپے میں یہی کچھ تو دے سکتے ہیں۔کیسا خوش نصیب وہ بیٹا تھا اور کیسا خوش نصیب وہ باپ تھا۔احمدیہ کلچر کا یہ پہلو بھی دوسروں سے ممتاز ہے۔

احمدیہ کلچر میں تعزیت کے قرینے بھی دوسروں سے مختلف ہیں۔ ہمارے ہاں جزع فزع کا تصور نہیں تعزیت کے لئے صرف انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ دینا ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔فاتحہ یا قل یا تیسرے یا چالیسویں کا رواج ہمارے ہاں نہیں۔کئی بار غیر احمدی دوستوں کے ہاں تعزیت کے سلسلہ میں جانا ہوا

تو بہت دقت پیش آئی کیونکہ جو آتا وہ ''دعائے خیر'' کہہ کر فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا لیتا۔مگر ہم نے دیکھا کہ ہر شخص آنے والے کے ساتھ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا تو ضرور ہے کچھ پڑھتا پڑھاتا نہیں اور اپنی مرضی سے ہاتھ چھوڑ کر باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔فاتحہ محض رواج بنی ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں اس کا رواج نہیں۔ ہاں لوگ پرسہ دینے ضرور جاتے ہیں۔تین دن تک تو دوست عزیز باقاعدہ آتے ہیں البتہ قبر پر دعا کرنے کے لئے لوگ ضرور جاتے رہتے ہیں۔احمدیہ کلچر میں اسے فاتحہ نہیں کہتے دعا ہی کہتے ہیں۔بہشتی مقبرے میں صبح صبح دعا کرنے والوں کا تانتا لگا ہوتا ہے۔قادیان میں لوگ بہشتی مقبرے میں حاضر ہوتے تو سب سے پہلے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی قبر مبارک پر اور حضرت خلیفہ المسیح الاول ؓ کی قبر پر دعا کرتے پھر دوسروں کی قبروں پر جاتے۔ربوہ میں حضرت اماں جان ؓ، حضرت خلیفہ المسیح الثانی ؓ اور حضرت خلیفہ المسیح الثالثؒ کے مرقدوں پر پہلے دعا کی جاتی ہے اس کے بعد لوگ اپنے اعزہ کی قبروں پر دعا کرتے ہیں۔مگر ہمارے ہاں قبروں پر کوئی منت مانی جاتی ہے نہ کوئی چڑھاو چڑھایا جاتا ہے۔ جہانتک ہماری تربیت کا تعلق ہے ہمیں علم ہے کہ قبروں سے کوئی توقع وابستہ نہیں کی جانی چاہیئے۔دیگر درگاہوں یا مزاروں پر جو کچھ ہوتا ہے وہ ہمارے ہاں بنظر استحسان نہیں دیکھا جاتا البتہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اسوے سے معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں کے مزاروں پر دعا کی نیت سے جانا مستحب ہے کیونکہ حضرت صاحب خود بھی کئی ایک بزرگوں کے مزاروں پر دعا کے لئے تشریف لے گئے۔اسی طرح ہمارے ہاں چالیسویں وغیرہ کی دعوت کا بھی کوئی رواج نہیں۔عام معاشرے میں تو یہ رواج ہے کہ مرنے والا مر جاتا ہے اس کے پسماندگان لوگوں کو کھلا کھلا کر مر جاتے ہیں۔

تعزیت کے لئے آنے والے بھی ہمارے ہاں ہاتھ اٹھا کر فاتحہ نہیں پڑھتے۔خاموشی سے آتے 'لواحقین سے ملتے' انا للہ پڑھتے اور خاموشی سے بیٹھ کر مرنے والے کے شمائل کا تذکرہ کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں اذْكُرُوْا مَوْتَكُمْ بِالْخَيْر کا رواج ہے مرنے والے کے عیوب کا تذکرہ مناسب نہیں جانا جاتا۔مغفرت کی دعائیں ہی کی جاتی ہیں۔

ہمسایوں سے حسن سلوک بھی احمدیہ کلچر کا حصہ ہے۔ہمسایوں سے اپنوں جیسا سلوک کرنا اسلامی اخوت کا اہم حصہ تھا مگر افسوس کہ لوگ اسے بھول بیٹھے۔قادیان اور ربوہ میں اس بات کا بہت اہتمام کیا جاتا تھا اور ہے کہ ہمسایوں سے حسن سلوک کا کوئی موقع ضائع نہ ہو۔حضرت خلیفہ المسیح الرابعؒ نے تو باقاعدہ عیدین کے موقعوں پر ہمسایوں کو اپنی خوشیوں میں شریک کرنے کا حکم دے رکھا ہے۔ہمیں یاد ہے قادیان کے زمانے کے ہمارے ہمسائے ملک صلاح الدین صاحب اور پڑوس میں رہنے والے دوسرے خاندانوں سے اتنی اپنائیت کا احساس ہوتا تھا کہ کوئی اجنبیت کبھی در ہی نہیں آتی تھی۔ بابا ہر سیاں والے، ان کی آل اولاد، بابا جی علی گوہر ان کی آل اولاد حکیم رحیم بخش کی آل اولاد، بخاری صاحب، ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب، مولوی محمد سلیم صاحب، شیخ فضل احمد بٹالوی صاحب سب لوگ ایک ہی کنبے کے افراد لگتے تھے۔ربوہ میں بھی ہمسایوں سے وہی اپنائیت چلی آتی ہے۔ہمارے ہاں اردو میں محاورہ ہے ’’حق ہمسایہ ماں جایا‘‘ یعنی ہمسایوں کا حق ماں جائے بہن بھائیوں جیسا ہے مگر ہمارے ہاں اجنبیت بڑھ رہی ہے۔مغرب میں تو ہمسائیگی کا کوئی تصور ہی نہیں لوگ برسوں دیوار بہ دیوار رہتے ہیں مگر ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں۔ہمارے ہاں ایسا نہیں تھا مگر اب ایسا ہو رہا ہے۔ احمدیہ کلچر میں ہمسائے کے حقوق اب بھی قائم ہیں۔جاپان کی بات ہے، ہمارے پڑوس میں ایک ہمسائے کا انتقال ہو گیا۔ہم نے اپنے رفیق کار امریکن پروفیسر آسٹن فاریسی صاحب سے کہا کہ تعزیت کے لئے چلنا چاہئے۔فرمانے لگے نہیں تیسرا گھر ہے، دوسرا ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔کچھ دنوں بعد فاریسی صاحب بیمار ہو گئے۔ہم عیادت کے لئے اوپر تیسری منزل پر ان کے دولت کدے پر حاضر

ہوئے۔ تفنن کے طور پر ان سے کہا کہ شیطان کے کان بہرے کل کلاں آپ کے دشمنوں کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو ہم کیا کریں گے؟ کہنے لگے کیوں اتنی بے مروتی دکھاؤ گے کہ میرے جنازے کو کندھا بھی نہیں دو گے؟ ہم نے کہا نہیں ایسی بات تو نہیں صرف ایک دقت ہے کہ آپ کا مکان بھی تیسرا مکان ہے دوسرے تک تو ہم بلا تکلف جا سکتے ہیں۔ بہت ہنسے۔ تب ہم نے انہیں اسلامی معاشرہ میں ہمسائے کے حقوق کا بتایا۔ فرمانے لگے ایسا تو صرف فرشتوں کے معاشرے میں ہو سکتا ہے۔ احمدیہ معاشرہ کوئی فرشتوں کا معاشرہ تو نہیں پھر بھی ہمارے ہاں ہمسایوں کے حقوق کا لحاظ اب بھی موجود ہے۔ ضرورت میں ہمسایوں کی خبر گیری، بیماری میں ہاتھ پیر کی خدمت، اب بھی ہمارے ہاں اسی خوش دلی کے ساتھ کی جاتی ہے۔

خدمتِ خلق کا لفظ بھی ہمارے ہاں ہی سے شروع ہوا۔ کسی مصیبت کا وقت ہو تو خدام، انصار یا اطفال خدمت کے لئے تیار رہتے ہیں۔ قادیان کا تو ہمیں یاد نہیں ربوہ میں سیلاب آتا تو اردگرد کا سارا علاقہ پانی میں گھر جاتا۔ خدام خدمت کے لئے میدان میں اتر پڑتے اور اپنی جانوں کی پروا کئے بغیر خدمت پر مستعد رہتے۔ ہم نے کھڑکن گاؤں تک بھی خدام کو کشتیوں میں جاتے اور لوگوں کی جانیں بچاتے دیکھا ہے۔ بھوکوں کو کھانا پہنچانا بھی انہیں خدام کو سزاوار رہا جو اندھیری راتوں میں بھی سیلاب کے پانی میں کشتیاں کھیتے دور دور کے بھوکے پیاسے محصور شدہ لوگوں تک پہنچتے تھے اور انہیں کھانا پہنچاتے تھے۔ بیماروں کے لئے تو خدمتی کیمپ لگتے ہی رہتے ہیں۔ گرمیوں میں بسوں کے اڈہ پر اور سٹیشن پر پیاسوں کو پانی پلانے کا کام بھی جاری رہتا تھا تا آنکہ ایک نیک آدمی کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی اس نے آنکھ بچا کر پانی والے ڈرم میں زہر کی پڑیا ملا دی۔ وہ تو خیر گزری کہ کسی دیکھنے والے نے دیکھ لیا اور وہ پانی ضائع کر دیا گیا ورنہ ایک نیا کھڑاک کھڑا ہو جاتا۔ اس کے بعد بسوں کے اڈہ پر پانی

پلانے کا کام روک دیا گیا پانی بیچنے والوں کو کھلی آزادی ہے مگر ربوہ والے پانی نہیں بیچتے جو لوگ بیچتے ہیں وہ ربوہ کے نہیں باہر سے آکر ثواب کا یہ کام کرتے ہیں۔

خدمتِ خلق کا ایک انداز احمدیہ کلچر سے مختص ہے اسے وقارِ عمل کہتے ہیں یعنی رضا کارانہ طور سے سڑکوں،گلیوں،محلوں کی صفائی اورسڑکوں کی مرمت۔خدام،اطفال،انصارسب ہی وقارِعمل میں شریک ہوتے ہیں قادیان میں ہم نے ایک بارحضرت صاحب کوبھی وقارِعمل میں شریک ہوتے اوراپنے ہاتھ سے پھاوڑا چلاتے دیکھا۔پھاوڑے کدالیں تسلے خدام الاحمدیہ والے مہیا کرتے تھے اور محلے کے سب لوگ گلی محلے کی صفائی میں مشغول ہو جاتے تھے اوراس کام میں کسی کو عار نہ تھی یہاں سویڈن والوں کو دیکھا کہ مہینے دو مہینے میں ایک بارسب لوگ مل جل کر اپنے ماحول کی صفائی رضا کارانہ طور پر کرتے ہیں اورایسے کام میں فخر محسوس کرتے ہیں۔حیرت ہے کہ انہیں جماعت احمدیہ کے وقارِعمل کی بھنک کہاں سے پڑ گئی۔درحیرتم کہ بادہ فروش ازکجا شنید۔

جماعت احمدیہ کے ماحول کے ساتھ بعض الفاظ مخصوص ہیں مثلاً مددگار کارکن۔ ہمارے ہاں دفتروں میں ادنیٰ کام کرنے والوں کو چپراسی نہیں کہا جاتا ان کی عزتِ نفس کا لحاظ رکھتے ہوئے انہیں مددگارکارکن کہتے ہیں۔کچھ عرصہ پہلے ہماراایک مضمون جماعت کے پرچوں میں مددگارکارکنوں کے بارے میں چھپا جس میں ہم نے ذکرکیا کہ جماعت احمدیہ ادنیٰ خدمت پر مامور ہونے والوں کے جذبہ اخلاص کی قدرکرتی ہے پھر جماعت کی تنظیموں کا نظام جماعت کے استحکام کا موجب ہے ان کی وجہ سے بھی ہمارے ہاں بہت سے الفاظ ایسے مروج ہیں جو دوسروں کے لئے اجنبی ہیں۔ہم نے ایک بار احمدیوں کے ایک حلقہ میں جس میں غیراحمدی احباب بھی موجود تھے ایک شعرسنایا''یوں بوڑھی امنگوں کوجواں سال بنانا۔انصارکوخدام کے اجلاس پہ لانا''۔احمدیوں نے کماحقہ داددی۔غیرازجماعت شعرا

ہمارا منہ دیکھتے رہے۔ بعد میں ہمارے ایک بے تکلف دوست نے کہہ بھی دیا کہ یہ انصار خدام کا کیا سلسلہ ہے؟ ہم نے انہیں بتایا کہ جماعت کی تنظیموں میں بوڑھوں کی تنظیم کے اراکین کو انصار اور نوجوانوں کی تنظیم کے ارکان کو خدام کہتے ہیں تو کہنے لگے اب بات بنی۔ میں حیران ہورہا تھا کہ یہ تلمیحات کوئی خاص تلمیحات لگتی ہیں اس لئے ہمیں تو سمجھ میں نہیں آئیں۔ اسی طرح لجنہ کا لفظ ہمارے معاشرہ میں بامعنی لفظ ہے کیونکہ ہمارے ہاں عورتوں کی تنظیم کو لجنہ کہتے ہیں، دوسرے لوگ اس کو نہیں سمجھتے۔ نظام کے سلسلہ ہی میں جماعت کے انتظامی امور کو چلانے کے لئے انجمن اور تحریک کی تنظیمیں ہیں ان کے عہدیدار ناظر یا وکیل کہلاتے ہیں احمدیوں کے معاشرہ سے ہٹ کر یہ الفاظ بالکل الگ معنوں میں مستعمل ہیں۔ صرف ایک بار ایسا دیکھا کہ پنجاب کے ڈی پی آئی کالجز کے دفتر میں ایک عہدیدار کے دفتر کے باہر ناظر امور عامہ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ ہم فوراً وہاں سے بھاگ لئے کیونکہ اپنی سگریٹ نوشی کی وجہ سے ربوہ کی نظارت امور عامہ کی بلیک لسٹ پر تھے اور اس نام سے بدکتے تھے۔ الحمد للہ کہ سگریٹ نوشی تو ہم ترک کر چکے ہیں مگر امور عامہ والوں سے بدکنا نہ گیا۔ حکومت کے ضلعی نظام میں بھی بعض عہدیدار ناظر کہلاتے ہیں مگر ہمارے ہاں ناظر کے ساتھ بزرگی، علوِ مرتبت اور جماعتی عہدیدار ہونے کا احترام شامل ہے۔ جماعت کی یہ تنظیمیں جماعت کے فعال ہونے کی آئینہ دار ہیں۔ بچوں تک کی تنظیم اطفال الاحمدیہ موجود ہے بچیوں کی تنظیم ناصرات موجود ہے۔ ان تنظیموں کے ساتھ جو ذخیرہ الفاظ ہے وہ جماعت کے ماحول میں آزادانہ استعمال ہوتا ہے اور سمجھا جاتا ہے۔ یہ الفاظ ہمارے کلچر سے خاص ہیں۔

ہمارے احمدیہ کلچر کا ایک حصہ پردہ سے متعلق ہے۔ ہمارے ہاں غضِ بصر کا عام رواج ہے۔ عورتیں برقعہ پہنتی ہیں گلیوں بازاروں میں بے پردہ خواتین نظر نہیں آتیں۔ برقعہ پہننے کا جتنا رواج ربوہ

میں ہے اتنا پاکستان کے کسی اور شہر میں نہیں۔ ہماری بچیاں کالجوں یونیورسٹیوں میں پڑھنے بھی جاتی ہیں تو پردہ کی رعایت ملحوظ رکھتی ہیں۔ ہم گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں تھے۔ ربوہ سے تین بچیاں ہمارے ساتھ ہمارے ہی کالج میں پڑھنے کے لئے جاتی تھیں۔ تمام اساتذہ جن میں اشد ترین مخالف اساتذہ بھی شامل تھے اس بات کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کہ اصل پردہ کی رعایت تو ربوہ سے آنے والی بچیاں ملحوظ رکھتی ہیں۔ ان تین بچیوں میں کی ایک بچی ایک بار اپنی بے پردہ کلاس فیلوز کے ساتھ ایک سیمینار میں آ گئی۔ ہم نے جب ایک اجنبی بچی کو اپنے سیمینار میں موجود پایا تو باقی بچیوں سے اس اجنبی بچی کے بارے میں پوچھا کہ آپ کی تعریف؟ وہ حیرت زدہ ہو کر رہ گئیں۔ وہ بچی کہنے لگی ''سر آپ نے پہچانا نہیں؟ میں فلاں ہوں اور روز آپ کے ساتھ موٹر میں ربوہ سے آتی ہوں آج میں اپنی والدہ کی اجازت سے پہلی بار آپ کے سامنے آئی ہوں''۔ فی زمانہ پردہ بھی احمدیہ کلچر کا حصہ بن گیا ہے۔ احمدیہ کلچر کی یہ پہچان ایک صدی میں جا کر بنی ہے دو چار برس میں نہیں بنی۔ اتنا ہی کیا کم ہے کہ جماعت احمدیہ نے سو سال کے اندر اپنی علیحدہ ثقافتی پہچان بنا لی۔

ہم نے جماعت احمدیہ کے کلچر کی اتنی باتیں بیان کر دیں مگر ایک ضروری بات نظر انداز کر گئے۔ وہ پہلو شادی بیاہ کا پہلو ہے۔ ہمارے ہاں نکاح کا اعلان عین شادی کے وقت بھی کیا جاتا ہے اور پہلے بھی۔ عام طور سے نکاح کا اعلان مسجد میں کیا جاتا ہے۔ حق مہر عموماً دولہا کی چھ مہینے کی آمدنی کے برابر مقرر کیا جاتا ہے۔ شادی بیاہ کے معاملہ میں بھی بڑی سادگی روا رکھی جاتی ہے۔ ڈھول ڈھمکے کا رواج نہیں ہے۔ بارات شہر سے باہر کی ہو تو کھانا دینے کا رواج ہے ورنہ نہیں صرف مشروبات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ کھانا کھلانے کا رواج بھی اب آ کے ہوا ہے پہلے نہیں تھا۔ نکاح کا اعلان مسجد میں ہوتا تھا اس کے بعد چھوہارے بانٹ دئے جاتے تھے اللہ اللہ خیر سلا۔ حضرت صاحب کی بچیوں کی شادی بیاہ میں

بھی یہی سادگی روا رکھی جاتی تھی۔ ہمیں اپنے گھر میں بھائی جان محمد احمد نعیم کی شادی کا یاد ہے۔ ان کے ولیمے میں محلے کے کچھ لوگ شامل ہوئے تھے یا بھائی جان کے کچھ استاد۔ آپا امۃ السلام مرحومہ بیاہ کر آئیں تو ان کے جہیز کے سامان میں دو چار برتن تھے اور کپڑوں کے دو جوڑے۔ یہی احمدیہ کلچر کا رواج تھا۔ ہمارے ہاں جہیز کا تصور بھی بہت سادہ ہے۔ ماں باپ اپنی استطاعت کے مطابق بیٹی کو سادہ سامان اور دو چار جوڑے کپڑوں کے دیتے تھے جہیز کی نمائش کا رواج تھا نہ اب ہے۔ ولیمہ کی دعوت تو سنت ہے اس میں بھی حتی الوسع سادگی ملحوظ رکھی جاتی تھی۔ ہم نے ایک ولیمہ ایسا بھی دیکھا جس میں لوگ اپنے اپنے گھروں سے کھانا لائے تھے اور دولہا کے گھر ایک جگہ بیٹھ کر اکٹھے کھا لیا تھا۔ ایسا تو بہت مرتبہ دیکھا کہ لنگر والوں نے جماعت کی طرف سے ویسے ہی دعوت کر دی۔ دعوتوں میں حضرت صاحب کے ارشاد کے مطابق ایک کھانا ہوتا تھا حد ہوئی تو ایک کھانا میٹھے کا اور بس۔

جماعت میں مشہور طریقہ ایک کھانے کا طریق بھی رہا۔ یہ دراصل تحریک جدید کے مطالبات میں سے ایک مطالبہ تھا۔ حضرت صاحب نے بیرونی ممالک میں تبلیغ کے لئے تحریک جدید کا اجراء کیا تو جماعت سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ وہ کھانے میں بچت کرے اور گھروں میں صرف ایک کھانا پکایا جائے۔ ایک بار ایک مہمان جو انگریزوں کے دور میں بہت مشہور سیاست دان اور حکومت کے بڑے عہدیدار تھے (سر فضل حسین) قادیان حضرت صاحب سے ملاقات کے لئے آئے۔ کھانے کے لئے میز پر گئے تو کھانے کی میز پر چار قسم کے کھانے تھے۔ آپ نے کن اکھیوں سے دیکھا اور چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ آئی۔ حضرت صاحب فوراً سمجھ گئے کہ ان کا خیال ہے میں جماعت والوں کو تو ایک کھانے کی تاکید کرتا رہتا ہوں مگر خود میرے دستر خوان پر ایک سے زیادہ کھانے موجود ہیں۔ حضرت صاحب نے ان سے کہا جب مجھے آپ کے تشریف لانے کی اطلاع ہوئی تو میں نے اپنی چاروں

بیویوں کے ہاں کہلا بھیجا کہ جو جو کھانا پکا ہو وہ بھیج دو کیونکہ مہمان آ گئے ہیں۔ چنانچہ یہ جو چار کھانے آپ کو نظر آ رہے ہیں یہ اس وجہ سے ہیں ورنہ ہر گھر میں ایک کھانا ہی پکا ہوا ہے۔ بات تو شادی بیاہ کی تھی۔شادی بیاہ کے کھانوں میں بھی وہی سادگی ملحوظ رہتی تھی۔ جماعت کا ایک کھانے کا طریق یہاں بھی لاگو تھا۔ایسا نہ کرنے والے کے خلاف تادیبی کارروائی ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں رخصتی کا طریق بھی بہت سادہ ہے۔ بارات آئی۔ دولہا کے ساتھ کوئی بزرگ بیٹھ گئے۔نکاح پڑھانا ہوا تو نکاح پڑھایا اگر نکاح ہو چکا ہے تو صرف رخصتی کی تقریب ہوئی۔اس تقریب کا بھی ایک لگا بندھا طریق چلا آ رہا ہے اور عموماً ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تلاوت ہوئی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی دعائیہ نظم 'یہ روزِ کر مبارک سبحان من یرانی' کسی نے خوش الحانی سے پڑھ دی یا کسی نے اس تقریب کے لئے کوئی خاص نظم لکھی ہے تو وہ پڑھ دی گئی اس کے بعد دعا ہوئی اور لڑکے والے دلہن کو لے کر رخصت ہوئے۔ سادہ ترین رخصتی ہماری یادداشت کے مطابق ہمارے دوست روشن دین تنویر مرحوم کی تھی۔ ادھر مولانا راجیکی صاحب نے مسجد میں نکاح کا اعلان فرمایا ادھر تنویر صاحب اپنی دلہن کے گھر پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا کہ چلئے نکاح تو ہو گیا۔ وہ بی بی برقعہ پہن کر ساتھ ہو لیں۔ہم اپنی بیٹی فرحت تنویر کو یہ بات بتاتے ہیں تو وہ مانتی نہیں اور اماں سے پوچھنے میں شرماتی ہے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ جماعت احمدیہ کے کلچر کا محور خلیفہ وقت کی ذات ہے۔ خلافت سے جماعت احمدیہ کا خاص تعلق ہے۔اسی تعلق کی وجہ سے جماعت کی مرکزیت قائم ہے۔حضرت خلیفۃ المسیح الاول ؓ کے وصال پر جماعت میں اختلاف ہوا۔ کچھ لوگ جو خلافت کے حق میں نہیں تھے جماعت سے علیحدہ ہو کر لاہور چلے گئے اور اس ایک صدی میں اپنا تشخص کھو بیٹھے۔ جماعت کے ایک بڑے حصہ نے خلافت کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھا اور اس تعلق نے جماعت کو دن دونی رات چوگنی ترقی سے

ہمکنار کیا۔

جماعت احمدیہ میں خلافت کا تصور دنیا کی دوسری اماموں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ کوئی سیاسی رہنمائی یا امامت کا مسئلہ نہیں نہ ہی کوئی گدی نشینی کا مسئلہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پہلے خلیفہ حضرت حکیم مولوی نورالدین ؓ نہ ہوتے۔ پچاس کی دہائی میں بھی بعض منافقین نے جماعت میں فتنہ برپا کرنے کی کوشش کی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں خائب و خاسر کیا۔ جماعت کے خلیفہ کا براہ راست اللہ تعالیٰ سے تعلق ہے۔ یہ کوئی کتابی بات نہیں۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے یہ معجزہ ہوتے دیکھا ہے۔ حضرت خلیفہ المسیح الثانی ؓ کے وصال پر یہ معجزہ ہوا اور جماعت نے جان لیا کہ خدا ہی خلیفہ بناتا ہے اور اسے اپنی تائید سے نوازتا ہے۔ حضرت مرزا ناصر احمد صاحب سے ہمارا استادی شاگردی کا تعلق بھی رہا پھر ہم نے ان کے رفیقِ کار ہونے کا اعزاز بھی پایا۔ جس روز وہ خلافت کے مقام پر فائز ہوئے ان کی شخصیت ہی بدل گئی یوں لگا گویا پرانے مرزا ناصر احمد کی جگہ کسی نئے مرزا ناصر احمد نے جنم لیا ہے۔ ان کی ساری سختی ملائمت میں بدل گئی ہم نے پہلی بار ان کی بیعت کی تو ان کی آواز بھی بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایسے لگتا تھا ان کی زبان سے کوئی اور بول رہا ہے۔ پہلا خطبہ دینے کے لئے آئے تو ساری جماعت حیران رہ گئی کہ یہ وہی مرزا ناصر احمد ہیں جن کی تقریر میں روانی نہیں تھی؟ خدا لگتی بات یہ ہے کہ ان کی جلسہ سالانہ کی تقریروں کے دوران ہم لوگ بہانے بہانے سے اٹھ کر چلے جایا کرتے تھے۔ مگر خلیفہ کیا بنے اللہ تعالیٰ نے ان کی باتوں میں تاثیر اور تقریروں میں روانی پیدا کر دی وہی تقریریں معرفت کا بہتا ہوا دریا بن گئیں۔ یہ تو ہماری اپنی بات ہے کہ

احمدی ہیں۔ حضرت صاحب کے پرانے دوست اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں جو احمدیت کے مشہور معاند ظفر علی خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ ربوہ تشریف لائے۔ حضرت

خلیفہ المسیح الثالث سے ملاقات کے بعد واپس جاتے ہوئے مجھے کہنے لگے" پروازی یہ وہ پرانے مرزا ناصر احمد تونہیں ہیں"۔ میں نے کہا" درست فرمایا ہمارا بھی یہی خیال ہے"۔ یہ گواہی کسی احمدی کی نہیں ایک ایسے شخص کی ہے جو مدتوں یونیورسٹی سنڈیکیٹ اورسینیٹ میں ان کا رفیقِ کار رہا۔ انہیں بھی یہی محسوس ہوا کہ مرزا ناصر احمد کی شخصیت میں انقلاب آ گیا ہے۔

جماعت احمدیہ اپنے خلیفہ کو اپنا روحانی پیشوا مانتی ہے اور ان کے مرتبے کے مطابق ان کا احترام ملحوظ رکھتی ہے۔ ہم نے بڑے بڑوں کو خلیفہ وقت کے سامنے گنگ ہوتے دیکھا ہے۔ ایک بار تنویر صاحب مرحوم کو دیکھا کہ شلوار قمیض اچکن پہنے اور سر پر ٹوپی اوڑھے خوش خوش چلے آ رہے ہیں۔ ہم نے کہا خیر باشد آپ اس لباس میں کہاں سے آ رہے ہیں؟ کہنے لگے" حضرت صاحب سے مل کر آ رہا ہوں۔ یاران کے سامنے منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ حالانکہ ہم کالج میں آتے تو ان کے ساتھ سواونچ نیچ کر لیتے تھے۔ کہنے لگے ایک شعر ہو گیا ہے سنو'' مست ہیں جو بادۂ پندار میں۔ لڑکھڑاتے ہیں ترے دربار میں''۔ یہ رعب خلافت اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے۔ حضرت خلیفہ رابع کا اور ہمارا عمروں کا کوئی زیادہ تفاوت بھی نہیں تھا کچھ تھوڑی بہت بے تکلفی بھی ان کے ساتھ خلافت پر فائز ہونے سے پہلے رہی۔ مگر جس روز خلیفہ ہو گئے ہم ان کے سامنے جاتے ہوئے گھبراتے ہیں حالانکہ وہی مرزا طاہر احمد ہیں جو ادبی محفلوں میں ہمارے ساتھ بیٹھ کر غالب کے کلام پر بحث کیا کرتے تھے۔ اب تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے وہ دن بھی دکھایا ہے کہ حضرت خلیفہ المسیح الخامس ایدہ اللہ ہمارے شاگردوں میں سے ہیں مگر اب ان کا مرتبہ مرشد کا ہے ہم انہیں سیدی و مولائی ہی لکھتے ہیں اور یہی ان کو سزاوار ہے۔

احمدیہ کلچر کا ایک حصہ خلافت کے ساتھ ناقابلِ شکست تعلق کا بھی ہے، بچوں کو بڑوں کو سبھی کو خلافت کے مرتبے کا ادراک ہے۔ جماعت جانتی ہے کہ خلافت سے تعلق ہی جماعت کی زندگی اور یکجہتی کا

ضامن ہے۔

لوگ خلیفہ کے ہاتھ ضرور چومتے ہیں مگر ان کے پاؤں کو ہاتھ نہیں لگاتے کہ ہمارے ہاں اس کا رواج نہیں جماعت احمدیہ والے اپنے امام کو کوئی مافوق الفطری شئے نہیں جانتے۔ ہاں انہیں اس بات کا یقین ہے کہ ہمارا امام اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے اس لئے وہ ہر مسئلہ میں اس سے رہنمائی چاہتے ہیں اور بہ ظاہر ایسی ہدایات بھی جو مناسب نظر نہ آتی ہوں امام کے کہنے پر ان پر عمل ہوتا ہے تو وہی باتیں صحیح ثابت ہوتی ہیں۔ خلافت کی غیر مشروط اطاعت جماعت احمدیہ کے ایمان کا حصہ ہے۔

اور اب بات وہاں آ گئی جہاں سے جماعت کے وسائل کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ ساری دنیا حیران ہے کہ جماعت کے پاس اتنے وسائل کہاں سے آ گئے ہیں کہ ساری دنیا میں اس کے مشن کام کر رہے ہیں اور اب تو لوگ اور بھی جلنے لگے ہیں کیونکہ جماعت نے سیٹیلائٹ ٹی وی قائم کر لیا ہے اور یہ تو بڑی بڑی حکومتیں نہیں کر سکیں۔ جماعت نے یہ کام کیسے کر لیا؟ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ سمجھ تو ہمیں بھی نہیں آتی مگر اصل بات یہ ہے کہ خدائی کاموں کا انحصار انسانوں پر نہیں ہوتا۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں دہلی کے ایک بہت بڑے ادیب جو احمدی نہیں تھے قادیان تشریف لے گئے۔ واپس آ کر اپنے اخبار میں ایک روزنامچہ لکھا جس میں بیان فرمایا کہ قادیان کے درختوں پر چڑیاں بھی ”چندہ چندہ چندہ چندہ“ کر کے پکارتی تھیں۔ بات ٹھیک ہے۔ جماعت کے مالی وسائل کا کلیتہً انحصار جماعت کے چندے پر ہے ہر شخص اپنی آمد کا سولہواں حصہ جماعت کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے جو موصی ہیں وہ دسواں بعض اوقات اس سے بھی زیادہ حصہ جماعت کو دے دیتے ہیں تا کہ تبلیغ اسلام کے کام میں صرف ہو۔ ہمارے استادِ مکرم ماسٹر نذیر احمد رحمانی مرحوم کی تو چوتھے حصے کی وصیت تھی اس کے علاوہ موقع بموقع خلیفہ وقت مختلف مہمات کے لئے چندوں کی تحریک کرتے رہتے ہیں اور جماعت ان پر بھی

لبیک کہتی رہتی ہے جماعت نے ان چھوٹے چھوٹے چندوں سے بڑے بڑے کام کر لئے ہیں۔

مدتوں پہلے ہماری ایک نظم الفضل انٹرنیشنل لندن میں چھپی جس میں اسی بات کی طرف اشارہ تھا کہ جو کام دنیا کے دولت مندوں سے نہ ہو سکے" وہ کام کر لئے ہم نے حقیر چندوں سے"۔ حضرت صاحب کو ہماری یہ ترکیب ایک آنکھ نہیں بھائی۔ حضرت صاحب نے بڑی محبت سے سرزنش فرمائی کہ چندوں کے لئے حقیر کا لفظ بھی استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ خلیفہ کو جماعت کے چندوں کی کتنی غیرت ہے جماعت ہر تحریک پر لبیک کہتی ہے تو خلیفہ کو ان کے چندوں کی غیرت کیوں نہ ہو؟ ہم نے اس نظم میں سے یہ مصرعہ ہی نکال دیا۔

احمدیہ کلچر کا نمایاں ترین پہلو قربانی کا جذبہ ہے۔ مرد ہوں یا عورتیں۔ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ سب ہی اپنے اپنے میدان میں مالی قربانی کے لئے ہر لحظہ تیار رہتے ہیں یہی چیز دوسروں کو سمجھ نہیں آتی۔ اب یہ مطالبہ زور پکڑ رہا ہے کہ احمدیوں کے فتنے کا سدِ باب کرنے کے لئے مسلمان حکومتیں مل کر ایک ٹی وی سٹیشن قائم کریں۔ بھئی کریں۔ ہمیں تو خوشی ہوگی کہ اللہ رسول کا نام بلند ہوگا مگر اس بات کا خدشہ بھی ہے کہ اس بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا۔ ہر ملا کی خواہش ہوگی کہ ہر وقت اسی کے 'ارشادات' نشر ہوتے رہیں دوسروں کے ارشادات کیوں نشر ہوں؟ ایسا ٹی وی بن جائے گا تو ایک طرفہ تماشا ہوگا۔ جس عمارت کی بنیاد ہی نفرت پر استوار ہوگی وہ بھلا کاہے کو استوار ہوگی "خشت اول چوں نہد معمار کج۔ تا ثریا می رود دیوار کج"۔

جماعت کے وصیت کے نظام کے بارے میں ایک منافق نے ایک بار پھبتی کہی کہ جماعت اب تک تیس ہزار سے زیادہ موصی پیدا نہیں کر سکی۔ ہم نے کہا درست۔ تم کوئی ایک ہی ایسا نظام ہمیں بتا دو جس میں ایک موصی موجود ہو جس نے مستقلاً اپنے وسائل کو ایسی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہو۔ وہ

صاحب اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔

میرا مرشد

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی بانئ سلسلہ احمدیہ کے جدِ امجد مرزا ہادی بیگ صاحب وسطی ایشیا کے ایک معزز ایرانی نژاد فارسی گو حکمراں خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے اور سبز شہر (سمرقند) کے حاکم تھے تیمور نے انہیں جلاوطن ہونے پر مجبور کیا تو وہ مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے وقت میں 1530 کے قریب ہجرت کر کے اپنے اہل خانہ اور کوئی دوسو کے قریب سپاہیوں کے ساتھ ہندوستان میں وارد ہوئے اور پنجاب کے اس علاقہ میں آباد ہوئے جسے بعد میں برطانوی نظامِ مالداری کے تحت گورداسپور کے ضلع کا نام دیا گیا اور ایک وسیع رقبہ زمین پر اپنی ملکیت قائم کر کے ایک بستی آباد کی جسے اسلام پور کے نام سے موسوم کیا اور دستورِ زمانہ کے مطابق اس بستی کے گرداگرد ایک بیس فٹ اونچی اور اٹھارہ فٹ چوڑی فصیل بھی تعمیر کی جس کے آثار انیسویں صدی کے اواخر تک موجود تھے۔ وسطی ایشیا کے ایک معزز شاہی خاندان کا فرد اور ذی علم آدمی ہونے کی بنا پر دہلی کے حکمران مغلوں کی جانب سے مرزا ہادی بیگ کو عدالت کے فرائض سپرد کئے گئے۔ بدیں وجہ ان کی بستی عرصۂ دراز تک اسلام پور قاضی کے نام سے جانی جاتی رہی۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ نام مختصر ہوتے ہوتے صرف قاضیاں رہ گیا اور دوصدیوں کے بعد اب اس کا معروف نام قادیان ہے۔ مغلوں کے زمانہ میں اس خاندان کو سینکڑوں دیہات پر مالکانہ تصرف حاصل رہا۔ مرزا ہادی بیگ کی نویں پشت میں مرزا فیض محمد تھے جنہیں سلطنتِ مغلیہ کی جانب سے ہفت ہزاری کا اعزاز اور عضد الدولہ کا خطاب حاصل تھا۔ اس وقت اس تعلقہ کی سالانہ آمدنی آٹھ لاکھ روپے تھی۔ مرزا فیض محمد کے بعد ان کے صاحبزادے مرزا گل محمد خاندان کے سربراہ

بنے۔ یہ بہت نیک دل اور پارسا بزرگ تھے اور دہلی کی سلطنتِ مغلیہ سے نہایت قریبی تعلقات رکھتے تھے۔ ان کی علم دوستی کا یہ عالم تھا کہ ایک سو کے قریب علما و صلحا اور حفاظِ قرآن ان سے وابستہ تھے جنہیں ان کے دربار سے وظیفے عطا کئے جاتے تھے اور اس طرح ان کے ماحول میں قال اللہ و قال الرسول کا چرچا رہتا تھا۔ ان کے ملازمین اور متعلقین میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو تارکِ نماز ہو حتیٰ کہ ان کے ہاں چکی پیسنے والی عورتیں تک نمازِ پنجگانہ کی پابند اور تہجد گزار تھیں۔ مرزا گل محمد 1800 میں فوت ہوئے۔ یہ بانیء سلسلہ احمدیہ کے............دادا تھے۔ ان کے بعد مرزا عطاء محمد خاندان کے سربراہ بنے۔ اس وقت مغلیہ سلطنت کا انتزاع شروع ہو چکا تھا اور پنجاب میں سکھوں کی طاقت بڑھ رہی تھی حتیٰ کہ 1802 میں سکھوں نے اس بستی پر حلہ بول دیا اور قادیان کے رئیسوں کی جائیدادوں کتب خانوں اور مساجد کو نذرِ آتش کر دیا اور انہیں قیدی بنا لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کو رہائی ملی تو یہ لوگ ہجرت کر کے دریائے بیاس کے پار ریاست کپورتھلہ میں واقع بھاگووال نامی جگہ میں پناہ گزین ہوئے اور کوئی پندرہ سال کا عرصہ عملاً مہاجرت میں بسر کیا۔

1814 میں مرزا عطا محمد کا انتقال مہاجرت کی حالت میں ہوا۔ ان کے اولوالعزم صاحبزادے مرزا غلام مرتضیٰ ان کی نعش کو نہایت حوصلہ شکن حالات کے باوجود قادیان لائے اور انہیں اپنے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کیا انہی مرزا غلام مرتضیٰ نے ان کی جانشینی کی مسند سنبھالی۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی سلطنت کی وحدت کو مستحکم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو مرزا غلام مرتضیٰ کو واپس قادیان آنے کی اجازت ملی۔ اس احسان کے اعتراف میں مرزا غلام مرتضیٰ اس کی فوج میں شامل ہو گئے اور کئی معرکوں میں اس کے شانہ بشانہ لڑتے رہے۔ مہاراجہ نے ان کی شجاعت کے صلہ میں ان کی خاندانی جائیداد میں سے پانچ دیہات انہیں واگذار کر دئے۔

1839 میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انتقال کے ساتھ ہی سکھ سلطنت بکھرنے لگی۔ انگریزوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور پنجاب پر اپنا تسلط قائم کرلیا۔ امن جمی ہونے کے بعد انگریزوں نے مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کی قادیان اور اردگرد کے کچھ گاؤں پر ملکیت تو تسلیم کر لی مگر باقی کے پانچ گاؤں انہیں نہیں لوٹائے۔ ہاں اشک شوئی کے لئے انہیں سات سو روپے سالانہ کا گزارہ دار بنا دیا۔ المختصر بانیٔ سلسلہ احمدیہ کی پیدائش یعنی 13 فروری 1835 تک ماضی کی دنیاوی شان وشوکت اور خاندان کی رئیسانہ شان اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ مرزا صاحب کی پیدائش سے کچھ عرصہ قبل خاندان کی گذر بسر کشائش سے ہونے لگی تھی مگر مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کے کل جائیداد کی حسرتِ بازیافت کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے اور انگریزی عمل داری کے بعد ان کی اوقات محض گزارہ دار کی رہ گئی۔ مرزا غلام مرتضیٰ جو انگریز گورنر جنرل کے دربار میں بزمراۂ کرسی نشیناں بلائے جاتے تھے تقریباً پچاسی برس کی عمر پا کر اپنی آبائی جائیداد سے محرومی کا داغ سینے پر لئے جون 1876ء میں راہیِ عدم ہوئے اور اپنی وصیت کے مطابق اپنی تعمیر کردہ مسجد میں جو اب مسجدِ اقصیٰ کے نام سے موسوم ہے دفن ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد دستورِ مروجہ کے مطابق بانیٔ سلسلہ کے بڑے بھائی مرزا غلام قادر خاندان کے رئیس بنائے گئے۔ بہ نظرِ ظاہر مرزا غلام احمد بھائی کے دستِ نگر ہو گئے مگر ان کی بعد کی زندگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ آپ نے صبر و توکل اور قناعت و طمانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ بعد کی زندگی میں جب ان کے ہاتھ پر خدا کا قائم کردہ سلسلۂ عالیہ بن گیا تو آپ نے ایک عربی شعر میں یہ بات کہی کہ 'لفاظاتُ الموائدِ کان اکلی۔ فصِرتُ الیومَ مطعامَ الاہالیٰ'۔ کہ ایک وقت تھا کہ میری گذر بسر دسترخوان کے بچے ہوئے ٹکڑوں پر تھی اب یہ عالم ہے کہ خاندانوں کے خاندان میرے دسترخوان سے تمتع کرتے ہیں۔ مرزا غلام قادر صاحب کو سلسلۂ عالیہ میں شامل ہونے کی توفیق نہ ملی۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے

انہوں نے مرزا غلام احمد صاحب کے بڑے بیٹے مرزا سلطان احمد کو اپنا متبنیٰ کر لیا تھا اور وہی ان کی وفات پر ان کی جائیداد کے اور روایتی خاندانی سربراہی کے وارث بنے۔

مرزا غلام احمد محترمہ چراغ بی بی کے بطنِ مبارک سے 13 فروری 1835 کو بروزِ جمعہ طلوعِ فجر کے وقت توام تولد ہوئے۔ ان کے ساتھ توام پیدا ہونے والی لڑکی تھی جو بچپن ہی میں فوت ہو گئی۔ مرزا صاحب پانچ بہن بھائی تھے جن میں مرزا صاحب اپنے ماں باپ کی سب سے چھوٹی اولاد تھے۔ آپ طبعاً متین سنجیدہ اور گوشہ نشین تھے۔ بچپن ہی سے لہو ولعب سے انہیں پرہیز تھا۔ ان کی تعلیم رسمِ زمانہ کے مطابق گھر پر ہی ہوئی جہاں انہیں تعلیم دینے کے لئے ایک فارسی دان معلم کو ملازم رکھا گیا۔ اس استاد نے انہیں قرآن شریف اور فارسی کی بعض متداول کتابیں پڑھائیں۔ دس برس کے ہوئے تو ایک عربی داں استاد ان کی تربیت پر مقرر کئے گئے جنہوں نے عربی زبان کے سیکھنے کے لئے انہیں صرف ونحو کے بعض اسباق دیئے۔ سنِ بلوغ تک پہنچے تو ایک اور استاد ان کے لئے ملازم رکھے گئے جن کا کام انہیں منطق، حکمت اور علومِ مروجہ کی تعلیم دینا تھا۔ آپ نے اپنے والد سے جو خود ایک طبیبِ حاذق تھے حکمت کی تعلیم بھی حاصل کی۔ دستورِ زمانہ کے مطابق ان کا مکتب گھر پر ہی قائم کیا گیا تھا مگر قادیان کے دیگر بچے بھی اس مکتب سے فیض یاب ہونے کے لئے اس مکتب میں آتے تھے۔ آپ اپنی طبیعت کے مطابق دوسرے بچوں کے ساتھ بے تکلف نہیں ہوتے تھے ہاں اعتدال کے ساتھ ورزشی کھیلوں اور تفریح میں ضرور شریک ہوتے تھے۔ بچپن میں آپ نے تیرنا سیکھا اور گھڑسواری کی مشق بھی بہم پہنچائی مگر آپ کی دلپسند ورزش پیدل چلنا تھا اور یہ عادت مدت العمر قائم رہی۔ آپ خاصی تیز قدمی سے چلتے تھے۔ ان کے استاد کو کسی مجبوری کے تحت قادیان سے بٹالہ آنا پڑا تو آپ بھی تکمیلِ تعلیم کی خاطر بٹالہ میں مقیم ہو گئے جہاں ان کے آبائی مکانات میں سے ایک بڑی حویلی کو ان کا مکتب بنا دیا گیا۔ اس مکتب

میں ان کے ہم جماعت مولوی محمد حسین بٹالوی اور لالہ بھیم سین تھے۔مولوی محمد حسین بٹالوی نے مرزا صاحب کے دعویٰ مسیحیت سے قبل تک ان کے ساتھ دوستانہ تعلق استوار رکھا۔ براہینِ احمدیہ کی تالیف کے بعد اس پر شاندار ریویو بھی مولوی محمد حسین بٹالوی ہی نے لکھا بعد کو مولوی محمد حسین بٹالوی نے مخالفت پر کمر باندھی اوراس میں بھی کمال کو پہنچے مگر مرزا صاحب کا بال بیکا نہ کر سکے۔

اوائل جوانی ہی میں آپ کی شادی خاندان کی ایک لڑکی حرمت بی بی سے کر دی گئی جو رشتہ میں ان کے ماموں کی بیٹی تھیں اس شادی سے مرزا صاحب کے دو بیٹے ہوئے مرزا سلطان احمد (1853) اور مرزا فضل احمد (1855)۔ان کی شادی میں کوئی لا یعنی رسم ہوئی نہ کوئی روایتی دھوم دھڑ کا دیکھنے میں آیا حالانکہ ان کے بڑے بھائی کی شادی پر اربابِ نشاط کے 22 طائفے جمع ہوئے تھے۔ان کی شادی میں انتہائی سادگی اور اسلامی روایات ملحوظ رکھی گئیں اور کسی قسم کی کوئی خلافِ شریعت بدعت نہ ہوئی۔ دونوں بھائیوں کی شادی کی تقریبات ہی دونوں بھائیوں کی طبائع کے تفاوت کو واضح کرنے کو کافی ہیں۔

مرزا صاحب کی شادی بھی انہیں ان کے عباداتی مشاغل سے غافل نہ کر سکی ان کی خلوت پسندی قائم رہی۔تنہا ہوتے تو عبادت اور استغفار میں مشغول رہتے۔ان کے والد محترم انہیں ”مسیتڑ“ یعنی مسجد کا ہو رہنے والا کہا کرتے تھے۔انہیں بجا طور سے ان کے مستقبل کی فکر تھی کہ آبائی جائیداد تو رہی نہیں یہ شخص جو کمانے دھانے کی فکر نہیں کرتا بچوں کو روٹی کیسے کما کر کھلائے گا؟ اسی سلسلہ میں ایک بار والد صاحب نے ملازمت پر اصرار فرمایا تو آپ نے بڑے ادب سے جواب دیا کہ مجھے جس کا ملازم ہونا تھا ہو چکا ہوں! وہ زمانہ اسلام اور حامیانِ اسلام کے لئے بڑا نازک زمانہ تھا۔انگریزی عملداری کے مستحکم ہوتے ہی عیسائیوں کی بن آئی تھی اور وہ اسلام پر پے در پے اعتراضات کرتے چلے جاتے

تھے اور بانیٔ اسلام کی ذات پر بے جا اور لغو اعتراضات کی بھر مار تھی۔ مرزا صاحب کے دل میں اسلام اور بانیٔ اسلام کی وہ محبت ذات پر بے جا اور لغو اعتراضات کی بھر مار تھی۔ مرزا صاحب کے دل میں اسلام اور بانیٔ اسلام کی وہ محبت موجزن تھی کہ خود اپنے قول کے مطابق سترہ اٹھارہ برس کی عمر ہی سے وہ عیسائیوں کی کتابیں پڑھنے اور ان کے اعتراضوں کا جواب سوچنے لگے تھے جو اسلام اور بانیٔ اسلام کی ذات پر کئے جاتے تھے۔ اسلام کی حفاظت اور ناموسِ دینِ مصطفیٰ کے تحفظ کا انہیں اس درجہ احساس تھا کہ ان کی بعض راتیں سخت کرب اور بے چینی کی حالت میں گزرتی تھیں۔ مرزا صاحب نے ان اعتراضات کا جواب قرآنِ حکیم سے چاہا اور بصیرتِ غائر کتابِ الٰہی کا مطالعہ شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور اپنی جانب کھینچ لیا خود ان کا کہنا ہے کہ

لوگ کہتے ہیں کہ نالائق نہیں ہوتا قبول
میں تو نالائق بھی ہو کر پا گیا درگہ میں بار''!

قرآنِ حکیم کے مطالعہ اور اس کے مطالب پر غور کرنے میں آپ کو اس درجہ استغراق تھا کہ اس زمانہ کے دیکھنے والے گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے جب بھی انہیں دیکھا قرآن پڑھتے ہی دیکھا ان کے والد صاحب کو ان کی صحت اور ملازمت کی فکر کھائے جاتی تھی مگر انہیں عشقِ رسول اور عشقِ اسلام کی دھن لگی ہوئی تھی جو عمر بھر ان کے ساتھ رہی۔ مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے غم کہیں سو ہری رہی۔ آپ دوسرے صوفیا کی طرح اوراد و وظائف نہیں کرتے تھے مگر درود شریف کثرت سے پڑھتے تھے۔ نماز روزہ اور دیگر ارکانِ دین کی بجا آوری میں باقاعدگی تھی۔ تہجد ان کا معمول ہی نہیں گو یا ان کی زندگی تھی اور اس میں التزام اور باقاعدگی روا رکھتے تھے۔

ان کے والد مرزا غلام مرتضیٰ اپنے زمانہ کے بعض رؤسا کی طرح اپنے زمانہ کی انگریزی عدالتوں

میں مقدمات میں الجھے رہتے تھے اور اپنے بیٹے کو بھی اسی کام میں مصروف رکھنا یا دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ مرزا صاحب کو اپنے والد کے حکم کی تعمیل میں اکثر مقدمات کے سلسلہ میں باہر کی عدالتوں جانا پڑتا مگر آپ کا معمول تھا کہ باپ کی اطاعت تو ضرور کرتے مگر معاملاتِ مقدمہ میں کوئی دروغ یا نادرست بات روا نہ رکھتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ان کے مخالفین نے اپنے موقف کی تصدیق کے لئے خود انہیں کی گواہی رکھوادی اور مرزا صاحب نے راستی کی خاطر اپنے باپ کے موقف کے خلاف گواہی دے دی۔ ایک ایسے ہی مقدمہ میں جس میں ان کی گواہی کی وجہ سے فیصلہ ان کے والد کے خلاف ہو گیا تھا والد صاحب نے ناراض ہو کر انہیں گھر سے علیحدہ کر دیا اور آپ دو ماہ تک بٹالہ میں قیام فرما رہے۔ ان مقدمات کے سلسلہ میں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ بامر مجبوری واطاعتِ پدر بزرگوار چلے تو جاتے تھے مگر اپنا سارا وقت ذکرِ الٰہی اور نوافل میں گزارتے تھے۔ بیکار بیٹھنا اور لغویات میں مبتلا ہونا ان کی طبیعت ہی کے خلاف تھا۔ ایک مقدمہ میں عدالت سے آواز ایسے وقت میں پڑی جب آپ نماز میں مصروف تھے۔ فریقِ مخالف نے ان کے پیش نہ ہونے سے فائدہ اٹھانا چاہا مگر حاکم نے ان کے حق میں ڈگری جاری کر دی۔ راست گفتاری، عبادت میں مصروفیت انہیں پسند اور غیر ضروری باتوں میں وقت ضائع کرنے کی عادت انہیں ناپسند تھی اور جب تک اپنے والدِ گرامی کے ارشاد کی تعمیل میں مقدماتِ دنیوی میں مبتلا رہے اپنے اس عمل پر ثابت قدم رہے۔

اتنی محنت اور خلوت گزینی کو ان کی صحت پر اثر انداز ہونا ہی تھا چنانچہ تئیس برس کی عمر میں ہی سر کے بال سفید ہونے لگے۔ دورانِ سر اور ذیابیطس کے مرض لاحق ہو گئے مگر ان کے مشاغلِ دینی میں کوئی فرق نہ آیا۔ خوراک کے معاملہ میں بھی آپ بے پروا تھے جو ملا جیسا ملا کھا لیا۔ بھنے ہوئے چنوں پر اکتفا کرنا تو معمولات میں شامل تھا۔

1864 یا 1865 میں آپ کو عنفوانِ شباب کے عالم میں سرتاجِ مدینہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے مبارک کی زیارت کا شرف خواب میں حاصل ہوا۔مرزا صاحب کا کہنا ہے کہ آپ کی محبت نے مجھے فریفتہ کرلیا اور حضور کے حسین وجمیل چہرہ نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا! اس مبارک رویا کے بعد عشقِ رسول ہی ان کی زندگی کا محور بن گیا۔

1864 میں ان کے والدِ گرامی نے بزعمِ خود اپنے بیٹے کی ہمدردی میں انہیں سیالکوٹ میں متفرقات کی اسامی پر ملازم کروادیا۔آپ نے باپ کی خوشنودی کی خاطر زرہ امتثالِ امر یہ ملازمت کرتو لی مگر اس کو ایک قید خانہ ہی سمجھتے رہے۔کچہری کا کام کچہری پر کرتے اور باقی وقت ذکرِ الٰہی اور تلاوتِ قرآنِ پاک میں بسر کرتے۔شب بیداری ان کا معمول اور تبلیغِ اسلام ان کا دستور تھا قرآنِ حکیم کے مطالب پر غور وفکر کرنا ان کی غذا تھی۔اس ملازمت کے صلہ میں آپ کو جو معاوضہ ملتا اس میں سے قلیل سا حصہ اپنی ضروریات کے لئے رکھ کے باقی حصہ غربا اور مساکین میں تقسیم کردیتے۔ان کی نیکی اور پارسائی اور پاکیزہ زندگی کی گواہی وہ لوگ بھی دیتے ہیں جو مسلمان نہیں تھے اور وہ لوگ بھی جو ان سے عقیدہ کا اختلاف رکھتے تھے۔مولوی ظفرعلی خاں کے والد مولوی سراج الدین کا بیان ہے کہ مرزا صاحب ضلع سیالکوٹ میں محرر تھے اور ہم چشم دید شہادت سے کہہ سکتے ہیں کہ جوانی میں نہایت صالح اور متقی بزرگ تھے۔کاروبارِ ملازمت کے بعد ان کا تمام وقت مطالعہ دینیات میں صرف ہوتا تھا اور عوام سے کم ملتے تھے! مولانا سید میر حسن کا کہنا ہے کہ افسوس ہم نے ان کی قدر نہ کی۔ان کے کمالاتِ روحانی کو بیان نہیں کرسکتا۔ان کی زندگی معمولی انسان کی زندگی نہ تھی بلکہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو خدا تعالیٰ کے خاص بندے ہوتے ہیں اور دنیا میں کبھی کبھی آتے ہیں!

برطانوی عملداری میں پنجاب کا ضلع سیالکوٹ خاص طور سے عیسائیوں کی زد پر تھا اور اب بھی اس

ضلع میں اپنے تناسب کے لحاظ سے عیسائیوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔مرزا صاحب اسلام کی حقانیت کی خاطر عیسائیوں سے ہر دم مناظرہ اور بحث مباحثہ کے لئے تیار رہتے تھے عیسائی منادوں سے ان کے مباحثے ہوتے رہتے تھے۔سکاچ مشن کے فاضل پادری بٹلر سے مرزا صاحب کے خوب خوب مباحثے رہے۔ پادری بٹلر پڑھے لکھے آدمی تھے اس لئے مرزا صاحب کے علم وفضل کے معترف تھے حتیٰ کہ جب ان کی وطن مراجعت کا وقت آیا تو خاص طور سے مرزا صاحب سے الوداعی ملاقات کے لئے آئے اور وہیں اس دفتر میں پہنچ گئے جس دفتر میں مرزا صاحب کام کرتے تھے۔مرزا صاحب کی باتوں میں موہنی تھی۔مخالف بھی ان سے گفتگو کر کے اطمینان محسوس کرتے تھے۔

مرزا صاحب 1868 میں والد صاحب کے حکم پر ملازمت سے مستعفی ہو کر سیالکوٹ سے واپس تشریف لے گئے اور اس آزمائش سے نجات پائی کیونکہ ان کے اپنے قول کے مطابق آپ نے وہ تمام ایام سخت کراہت اور درد کے ساتھ بسر کئے! آپ اس روز قادیان واپس پہنچے جس روز ان کی والدہ محترمہ کا انتقال ہوا۔آپ کو اپنی والدہ محترمہ سے از حد پیار تھا ان کی وفات کے بعد جب بھی ان کا ذکر کرتے آنکھیں نم ہو جاتیں۔والدہ کو بھی اپنے اس بیٹے سے جسے دوسرے استخفاف سے ''ملاں'' کہتے تھے بہت پیار تھا اور وہ ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھیں۔ویسے بھی خاندان کے سربراہ کی زوجہ ہونے کے ناطے بڑی دور اندیش اور معاملہ فہم تھیں عالی ہمتی، ہمدردی، غمگساری اور غریب پروری میں اپنی مثال آپ تھیں۔قناعت، عفت اور مروت آپ کے خاص اوصاف تھے۔آپ آئمہ ضلع ہوشیار پور کے ایک معزز مغل خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔والدہ کی وفات کے بعد مرزا صاحب کی عام ضروریات کا خیال رکھنے والا بظاہر کوئی نہ رہا۔

قادیان واپس آجانے کے کچھ عرصہ بعد انہیں ریاست کپورتھلہ سے تعلیم کے محکمہ کی افسری کی

پیشکش ہوئی مگر آپ نے والد صاحب قبلہ سے عرض کیا کہ میں کوئی نوکری کرنا نہیں چاہتا۔ دو جوڑے گاڑھے کے اور جیسی روٹی میسر ہو بھیج دیا کریں! چنانچہ ان کے والد گرامی طوعاً کرہاً اس بات پر راضی ہو گئے اور اپنے ایک ساتھی سے رقت بھری آواز میں کہا میاں غلام نبی میں خوش تو اسی پر ہوں۔ سچی راہ تو یہی ہے جس پر یہ چل رہا ہے! اسی سال آپ نے اپنے والد محترم کی خدمت میں ایک عریضہ بھی لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مجھے آلائشِ دنیاوی سے کلی کنارہ کش ہو کر یادِ الٰہی میں زندگی بسر کرنے کی اجازت دی جائے۔

1868 یا 1869 ہی کا واقعہ ہے کہ مولوی محمد حسین بٹالوی تحصیلِ علم کے بعد دہلی سے واپس آئے تو اہلحدیث کے خلاف جو شورش برپا تھی وہ بٹالہ بھی پہنچ گئی۔ اتفاق سے مرزا صاحب بٹالہ میں تھے ایک صاحب انہیں کشاں کشاں مناظرہ کے لئے مولوی محمد حسین کے ہاں لے گئے۔ مرزا صاحب نے ان سے پوچھا آپ کا دعویٰ کیا ہے؟ مولوی صاحب نے کہا قرآن ان سب سے مقدم ہے۔ اس کے بعد اقوالِ رسول کا درجہ ہے۔ کتاب اللہ اور احادیثِ رسول کے مقابل کسی انسان کی بات قابلِ حجت نہیں! مرزا صاحب نے کہا آپ کا یہ اعتقاد معقول اور نا قابلِ اعتراض ہے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ لوگوں نے شور مچا دیا ہار گئے ہار گئے۔ جو شخص آپ کو ساتھ لے کر گیا تھا وہ سخت طیش میں آیا کہ آپ نے ہمیں ذلیل و رسوا کر دیا مگر مرزا صاحب یہی کہتے رہے کہ کیا میں یہ کہوں کہ امت کے کسی فرد کا قول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول پر مقدم ہے؟ زجر و توبیخ کے باوجود صدق مقالی پر ثابت قدم رہنے کے اس واقعہ کے بعد آپ کو الہام ہوا

" تیرا خدا تیرے اس فعل سے راضی ہوا۔ اور وہ تجھے بہت برکت دے گا یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے!"

یہ الہام مرزا صاحب کے ابتدائی الہامات میں سے ایک ہے۔

ملازمت کے جھنجھٹ سے فارغ ہوئے تو آپ کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ آپ کو قلم کے ذریعہ جہاد کا آغاز کرنا چاہیئے چنانچہ آپ نے مختلف اخبارات میں مختلف دینی موضوعات پر مضامین لکھنا شروع کئے اللہ تعالیٰ نے جو قدرتِ بیان انہیں عطا فرمائی تھی وہ اسلام کی خدمت کے لئے وقف ہو گئی اور لوگ ان کے مضامین کو ذوق وشوق سے پڑھنے لگے۔ ان کے موضوعات خالصتہً دینی موضوعات ہوتے تھے۔ پہلا مضمون بنگلور کے رسالہ ''منشورِ محمدی'' مورخہ 25 اگست 1872 میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں آپ نے اپنے بیس سالہ تجربہ کی بنا پر یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ تمام انسانی معاملات اور تعلقات کی اساس صدق وصفا اور سچائی ہے اس لئے ایک سچے مذہب کی نشانی بھی یہی ٹھہرتی ہے کہ اس نے اپنے متبعین کو کہاں تک اور کس طور سے سچائی پر کاربند ہونے کی تعلیم دی ہے۔ آپ نے اس کے ثبوت میں یہ کہا کہ میں اسلام کی تعلیمات سے سچائی کے بارے میں پیش کردہ تعلیمات نکال کر دکھاتا ہوں کسی دیگر مذہب کا کوئی بھی پیروکار عیسائی ہو یا ہندو، آریہ سماج سے متعلق ہو یا برہموسماج سے اپنے مذہب کی تعلیمات میں سے سچائی کے موضوع پر اتنی ہی بلکہ اس کے نصف کے قریب ہی تعلیمات نکال کر پیش کرے تو آپ اسے پانچ سو روپیہ انعام دیں گے۔ اور یہ پانچ سو روپیہ آج سے ایک سو تیس برس قبل کا پانچ سو روپیہ تھا۔ ہر چند کہ یہ بڑا ہی آسان چیلنج تھا مگر کسی کو جرات نہ ہوئی کہ اسلام کے مقابلہ پر اپنے دین کی تعلیمات میں سے ایسی تعلیمات کو یکجا کر کے پیش کرسکتا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے پرچوں نے بھی مرزا صاحب سے مضامین طلب کرنا شروع کر دئے۔ چنانچہ ملک کے دوسرے حصوں کے اخبارات میں آپ کے مضامین کا چرچا ہونے لگا اور مرزا صاحب اسلام اور بانیء اسلام کے دفاع کے علمبردار سمجھے جانے لگے۔ کسی مذہب اور حلقہ کی طرف سے کہیں اسلام پر کوئی اعتراض ہوتا تو جواب

کے لئے سب کی نگاہیں ان کی جانب اُٹھتیں۔

اس دور میں مرزا صاحب کی زندگی انتہائی اہم موڑ پر تھی۔ خلوت میں رہنا اور عبادات میں مشغول رہنا ہی انہیں مرغوب تھا۔ مسجد میں جا کر نمازیں پڑھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کے والد کے ایک غریب قرابت دار جاننے والے کا بیان ہے کہ میں سمجھتا تھا مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کا ایک ہی بیٹا ہے مگر جب ان کے گھر میں ایک مرد کو یوں مسجد کی طرف سعی کرتے دیکھا تو معلوم ہوا ان کا ایک بیٹا اور بھی ہے اور اسے دنیا میں مسجد سے زیادہ کوئی جگہ مرغوب نہیں۔ چنانچہ انہوں نے ان کی خدمت پر کمر باندھ لی اور پھر انہی کے حجرے کے ہو کر رہ گئے۔ اس حجرہ میں ایک چارپائی تھی اور ایک تخت پوش۔ مرزا صاحب تخت پوش پر سوتے تھے چارپائی ان کے استعمال کے لئے مختص کر دی۔ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا ہو گیا۔ ان کا کہنا ہے مرزا صاحب کو سوائے عبادت کے کسی چیز کا شغف نہیں تھا کھانے پینے اور نعمائے دنیوی سے بالکل بے نیاز تھے۔ ان دونوں کا کھانا گھر کے مطبخ سے آتا تھا۔ نابینا حافظ معین الدین عرف مانا بھی آپ کے خدمت گزار تھے ان کا کھانا بھی مرزا صاحب کے گھر کے عام باورچی خانہ سے آتا تھا جب مرزا صاحب کا کھانا آتا تو آپ انتظار کرتے کہ حافظ صاحب کا کھانا بھی آ جائے۔ آ جاتا تو دونوں سالن ملا لیتے پھر حافظ صاحب سے کہتے اب کھانا کھائیں۔ حافظ صاحب کے سیر ہونے کا انہیں اتنا خیال رہتا کہ اپنے حصہ کا کھانا بھی انہیں دے دیتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اپنے ساتھی کا کھانا بھی حافظ صاحب کو دے دیا اور خود اپنے لئے اور اپنے ساتھی کے لئے بھاڑ سے بھنے ہوئے چنے منگوا لئے۔ کھانا آہستہ آہستہ اور چبا چبا کر کھاتے اور باتیں بشاشت سے کرتے تھے۔

دن رات کے اس ساتھی یعنی مرزا محمد دین صاحب کا بیان ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد آپ سو جاتے اور نصف شب کے قریب اٹھ کر نفل پڑھنا شروع کر دیتے۔ اس کے بعد قرآن مجید کی تلاوت

کرتے اور فجر کی نماز تک تلاوت کرتے رہتے۔ روشنی کے لئے آپ مٹی کا دیا جلاتے تھے۔ اپنے ساتھی کو نماز کے لئے بیدار کرتے تو پانی کا ہلکا سا چھینٹا دے کر بیدار کرتے کہ یہ سنتِ نبوی ہے نماز فجر کے بعد تھوڑی دیر کے لئے سونا آپ کا معمول تھا۔

اسی دوران 1874 میں آپ نے کشفی نظارہ میں دیکھا کہ ایک فرشتہ ایک لڑکے کی صورت میں ایک اونچی جگہ پر بیٹھا ہے اس نے ایک نہایت چمکیلا اور پاکیزہ نان انہیں عطا کیا اور کہا یہ تیرے لئے اور تیرے ساتھ کے درویشوں کے لئے ہے! اس کشف میں درویشوں کی ایک جماعت عطا ہونے کے علاوہ رزق کی کشائش کی خوش خبری بھی تھی جو حرف بہ حرف پوری ہوئی اور ان کا لنگر خانہ آج دنیا کے ہر اس ملک میں جاری ہے جہاں جہاں آپ کی جماعت موجود ہے اور لاکھوں لوگ اس لنگر سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

آپ کے والد ماجد نے 1875 میں قادیان میں ایک جامع مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا حالانکہ انہی کے خاندان کے ایک بزرگ کا بیان ہے کہ قادیان میں تین آدمی دین کا ذوق رکھتے تھے۔ مرزا غلام احمد، مرزا کمال الدین اور میر عابد علی۔ باقی مسلمان آبادی کو دین سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ صرف مرزا غلام احمد باقاعدگی سے پنجوقتہ نماز کے لئے مسجد میں جاتے تھے اور بعض اوقات ان کے ساتھ جماعت میں شریک ہونے والا بھی کوئی نہیں ہوتا تھا مگر مرزا غلام مرتضیٰ صاحب نے سات سو روپے کے صرفہ سے ایک قطعہ زمین خریدا اور اس پر جامع مسجد کی بنیاد رکھ دی اور وصیت کی کہ مرنے کے بعد انہیں اسی مسجد کے صحن میں دفن کیا جائے تاکہ بعد از مرگ بھی اذان اور نماز کی آواز کانوں میں پڑتی رہے۔ خدائی تصرف یہ ہوا کہ ادھر مسجد کی عمارت بہمہ وجوہ مکمل ہوئی صرف فرش کی چند اینٹیں باقی تھیں کہ مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کا وقت موعود آ گیا اور وہ اسی مسجد کے صحن میں دفن ہوئے۔ راقم الحروف نے ان کا

مزارِ مبارک دیکھا ہوا ہے منارۃ المسیح کے عین ساتھ مسجد کے صحن میں ان کا مزار ہے جس کا تعویذ سنگ سفید سے بنایا گیا ہے۔

مرزا غلام مرتضیٰ وجیہہ وشکیل اور دراز قد بزرگ تھے جن کا رنگ گندمی تھا آنکھیں موٹی اور سرخ تھیں۔داڑھی لمبی تھی۔چہرے سے شاہی رعب وجلال ٹپکتا تھا۔ازبسکہ دو بارو مختلف حاکموں کی ماتحتی میں رہنا پڑا مگر زبان کو خوشامد اور تملق سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔عزت نفس اور خودداری کا از حد پاس رکھتے تھے۔ایک بار ایک سکھ راجہ نے جوان کے علاج سے صحت یاب ہو گیا تھا ان کی آبائی ریاست کے دو گاؤں ان کے معالجہ کے معاوضہ میں واپس لوٹانا چاہے تو آپ نے پائے حقارت سے ٹھکرا دیئے کہ میں علاج کے معاوضہ میں اپنے آبا و اجداد کی ریاست کے گم شدہ گاؤں لینا اپنے اور اپنی اولاد کے لئے باعثِ عار سمجھتا ہوں۔انگریزوں کی عملداری کے آغاز میں جب حاکم اپنی حاکمیت کا رعب قائم کرنے پر کمر بستہ تھے آپ انگریز حاکموں سے دب کر بات نہیں کرتے تھے۔آپ کی اولوالعزمی اور جواں مردی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے باپ کا انتقال غریب الوطنی میں ہوا مگر باپ کی نعش کو نامساعد حالات کے باوجود وطن میں واپس لائے اور آبائی قبرستان میں دفن کیا حالانکہ اس وقت ان کی عمر ابھی پندرہ یا سولہ برس کی تھی۔آپ نے طب کی تعلیم دہلی کے مشہور شریفی خاندان کے حکیم محمد شریف سے حاصل کی مگر طبابت کو پیشہ نہیں بنایا محض خدمتِ خلق کا وسیلہ رہنے دیا۔استغنا اور خودداری ان کی طبیعت میں تھی۔نیک نیت، صاف باطن اور خلقِ مجسم تھے۔غریب پروری ان کے خاندان کا خاصہ تھی۔اگرچہ عمر بھر دنیا کوشی میں مبتلا رہے مگر آخر عمر میں اپنی تہی دامنی کا بے حد احساس ہونے لگا تھا۔خود انہیں کا ایک شعر ہے:

کردیم   ناکردنی   ہمہ   عمر

اے وائے بما کہ ماچہ کردم

کہ میں عمر بھر ناکردنی امور میں مصروف رہا، مجھ پر افسوس کہ میں نے کیا کیا؟ شاید اسی احساس نے ان سے یہ عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی حالانکہ حالات زمانہ کے مطابق اس بستی میں کسی وسیع مسجد کی ضرورت تھی نہ حاجت۔

والد گرامی کی وفات آپ کے لئے بلاشبہ شدید صدمہ کا موجب تھی اور شاید کچھ گھبراہٹ بھی مرزا صاحب کو ہوئی ہو کہ اب معیشت کی کیا صورت پیش آئے گی مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرآن حکیم کی یہ آیت الہام ہوئی اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کہ کیا اللہ اپنے بندے کو کافی نہیں؟ اس الہام نے تمام ہموم و غموم دور کر دیئے۔ مرزا صاحب کا یہ الہام احمدی لوگ اپنی انگوٹھیوں میں کھدواتے ہیں کیونکہ مرزا صاحب نے خود ایسے کیا تھا اور اب اس قرآنی آیت والی انگوٹھی کو احمدیوں کا امتیازی نشان سمجھا جاتا ہے کوئی دوسرا مسلمان ایسی انگوٹھی نہیں پہنتا۔

اسی سال آپ کو جناب الٰہی سے جسمانی مجاہدہ کا اشارہ ہوا چنانچہ آپ نے قریباً آٹھ نو ماہ تک نفلی روزے رکھے۔ اس نفلی عبادت سے خود ان کے قول کے مطابق انہیں بہت سے روحانی حظوظ ولذائذ کا تجربہ حاصل ہوا۔ بہت سے پرانے انبیاء واولیاء سے کشفی طور پر ملاقات کا موقعہ ملا اور ایک بار عین بیداری کے عالم میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہل بیت کا دیدار نصیب ہوا۔ مرزا صاحب نے اپنے مریدوں کو علی الدوام ایسا مجاہدہ کرنے سے منع کیا ہے کیونکہ ان کا اپنا مجاہدہ محض ارشادِ ربانی کی تعمیل میں تھا۔

والد گرامی کی وفات کے بعد آپ پر تواتر سے الہامات و مکاشفات کا نزول ہونے لگا مگر اس دور کے ساتھ یہ آزمائش بھی انگیز کرنا پڑی جو آپ کے بڑے بھائی مرزا غلام قادر صاحب کی جانشینی کی

صورت میں آئی۔ از بسکہ والد کی وفات کے بعد دونوں بھائی جائیدادِ پدری میں برابر کے شریک تھے مگر دستورِ زمانہ کے مطابق بڑے بھائی کو جانشین ہونا تھا۔ ہوئے۔ ہر چند مرزا غلام قادر چھوٹے بھائی کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتے تھے مگر معیشت کے تمام تر وجوہ چونکہ ان سے وابستہ تھے اس لئے وہ چھوٹے بھائی کو ایک بوجھ خیال کرتے تھے۔ ان کا اکثر وقت ملازمت کے سلسلہ میں باہر گذرتا تھا اس لئے ان کے گھر کے لوگ چھوٹے بھائی کو ہر ممکن ایذا دے کر اور تنگی میں مبتلا کر کے خوشی اور اطمینان محسوس کرتے تھے۔ انہیں یہ چیز بھی گوارا نہیں تھی کہ کوئی چھوٹے بھائی کو ڈھنگ کی کھانے کی کوئی چیز ہی پہنچا دے۔ سات برس کا یہ دور خاصے ابتلا میں گذرا مگر مرزا صاحب کے منہ سے اپنے بھائی یا بھاوجہ کے لئے کوئی کلمۂ درشت نہ نکلا۔

1877ء میں آپ نے اپنا ایک مضمون طباعت کے لئے امرتسر کے ایک پریس کو بھیجا۔ وہ پریس رلیارام نامی ایک عیسائی وکیل کا تھا۔ مسودہ کے ساتھ آپ نے پیکٹ میں ایک خط بھی رکھ دیا جس میں طباعت کے بارہ میں بعض ہدایات تھیں اور مضمون کو جلد چھاپنے کی تلقین تھی۔ پیکٹ رلیارام کو پہنچا تو اس کی شیطانی رگ پھڑک اٹھی کیونکہ کسی پیکٹ میں خط رکھنا ڈاک خانہ کے قواعد کی رو سے جرم تھا جس کی سزا پانچ سو روپیہ جرمانہ یا چھ ماہ قید تک ہوسکتی تھی۔ رلیارام نے محکمہ ڈاک والوں سے مل کر مرزا صاحب پر فوجداری مقدمہ دائر کر دیا۔ مرزا صاحب کے خلاف یہ پہلا مقدمہ تھا۔ آپ کے وکیل نے مشورہ دیا کہ اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ آپ نے وہ خط پیکٹ میں رکھا تھا صرف رلیارام کا بیان قابلِ اعتنا نہیں کہ وہ آپ سے عقیدہ کا اختلاف رکھتا ہے اس لئے آپ اپنے اظہار میں کہہ دیں کہ آپ نے مذکورہ خط پیکٹ میں نہیں رکھا۔ مرزا صاحب نے کہا یہ کیسے کہہ دوں؟ خط تو میں نے رکھا تھا۔ وکیل نے بہتیرا زور مارا کہ اعتراف کر لینے کی صورت میں ایک عزت دار خاندان پر فوجداری مقدمہ

میں سزایاب ہونے کا داغ لگ جائے گا آپ اپنی "سچائی" کی ضد چھوڑ دیں مگر مرزا صاحب ثابت قدم رہے۔حتیٰ کہ ان کے وکیل شیخ علی احمد صاحب نے ناچار کہہ دیا کہ اگر آپ میری بات نہیں مانتے تو میں آپ کی وکالت سے دستبردار ہوتا ہوں اور ہو گئے۔مقدمہ پیش ہوا تو انگریز مجسٹریٹ نے بیان قلمبند کرتے ہوئے پوچھا کیا یہ آپ کا فرستادہ پیکٹ ہے اور یہ خط آپ نے ہی اس میں رکھا ہے؟ مرزا صاحب نے کہا' جناب یہ میرا ہی فرستادہ پیکٹ ہے اور خط بھی میرا ہی رکھا ہوا ہے مگر خط کے رکھنے میں محکمہ ڈاک کو نقصان پہنچانے کی نیت نہیں تھی اور یہ خط کوئی نجی خط ہے بھی نہیں مضمون سے ہی متعلق ہے!' استغاثہ والوں نے بہتیرا زور مارا اور محکمہ ڈاک والوں نے لمبی چوڑی بحثیں کیں مگر انگریز مجسٹریٹ پر اللہ کے فضل سے مرزا صاحب کی صدق بیانی کا ایسا اچھا اثر ہو چکا تھا کہ ان کی ایک پیش نہ گئی اور مجسٹریٹ نے مقدمہ خارج کر کے مرزا صاحب کو بری کر دیا۔ان کے وکیل کو جو اپنے سابق مؤکل کے سزایاب ہونے کا پورا وثوق رکھتے تھے مرزا صاحب کے بری ہو جانے کا علم ہوا تو بہت حیران ہوئے مگر راست بیانی بہر حال راست بیانی ہے جو اپنا اثر دکھاتی ہے۔بعد کی زندگی میں بھی مرزا صاحب کو بہت سے مقدمات کا سامنا ہوا جن میں ایک قتل کی سازش مجرمانہ کا مقدمہ بھی تھا مگر مرزا صاحب نے کبھی صدقِ مقالی کو چھوڑ کر دروغ بیانی کو اختیار نہیں کیا۔

1877 میں ہی ایک بار آپ حکیم میر حسام الدین کی معیت میں کچھ روز کے لئے سیالکوٹ تشریف لے گئے اور اپنے پرانے ہندو دوست لالہ بھیم سین کے ہاں قیام فرمایا۔اسی سال مشہور صحافی مولوی سراج الدین صاحب بانی اخبار زمیندار قادیان گئے اور مرزا صاحب کے مہمان ہوئے جس کا ذکر آپ نے 1908 میں مرزا صاحب کی وفات کے بعد اپنے اخبار میں کیا ۔"1877 میں ہمیں ایک شب قادیان میں آپ کے یہاں مہمانی کی عزت حاصل ہوئی۔ان دنوں آپ عبادت اور وظائف میں اس

قدر محو و مستغرق تھے کہ مہمانوں سے بھی بہت کم گفتگو کرتے تھے“۔

مولوی سراج الدین صاحب برصغیر پاک و ہند کے نامور صحافی اور شاعر اور جماعت کے سخت معاند مولانا ظفر علی خاں کے اور نامور ماہر تعلیم پروفیسر حمید احمد خاں کے والدِ بزرگوار تھے۔ اسی زمانہ میں مرزا صاحب نے ایک کتاب ”نعمت الباری“ لکھنے کی طرح ڈالی جس میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تذکرہ کرنا مقصود تھا فارسی اشعار میں اس کا ”خطبہ“ یعنی دیباچہ بھی لکھ لیا مگر ان کا کہنا ہے کہ میں نے قلم لے کر لکھنا شروع کیا تو یکا یک بارانِ رحمت کا نزول ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ بارش کا ہر قطرہ اللہ تعالیٰ کے بے انتہا فضل لے کر زمین پر اترتا ہے اس خیال کے آتے ہی میں نے قلم رکھ دیا کہ میں بھلا ربِ رحیم کے احسانات کو کیسے شمار کرسکتا ہوں؟" وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا۔" اس طرح یہ کتاب معرضِ تصنیف میں نہ آئی۔

اسلام کو عیسائیوں کے گونا گوں حملوں کا سامنا تو تھا ہی برصغیر کے مقامی ہندو باشندوں کی جانب سے انگریزی راج کے مستحکم اور مسلمانوں کے لمبے عہد حکومت کے ختم ہوتے ہی اپنی قدیم شان و شوکت حاصل کرنے اور رام راج قائم کرنے کے منصوبے شروع ہو گئے۔ اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ اسلام اور بانیء اسلام پر لغو اور بے جا اعتراضات کر کے عامت الناس کو اسلام کی تعلیمات سے بیزار کیا جائے۔ چنانچہ سوامی دیانند نے جنوری 1877 میں بمبئی کے مقام پر آریہ سماج نامی تحریک کی بنیاد رکھی جس کا اصل مقصد ہندوؤں کی عظمتِ رفتہ کو واپس حاصل کرنا تھا۔ اس تحریک کو پنجاب میں بڑی سرعت کے ساتھ کامیابی نصیب ہونے لگی اور لوگ جوق در جوق اس کی طرف مائل ہونے لگے۔ اس تحریک کا طریقہ یہ تھا کہ یہ لوگ ویدوں کی از کار رفتہ تعلیمات میں مغربی علوم کا اور جہاں ممکن ہوتا اسلام کی عمومی تعلیمات کا پیوند لگا کر لوگوں کو یہ باور کروانے کی کوشش کرتے کہ وید محض پرانے زمانہ کی بیکار

کتابیں نہیں بلکہ موجود زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ دینے والی کتابیں ہیں صرف ان کی جدید تفسیر کرنے کی ضرورت ہے۔ دیکھتے دیکھتے اس تحریک کا دائرہ پنجاب میں وسیع ہونا شروع ہوا۔ مرزا صاحب نے بھانپ لیا کہ یہ دراصل خدا کی توحید کے خلاف قائم کیا جانے والا محاذ ہے اور اس فتنہ کا فوری سد باب کیا جانا ضروری ہے چنانچہ آپ نے اپنے قلم کی ساری قوت آریہ سماج کے فتنہ کے استیصال کے لئے وقف کردی اور وہ فتنہ جو اتنی سرعت سے پھیلنا شروع ہوا تھا فوراً اتنا غیر معتبر ہوگیا کہ اس کے عہدیدار اپنے عقیدہ سے بیزار اور تائب ہونے لگے مگر اس تحریک کے پس پردہ آریہ سماج قائم کرنے کی جو سیاسی ریشہ دوانیاں تھیں وہ اپنی جگہ قائم رہیں۔ عیسائی اپنے جگہ دبک کر بیٹھے ہوئے تھے آریہ سماجی اپنی جگہ لاجواب ہوکر بغلیں جھانکنے لگے مرزا صاحب ہرگاہ انہیں بلاتے رہے مگر کوئی سامنے نہ آیا۔

آزمائش کے لئے کوئی نہ آیا ہر چند
ہر مخالف کو مقابل پہ بلایا ہم نے

مرزا صاحب نے آریہ سماج اور برہمو سماج کے اثر کو بے اثر بنا کر دراصل مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی ورنہ صدہا مسلمان آریہ سماج میں شامل ہو چکے تھے اور یہ سلسلہ روز افزوں تھا مگر ان کے بروقت سدِ باب نے ان تحریکات کا ڈنک نکال دیا۔

مشہور صحافی سید حبیب سابق مدیر سیاست نے اعتراف کیا کہ ’’مرزا صاحب کی کامیابی کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جب کہ جہالت مسلمانوں پر قابض تھی اور اسلام مسیحی اور آریہ مبلغین کے طعن و تشنیع کا مورد بنا ہوا تھا۔ مرزا صاحب نے اس حالت سے فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کی طرف سے سینہ سپر ہوکر اغیار کا مقابلہ کیا‘‘ اور مقابلہ بھی ایسا کیا کہ خود ان کے قول کے مطابق، دشمنوں کے دانت کھٹے کردئے!

1880 میں مرزا صاحب کی پہلی تصنیف ''براہینِ احمدیہ'' چھپ کر سامنے آئی۔اس کتاب میں مرزا صاحب نے تین سو دلائلِ عقلیہ ونقلیہ سے اسلام اور قرآنِ مجید اور نبوتِ محمدیہ کی صداقت ثابت کی ہے اور دیگر مذاہب کو رد کیا ہے۔اس کتاب کی اشاعت نے انہیں سارے ہندوستان میں شہرت دے دی۔ کتاب کا اسلوب عالمانہ ہے۔زبان کا لہجہ دقیق علمی لہجہ ہے۔اپنے مطالب ومحاسن کی وجہ سے یہ کتاب بہت جلد اسلامی لٹریچر کا عمدہ نمونہ سمجھی گئی اور اس کے مصنف کو اسلامی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔اس زمانہ کے بعض علما نے اس پر شاندار ریویو کئے مگر دستورِ زمانہ کے مطابق بعض مخالفین نے اس کتاب کی اشاعت پر مصنف کے خلاف فتویٰ ہائے کفر شائع کئے اور ان کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ ومقام کے بارے میں مبالغہ وغلو سے کام لیا ہے۔اور خود ملہم ہونے کا دعویٰ کر کے کفر کا ارتکاب کیا ہے۔اس کتاب کے پہلے دو حصے 1880 میں تیسرا حصہ 1882 میں اور چوتھا حصہ 1884 میں شائع ہوا۔ پانچواں حصہ ان کی وفات کے بعد چھپ کر سامنے آیا۔

مرزا صاحب کو ماموریت کا پہلا الہام 1882 میں ہوا (مگر آپ نے مامور اور مجدد ہونے کا دعویٰ 1885 میں کیا)۔اس الہام میں جو عربی کے ستر فقرات پر مشتمل ہے اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جو مرتبہ بھی عطا کرے گا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کی برکت سے ہوگا۔1882 ہی میں آپ کو بتایا گیا کہ لوگ دور دور سے آپ کے پاس آئیں گے حالانکہ اس وقت قادیان ایک کورہ تھا جس کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔پھر وہ رجوعِ خلائق ہوا کہ راستوں میں گڑھے پڑ گئے۔

17 نومبر 1884 کو آپ کا نکاح ثانی حضرت خواجہ میر دردؒ کے خانوادہ میں دہلی میں ہوا۔مولوی سید نذیر حسین محدث دہلوی نے اس نکاح کا اعلان کیا۔اس بیوی کے بطن سے دس اولادیں اللہ تعالیٰ

نے عطا فرمائیں جن میں سے پانچ نے لمبی عمر پائی۔ سب سے بڑے بیٹے حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد، خلیفۃ المسیح الاول حضرت حکیم مولوی نورالدین کی وفات پر 1914 میں ان کے خلیفہ ہوئے۔ 1965 میں ان کی وفات پر ان کے بڑے بیٹے حضرت مرزا ناصر احمدؒ نے تیسری خلافت کی ردا اوڑھی۔ چوتھے خلیفہ بھی خلیفہ ثانیؓ کے بیٹے حضرت مرزا طاہر احمدؒ تھے اور اب 2003 میں ان کے وصال کے بعد بانی سلسلہ عالیہ کے سب سے چھوٹے بیٹے حضرت مرزا شریف احمد کے پوتے حضرت مرزا مسرور احمد ایدہ اللہ تعالیٰ خلافتِ خامسہ کے منصب پر فائز اور فائز و کامران ہیں۔ اس طرح آپ کی نسل میں رشد کا سلسلہ جاری ہے۔

آپ نے پہلی بیعت 23 مارچ 1889 کو لدھیانہ میں قبول کی اور اس طرح جماعتِ احمدیہ کی بنیاد رکھی۔ 40 افراد نے باری باری بیعت کی پہلی بیعت کنندہ حضرت مولوی نورالدین صاحب تھے۔ 1890-91ء میں آپ نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔

بانئ سلسلہ احمدیہ نے 1891 میں پہلے سالانہ جلسہ کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ 27 دسمبر 1891 کو پہلے جلسہ میں 75 افراد شریک ہوئے۔ 1946 میں قادیان کے آخری سالانہ جلسے پر کم و بیش تینتیس ہزار افراد حاضر تھے۔ اور ربوہ میں ہونے والے سالانہ جلسہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد اڑھائی لاکھ سے متجاوز تھی۔ حکومت پاکستان نے 1984 سے بعد اب تک سالانہ جلسہ کے انعقاد کی اجازت نہیں دی اس لئے دنیا کے مختلف ممالک میں یہ جلسہ منعقد ہوتا ہے۔ یہ جلسہ جماعت احمدیہ کا اہم سالانہ اجتماع سمجھا جاتا ہے 1892 میں آپ سیالکوٹ تشریف لے گئے۔ اس شہر میں آپ نے ملازمت کے کچھ سال بسر کئے تھے اس لئے ہجومِ خلائق دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ لوگ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ شخص جس نے اپنی نوجوانی کا کچھ عرصہ ہمارے درمیان پاکیزگی اور نیکی سے گزارا ہے اب کیسا ہے۔ اس سفر کے

دوران ان کے بہت سے پرانے جاننے والوں نے آپ کی بیعت میں شمولیت کی جن میں علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد بھی شامل تھے۔ اقبال اور ان کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد صاحب اس وقت سے ہی اپنے کو بیعت میں شامل سمجھتے تھے اور 1913 تک ان کا جماعت کے ساتھ تعلق رہا گو بعد کو بعض سیاسی مصالح کی بنا پر اقبال بیعت سے الگ ہو گئے۔

انجیل کی پرانی پیشگوئیوں میں مذکور تھا کہ مہدیٔ موعود کے ظہور کے وقت چاند اور سورج کو ایک معینہ وقت میں گرہن لگے گا اور اس سے قبل کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مامور کے لئے یہ آسمانی نشان ظاہر ہوا ہو۔ چنانچہ 20 مارچ 1894 کو چاند گرہن اور 6 اپریل 1894 کو سورج گرہن ہوا اور دنیا نے اس کسوف وخسوف کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔

1895 میں مرزا صاحب نے اللہ تعالیٰ سے خبر پا کر اعلان کیا کہ مسیح ناصری فوت ہو چکے ہیں اور ان کا مدفن محلہ خانیار سرینگر میں موجود ہے۔ 1896 میں لاہور میں جلسہ اعظم مذاہب 26، 27 اور 28 دسمبر کو منعقد ہوا اس میں مرزا صاحب کا معرکتہ الآراء مضمون ''اسلامی اصول کی فلاسفی'' پڑھا گیا۔ یہ کتاب اب تک لاکھوں لوگوں کی ہدایت کا موجب ہو چکی ہے اور دنیا کی بڑی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے 6 مارچ 1897 کو پنڈت لیکھرام جو آریہ سماج کا بڑا دیدہ ور لیڈر تھا مرزا صاحب کی انذاری پیشگوئی کے مطابق ایک نامعلوم فرد کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اسی سال عیسائیوں میں سے پادری ہنری مارٹن کلارک نے مرزا صاحب پر قتل کی سازش کرنے کا مقدمہ امرتسر میں دائر کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے مرزا صاحب کی بریت کے سامان پیدا کئے اور دشمن خائب وخاسر رہا۔ ولیم مانیگو ڈگلس نے جو گورداسپور کے ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے 23 اگست 1897 کو انہیں اس الزام سے بری کر دیا۔ کیپٹن ڈگلس جو کرنل ڈگلس کے عہدے تک پہنچے بیسویں صدی کی چھٹی دہائی تک زندہ تھے اور اپنے ملنے

والوں کو مرزا صاحب کے مقدمہ کے بارہ میں بڑے فخر سے بتایا کرتے تھے انہوں نے مرزا صاحب کی جماعت کو سینکڑوں سے لاکھوں ہوتے دیکھا تھا اور اس کی گواہی دیا کرتے تھے۔

1901 میں سرکاری مردم شماری ہونے والی تھی اس لئے مرزا صاحب نے اپنی جماعت کے لئے فرقہ احمدیہ کا نام تجویز کیا اور احمدیوں نے اس کے مطابق اپنے نام رجسٹر کروائے۔

14 جولائی 1903 کو ان کے مرید صاحبزادہ سید عبداللطیف کو سنگسار کر کے شہید کر دیا گیا۔ اس پر مرزا صاحب نے کابل کی سرزمین کو انتباہ کیا کہ اے کابل کی سرزمین تو خدا کی نظروں سے گر گئی۔ اور دنیا آج تک اس سرزمین کی ذلت تباہی اور رسوائی کا مشاہدہ کرتی چلی آ رہی ہے۔

26 مئی 1908 کو مرزا صاحب نے لاہور میں انتقال کیا اور اگلے روز ان کی نعش کو قادیان میں دفن کیا گیا نمازِ جنازہ ان کے پہلے خلیفہ مولوی نورالدین بھیروی نے پڑھائی۔

ان کے صاحبزادے مرزا بشیر احمد صاحب کے قول کے مطابق مرزا صاحب " کا چہرہ کتابی تھا اور رنگ سفیدی مائل گندمی تھا اور خط و خال نہایت متناسب تھے۔ سر کے بال بہت ملائم اور سیدھے تھے مگر بالوں کے آخری حصے میں کسی قدر خوبصورت خم پڑتا تھا۔ داڑھی گھندار تھی مگر رخسار بالوں سے پاک تھے۔ قد درمیانہ تھا اور جسم خوب سڈول اور متناسب تھا اور ہاتھ پاؤں بھرے بھرے اور ہڈی فراخ اور مضبوط تھی۔ چلنے میں قدم تیزی سے اٹھتا تھا مگر یہ تیزی ناگوار نہیں معلوم ہوتی تھی۔ زبان بہت صاف تھی مگر کسی کسی لفظ میں کبھی کبھی خفیف سی لکنت پائی جاتی تھی۔ جو صرف ایک چوکس آدمی ہی محسوس کر سکتا تھا۔ پچھتر سال کی عمر پائی مگر کمر میں خم نہیں آیا۔

ادیب شہیر میر محمد اسمٰعیل دہلوی نے ان کے بارہ میں لکھا "میں نے آپ کو اس وقت دیکھا جب میں دو سال کا بچہ تھا پھر آپ میری آنکھوں سے اس وقت غائب ہوئے جب میں 27 سال کا جوان تھا

مگر میں خدا کی قسم کھا کر بیان کرتا ہوں کہ میں نے آپ سے بہتر، آپ سے زیادہ خلیق، آپ سے زیادہ نیک، آپ سے زیادہ بزرگ، آپ سے زیادہ اللہ اور رسولؐ کی محبت میں غرق، کوئی شخص نہیں دیکھا۔'' آپ اخلاق میں کامل تھے یعنی آپ نہایت رؤف رحیم شخص تھے۔ سخی تھے، مہمان نواز تھے، اشجع الناس تھے۔ ابتلاؤں کے وقت جب لوگوں کے دل بیٹھے جاتے تھے آپ شیر نر کی طرح آگے بڑھتے تھے۔ عفو، چشم پوشی، فیاضی، دیانت، خاکساری، صبر، شکر، استغناء، حیا، غضِ بصر، عفت، محنت، قناعت، وفاداری، بے تکلفی، سادگی، شفقت، ادب الٰہی، ادب رسولؐ و بزرگانِ دین، حلم، میانہ روی، ادائیگی حقوق، ایفائے عہد، چستی، ہمدردی، اشاعتِ دین، تربیت، غیرت، حسنِ معاشرت، مال کی نگہداشت و وقار، طہارت، زندہ دلی اور مزاح، غیرت، احسان، حفظِ مراتب، حسنِ ظنی، ہمت، اولو العزمی، خودداری، خوش روئی اور کشادہ پیشانی، کظمِ غیظ، کفِ ید و کفِ لسان، ایثار، معمور الاوقات ہونا، انتظام، اشاعتِ علم و معرفتِ خدا اور اس کے رسول کا عشق، کامل اتباعِ رسولؐ۔'' مختصراً یہ آپ کے اخلاق و عادات تھے۔ آپ میں ایک مقناطیسی جذب تھا ایک عجیب کشش تھی رعب تھا برکت تھی، موانست تھی، بات میں اثر تھا، دعائیں قبولیت تھی، خدام پروانہ وار حلقہ باندھ کر آپ کے پاس بیٹھتے تھے اور دلوں سے زنگ خود بخود دھلتا جاتا تھا۔''

تازہ بستیاں آباد

مہاجرت انسانی زندگی کا ہمیشہ سے حصہ رہی ہے کیونکہ انسان ایک ماحول یا ملک میں تنگی ترشی یا عدم استحکام کے آثار دیکھے تو نقلِ مکانی کر جاتا ہے۔ انسانی زندگی کا ارتقاء مہاجرت کی گونا گوں کیفیتوں کا مظہر رہا ہے اور ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت ایک عظیم مہاجرت وقوع میں آئی۔ اس ہجرت کو بیسویں

صدی کی سب سے بڑی ہجرت قرار دیا گیا کیونکہ لکھوکھا انسان اپنے پرکھوں کا وطن چھوڑ کر اپنے نئے وطن کی طرف چل پڑے وہ وطن جس کا خواب ان لوگوں نے دیکھا تھا امن، سکون، آشتی اور آزادی کا وطن۔ اس وطن تک پہنچنے میں بہت سی جانیں تلف ہوئیں۔ کچھ راہ میں کھیت رہے کچھ یہاں پہنچ کر غریب الوطنی کے آلام کا شکار ہوئے۔ میں 1990 میں دوسری بار مہاجرت کا شکار ہوا تو میں نے انگریزی میں ایک نظم کہی THE GENERATION GAP اس نظم کا اب تک اردو زبان میں ترجمہ نہیں ہوا مگر اس نظم نے بین الاقوامی ادبی حلقوں سے بہت تحسین وصول کی۔ اس انگریزی نظم کا عنوان تھا

دونسلوں کا بُعد

''نصف صدی پہلے،
میرے آباء واجداد نے،
آزادی اور اطمینان کی خاطر
اپنی خوابوں کی سرزمین کی طرف، مہاجرت اختیار کی۔
نصف صدی کے بعد
ان کی اولاد نے بھی مہاجرت کی،
مگر، ایسی سرزمین کی جانب
جو انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔''

یہ داستان پہلی مہاجرت کے بعد کی داستان ہے۔ ہم لوگ قادیان سے نکلے تو انفرادی طور پر جس

جس کے جہاں جہاں سینگ سمائے جا بیٹھا مگر جماعت کو تو بہر حال ایک مرکز درکار تھا۔ بنا بنایا مرکز کہاں سے آتا؟ جماعت کو ایسے خطۂ زمین کی ضرورت تھی جہاں وہ اپنا مرکز تعمیر کر کے اپنے مشن کو جاری رکھ سکے۔ ادھر قدرت مہربان تھی اس نے صدیوں سے ایک بے آباد خطہ اسی مقصد کے لئے مختص کر رکھا تھا۔ یہ بے آب و گیاہ خطہ زمین دریا کے کنارے ہونے کے باوجود روئیدگی سے عاری تھا ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے بعد کو مجھے بتایا کہ یہ علاقہ اتنا بے آباد اور خوفناک تھا کہ وہ لوگ دن میں بھی یہاں سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے اور موٹر کی رفتار تیز کر دیا کرتے تھے۔ شور سے بھرپور زمین اور کالے کالے پہاڑ، ایک ویران قبرستان۔ خوف کے سارے قرینے موجود تھے بہت سے لوگ اس قطعۂ زمین کو دریا سے پانی اٹھا کر یا زمین سے پانی نکال کر سیراب کرنے میں ناکامی کا اعلان کر چکے تھے اور لاکھوں روپیہ برباد کر چکے تھے۔ چنانچہ جماعت احمدیہ نے اس بے آب و گیاہ خطۂ زمین کو چنا تو اردگرد کے لوگوں نے یہی سوچا ہوگا کہ عجیب سر پھرے لوگ ہیں اس بنجر زمین کو لے کر کیا کریں گے؟ انہیں یہ علم نہیں تھا کہ یہ جماعت واقعی سر پھروں کی جماعت ہے ظاہری مشکلات اس جماعت کا راستہ نہیں روک سکتیں،

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد۔

ربوہ میں کچے مکانوں کی آبادی تھی لمبی لمبی قطار میں کچی اینٹوں سے بنے ہوئے مکان۔ انجمن کے دفاتر کا بھی یہی اسلوب تھا۔ تین چار لمبی بیرک نما عمارتیں تھی جنہیں چھوٹے چھوٹے کمروں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہم بچوں کو دفاتر کی طرف جانے کی اجازت نہیں تھی صرف ایک دو بار اباجی کو بلانے کے لئے جانا پڑا کیونکہ امی بہت بیمار تھیں۔ آخر اسی بیماری میں انہوں نے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی اور ربوہ کے بہشتی مقبرہ کے اولین آباد کاروں میں شمار ہوئیں۔ یہ 1951 کی بات ہے اس

وقت میں دسویں جماعت میں تھا اور چند مہینوں بعد میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ اسی لئے گھر کے اداس اور پریشان ماحول سے دور رکھنے کے لئے اباجی نے سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کروا دیا مگر ہمارا سارا وقت رحمانی صاحب کے ہاں پھوپھی صوفیہ مرحومہ کے ہاں گزرتا تھا۔ سردار مصباح الدین صاحب کے گھر والوں سے اور سردار نذر حسین صاحب بلوچ کی بیٹی آپا طیفی کے ساتھ قادیان سے تعلق تھا اس لئے ان لوگوں نے ماں کا غم بھلا دیا اور ہم امتحان دے کر ربوہ آ گئے۔ ربوہ کے ابتدائی دنوں کی آبادی خیموں میں تھی ہم نے خیمے نہیں دیکھے مگر ہمارے دوست عبدالسلام اختر صاحب نے خیموں کا ذکر اتنی تفصیل سے ہمارے سامنے کر رکھا تھا کہ ہمیں خیموں کی آبادی اپنی آنکھوں دیکھی بات لگتی تھی۔ اختر صاحب بتایا کرتے تھے کہ پہلی رات ہم لوگ خوف کے مارے سو بھی نہیں سکے۔ کچھ اجنبی جگہ کا خوف ویرانی کا ڈر کچھ گیدڑوں کی ہاؤ ہو۔ خیموں میں رہنا تو جماعت والوں کے لئے اچنبھے کی بات نہیں تھی کیونکہ خدام کے اجتماعات میں خیموں میں ہی رہنا پڑتا تھا۔ ہمیں تو یہ بات یاد ہے کہ حضرت صاحب کا قصر خلافت بھی کچا تھا اس کے ساتھ ایک کچی مسجد تھی اس میں حضرت صاحب نماز کے لئے تشریف لاتے اور جمعہ کا خطبہ دیا کرتے تھے۔ سخت گرمی کے دنوں میں بھی حضرت صاحب ظہر یا عصر کی نماز کے بعد مجلس عرفان کے لئے تشریف فرما ہوا کرتے تھے۔ ذہن میں ابھی تک وہ تصویر مستحضر ہے حضرت صاحب محراب میں تشریف رکھتے ہیں۔ ایک دو خادم پنکھا جھل رہے ہیں۔ حضرت صاحب کی قمیض پسینہ سے جسم پر چپک رہی ہے۔ ایک دو بار حضرت صاحب نے سر سے پگڑی بھی اتاری مگر ہمیں حضرت صاحب کا ٹوپی پہننا یاد نہیں۔ ربوہ میں بجلی تو بہت بعد میں آئی۔ اسی حالت میں گرمیاں بھی گزر جاتی تھیں سردیاں بھی۔ پھر ہمیں وہ قیامت بھی یاد ہے جب حضرت اماں جان کا انتقال ہوا۔ ہم نے کسی جنازہ کے ساتھ لمبے لمبے بانس پہلی بار بندھے ہوئے دیکھے۔ لوگ زار و قطار

روتے دیکھے۔ حضرت اماں جان کی وفات کی خبر ریڈیو سے تین بار نشر ہوئی۔ لفظ تک ذہن میں ہیں ''بڑے افسوس سے اطلاع دی جاتی ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی بیوہ اور امام جماعت احمدیہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کی والدہ محترمہ آج ربوے میں انتقال کر گئیں۔'' اس وقت ربوے کا لفظ سن کر بہت اچنبھا ہوا کیونکہ 'امالہ' کا مسئلہ نہیں پڑھا تھا۔ پڑھا بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا تھا جماعت کے اکثر مقرروں کو 'امالے' سے آج تک بے اعتنائی کرتے سن اور دیکھ رہے ہیں مگر ریڈیو والوں نے ایک ہی نشریہ میں امالے کا مسئلہ ذہن نشین کروا دیا۔ آبادی ریلوے لائن کے دونوں طرف تھی۔ ہم موجودہ دارالصدر والی طرف رہتے تھے اسے محلہ الف کہا جاتا تھا لائن کے پار بھی کوارٹروں کی قطاریں تھیں۔ چاچا جی بھامڑی صاحب اور ماجد شاہد ان کوارٹروں میں رہتے تھے گاڑی بھی دن میں شاید ایک ہی آتی تھی۔ صبح چھ بجے کے قریب اور شام کو چھ بجے کے قریب ہم لوگ چنیوٹ جاتے تو اسی گاڑی سے آتے جاتے تھے۔ گاؤں میں تھے تو اپنے گاؤں سے قاضیاں کے قصبہ تک پیدل ہی آتے جاتے تھے بس یہی چنیوٹ کے جتنا فاصلہ ہوگا مگر پیدل آنا جانا کھلتا نہیں تھا یہاں وہ ماحول نہیں تھا اس لئے صبح کے بھولے شام کو گھر لوٹتے تھے۔ پھر ابا جی نے نور الدین صاحب خوش نویس سے ایک پرانی ریلے سائیکل خریدی۔ منشی صاحب سائیکل رکھنے اور کتابت کرنے کے بارہ میں بہت نستعلیق تھے۔ مچھلی کا شکار کھیلنے کے شوقین تھے شاید اب بھی ہوں اس لئے کتابت سے فارغ ہوتے تو کیل کانٹے سے لیس ہو کر دریا پر پہنچ جاتے۔ یہ سائیکل ان کے حوصلوں کا ساتھ نہ دے سکی ہوگی اس لئے آپ نے بیچ دی ابا جی نے دفتر سے پیشگی لے کر یہ قیمتی سائیکل بیس روپے میں خریدی۔ ظاہر ہے ابا جی اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ سائیکل پر بیٹھنے سے تو رہے اس لئے سائیکل ہمارے چنیوٹ آنے جانے کے لئے خریدی گئی۔ ماجد شاہد جو ہم سے ایک کلاس آگے تھا اور جثہ میں ہم سے زیادہ توانا تھا ہمارا ساتھی قرار

پایا۔ ماجد سائیکل چلاتا ہم اطمینان سے کیرئیر پر بیٹھتے مگر دو دو سائیکل سواروں نے ایک ڈبل گئیر سسٹم ایجاد کرلیا۔ وہ یوں کہ دریا کی چڑھائی چڑھتے ہوئے پیچھے کیرئیر پر بیٹھا ہوا سوار پیچھے سے پیڈل چلاتا تھا اور گدی پر بیٹھا ہوا سوار بھی اس کے ساتھ ساتھ پیڈل چلاتا رہتا تھا اس طرح چڑھائی کا مرحلہ طے ہو جاتا تھا مگر یہ ڈبل گئیر اکثر سارا سارا راستہ ہی استعمال ہونے لگا تھا کہ ایک شخص کو سارا وقت سائیکل نہ چلانی پڑے۔ خاص طور پر جب ہوا تیز اور مخالف ہوتی تو یہ سسٹم بہت کارآمد رہتا۔ سڑک پر اکا دکا لاریاں چلتی تھیں وہ بھی گیس پلانٹ سے چلتی تھیں اکثر یوں ہوتا تھا کہ بسوں کا گیس پلانٹ دریا کی چڑھائی چڑھنے کے لئے مناسب قوت مہیا نہ کرسکتا تو بسوں کا انجن دم توڑ دیتا۔ تب سواریاں اتر کر دھکا لگاتیں اور انجن کی مدد کرتیں۔ خدا خدا کر کے چڑھائی ختم ہوتی تو سواریاں ہانپتی کانپتی بس میں سوار ہو جاتیں۔ (استاذی پروفیسر مبارک احمد انصاری نے یہ حصہ ملاحظہ فرمایا تو فرمایا کہ اس پلانٹ میں لکڑی کا کوئلہ جلایا جاتا تھا۔ کیمسٹری کے استاد ہیں ٹھیک ہی کہتے ہوں گے! ہم نے تو ادب کے ناطے لکڑی کے کوئلے کا ایک ہی مصرف سن رکھا ہے

''میں پاپن کچھ ایسی جلی کوئلہ بھیو نہ راکھ''۔

بسوں کے ڈرائیور ہم سائیکل سواروں پر بہت مہربان تھے کیونکہ بسا اوقات انہیں ہمارے دھکوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ سڑک چھوٹی سی تھی بمشکل ایک بس گزر سکتی تھی۔ اردگرد ریت کے انبار تھے اس لئے ہمیں سڑک سے اترنا پڑتا تو ہم سائیکلوں سے ہی اتر جاتے تھے کیونکہ ریت میں دھنس جانے کے بعد سائیکل کو کھینچنا مشکل کیا ناممکن ہو جاتا تھا۔ ٹرک اس زمانہ میں بہت شاذ ہی نظر آتے تھے بار برداری کے لئے تانگے یا گھوڑے کام میں لائے جاتے تھے۔ ربوہ کے سبزی بیچنے والے چنیوٹ سے سبزی لاتے اور انہیں تانگوں پر لایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں گدھا بھی بار برداری کے لئے عام

استعمال ہوتا تھا۔آج کل تو صرف اینٹیں ڈھونے کے لئے یا ریڑھا کھینچنے کے لئے استعمال میں آتا ہے۔ربوہ میں سب سے پہلے گدھوں کے ذریعہ بار برداری کا کام ہمارے ایک کلاس فیلو نعمت نے شروع کیا۔اس کے پاس ایک گدھا تھا وہ اس سے اس زمانہ میں دو روپے دیہاڑی کما لیتا تھا اور ہمیں ٹھینگا دکھایا کرتا تھا کہ لو میں کماؤ پتر ہوں تم لوگ ماں باپ کے ٹکڑوں پر پلتے ہو۔

ربوہ کی پہلی پہلی عمارتوں میں یعنی کچی عمارتوں میں جو عمارتیں ہمارے سامنے بنیں دفاتر تحریک جدید کی عمارتیں تھیں۔تحریک کے دفاتر ایک چوکور احاطہ کی صورت میں تھے۔یہ احاطہ بعد کو جامعہ احمدیہ کے ہاسٹل کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ایک احاطہ اور بھی تھا اسے 'احاطہ' کہا جاتا تھا اس کے اندر غرباء کے خاندان رہتے تھے ہمارے سکول کے دوستوں میں سے ایک دوست اس احاطہ میں رہتا تھا اس لئے ہمیں اس احاطہ کے اندر آنے جانے کا موقعہ ملتا رہا۔اب تو وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت خوش حال اور آل اولاد والا ہے اور لندن میں قیام پذیر ہے مگر اس میں ذرا تبدیلی آئی ہو۔اسے اپنے بچپن کی ساری باتیں اور غربت کے سارے حالات یاد ہیں۔یہی انسان کی بڑائی ہے کہ کشائش میسر ہو تو عدم کشائش کے زمانہ کو بھول نہ جائے۔گر بہ دولت برسی،

مست نہ گردی مردی۔

ہماری گلی میں دونوں طرف کوارٹر تھے بیچ میں کشادہ راستہ تھا ہمارا مکان پہلا تھا مقابل کے پہلے مکان میں بھائی محمد عالم حضرت صاحب کے باڈی گارڈ اور ان کے ابا غلام حسین رہتے تھے دوسرے مکان میں بھائی جان محمد احمد نعیم اور پھوپھا جی حضرت مولوی غلام نبی مصری تھے ہمارے ساتھ کے مکان میں قاری محمد امین صاحب اور تیسرے مکان میں مولانا محمد یعقوب صاحب طاہر تھے ان سے آگے چوہدری اعجاز نصر اللہ خاں تھے جو ان دنوں معاون ناظر امورِ عامہ تھے،ان کی جگہ چوہدری عطاء

اللہ صاحب آئے۔ سٹیشن کی جانب جہاں گلی ختم ہوتی تھی حافظ غلام محی الدین صاحب نے ایک چھوٹا سا چائے خانہ کھول رکھا تھا۔ حضرت مولوی مصلح الدین راجیکی وہیں تشریف رکھتے تھے اس لئے ہمارا وہاں آنا جانا تھا۔ ویسے ربوہ کے چائے خانوں میں سیلونی کا چائے خانہ بہت مشہور تھا۔ سیلونی صاحب عجیب خوشبودار چائے بناتے تھے خدا معلوم کون سی پتی استعمال کرتے تھے اور چائے میں کیا خوشبو ملاتے تھے کہ ان کے ہاں سے ایک بار چائے پینے والا انہیں کا ہو کے رہ جاتا تھا۔ ایک کچے کوارٹر کے احاطہ میں ایک بہت بڑا خیمہ انہوں نے لگا رکھا تھا۔ پھر خدا جانے کیا بجوگ پڑا کہ سیلونی صاحب اپنا بوریا بستر سمیٹ کر ربوہ ہی سے چلے گئے مدتوں بعد انہیں جھنگ کی ضلع کچہری میں ڈیرہ لگائے بیٹھے دیکھا مگر ان سے بات چیت کا موقعہ نہ ملا کہ ان سے پوچھ ہی لیتے کہ ربوہ کے لگے لگائے گاہک چھوڑ کر جھنگ میں آ بیٹھنے میں کیا تک تھی؟ ان کے ہاں صرف چائے ہی اچھی نہیں ہوتی تھی صفائی کا بھی بہت خیال رکھا جاتا تھا صاف ستھرے برتن۔ صاف ستھری میزیں کرسیاں۔ اپنے خان میر افغان صاحب قادیان کے زمانہ سے حضرت صاحب کے باڈی گارڈ کے طور پر معروف تھے آپ نے بھی اک چائے خانہ کھول رکھا تھا اس میں پٹھانوں والی کڑک چائے بیچتے تھے۔ فیاض خاں صاحب کرمانی بھی چائے پلاتے اور اپنی خاموش گفتگو سے گاہکوں کو متمتع کیا کرتے تھے۔ ربوہ کی آبادی میں ایک اور بڑا سا خیمہ تھا وہ ملک عمر علی صاحب کا خیمہ تھا۔ آپ اس خیمہ میں رہتے تھے۔ تحریک جدید کے دفتروں میں کام کرتے تھے غالباً وکیل التبشیر تھے اور تبشیر کی خاطر ہی آپ نے ایک جرمن خاتون سے بیاہ بھی کر لیا تھا ربوہ میں اس بیاہ کا خوب چرچا ہوا۔ ہمارے پڑوس ہی میں پچھلی گلی میں حضرت قاضی عبدالرحیم اور قاضی عبداللہ صاحب رہتے تھے۔ قاضی عبدالرحیم صاحب کی نگرانی میں مسجد مبارک اور نیا قصر خلافت تعمیر ہوا۔ انجمن اور تحریک کے دفاتر کی عمارتیں بھی غالباً انہی کی نگرانی میں بنیں۔ نہایت محنت کرنے والے

بزرگ تھے حضرت قاضی محمد عبداللہ صاحب سے تو کافی دیر تک متمتع ہونے کا موقعہ ملتا رہا۔ قاضی صاحب بہت اونچا سننے لگے تھے مگر شہر بھر میں آپ کا بہت احترام تھا۔ بزرگوں کا ذکر شروع ہو گیا تو حضرت مفتی محمد صادق صاحب یاد آ گئے۔آپ بہت ضعیف تھے۔لمبی سفید داڑھی سر پر سبز پگڑی بر میں ایک لمبا سا چغہ، غالباً دگلہ تھا یعنی اس میں روئی بھری ہوئی ہوتی تھی۔حضرت مفتی صاحب آہستہ آہستہ چلتے اور محلہ کے بچوں میں ٹافیاں گولیاں بانٹتے رہتے تھے جدھر سے ان کا گزر ہوتا بچے قطاروں میں کھڑے ان کا انتظار کرتے۔جو بچہ سلام کرتا حضرت مفتی صاحب اسے ایک گولی دے دیتے۔کئی بچے ایک جگہ سے ٹافی یا گولی لینے کے بعد لپک کر دوسری جگہ جا پہنچتے اور پھر اپنا حصہ وصول کرتے۔حضرت مفتی صاحب مسکراتے مگر اسے دوبارہ گولی یا ٹافی دینے سے انکار نہ کرتے۔حضرت مفتی صاحب کی تقریریں جلسہ سالانہ پر ذکرِ حبیب کے موضوع پر ہوتی تھیں اور بہت دلچسپی اور احترام سے سنی جاتی تھیں۔مفتی صاحب کی زبان میں بہت مٹھاس تھی ذکرِ حبیب ان کی زبان سے بہت مزا دیتا تھا۔مفتی صاحب کئی بار بات کرتے کرتے واقعات سناتے سناتے آب دیدہ ہو جاتے سارا مجمع رونے لگتا ہمیں حضرت مفتی صاحب کی زبان سے ذکرِ حبیب سننے کا جو مزا آیا وہ کسی اور سے سننے میں نہ آیا۔غالب نے جو کہہ رکھا ہے ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا اس کی سمجھ مفتی صاحب کی تقریریں سن کر آئی۔

دیکھتے دیکھتے ربوہ کی آبادی میں کچے مکانوں کی کثرت ہو گئی۔انجمن کے دفتر پکے بن گئے۔ہم ہسپتال میں کلرکی کرتے تھے تو کچی عمارت میں ہسپتال قائم تھا۔ایک کمرہ میں کلرک اور ڈاکٹر اکٹھے بیٹھتے تھے دوسرے میں ڈسپنسری تھی جہاں سے کرامت احمد خاں، بھائی حفیظ اور ان کے کزن بھائی عبدالقیوم دوائیں بانٹتے۔ایک کمرہ میں لطفی یعنی لطف الرحمن شاکر بیٹھا ''پالی پالی لمفولمفو'' کرتا گنتا اور خون جانچتا رہتا۔پھر بڑا ہسپتال بنا۔ربوہ کا نقشہ بدل گیا۔بسوں کا اڈہ بن گیا۔سٹیشن پر لکڑی کی گیلیوں سے

بنے ہوئے چھوٹے سے کمرہ کی بجائے ذرا بڑا کمرہ بن گیا۔ پلیٹ فارم تو اب جا کر کہیں نئی عمارت کے بعد اونچا ہوا ہے اس زمانہ میں بالکل ہی زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک دو بار حضرت صاحب کہیں تشریف لے گئے تو ان کے لئے لکڑی کا بنا ہوا پائیدان علیحدہ سے مہیا کیا گیا جلسہ سالانہ بھی خوب ہوتا تھا۔ کچی بیرکیں بنتیں۔ ان پر سرکنڈے کی چھت ڈالی جاتی۔ ایک بار ہمیں یاد ہے کہ ایک بیرک میں اچانک آگ لگی اور دیکھتے دیکھتے ساری بیرکیں اس کی زد میں آگئیں خشک سرکنڈے کی چھتیں اور اندر پرالی۔ چشم زدن میں ساری چھتیں راکھ کا ڈھیر بن گئیں مگر کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ خدام نے تگ و دو کر کے آگ بجھالی۔ اگلے روز پھر چھتیں ڈال دی گئیں جلسہ کا انتظام جاری رہا۔ ہم نے شعلوں کی لپکتی زبانیں دیکھیں تو بہت خوف آیا مگر کام کرنے والوں کے حوصلے بلند تھے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑا۔ بعد کو جلسہ سالانہ کے موقعہ پر چنیوٹ یا سرگودھے کی میونسپل کمیٹیوں سے فائر بریگیڈ کی گاڑیاں عاریاً منگوائی جاتیں اور جلسہ کے دنوں میں ربوہ میں موجود رہتیں ہم نے کبھی انہیں استعمال ہوتے نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہی رہا اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو ہمیشہ ہر قسم کی آگ سے محفوظ ہی رکھا ہے۔ الحمدللہ۔ ڈاک خانہ بھی ایک کچی عمارت میں تھا اس میں پوسٹ ماسٹر ایک صاحب برج لال شاء تھے ہم لوگ حیران ہوا کرتے تھے کہ یہ عیسائی ہو کر شاہ کیوں کہلاتے ہیں؟ پھر سوچا برنارڈ شاء کی طرح کے شاء ہوں گے بڑے نستعلیق آدمی تھے صاف ستھرے کپڑے پہنتے۔ خاکی رنگ کی زین کے کپڑے۔ سر پر سولا ہیٹ۔ میاں منور احمد صاحب جب ربوہ کی نوٹیفائیڈ ایریا کمیٹی کے کرتا دھرتا تھے۔ کمیٹی کی طرف جاتے تو برج لال شاء صاحب ہیٹ اتار کر انہیں سلام کیا کرتے تھے۔ کمیٹی کا ایک دو کمروں کا دفتر ڈاک خانہ کے ساتھ ہی تھا۔ اپنے حاجی برکت اللہ صاحب بعد کو ربوہ کے پوسٹ آفس میں آئے یا شاید اس وقت بھی موجود ہوں ہمیں علم نہیں۔ حاجی برکت اللہ صاحب کے ایک صاحبزادے مطیع اللہ

درد تھے اور دوسرے رفیع اللہ ٹیلیفون کے محکمہ میں تھے اب بھی شاید ہوں۔ حاجی صاحب بھی ریٹائر ہونے کے بعد ایک سب پوسٹ آفس بنا کر کام میں مصروف رہے۔ معلوم نہیں حیات ہیں یا گزر گئے۔ خوب آدمی تھے غالباً مولانا درد صاحب کے عزیزوں میں سے تھے یا بھائی تھے؟ واللہ اعلم بالصواب۔ بسوں کا اڈہ مدتوں قصرِ خلافت اور مسجد مبارک کے پاس رہا جہاں گھاس کے سرسبز وشاداب قطعات کے دائیں بائیں والی سڑکیں ملتی ہیں۔ ایک کونے پر اڈہ تھا دوسرے کونے پر مہمان خانہ۔ دارالضیافت بھی اب نئی جگہ پر بنا ہے پہلے اڈہ کے عین ساتھ تھا اب جہاں مسجد مبارک کے صحن کے آگے کا وسیع میدان نظر آتا ہے یہاں مہمان خانہ تھا کہ مہمان بس سے اترتے سیدھے مہمان خانہ میں پہنچیں۔ مسجد مبارک والا گیٹ بھی بعد کو بنا ہے جب حضرت صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا اس کے بعد۔ حضرت صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا تو غالباً ظہر یا عصر کی نماز کا وقت تھا۔ ایک شخص خدا معلوم کس طرح عین حضرت صاحب کے پیچھے نماز میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک تیز چاقو اپنی چادر میں چھپا رکھا تھا۔ پہرے داروں کو اس کی حرکات پر ذرا بھی شبہ نہ ہوا۔ نماز کے دوران یا نماز پڑھانے کے بعد، جب حضرت صاحب جھکے ہوئے تھے رکوع کی خاطر یا جوتے پہننے کی خاطر اس شخص نے عین گردن پر چاقو سے حملہ کر دیا چاقو گردن میں گہرا پیوست ہو گیا۔ خون کے فوارے چھوٹ پڑے۔ ہمارے سکول کے پی ٹی ماسٹر ماسٹر غلام مرتضیٰ صاحب اتفاق سے اس وقت موجود تھے آپ نے لپک کر حملہ آور کو قابو کیا۔ ان کے سارے کپڑے حضرت صاحب کے خون سے سرخ ہو گئے۔ بہرحال حضرت صاحب اندر تشریف لے گئے۔ اس قاتلانہ حملہ کی خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی۔ سب لوگ قصرِ خلافت کی طرف لپکے۔ حملہ آور کو قابو کیا گیا تو حضرت صاحب نے فرمایا اس کی پوری حفاظت کریں اسے کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ یہی وجہ تھی کہ کسی نے اس بدقسمت شخص کو کچھ نہیں کہا ورنہ لوگ اس کی تکہ بوٹی کر دیتے۔ ہمیں

اتنا یاد ہے اس وقت حضرت صاحب کا ایک پیغام جماعت کے نام پڑھ کر سنایا گیا اور بعد کو الفضل میں بھی چھپا اس دردناک پیغام میں بھی حضرت صاحب نے یہی کہا تھا کہ جماعت کو حوصلہ مندی کے ساتھ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ پیغام کی ساری باتیں تو اس وقت ذہن میں نہیں مگر اس کا لب لباب یہ تھا کہ اگر تو میرا وقت مقدر آ گیا ہے تو جماعت کو حوصلہ کے ساتھ جماعت کے نظام کے ساتھ وابستہ رہنا چاہئے کیونکہ افراد کو تو بہرحال مرنا ہی ہوتا ہے جماعتیں نہیں مرا کرتیں۔ میں یہ ساری تفصیلات اپنی یادداشت کے زور سے لکھ رہا ہوں اس لئے ہوسکتا ہے حضرت صاحب کے پیغام کے اصل الفاظ سے کچھ اختلاف ہو لیکن اتنا یقین ہے کہ ان الفاظ کا یہی مطلب بنتا تھا واللہ اعلم بالصواب۔ ربوہ والوں کے لئے خاص طور سے وہ وقت بڑا کڑا وقت تھا۔ ہمیں یاد ہے حضرت صاحب کی صحت کے بارہ میں روز بلیٹن شائع ہوتے تھے۔ دعاؤں کی تحریک ہوتی تھی اور لوگ رو رو کر دعائیں کرتے تھے۔ ساری جماعت از حد بیقرار تھی۔ ربوہ کے در و دیوار سے اداسی ٹپکتی تھی۔ حضرت اماں جان کی وفات کے وقت جو نظارہ دیکھا تھا اسی قسم کی کیفیت سامنے آ رہی تھی مگر اللہ کا فضل ہوا اور حضرت صاحب ٹھیک ہو گئے اگرچہ اس زہریلے چاقو کا اثر اعصاب پر پڑا اور گیارہ بارہ برس بعد جب حضرت صاحب کا وصال ہوا تو بھی یہی جانا گیا کہ اس قاتلانہ حملہ کا اثر جسم اور اعصاب پر باقی ہے۔ حملہ آور کو اقدامِ قتل کے جرم میں پانچ یا چھ برس کی قید ہوئی۔ اس وقت ساری جماعت کو احساس ہوا کہ امام کا وجود جماعت کے لئے کیا ہوتا ہے؟ حضرت صاحب نے تقریباً نصف صدی تک جماعت کی رہنمائی فرمائی۔ اس عرصہ میں دو نسلیں پیدا ہوئیں بڑی ہوئیں اور بوڑھی بھی ہو گئیں، اس لئے حضرت صاحب کا وجود ہی جماعت لگتا تھا انہی دنوں ایک فتنۂ منافقین بھی جماعت میں برپا ہوا۔ اس فتنہ کی باگ ڈور تو بعض بڑے منافقین کے ہاتھوں میں تھی مگر ان لوگوں نے چھوٹوں کو آگے کر رکھا تھا۔ اس فتنہ کی سرکوبی کا حال بھی ہمیں خوب یاد

ہے۔ایک روز اچانک اخبار الفضل میں اعلان پڑھا کہ جماعت اللہ رکھا اور اس کے ساتھیوں سے بیزاری کا اعلان کرے کیونکہ یہ لوگ جماعت میں فتنہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ساری جماعت چونک گئی کہ یہ اللہ رکھا کون ہے اور جماعت میں فتنہ کیوں پیدا کرنا چاہتا ہے؟ جماعت نے پورے خلوص اور تعہد کے ساتھ امام وقت کے ساتھ وفاداری اور اطاعت کا عہد کیا بعد کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس فتنہ میں جماعت کے بعض بظاہر بڑے لوگ بھی ملوث تھے۔اللہ تعالیٰ نے جماعت کو اس فتنہ سے بچا لیا۔حضرت صاحب نے جس حکمت سے اس فتنہ کا استیصال کیا اس سے جماعت کو یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ ان کی قیادت کیسے زیرک اور اولوالعزم امام کے ہاتھ میں ہے۔اس فتنہ کے بعد خدام اور اطفال اور انصار کے عہدوں میں امام وقت کی ہر معروف امر میں اطاعت کرنے کے الفاظ شامل کئے گئے۔ پہلے یہ الفاظ اس صورت میں موجود نہیں تھے۔ہم لوگ محلہ الف سے اٹھ کر محلہ دارالرحمت وسطیٰ والے مکان میں آ گئے۔ساتھ پھوپھا جی کا ایک کمرہ کا مکان تھا اندر سے صحن ایک ہی تھا اس لئے باہر سے مکان بڑا لگتا تھا ہمارے اپنے گھر میں تایا جی محمد خاں، امی ابا، تین بہنیں تین بھائی سب کی سمائی تھی۔ پھر دوسرا کمرہ بنا۔اس وقت ہم شاید ایف اے کا امتحان دے رہے تھے۔ربوہ میں بجلی آ گئی تھی مگر ہمارے گھر تک نہیں پہنچی تھی بجلی کے محکمہ میں مکرم احمد زمان صاحب تھے اب ان کی اولاد جرمنی میں بیٹھی ہے۔سید سجاد حیدر شاہ صاحب تھے ان کی اولاد بھی ہماری شاگرد ہوئی۔نعیم حیدر کسی ڈائجسٹ میں کام کرتا تھا خدا معلوم کہاں ہے اور کہاں ڈائجسٹ ہوگیا ہے اس کا ماموں سید ارشاد علی شاہ ہمارا کلاس فیلو تھا۔اس کے نانا سید سمیع اللہ شاہ صاحب ہمارے استاد تھے۔اللہ بخشے خوب آدمی تھے۔خدا خدا کر کے بجلی ہمارے گھر تک بھی پہنچی مگر صرف روشنی کے لئے استعمال میں آتی تھی۔پنکھے چلانے کا رواج بعد میں آیا پھر اللہ تعالیٰ کے فضل سے گھر میں ائرکنڈیشنز بھی لگے۔مگر وہ وقت بھی گزر ہی گیا۔ربوہ میں بجلی کی وہ

آنکھ مچولی رہتی تھی کہ پناہ بخدا پہلے پہل میاں مظفر احمد صاحب نے اصرار کر کے حضرت مرزا بشیر احمد کے ہاں ائر کنڈیشنر لگوایا حضرت میاں صاحب نے واپڈا کے احمدی جنرل منیجر چوہدری عبدالحمید صاحب کو ایک خط لکھا چونکہ ہم اس خط کے کاتب ہیں اس لئے ہمیں یاد ہے لکھا تھا ''میرے کمرہ میں عزیزم مکرم مرزا مظفر احمد نے ائر کنڈیشنر لگوا دیا ہے اگر بجلی کی کمی بیشی کی وجہ سے اسے کچھ ہوا تو ساری ذمہ داری آپ پر ہوگی''۔ظاہر ہے یہ خط تفنن کے طور پر لکھا گیا ہوگا مگر وہ ائر کنڈیشنر مدتوں واپڈا کی دست برد سے محفوظ رہا۔ ہمارے اپنے تجربہ میں یہ بات آئی کہ ہم واپڈا کے ڈائریکٹر فنانس کے کمرہ میں بیٹھے تھے کہ اچانک بجلی چلی گئی اور جاتے جاتے ڈائریکٹر صاحب کے ائر کنڈیشنر کی جان بھی ساتھ لیتی گئی ۔بجلی تو آ گئی ائر کنڈیشنر صاحب دوبارہ زندہ نہ کیا جا سکے۔ہم نے کہا لو جب واپڈا اپنے ڈائریکٹر فنانس کو نہیں بخشتی تو ہما شما کس شمار قطار میں ہیں؟ سنا ہے ربوہ میں بجلی کی آنکھ مچولی اسی طرح جاری ہے مگر جناب بجلی اور پانی ہے تو واپڈا تو ہوگا۔کہا افغان کا ڈر ہے۔کہا افغان تو ہوگا۔ہم بجلی کا ذکر کرتے ہوئے بجلی کی سی تیزی سے دوسری طرف مڑ گئے یہ خیال نہ آیا کہ ربوہ کے ذرائع مواصلات کا تو ذکر کیا ہی نہیں۔آج لوگ اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ کسی زمانہ میں ربوہ میں کوئی تانگہ نہیں تھا اور تانگہ اس لئے نہیں تھا کہ کوئی سڑک ہی نہیں تھی۔ ہاں رستے ہموار کئے گئے تھے رفتہ رفتہ ان ہموار راستوں پر بجری ڈالی گئی پھر پکی سڑکیں تو کہیں ساٹھ کی دہائی میں آ کر بنی ہیں۔بسوں کا یہ عالم تھا کہ اکا دکا بسیں چلتی تھیں اور وہ بھی گیس پلانٹ سے۔گیس پلانٹ بالکل ویسا ہی گیس پلانٹ ہوتا تھا جیسا آج کل ویلڈنگ کرنے والوں کے گیس پلانٹ ہوتے ہیں بس کے پیچھے جہاں آج کل لٹر کے لٹکے ہوتے ہیں وہاں وہ پلانٹ لگا ہوتا تھا۔اس میں آگ جلتی تھی اور کسی خاص کیمیکل سے گیس پیدا کی جاتی تھی جو انجن کو توانائی مہیا کرتی تھی۔کونسی گیس تھی؟ ہمیں پتہ نہیں کیونکہ ہم سائنس کے باب میں کورے کے کورے ہیں۔

ویسے ہمارا خیال ہے ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہ صاحب بھی اس گیس کا فارمولا زبانی نہیں بتا سکتے ہوں گے اسی لئے شاید وہ اپنی پرانی تصنیف کردہ کیمسٹری کی کتاب تلاش کر رہے ہیں کتابیں بیچتے وقت شاہد صاحب کو خیال نہ رہا کہ ایک آدھ نسخہ ریکارڈ کے لئے بھی سنبھال لینا چاہیئے مگر انہیں کیا خبر تھی کہ ہم ان سے پانچ دہائیوں کے بعد بسوں کو چلانے والی گیس کا نسخہ پوچھ لیں گے؟ دو بس کمپنیاں متروکہ املاک میں شمار ہوتی تھیں۔ایک کا نام تھا ہمالیہ ٹرانسپورٹ اور دوسری کا نیوسورج ٹرانسپورٹ۔ ہمالیہ کمپنی کا تو پتہ نہیں، ہمالیہ سے اتر کر کس کی گود میں گری نیوسورج کمپنی نے نصرت ٹرانسپورٹ کمپنی کا نام اختیار کیا اور ملک فتح محمد خاں صاحب ٹوانہ ایم اے کی ملکیت میں آئی ان دونوں بس کمپنیوں کی بسیں سرگودھا اور فیصل آباد کے درمیان چلتیں۔ یونائیٹڈ ٹرانسپورٹ ہمارے احمدی پراچگان کی ملکیت تھی اور لاہور سرگودھا اور بھیرہ کے درمیان چلتی تھی۔اس کمپنی کا تخصص یہ تھا کہ لاہور تک اس کے سفر کا وقت مقرر تھا اس لئے یہ بسیں راستے میں زیادہ رکتی نہ تھیں ایک اور ٹرانسپورٹ کمپنی لاہور کے کراؤن سنیما والوں کی ملکیت تھی کراؤن ٹرانسپورٹ۔ تقسیم ملک سے قبل لاہور اور پٹھانکوٹ کے درمیان چلتی تھی پھر یہ بھی لاہور اور سرگودھا کے درمیان چلنے لگی۔ اس زمانہ میں لاہور کا کرایہ تین روپے تین آنے تھا۔ پھر ہمارے مرزا منیر احمد صاحب کی طارق ٹرانسپورٹ کمپنی سامنے آئی۔اس کا روٹ بھی لاہور بھیرہ تھا اس کمپنی کی خاص بات یہ تھی کہ لاہور اور سرگودھا کے درمیان کم سے کم وقت لیتی تھی مگر ہمیں تو ایک بار لے ہی بیٹھی تھی وہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا کہ ہم بچ گئے۔ یہ چھٹی دہائی کی بات ہے۔ہم پی ایچ ڈی کے سلسلہ میں تین دن لاہور اور تین دن ربوہ میں رہتے تھے۔قبلہ قاضی محمد اسلم صاحب نے اور ان سے پہلے حضرت مرزا ناصر احمد صاحب نے ہمیں کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ ہم پی ایچ ڈی کے سلسلہ میں جتنی دیر تک چاہیں لاہور میں رک لیں ہماری چھٹیوں پر یا ملازمت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا چنانچہ ہم جمعرات

کی شام لاہور چلے جاتے جمعہ ہفتہ اور اتوار وہاں ٹھہرتے لائبریریوں میں تحقیقی کام کرتے اور اتوار کی شام کو واپس ربوہ آ جاتے۔عموماً ہم وہاں سے شام کے سات بجے کی بس لیتے جو آخری بس ہوتی تھی۔ طارق ٹرانسپورٹ والوں کی یہ بس تاجر حلقہ میں بہت مقبول تھی۔ہم تاجر تو نہ تھے مگر ہمیں یہ آخری بس بہت مناسب لگتی تھی کیونکہ سارا دن لائبریری میں کام کرنے کو مل جاتا تھا۔ایسا ہی ایک سفر تھا ہم آخری بس پر لاہور سے چلے۔ربوہ کے درمیانی درہ کی چڑھائی چڑھتے ہوئے ڈرائیور سامنے سے آنے والی کسی بس یا ٹرک کی روشنی میں اندازہ نہ کر سکا اور بس پہلو کے بل الٹ گئی نہ صرف الٹ گئی بلکہ دو چار لڑھکنیاں کھاتی ہوئی دور جا پڑی۔ہم بائیں جانب بیٹھے تھے دائیں طرف بھاری تن وتوش والے میانوالی کے تاجر تھے اور ان کا سامان۔وہ سارا ہمارے اوپر آ رہا حواس باختہ الٹی ہوئی بس سے نکلے لوگ باگ ہراساں تھے مگر اللہ کا فضل تھا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا زخمی تو ہم بھی تھے مگر یہ تسلی تھی کہ ابھی کہیں سے ربوہ والے خدام دوڑتے بھاگتے آ جائیں گے اور ہمیں ہسپتال پہنچا دیں گے چنانچہ ہم ہسپتال پہنچائے گئے۔ڈاکٹر صاحب نے دیکھا اور فرمایا بظاہر کوئی ہڈی وغیرہ نہیں ٹوٹی۔ہم نے انہیں بتایا کہ سینہ میں بہت درد محسوس ہو رہی ہے۔کہنے لگے کوئی بات نہیں حادثہ کا صدمہ ہے ٹھیک ہو جائے گا۔ہم گھر پہنچ گئے۔اگلے روز تکلیف بڑھ گئی دوبارہ ہسپتال پہنچے تو ایکسرے ہوا معلوم ہوا زیادہ نہیں بائیں طرف کی اوپر کی تین پسلیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے ہمیں پلستر میں جکڑ دیا اور فرمایا بس اسی طرح یہ پسلیاں خود بخود جڑ جائیں گی جگہ ایسی ہے کہ اگر بوجھ نہ اٹھائیں تو دقت نہیں ہوگی۔چلئے ہم کچھ دنوں کے لئے پابند بستر ہو گئے۔اب بھی سرد ہوا چلتی ہے تو وہیں ٹیس سی اٹھتی ہے "جب چلی سرد ہوا ہم نے تمہیں یاد کیا"۔اس ہمالیہ ٹرانسپورٹ کی ایک بس ایک بار ملک عمر علی صاحب کی کوٹھی کے قریب بس الٹ گئی۔ایسی الٹی کہ پہیے اوپر ہو گئے۔دو چار جانیں بھی تلف ہوئیں۔ہم نے وہ بس دیکھی

تو بہت خوف آیا جو پاکستان سے آتے وقت تک قائم تھا۔ مستزاد خود اپنے آپ کو حادثہ پیش آ گیا۔ انہی دنوں میں ہمارے ایک محلہ دار تھے ملک محمد اشرف صاحب غالباً تبشیر کے دفتر میں کام کرتے تھے وہ سرگودھا جاتے ہوئے گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کمپنی کی کسی بس میں سفر کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہوئے اور جاں بحق تسلیم کی۔ ہمارے ساتھ واقفیت نہیں تھی مگر ہمارے یار ملک فضل الٰہی کے عزیزوں میں سے تھے اللہ بخشے ربوہ کے غالباً پہلے باشندے تھے جو بس کے حادثہ میں جاں بحق ہوئے۔ بھیرہ کے رہنے والے تھے۔ ربوہ میں ان کی حادثاتی موت کا بہت چرچا رہا۔ ان دنوں بسوں کے حادثات غیر معمولی سمجھے جاتے تھے آج کل تو حادثے زندگی کا معمول ہیں اور سال میں ہزاروں لوگ ان کا شکار ہوتے ہیں۔ ملک فضل الٰہی کا ذکر آ گیا تو اپنے زمانہ کے ساتھی کلرکوں کا خیال آ گیا آج بھی انہیں کلرکی کرتے دیکھتے ہیں تو اللہ کا شکر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس آزمائش سے جلد ہی نکال لیا۔ فضل الٰہی ہماری طرح ہمارے ساتھ ہی کلرکی کے میدان میں اترا تھا۔ بھیرہ کا رہنے والا نہایت باوفا دوست ہے۔ ہماری عمریں ایک جیسی تھیں اس لئے ہمارا یارانہ بھی بہت تھا فضل الٰہی کلرکی چھوڑ کر مونگ رسول کے اوورسیئر سکول میں داخل ہو گیا اور محکمہ انہار سے اسسٹنٹ انجینئر کی حیثیت سے ریٹائر ہوا اور اب سعودی عرب میں کسی کمپنی میں کام کرتا ہے اس زمانہ کے ساتھیوں میں سے ارشاد شاید آفس سپرنٹنڈنٹ ہے۔ مولوی جمیل صاحب تو ریٹائر ہو گئے انجمن کے دفتروں پر نگاہ دوڑاتا ہوں تو بہت سے لوگ اس زمانہ کے لگتے ہیں مگر ان سے شناسائی کا سلسلہ نہیں تھا۔

حضرت میاں بشیر احمد صاحب کی وفات بھی ساٹھ کی دہائی کے شروع میں ہوئی۔ ہمیں یاد ہے ہم یونیورسٹی لائبریری میں بیٹھے تھے کہ ایک دوست نے حضرت میاں صاحب کی وفات کی خبر سنائی ہم سیدھے 23 ریس کورس روڈ پہنچے۔ ساری جماعت احمدیہ لاہور وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ یہ کوٹھی میاں مظفر احمد

صاحب کی سرکاری رہائش گاہ تھی۔ حضرت میاں صاحب کا جنازہ اندر رکھا تھا لوگ ایک دروازہ سے دیدار کے لئے اندر جاتے دوسرے سے نکل جاتے۔ بیماری کی نوعیت کا تو ہمیں علم نہیں مگر اتنا سنا کہ بخار اتنا تیز تھا کہ بار بار برف کے پانی سے جسم کو تر کرنے کے نہیں اترتا تھا اسی بخار میں آپ نے جاں دے دی۔ بہت صدمہ ہوا۔ حضرت میاں صاحب سے احمدی ہونے کے ناطے سے جو تعلق تھا ہمارا تعلق اس سے کہیں زیادہ تھا۔ ہم نے زندگی کا ایسا زمانہ ان کے سائے میں بسر کیا تھا جو نہایت اہم زمانہ ہوتا ہے۔ ہمیں تعلیم کا شوق دلانے میں ان کا بہت ہاتھ تھا۔ جب بھی ملنا ہوتا تعلیم کی ترقی کا پوچھتے رہتے۔ اے کاش ہمارے پی ایچ ڈی ہوجانے تک زندہ رہتے تو انہیں کتنی خوشی ہوتی۔ انہیں اس بات کا اشتیاق بھی تھا کہ ربوہ میں ان کے سائے میں پلا ہوا کوئی بچہ تعلیمی لحاظ سے اس مرتبہ تک پہنچے۔ لاہور سے ان کا جنازہ ربوہ لایا گیا۔ ہم بھی ایک بس میں ساتھ آئے۔ اگلے روز ان کا جنازہ ہوا۔ حضرت مرزا ناصر احمد صاحب پرنسپل تعلیم الاسلام کالج نے جنازہ پڑھایا۔ ربوہ میں ہم نے پہلا جنازہ جو حضرت مرزا ناصر احمد کی امامت میں پڑھا غالباً یہی تھا۔ خلافت کے مرتبہ پر تو وہ 1965 میں فائز ہوئے۔ ربوہ کی ساری آبادی ہماری آنکھوں کے سامنے ہوئی۔ کچے مکانوں سے پکے مکانوں، کوٹھیوں تک، سب کے ہم چشم دید گواہ ہیں۔ پہلے پہلے ربوہ میں ملک صاحب خاں صاحب نون نے اپنی کوٹھی بنائی۔ ملک صاحب خاں صاحب نون ڈپٹی کمشنر کے طور پر ریٹائر ہوئے تھے اور نہایت مخلص احمدی تھے۔ عمر بھر نرینہ اولاد کی خواہش میں گھلتے رہے آخر اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹا دیا ملک احمد خاں نون۔ مگر ملک صاحب کی وفات کے بعد وہ ربوہ چھوڑ گئے۔ ملک صاحب خاں صاحب نون سرگودھا کے بڑے زمینداروں میں سے تھے۔ انگریز حاکموں کا دستور تھا کہ وہ مقامی شرفاء میں سے بعض لوگوں کو انتظامی عہدوں پر متعین کیا کرتے تھے۔ ملک سر فیروز خاں نون کے والد کمشنر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ملک صاحب کی

کوٹھی ربوہ کی پہلی پہلی کوٹھی تھی ۔ہم نے ملک صاحب کو ایک یا دو بار دیکھا۔نہایت متین اور سنجیدہ آدمی تھے مگر ہمیں اس زمانہ میں ان سے مستفید ہونے کا موقعہ نہ ملا یہاں تک لکھا تھا کہ خیال آیا کہ اگر کوئی پڑھنے والا پوچھ بیٹھے کہ شروع میں آپ نے لکھا تھا کہ پانی کا ایک قطرہ تک اس زمین میں نہیں تھا تو ہم اتنے مکانات اور کوٹھیوں پر کوٹھیاں کہاں سے بناتے چلے جارہے ہیں؟ تو ہم کیا جواب دیں گے؟ ربوہ میں پانی کی دریافت بھی عجیب معجزہ ہے۔جس طرح پہلی مسجد ہسپتال کے احاطہ میں مسجد یادگار کے نام سے کھڑی ہے اسی طرح پہلا ٹیوب ویل البشریٰ والے چوک میں میاں منور احمد صاحب کی کوٹھی والے کونے پر لگا تھا۔ یہ وہ جگہ ہے جس کے بارہ میں سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کو بتایا گیا ’’پاؤں کے نیچے سے مرے پانی بہادیا‘‘ یہ جگہ خواب میں دکھائی گئی ۔اگلے روز اسی جگہ سے جہاں سے کئی بار بورنگ کے باوجود ناکامی ہوچکی تھی پانی نکل آیا صرف وہی سے نہیں نکلا ربوہ میں ہر جگہ سے نکل آیا پانی نہ نکلتا تو آبادی کہاں سے ہوتی ؟ مگر پانی ابتداء میں اتنا نمکین تھا کہ بالکل کڑوا محسوس ہوتا تھا اور پینے کے لئے احمد نگر سے پانی لانا پڑتا تھا اب تو لوگ دریا کا مصفا پانی پیتے ہیں اور سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی زمانہ میں ربوہ کا پانی کڑوا ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس پانی کی نمکیت کم ہوتی گئی اور انہیں علاقوں کا پانی اب پینے کے قابل ہوگیا ہے مثلاً دارالرحمت وسطیٰ کا پانی شروع سے ہی نسبتاً میٹھا تھا اب بھی ہے مگر دارالصدر کا پانی بھی اب پینے کے قابل ہوگیا ہے۔اس وقت نلکے بھی بہت گہرائی پر جاکر لگتے تھے اس زمانہ میں قریشی فضلِ حق ،عبدالغنی صاحبان نے بہت محنت کی ۔اسی محنت کا صلہ اللہ تعالیٰ نے دیا کہ اب بورنگ کے سلسلے میں اتنی گہرائی میں نہیں جانا پڑتا۔ پھر ٹیوب ویل لگے۔کالج کی عمارت بنانے کا مرحلہ تھا مگر کالج کے احاطہ میں یا کالج کے قریب پانی کا نام ونشان نہیں تھا اس لئے کالج کا ٹیوب ویل دارالعلوم میں جاکر لگا وہیں جہاں آس پاس میں ہمارے دوست جسٹس محمد اسلام بھٹی صاحب کی زمین تھی ۔ پانی

اتنی دور سے لانا پڑتا تھا مگر کام کہیں رکا کرتے ہیں کالج کی عمارت بنی کالج لاہور سے ربوہ منتقل ہوا۔ ہوسٹل میں کئی سوطلباء رہتے تھے سب ہی پانی کے سلسلہ میں مطمئن رہے صرف یہ تھا کہ گھر میں اگر ذاتی نلکے پر ڈونکی پمپ لگا کر پانی اٹھا کر غسلخانوں تک پہنچایا جاتا تھا تو چائے بنانے میں آسانی رہتی تھی۔ قارئین حیران ہوں گے کہ یہ کیا شتر گربہ ہے؟ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہم نے ڈونکی پمپ سے پانی اٹھا کر اپنے گھر کے غسل خانہ تک پانی پہنچا رکھا تھا نہانے دھونے میں آسانی رہے۔ ہمارے ایک زندہ دل مہمان لاہور سے تشریف لائے ہوئے تھے نہانے کے لئے غسل خانہ میں گئے تو تھوڑی دیر کے بعد نوکر کو آواز دی۔ وہ بھاگا بھاگا گیا تو فرمانے لگے ذرا ایک کپ اور چائے کی پتی لے آؤ۔ وہ اس مطالبہ پر بھونچکا رہ گیا۔ تو مہمان موصوف نے ڈانٹا کہ جاتے کیوں نہیں میرا وقت ضائع کر رہے ہو؟ بیگم صاحبہ سے کہو چائے کی پتی اور ایک کپ دے دیں! وہ بیچارا بادلِ ناخواستہ آیا اور ہماری بیگم تک مہمان موصوف کا مطالبہ پہنچایا انہوں نے ہمیں بھگایا کہ جا کر مہمان کی خیر خیریت دریافت کریں کہ نہاتے میں ان کا دماغ تو نہیں چل گیا؟ ہم نے چائے کی پتی کی لم پوچھی فرمانے لگے نہیں اب ضرورت نہیں رہی پانی ٹھنڈا ہو گیا ہے ورنہ شروع شروع میں اتنا گرم پانی نکلا تھا کہ میں نے سوچا اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چائے ہی بنالوں۔ بھابھی تکلیف سے بچ جائیں گی۔ سو جناب ہمارے ہاں پانی کا یہ عالم بھی رہا ہے اب تو ٹینکی کا پانی ہے اور ذرا سی دیر میں ٹھنڈا بھی ہو جاتا ہے۔ آج کل کے باشندے اس دور کی صعوبتوں کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ مگر یہ سارا مسئلہ دنیا کو حیران کر دینے کے لئے کافی تھا کہ وہ جگہ جہاں لوگ ہزار روپیہ خرچ کرنے اور رائج الوقت ٹیکنالوجی استعمال کرنے کے باوجود پانی حاصل نہ کر سکے تو اس جماعت کے پاس کیا نسخہ تھا کہ جھٹ پانی نکل آیا۔ نسخہ تو ہمیں بھی معلوم ہے مگر بتانے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ وہ نسخہ ہر ایک کے کام نہیں آتا۔ اس نسخہ کی تیاری میں راتوں کی دعائیں اور

سحر گاہ کا تضرع شامل کرنا پڑتا ہے۔ یہی اجزاء آج کل نایاب ہو رہے ہیں۔ پانی کے سلسلہ میں کافی دقت بھی رہی۔ گھروں میں نلکے ہونے کے باوجود پینے کا پانی بعض خاص محلوں سے منگوانا پڑتا تھا مثلاً انجمن اور تحریک کے کوارٹرز جس جگہ واقع ہیں وہاں کا پانی پینے کے قابل نہیں ہوا ان لوگوں کو زائد پیسے خرچ کر کے سقہ لگوانا پڑتا تھا جو دارالرحمت سے پانی ڈھوتا تھا اس وقت پینے کے پانی کی قدر ہوئی پھر جن محلوں کا پانی نمکین تھا وہاں یہ عالم بھی تھا کہ پانی میں نمکیات کی کثیر مقدار شامل تھی ہم مذاق میں کہا کرتے تھے کہ حکومت ایٹمی توانائی کے سلسلہ میں خواہ مخواہ ''بھاری پانی'' کے مہیا کرنے میں اتنی تگ و دو کر رہی ہے ربوہ سے پانی منگوا لے۔ بھاری پانی کا مسئلہ حل ہو جائیگا اس پانی کی ایک اور خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس پانی سے نہانے کے بعد بالوں کا میل وغیرہ نکل جاتا تھا مگر خود پانی نہیں نکلتا تھا۔ پانی کے سارے اجزا بالوں کو یوں گچھا مچھا بنا دیتے تھے کہ الامان والحفیظ۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود ربوہ آباد ہوا پانی کی فراوانی ہوئی سبزہ بھی ہو گیا جہاں ایک تنکا نہیں اگتا تھا وہاں گلشن احمد نرسری کے اشتہارات الفضل میں شائع ہوتے ہیں۔ زمین گل و گلزار ہو گئی ہے۔ گھروں میں پائیں باغ کا رواج بھی ہو گیا ہے۔ کالج کا نیا کیمپس تو نسبتاً زرخیز زمین پر قائم ہوا ہے وہاں روئیدگی تھی مگر وہاں امرودوں کا باغ لگانے کا کوئی نہیں سوچ سکتا تھا۔ امرودوں کے باغ لگانے سے ایک امرود بیچنے والا یاد آیا اس نے کالج کے امرودوں کا ٹھیکا لے رکھا تھا۔ ادھر کوٹ امیر شاہ کی طرف ایک امرودوں کا باغ تھا۔ اس نے کالج کے امرودوں کو کوٹ امیر شاہ سے ممیّز کرنے کے لئے نعرہ ایجاد کیا تھا۔ کہا کرتا تھا ''لو جی یونیورسٹی کے پڑھے لکھے امرود''۔ کالج کے نئے کیمپس کو زبانِ خلق نے ہمیشہ یونیورسٹی ہی کہا اور زبانِ خلق نقارۂ خدا ہوتی ہے۔ کالج قومیا لیا نہ جاتا تو ہم اسے یونیورسٹی بنا ہی لیتے۔ خیر وہ وقت بھی ان شاء اللہ ضرور آئے گا۔

ربوہ میں مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ سارا سال ہی جاری رہتا تھا اب بھی ہوگا۔ اس زمانہ میں حکیم فضل الرحمن صاحب دارالضیافت کے نگران تھے۔ حکیم صاحب لمبا عرصہ افریقہ میں مبلغ رہ کر تشریف لائے تھے نہایت وجیہہ اور دبنگ آدمی تھے ان کا رعب داب بھی بہت تھا۔ ہاتھ میں ایک کھونڈ بھی رکھتے تھے۔ ایک دو فقیر عین کھانے کے موقع پر آ ٹپکا کرتے تھے حکیم صاحب نہایت احترام سے انہیں کھانا دے دیا کرتے تھے کسی نے کہا یوں فقیروں کو کھانا دیتے رہو گے تو سارے علاقے کے فقیر اپنے اپنے کشکول لئے آموجود ہوں گے۔ حکیم صاحب مسکرائے فرمایا ''یہ میرا کھونڈ کس مرض کی دوا ہے؟'' مگر ہم نے کبھی انہیں کسی فقیر کو جھڑکتے یا کھانا دینے سے انکار کرتے نہیں دیکھا۔ فرماتے تھے جس کا لنگر ہے اس نے یہی طریق رکھا تو میں کون ہوتا ہوں اس کو بدلنے والا؟ دارالضیافت میں مہمانوں کی ریل پیل رہتی تھی۔ صبح کے وقت کھانے میں دال اور شام کے وقت آلو یا شلجم گوشت ہوتا تھا۔ یہ طریق پرانا تھا اور خدا معلوم کب سے چلا آتا تھا جب کالج بن رہا تھا حضرت میاں ناصر احمد صاحب سائیکل پر سوار آتے جلدی جلدی کھانا کھاتے اور کالج پہنچ جاتے تاکہ کالج کے کام کی نگرانی میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔ ہمیں دو ایک بار انہیں دیکھنے کا موقعہ ملا۔ خاموشی سے آتے دال روٹی جو کچھ میسر ہوتی کھاتے اور یہ جا وہ جا۔ ایسا ہی ہم نے جلسہ سالانہ کے موقعہ پر مرزا طاہر احمد صاحب کو دیکھا تندور پر بیٹھے روٹی اترتی دیکھ رہے ہیں۔ ایک روٹی کھا رہے ہیں سالن کی پروا نہیں اگر کسی نے سالن سامنے رکھ دیا تو لقمہ اس میں ڈبو لیا ورنہ سادہ روٹی کھا کے چلتے بنے۔ نگرانی بھی ہوگئی نمونہ بھی چکھ لیا ایک پنتھ دو کاج۔

دارالضیافت نئی عمارت میں منتقل ہوا تو مرزا معظم بیگ صاحب اس کے نگران بنے۔ یہ بزرگ ربوہ کے ماحول کے نہیں تھے کہیں باہر سے تشریف لائے تھے اس لئے زیادہ دیر نہیں ٹکے اب تو منور

جاوید صاحب نے خوب کام سنبھال لیا ہے حالانکہ مغلپورہ میں جہاں سے تشریف لائے ہیں ریلوے ورکشاپ تو موجود ہے لنگر خانہ کی ٹریننگ کا کوئی بندوبست نہیں پتہ نہیں اتنا تجربہ کہاں سے لے آئے کہ اس عالمی لنگر کو نہایت خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔ خادم تھے تو گنج مغلپورہ کی مجلس کی وجہ سے بہت معروف تھے ہم سمجھا کرتے تھے گنج میں رہتے ہیں تو محض 'گنج' خوبی ہوں گے مگر یہ تو گنج گرانمایہ نکلے۔

بات اب عام آدمیوں سے نکل کر گنج ہائے گراں مایہ تک پہنچنے لگی ہے اس لئے ہمیں رک جانا چاہئے ابھی تک تو لوگ ہمارے مضمونوں کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں اس لئے لکھے دیتے ہیں کل جانئے کیا ہو،

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے۔ پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے۔'

خاموش علماء

دنیا کا دستور ہے کہ ہر سلسلہ میں ایسے علماء موجود رہتے ہیں جو اپنی خاموش طبعی یا فطری حجاب کی وجہ سے سامنے نہیں آتے مگر اپنے اپنے میدان میں علمی خدمات کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں ان کی حیثیت ان کل پرزوں کی سی ہوتی ہے جو سامنے نہیں ہوتے مگر مشین کو قوت بہم پہنچاتے رہتے ہیں اگر ان میں سے کسی کل پرزے کو نقصان پہنچ جائے تو ساری مشین کی قوت متاثر ہوتی ہے۔ انسانی تہذیب کی ترقی ایسے خاموش طبع عالموں کی رہین منت رہی ہے۔

ہم نے قادیان میں اور ربوہ میں بعض ایسے عالموں کو دیکھا اور ان سے حسب عمر و استطاعت استفادہ کیا جو بظاہر بالکل خاموش طبع تھے مگر بہ باطن علم کا بحر بے کراں تھے۔ اپنے گھر میں حضرت

مولوی غلام نبی مصری کا وجود سامنے تھا۔آپ نہایت مسکین طبع خاموش طبع عالم تھے۔عربی میں ان کا کہا مستند سمجھا جاتا تھا مگر کبھی جوان کے منہ سے تفاخر کی کوئی بات سنی ہو۔نہیں وہ تو ایسے حلیم الطبع تھے کہ ہم بچوں میں سے کسی کو کسی بات پر سرزنش بھی کرنا پڑتی تو گھبرا جاتے۔قادیان کے مدرسہ احمدیہ میں استاد تھے اور حضرت خلیفہ المسیح الاول کے خاص الخاص شاگردوں میں سے تھے ان کے شاگرد ان کے احترام میں بچھے جاتے تھے مگر پھوپھا جی کہ ہماری پھوپھی بیگم جی ان کے عقد میں تھیں،ان سے بھی بڑھ کر ان سے تواضع سے پیش آتے تھے۔کوئی شاگرد فرط ادب سے آنکھیں جھکا کر بات کرتا تو آپ فروتنی سے اور زیادہ جھک جاتے۔زیادہ بات کرنے کی عادت نہیں تھی ہاں یا نہ میں جواب دیتے۔ہاں کسی مسئلہ پر تفصیل بیان کرنا درکار ہوتی تو آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر تفصیل بیان فرماتے۔گھر میں یا گھر سے باہر ہم نے کبھی انہیں کسی بات پر برافروختہ ہوتے نہیں دیکھا۔عربی زبان ان کا تخصص تھا لکھتے بھی عربی رسم الخط میں تھے مگر عربوں کے برعکس ان کے کلام میں جامعیت تو ہوتی تھی مبالغہ نہیں ہوتا تھا۔ اختصار ان کی طبیعت کا خاصہ تھا مَا قَلَّ وَدَلَّ ۔

حضرت مولوی غلام نبی مصری اپنے شاگردوں کو اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے ان کی بہبود کا خیال رکھنا ان کے لئے ہر وقت دعائیں کرتے رہنا۔مکرم ملک عمر علی صاحب کھوکھر رئیس ملتان کو پھوپھا جی سے خاص عقیدت تھی ان سے حدیث کا درس بھی لیا کرتے تھے رئیس تھے مگر ہمارے گھر میں آتے تو کھڑی چارپائی پر بیٹھ کر درس لیتے ایک بار ملک صاحب کے بارہ میں خبر ملی کہ وہ بیمار ہیں۔ پھوپھا جی نے جس بیقراری سے ان کی صحت کے لئے دعائیں کیں اس پر بہت رشک آیا لڑکپن کا زمانہ تھا خیال ہوا کہ ملک صاحب امیر کبیر آدمی ہیں اس لئے پھوپھا جی ان کے لئے اتنی بیقراری سے دعائیں کررہے ہیں مگر کچھ عرصہ بعد قادیان سے ملک صلاح الدین صاحب کی طرف سے دعا کی درخواست آئی تو ہم

نے دیکھا کہ ملک صلاح الدین صاحب کی صحت کے لئے پہلے سے بھی زیادہ ابتہال اور تضرع سے دعائیں کر رہے ہیں۔ تب اندازہ ہوا کہ ان کے دل میں سارے ہی شاگردوں کے لئے محبت کا ایک خاص گوشہ ہے اور جب کسی شاگرد کو بیمار پاتے ہیں تو اس کی صحت کے لئے دل و جان سے گداز ہو کر دعائیں کرتے ہیں۔ استاد اپنے شاگردوں کو اور دے بھی کیا سکتا ہے؟ اور جن شاگردوں کو ایسے استاد نصیب ہو جائیں اورانہیں چاہئے بھی کیا؟ چھوٹا منہ بڑی بات ہے مگر ہم نے اپنے شاگردوں سے محبت کرنے کے قرینے حضرت پھوپھا جی سے ہی سیکھے ہیں۔ ورنہ ہم کیا ہماری استادی کیا؟ فارسی والوں کا کہا تو ہمیں یاد ہی ہے

'درس ادیب اگر بود زمزمہءِ محبتے۔ جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را' مگر بات صرف مکتب تک محدود نہیں رہنی چاہئے۔ حضرت پھوپھا جی نے اپنے شاگردوں سے تعلق کو زندگی بھر کا تعلق بنایا اور یہی سمجھ کر نبھایا۔ ان کی آخری بیماری کے دوران ہم نے ان کے شاگردوں کو جس طرح بیقراری کے ساتھ ان کے لئے دعائیں کرتے دیکھا اور تشویش کا اظہار کرتے دیکھا وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ ایک کمرہ کا چھوٹا سا مکان تھا۔ لوگ آتے۔ باہر ہی سے حال پوچھتے اور دعائیں کرتے واپس چلے جاتے۔ پھوپھا جی آخر وقت تک ہوش میں رہے اس لئے جس جس کے بارہ میں انہیں اطلاع کی جاتی کہ وہ عیادت کے لئے حاضر ہوئے تھے تو بہت ممنونیت کا اظہار کرتے اور بہت دعائیں دیتے۔ دعا ان کا خاص وصف تھا۔ ان کے لب ہر وقت ذکر الٰہی سے تر رہتے تھے۔ ان کی وفات پر معلوم ہوا کہ کتنا بڑا اور بزرگ عالم دنیا سے اٹھ گیا ہے۔ موت العالِم موت العالَم۔

دراصل اس مضمون میں ایسے علماء کا ذکر کرنا مقصود ہے جو سٹیج کے آدمی نہیں تھے یعنی تقریر کے مردِ میدان نہیں تھے مگر ان کا وجود سلسلہ کے لئے اسی طرح مفید اور ضروری تھا جس طرح عالم مقرروں کا

ہوتا ہے۔خود ہمارے ابا حضرت مولوی احمد خاں نسیم فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ تو دیہاتی مبلغ ہیں۔ ایک بار مولانا عزیز الرحمن منگلہ ابا جی سے کہنے لگے آپ جماعت احمدیہ کے جلسہ سالانہ پر تقریر کیوں نہیں کرتے؟ ابا جی نے کہا میں سٹیج کا آدمی نہیں ہوں۔منگلہ صاحب کہنے لگے مگر آپ چک منگلے میں تو خوب تقریریں کرتے ہیں۔ابا جی نے کہا درست مگر جماعت احمدیہ کے سالانہ جلسے میں اور چک منگلے کے جلسے میں بہت فرق ہے۔جلسہ سالانہ کا سٹیج ایک علمی سٹیج ہے جہاں سے سلسلہ کے علماء جماعت کا علمی موقف دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ہم لوگ دیہاتیوں کے طور طریقوں سے دیہاتیوں تک پیغام پہنچاتے ہیں اور بس۔سلسلہ عالیہ احمدیہ میں ہزاروں ایسے لوگ تھے جو سٹیج کے آدمی نہیں تھے مگر سلسلہ کے لئے ان کا وجود اسی طرح لابدی تھا۔حضرت حافظ مختار احمد شاہجہانپوری مانے ہوئے عالم تھے مگر سٹیج کے آدمی نہیں تھے۔اگر کہیں جوانی میں سٹیج پر تقریر کی ہو تو وہ ہمارے ہوش سے پہلے کی بات ہے۔ہم نے سلسلہ کے اکثر علماء کو ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے دیکھا۔یہ تو ہمارے اپنے تجربے کی بات ہے کہ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب نے کسی مسئلہ پر حضرت حافظ صاحب سے راہنمائی چاہی اور ہمیں ہی خط دے کر بھیجا حضرت میاں صاحب کا استفسار بھی ہم نے ہی لکھا اور حضرت حافظ صاحب کا جواب بھی ہمیں نے قلمبند کیا۔جماعت کے علماء میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔حافظ صاحب نرے پرے شاعر ہی نہیں تھے بڑے متبحر عالم تھے۔ایک بار سلسلہ کے کسی معاند نے حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے کلام پر اعتراض کیا کہ حضرت صاحب نے ''کہ تا'' کی ترکیب باندھی ہے جو سراسر غیر فصیح ہے۔''اک برہنہ سے نہ یہ ہوگا کہ تا باندھے ازار''۔ہم حاضر تھے۔حضرت حافظ صاحب فرمانے لگے میاں بتاؤ تو کس کس استاد شاعر نے ''کہ تا'' کی ترکیب باندھی ہے؟ ہمارا سارا علم غالب تک پہنچ کر تمام ہو گیا کہ 'آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے ''کہ تا''۔اس پہ کھل جائے کہ اس کو حسرتِ

دیدار رہے۔ حافظ صاحب نے اساتذہ شعراء اردو کے کلام سے اپنی یادداشت کے زور پر، خدا جھوٹ نہ بلوائے، تو بیسیوں اشعار ہمیں ایسے سنا دئے کہ لو ان اساتذہ نے ''کہ تا'' کی ترکیب باندھی ہے اور معترض نے کہ اپنے کو بڑا مستند اور عالم صحافی جانتے ہیں کتنا بودا اعتراض کیا ہے انہیں ان اساتذہ کے کلام کا علم ہی نہیں۔ اب ایسے وجود کہاں؟ مگر حضرت حافظ صاحب خاموش عالم تھے۔ گفتگو ایسی کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی مگر تقریر ان کا میدان نہیں تھا۔

حضرت حافظ صاحب کی یادداشت کمپیوٹر جیسی تھی۔ حوالے انہیں یاد رہتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ہم حاضر تھے۔ حضرت حافظ صاحب کو کسی حوالہ کی ضرورت پڑی۔ ان کا کمرہ کتابوں کا کباڑ خانہ لگتا تھا۔ فرمایا 'میاں تمہی تکلیف کرو وہ سامنے کتابوں کا جو ڈھیر ہے اس میں ساتویں یا چھٹے نمبر پر ایک کتاب پڑی ہے اس کے صفحہ 315 پر آٹھویں یا دسویں سطر میں ایک حوالہ ہے جو مجھے درکار ہے ذرا ہاتھ بڑھائیو'۔ ہم حیران رہ گئے۔ حافظ صاحب کی بات باون تولے پاؤ رتی کی تھی۔ حوالہ اسی مقام پر موجود تھا۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا اور پھر کتاب رکھ دی۔ دو ہفتوں کے بعد اتفاق سے اسی حوالہ کی ضرورت پڑی تو کسی اور مقام پر رکھی ہوئی کتاب کا محل وقوع انہیں یاد تھا۔ ہم سمجھتے تھے ان کا کمرہ کتابوں کا کباڑ خانہ ہے مگر وہ تو کتب خانہ نکلا۔ اس کتب خانہ کی ساری کیٹلاگ حافظ صاحب کے ذہن میں محفوظ تھی۔ ایسی یادداشت ہم نے بہت کم دیکھی۔ جاپان میں ایک لائبریرین کی یادداشت میں حضرت حافظ صاحب کی یادداشت کا پرتو نظر آیا مگر ان کا میدان ہی کتاب خانہ تھا۔ ہمارے شعبہ اردو کی لائبریری اپنی نئی عمارت میں منتقل ہو رہی تھی۔ ساری کتابیں ایک ڈھیر کی صورت میں بکھری پڑی تھیں۔ اتفاق سے جاپانی ٹی وی ''این ایچ کے'' والوں کو کسی حوالہ کی ضرورت پڑی۔ انہوں نے ہم سے استمداد کیا۔ ہم حوالہ دیکھنے کے لئے لائبریری میں پہنچے تو ساری کتابوں کے پشتے لگے ہوئے تھے۔ ہمارے ہاتھوں

کے طوطے اڑ گئے کہ اب کیا ہوگا؟ لائبریرین سے رابطہ کیا فرمانے لگیں کہ آپ کی مطلوبہ کتاب فلاں پشتے میں فلاں نمبر پر پڑی ہے ہم نے دیکھا کہ کتاب موجود تھی۔ یہ صفت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے سلسلہ عالیہ احمدیہ کو ایسے عالم دے رکھے تھے جو اپنی ذات میں چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ ہمارے مولانا دوست محمد شاہد کوئی کم حوالہ شناس نہیں انہیں بھی ہزاروں حوالے زبانی یاد رہتے ہیں۔ ربوہ کے ابتدائی دنوں میں ایک صاحب لائبریری میں تھے حکیم غلام حسین غالباً ان کا نام تھا۔ وہ بھی کتابوں کے عاشق تھے۔

ایک خاموش عالم مولانا عبداللطیف بہاولپوری تھے۔ جامعہ احمدیہ میں استاد تھے۔ ہمیں ان کی خدمت میں حضرت مولانا راجیکی صاحب نے ایک بار کسی کام کی غرض سے بھیجا تھا۔ مولوی صاحب راجیکی صاحب کے گھر کے قریب

(قریب کیا' عنقریب' یعنی بالکل سامنے کونے پر) رہتے تھے۔ ہم گئے تو اس وقت کسی کتاب کی تصنیف میں مصروف تھے حضرت مولانا راجیکی صاحب کا پیغام سنا تو فوراً اس کی تعمیل کی طرف توجہ کی۔ ان کی وفات پر ان کے بارہ میں مضامین چھپے تو ان کے علمی مرتبہ کا اندازہ ہوا مگر ان کی طبیعت میں ایسی خاموشی اور عزلت گزینی تھی کہ انہیں کبھی نمایاں نہیں دیکھا۔

جماعت کے خاموش علماء کا ذکر ہو رہا ہے تو خیال آ رہا ہے حضرت مرزا بشیر احمد اور حضرت مرزا شریف احمد صاحب بھی تو خاموش علماء میں سے تھے کیونکہ یہ دونوں بزرگ بھی سٹیج کے آدمی نہیں تھے۔ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کا ذکر تو ہم کئی جگہ کر چکے ہیں مگر حضرت مرزا شریف احمد صاحب کا ذکر خیر اب تک کہیں نہیں ہوا حالانکہ ان سے تو قادیان کے زمانہ سے تعلق تھا بلکہ ان سے تو ہمارا آباواجداد کے زمانہ سے تعلق تھا۔

ہمارے دادا مولوی محمد افضل خاں سلسلہ احمدیہ میں بیعت ہوئے تو قادیان میں آ بسے۔ اچھی خاصی زمینداری تھی۔ زمین بٹائی پر دے دی اور درحبیب پر دھونی رما کر بیٹھ گئے اور حضرت مرزا شریف احمد صاحب کے دربان ہو گئے۔ ہمارے تایا محمد خاں حضرت نواب مبارکہ بیگم صاحبہ اور حضرت نواب امۃ الحفیظ صاحبہ کی کوٹھی کی دربانی کرتے تھے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا اور الحمدللہ کہ کیا کچھ نہیں دیا، وہ سب خاندان بانی سلسلہ کی دربانی کا صدقہ ہے۔ ثم الحمدللہ۔ ہمارے دادا نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک سو بیس برس کے قریب عمر پائی۔ ہم نے جب بھی انہیں اپنی ہوش میں دیکھا اپنے گھر میں آم کے درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھے اور قرآن پڑھتے دیکھا۔ دادا جان کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت میاں شریف احمد صاحب کی کوٹھی کی دربانی ان کے سپرد تھی۔ عمارت میں توسیع ہو رہی تھی جو دیوار بنی اس کے بارہ میں دادا جان کو خیال ہوا کہ اس میں کوئی کمی رہ گئی ہے ٹھیک سے نہیں بنی۔ آپ نے حضرت بیگم صاحبہ سے ذکر کیا۔ فرمانے لگیں بابا افضل خاں ''دیوار اتنی ہی کمزور ہے تو بھلا اسے ایک دھکے میں گرا تو دو''۔ دادا جان نے ایک ہی دھکا دیا تو سیمنٹ چنی ہوئی دیوار وہ جا پڑی۔ سب لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ حضرت میاں صاحب نے معماروں کو بلا کر دوبارہ دیوار بنوائی معماروں نے اعتراف کیا کہ واقعی دیوار کی تعمیر میں ان لوگوں نے پورا سیمنٹ استعمال نہیں کیا تھا۔ ایک اور واقعہ بھی ہم نے حضرت میاں شریف احمد کی زبان مبارک سے سنا کہ ایک بار کوٹھی میں ایک سانپ نکل آیا۔ سانپ کی دہشت ایسی ہوتی ہے کہ ہر طرف دہائی مچ گئی۔ دادا جان نے پوچھا کیا ہوا معلوم ہوا سانپ ہے۔ دادا جان نے کہا اسے مارے نہیں۔ میں اسے حصار میں پابند کر دیتا ہوں کسی کو کچھ نہیں کہے گا۔ چنانچہ دادا جان نے کسی دعا کے تحت اس سانپ کے گرد ایک حصار کھینچا اور سانپ کو حکم دیا کہ اس حلقہ میں سمٹ کر بیٹھ جائے۔ وہ بیٹھ گیا۔ آپ نے اسے سرزنش فرمائی اور کہا خبردار آئندہ ان بزرگوں کی اولاد کو تنگ نہ کرنا۔ یہ کہہ کر

سانپ کو چلے جانے کا حکم دیا پھر اس کوٹھی میں کبھی کوئی سانپ نظر نہیں آیا۔ ہم بچے ان کے گھر میں یوں کھیلتے پھرتے تھے جیسے اپنا ہی گھر ہو۔ ربوہ میں حضرت مرزا شریف احمد صاحب اصلاح وارشاد کے ناظر تھے۔ ہم انجمن کے کلرک ہونے کے باوجود حضرت میاں صاحب کے دفتر میں کام نہیں کرتے تھے مگر میاں صاحب کو خاموشی سے آتے جاتے دیکھتے رہتے تھے دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا۔ حضرت میاں صاحب نہایت کم گو آدمی تھے۔ دفتر کی طرف آتے ہوئے کئی بار انہیں دیکھا مگر خاموش اور خود اپنی ذات میں مگن۔ پیدل چلنا انہیں بہت پسند تھا۔ اس زمانہ میں آپ دارالصدر سے یعنی اپنے گھر سے چلتے اور خلیفہ صلاح الدین صاحب کے گھر محلہ دارالیمن پیدل یا کبھی کبھی سائیکل پر جاتے۔ پاؤں دھول میں اٹ جاتے مگر چہرہ پر گرد ملال نہ ہوتی۔ خلیفہ صلاح الدین صاحب سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں دوست پہروں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ دونوں میں کیا گفتگو رہتی ہوگی معلوم نہیں کیونکہ ہم نے انہیں گفتگو کرتے نہیں سنا۔ مگر یہ بھی ہوسکتا ہے دونوں دوست خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو تکتے رہتے ہوں۔ جب بے تکلفی اور محبت اس درجہ تک پہنچ جائے تو باتیں کرنے کو رہ بھی کیا جاتا ہے؟ ہم نے حضرت میاں شریف احمد صاحب کی اس خاموش محبت کا دور سے ہی نظارہ کیا ہے۔

ایک بار خلیفہ صلاح الدین احمد سے ملنے کے لئے ان کے در دولت پر حاضر ہونے کا موقعہ ملا۔ ہم کسی رسالہ کے لئے کوئی مضمون لکھ رہے تھے فلسفہ کی کوئی بات تھی جو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کسی نے بتایا کہ خلیفہ صلاح الدین صاحب فلسفہ کے عالم ہیں ان سے رابطہ کرو۔ چنانچہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مسئلہ حل ہو گیا مگر خلیفہ صاحب سے بے تکلفی نہ ہوسکی کہ پھر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی جسارت کرتے۔ ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ خلیفہ صاحب واقعتاً بڑے عالم آدمی تھے مگر خاموش اور گوشہ نشیں۔ ہمیں یہ تک معلوم نہیں تھا کہ خلیفہ صاحب کوئی کام بھی کرتے ہیں یا نہیں یا ان

کے روزگار کا کیا بندوبست ہے مگر ہم نے انہیں بے فکر اور مطمئن ہی پایا۔ اپنے علم پر مطمئن تھے اور جس شخص کے گھر حضرت میاں شریف احمد چل کر جاتے ہوں اس کے مستغنی ہونے کی بات سمجھ بھی آتی ہے۔

ربوہ کے خاموش عالموں میں جو عالم بہت ہی خاموش عالم تھے وہ ہمارے ملک مبارک احمد صاحب تھے۔ عربی رسالہ البشریٰ کے ایڈیٹر۔ انتہا کے سادہ اور سادہ دل۔ جامعہ احمدیہ کے استاد تھے اپنے کام سے کام رکھتے۔ مجلسوں میں جانا انہیں پسند نہیں تھا ہماری ایک پھوپھی زاد بہن تھیں وہ دوالمیال کے حکیم عطا محمد صاحب سے بیاہی ہوئی تھیں اس لئے دوالمیال والوں سے تھوڑا سا رشتہ بھی تھا۔ قبلہ ملک صاحب دوالمیال کے تھے۔ ان کے والد ملک عبدالرحمن صاحب اونچے لمبے قدآور بزرگ تھے۔ بڑھاپے میں قدخم کی کیفیت ان کے ہاں جھلکنے لگی تھی مگر بات میں وہی طنطنہ قائم تھا مگر ملک مبارک احمد صاحب نہایت خاموش طبع اور عافیت جو تھے ہم نے انہیں کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات کرتے یا کسی پر غصہ کرتے نہیں دیکھا۔ ان کے بچوں میں سے منور ہمارا شاگرد ہوا۔ ان کی بچیاں ہماری آنکھوں کے سامنے پل کر بڑی ہوئیں اور اب ماشاء اللہ گھر بار والی ہیں۔ ملک صاحب کو اپنی اولاد سے انتہا کا پیار تھا۔ ان کی بچیوں میں سے امۃ الباسط نے انجینئر نگ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ایک بار فرمانے لگے مجھے لاہور کبھی اچھا نہیں لگتا تھا اب اچھا لگنے لگا ہے۔ ہم نے کہا کیوں؟ فرمایا 'اس لئے کہ میری بیٹی لاہور میں پڑھ رہی ہے'۔ یہ تھے ملک مبارک احمد صاحب۔ علم کے پھل سے لدے ہوئے درخت کی طرح جھکے ہوئے۔ ہمارے دوست علامہ یعقوب امجد کہا کرتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے ملک صاحب سے عربی نہیں پڑھی تو اسے عربی کی لذت کا اندازہ ہی نہیں ہوسکتا ہم بھی انہیں محرومین میں سے ہیں۔ اب ملک مبارک احمد صاحب کا ذکر آ گیا تو ایک بوجھ بھی اپنے سر کا اتار دیں۔ ان کی بیٹی

امۃ الباسط کی شادی ہوئی۔ وہ اپنے میاں کے ساتھ قبلہ مولانا محمد احمد صاحب جلیل مدظلہ کی خدمت میں سلام کرنے کو ہمارے گھر آئی۔ صبح کا وقت تھا۔ ہم نے گھنٹی کی آواز پر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک نو جوان لڑکی اور اس کے ساتھ ایک نوجوان آدمی کھڑے ہیں۔ کہنے لگے ہم حضرت مولوی صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ اتفاق یوں تھا کہ مولوی صاحب رات کو بیمار ہو گئے تھے اور شدت علالت کی وجہ سے ہسپتال میں داخل کروائے گئے تھے۔ ہم نے اس جوڑے سے کہا کہ قبلہ مولوی صاحب تو بیمار ہیں اور ہسپتال میں ہیں۔ وہ واپس ہونے لگے تو ہم نے ''تاکید'' کی کہ اب کہیں ان کو ہسپتال میں جا کر تنگ نہ کیجئے گا کیونکہ ڈاکٹر نے انہیں آرام کا مشورہ دیا ہے۔ اس پر وہ لڑکی کہنے لگی '' آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں امۃ الباسط ہوں ملک مبارک احمد صاحب کی بیٹی''۔ اب باسط ہمارے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوئی تھی اور کچھ روز پہلے ہم نے اسے اپنے ہاتھوں رخصت کیا تھا۔ اس کی یہ بات سن کر ہم بہت شرمندہ ہوئے۔ ہم نے بہترا کہا بیٹی اندر آؤ مولوی صاحب کی بیگم سے ملو ہمارے گھر والوں سے پیار لو۔ مگر اس کے میاں اتنے ناراض ہو گئے تھے کہ انہوں نے اندر آنا پسند نہیں کیا باسط بیٹی ہمیں اس بات کا بہت افسوس ہے۔ ہم کب سے یہ بوجھ اٹھائے پھرتے تھے کہ تم سے ملنا ہو تو اس '' گستاخانہ تاکید'' کی معافی مانگیں۔ ملنا تو نہ ہوا۔ اب اس کے ابا کا ذکر آ گیا تو اپنے سر کا بوجھ اتار رہے ہیں۔ امید ہے امۃ الباسط اور اس کا میاں ہماری کوتاہی سے صرف نظر کریں گے اور معاف کر دیں گے۔ اب تو وہ ماشاء اللہ آل اولاد والی ہوگی۔ اللہ اسے خوش رکھے۔ بعض اوقات ایک ذرا سی بات کتنے پچھتاوے پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ (پچھلے سال ہم ٹورنٹو میں احمدیہ ابوڈ آف پیس کی عمارت کے سامنے کسی کے انتظار میں موٹر میں بیٹھے تھے کہ امۃ الباسط دور سے ہمیں پہچان کر آئی اور سلام کیا۔ ماشاء اللہ بڑی پیاری لگ رہی تھی مگر اس سے بات کرنے کا موقع تھا نہ وقت۔ الحمد للہ کہ اب وہ بھی یہیں کینیڈا میں آباد ہے۔ ہماری

بیگم نے بتایا کہ اس کا بیٹا بھی اب ماشاءاللہ بڑا سا ہے)

خاموش عالموں میں سے حضرت مولوی محمد حسین صاحب سبز پگڑی والے بھی تھے۔ عام جلسوں میں تقریر کرنا تو آپ نے اس وقت شروع کیا جب کبرنا موت الکبراء کے مصداق حضرت بانی سلسلہ کے رفیقوں میں سے آپ آخری رفیق کے طور پر رہ گئے ورنہ اس سے پہلے جلسوں سے گریز پا ہی رہتے تھے۔ دیہاتی مبلغ تھے۔ ابا جی کے ساتھیوں میں سے تھے۔ گیانی واحد حسین صاحب جنہیں میں جماعت احمدیہ کے صوفیاء میں ایک نہایت بلند مرتبہ صوفی جانتا ہوں بھی ایسے ہی عالم تھے۔ گورمکھی کے عالم تھے مگر ان کا تخصص گورمکھی نہیں سکھوں والی پنجابی زبان تھی۔ بولتے تو یونہی لگتا تھا سکھوں کا کوئی گیانی بول رہا ہے۔ حضرت مولوی محمد حسین صاحب بھی نہایت سادہ طبیعت عالم تھے۔ ہم نے کئی مرتبہ انہیں دیہاتیوں میں بیٹھے گفتگو کرتے سنا۔ خاموشی سے معترض کا اعتراض سنتے اور پھر آہستہ سے کوئی ایسا نکتہ بیان فرما دیتے کہ معترض لاجواب ہو جاتا۔ گورمکھی کا ذکر آیا تو اپنے گیانی عباداللہ صاحب یاد آئے۔ گیانی صاحب کا تخصص گورمکھی اور سکھ مت تھا۔ اس بارہ میں سکھ بھی انہیں گرو مانتے تھے۔ 1965 کی جنگ کے بعد یا پہلے ریڈیو پاکستان والوں کو مشرقی پنجاب کے سکھوں کے لئے ایک خاص پروگرام پنجابی دربار شروع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان لوگوں نے حضرت خلیفۃ المسیح سے کہہ کر اجازت مانگی کہ ہمیں گیانی عباداللہ صاحب کی خدمات کی ضرورت ہے کیونکہ ان کے سوا کوئی ایسا نہیں جو سکھوں کا جواب سکھوں کی زبان اور ان کے لٹریچر سے دے سکے۔ گیانی عباداللہ صاحب نے گورمکھی میں اور سکھوں کے بارہ میں نہایت مفید لٹریچر تخلیق کیا ہے جو نہ صرف سلسلہ کے لئے بلکہ قومی لحاظ سے پاکستان کے لئے اب تک مفید اور مستند سمجھا جاتا ہے۔

گورمکھی کے ذکر سے بات اپنے بزرگ چوہدری عبدالواحد صاحب تک پہنچی۔ آپ ہندی کے عالم

فاضل تھے۔ان کے صاحبزادے ماجد شاہد ہمارے ساتھ سائیکل پر چنیوٹ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ چوہدری صاحب نے بہت کوشش کی کہ ماجد اور اس کے ساتھ ہم ان سے اور کچھ نہیں تو ہندی لکھنا پڑھنا ہی سیکھ لیں مگر باوجود کوشش کے طبیعت ادھر نہیں آئی۔ اب اس عمر میں سویڈن والوں نے ہم سے فرمائش کی کہ آپ ہندی سیکھ لیں تو ہمیں آپ کو شعبہ ہندو پاکستان میں جگہ دینا آسان ہو جائے گا مگر ہماری طبیعت پھر بھی اس طرف مائل نہ ہوئی ورنہ ہمارے دوست اوم پرکاش عارف ہوشیار پوری نے تو ہمارے لئے ہندی کا ایک قاعدہ باقاعدہ تصنیف کر کے سٹاک ہام بھجوا دیا۔ چوہدری عبدالواحد بھی بڑے ہی خاموش طبع بزرگ تھے۔ ہندی کے رسالے منگواتے اور پڑھتے رہتے تھے اور سلسلہ کے مفید مطلب حوالے نکالتے رہتے تھے۔اصلاح وارشاد کے دفتر میں نائب ناظر تھے وضع داری سے شلوار قمیص کے اوپر ہاف کوٹ پہنتے اور ٹوپی اوڑھتے تھے ہم نے بہت کم انہیں کوٹ کے بغیر دیکھا۔ خالہ زینب ان کی بیگم ہم سے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی تھیں ان کا گھر ہمارے لئے اپنا ہی گھر تھا ہم نے گھر میں بھی چوہدری صاحب کو خاموش اور مطالعہ میں مصروف پایا۔عجیب کتابی قسم کے بزرگ تھے مگر خشکی انہیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ان کے چہرہ پر ہر وقت ایک سنجیدہ سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ کچے کوارٹروں میں رہتے تھے تو ہم سائیکل پر ان کے گھر پہنچتے۔ ماجد باہر آتا اور ہم چنیوٹ کے لئے روانہ ہو جاتے۔ چوہدری صاحب کچھ دور تک ہمیں دیکھتے رہتے پھر اندر چلے جاتے۔ ان کی دعائیں ہمارے ساتھ رہتیں۔

مکرم ملک سیف الرحمن مفتی سلسلہ کے بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ہم نے قادیان میں حضرت سید سرور شاہ صاحب کو دیکھا ہوا تھا وہ کبھی جبہ و دستار کے بغیر نظر نہیں آئے تھے۔ان کے قریبی لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ اپنے مرتبہ کا بہت لحاظ رکھتے تھے مبادا کوئی مسئلہ پوچھنے والا ان کے لباس کو دیکھ کر ان کے مرتبہ

کا اندازہ نہ کر سکے اور ٹھوکر کھا جائے۔ مگر ہم نے مکرم ملک سیف الرحمن صاحب کو اور پھر اپنے قبلہ و کعبہ مولینا محمد احمد جلیل کو اس بارہ میں بے پروا پایا۔ مولینا جلیل صاحب تو اکثر باہر جاتے ہوئے شیروانی زیب تن فرماتے ہیں مکرم ملک صاحب کو ہم نے کئی بار بلکہ اکثر بغیر شیروانی کے جامعہ آتے جاتے دیکھا۔ ٹوپی ضرور اوڑھتے تھے انہیں ننگے سر دیکھنا یاد نہیں۔ سلسلہ کے علماء میں سے ایک ایسے بزرگ کا بھی ذکر پڑھ رکھا ہے کہ وہ ٹوپی نہیں اوڑھتے تھے حالانکہ حضرت امام جماعت الثانی کے استادوں میں سے تھے۔ ان کا مسلک تھا کہ ٹوپی اوڑھنا کوئی دینی مسئلہ نہیں تہذیبی مسئلہ ہے اور نماز ننگے سر بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ ہمیں اسی لئے وہ بزرگ بہت اچھے لگتے ہیں۔ جملۂ معترضہ۔ ابھی پچھلے دنوں عزیزم راجہ منیر احمد صاحب صدر خدام الاحمدیہ کی ایک دو تصویریں نگاہ سے گذریں جن میں آپ نے ایک نہایت ٹیکنی کلر ٹوپی اوڑھ رکھی تھی۔ ہم نے انہیں پیغام بھجوایا کہ اگر صدر ایسی ٹیکنی کلر ٹوپی اوڑھے گا تو مہتممین کون سی ٹوپی اوڑھا کریں گے؟ ان کا جواب آیا کہ وہ ٹوپی آپ نے کسی کی تالیف قلب کے لئے اوڑھی تھی اس لئے مہتممین کے بارہ میں فکرمند نہ ہوں ہم اس وقت سے یہی سوچ رہے ہیں کہ اس فقرہ کا کیا مطلب ہے؟ یہ کہ مہتممین کسی کی تالیف قلب ہرگز نہیں کریں گے؟ یا تالیف قلب کے لئے ٹوپی اوڑھنا ہی پڑی تو ایسی ٹیکنی کلر ٹوپی نہیں اوڑھیں گے؟ ہم ملک سیف الرحمن صاحب کے ذکر سے چلے تو کہاں پہنچ گئے۔ مکرم ملک صاحب سے ہماری دوستی کا تعلق بھی ایسا ہی تھا۔ جہاں ملتے بہت شفقت فرماتے۔ دوستی یوں شروع ہوئی کہ ان کی بیگم امۃ الرشید شوکت لجنہ کے رسالہ مصباح کی ایڈیٹر تھیں اور ہم اس زمانہ میں مصباح میں خوب چھپا کرتے تھے کیونکہ یہ رسالہ ہماری نظمیں مضامین چھاپ دیتا تھا ایک بار رسالہ چھپنے سے پہلے مکرم ملک صاحب سے سرراہ ملاقات ہوئی۔ فرمانے لگے اب کی بار مصباح میں آپ کی نظم آرہی ہے۔ بڑی اچھی نظم ہے۔ ہم نے شوخ چشمی کی اور کہا ''اچھا تو آپ ہیں امۃ الرشید

شوکت؟''۔ ملک صاحب بہت ہنسے۔ ہماری دوستی پکی ہوگئی۔ آپ جامعہ کے پرنسپل تھے۔ سلسلہ کے مفتی تھے مگر ذرا جوان کا مرتبہ ہماری اور ان کی دوستی میں حائل ہوا ہو۔ پھر ان کے بچے ہمارے شاگرد ہوگئے تو ایک نیا رشتہ بن گیا۔ ملک صاحب بھی خاموش عالم تھے۔ تقریر میں ''ضرورت شعری'' کی وجہ سے کرتے ہوں گے کہ جامعہ کے پرنسپل تھے مگر عام جلسوں میں انہیں تقریریں کرتے نہیں دیکھا۔ کالج کے ادبی اجلاسوں میں اور خاص طور سے مشاعروں میں ضرور تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک بار تساہل ہوا۔ دعوت نامہ انہیں نہ پہنچا یا رستہ میں کہیں ضائع ہوگیا۔ اس کے باوجود تشریف لائے فرمانے لگے میں نے سوچا یہ تو ہو نہیں سکتا آپ نے دعوت نامہ نہ بھجوایا ہو یقیناً رستہ میں کہیں ضائع ہوگیا ہوگا اس لئے میں آ گیا ہوں۔ مگر دعوتوں کے بارے میں بہت محتاط تھے۔ کالج کی ہر دعوت میں پرنسپل جامعہ ہونے کی وجہ سے مدعو ہوتے تھے اگر دعوت نامہ نہ پہنچ سکتا تو کبھی نہ آتے۔

ربوہ کے ناظر صاحبان وکلا صاحبان اور چنیدہ علما سلسلہ کو ہم 'ربوہ کی ولیمہ الیون' کے نام سے پکارا کرتے تھے کہ ہر ولیمہ میں یہی لوگ ربوہ کے ممتاز شہری ہونے کی وجہ سے مدعو ہوتے تھے اور ہیں۔ ملک صاحب اس الیون میں شامل ہونے کے باوجود دعوتوں کے رسیا نہیں تھے۔ شوگر کا مریض ہوجانے کے بعد تو محتاط بھی ہوگئے تھے مگر ہمیں یہ فلسفہ بھی ملک صاحب ہی نے سمجھایا کہ انسانی جسم کو ایک مناسب مقدار میں میٹھے کی ضرورت بہرحال رہتی ہے اس سے جسم کو محروم نہیں رکھنا چاہئے۔

اس طرح جسم کے صحت مند خلیے متاثر ہوتے ہیں۔ یہاں ہمارا شوگر سپیشلسٹ یورپ کا مانا ہوا شوگر سپیشلسٹ ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس کے زیر علاج رکھنے کا انتظام فرمایا ہوا ہے۔ اس نے دیگر ہدایتوں کے علاوہ یہ ہدایت بھی دی ہوئی ہے کہ جسم کو مکمل طور پر شکر سے محروم نہیں رکھنا چاہئے۔ شوگر زیادہ ہوجائے تو اس کا تدارک کیا جاسکتا ہے مگر جسم میں شکر کی کمی ہوجائے تو اس سے جسم کو ایسا نقصان

پہنچنے کا احتمال ہوسکتا ہے جس کا ازالہ نہ کیا جا سکے۔ یہاں تو ایسی بہت سی میٹھی غذائیں میسر ہیں جو شوگر کے مریضوں کے لئے بنی ہیں اور بے دریغ شوگر کے مریضوں کو کھلائی جاتی ہیں ہمارے ہاں ابھی ایسی خوراک میسر نہیں اس لئے شوگر کے مریض بیچارے ان سے محروم رہتے ہیں پچھلے برس ہم کینیڈا گئے تو عزیزی ہشام ملک نے ایڈمنٹن بلایا۔ ہم نے اسے مٹھائی کے کاروبار میں ملوث کیا لتھڑے ہوئے دیکھا تو یہی سوچا کہ ملک صاحب خود تو میٹھے سے اس طرح فیضیاب نہ ہو سکے۔ ہشام کو اس راہ پر لگا گئے۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔

ربوہ میں تاج الدین نام کے دو عالم تھے۔ ایک قبلہ مولوی تاج الدین صاحب ناظم قضا اور دوسرے تاج الدین 'مولوی فاضل گر' کہلاتے تھے۔ مولوی فاضل گر اس لئے کہ ان کے شاگرد مولوی فاضل کا امتحان دیتے تو پاس ہو جاتے خود امتحان میں بیٹھتے تو کامیاب نہ ہوتے تھے۔ اس لئے فرمایا کرتے تھے میں مولوی فاضل نہیں مولوی فاضل گر ہوں۔ نہایت حلیم الطبع اور منکسر المزاج بزرگ تھے۔ سادہ سے لباس میں ملبوس رہتے۔ کئی بار انہیں دیکھا کہ دودھ دہی کی دکان پر قطار میں کھڑے ہیں۔ ایک دو بار احتراماً انہیں پہلے باری دینا چاہی آپ نے پسند نہیں فرمایا۔ ان کے شاگردوں سے ان کے بارہ میں سنا کہ بہت عالم آدمی ہیں۔

جماعت احمدیہ کے عالموں اور دوسروں میں فرق دیکھنا ہو تو کسی پرانے استاد کا یہ شعر پیش نظر رکھیں تو بات واضح ہو جاتی ہے دوسرے علماء کو فخر ہے کہ

ہم نہ نکہت ہیں نہ گل ہیں جو مہکتے جاویں
آگ کی طرح جدھر جاویں دہکتے جاویں

مگر ہمارے علماء جدھر جاتے پھول کی طرح مہکتے جاتے تھے۔ ان کے علم کی خوشبو چاروں طرف

پھیلتی رہتی تھی اسی خوشبو نے لاکھوں آدمیوں کو اپنی طرف کھینچا تھا اور کھینچتی ہے۔ ذکر خاموش علماء کرام کا تھا ایک بزرگ تھے جنہیں جامعہ میں بائبل پڑھانے پر مامور دیکھا۔ ان کا اسم گرامی عبدالخالق تھا۔ عیسائیت سے تائب ہو کر احمدی ہوئے تھے۔ بائبل کے ایسے عالم کہ گویا ساری بائبل ان کی انگلیوں کی پوروں پر تھی۔ لوگ باگ بائبل کا حوالہ تلاش کرنے کے لئے لائبریری جانے کی بجائے انہیں جا ملتے تھے۔ انہیں دودھ جلیبی کا بہت شوق تھا میٹھے کے عاشق تھے۔ چنیا بیگم سے پرانی شناسائی تھی ایک بار انہیں سانپ نے ڈس لیا۔ ہفتہ دس دن بعد ٹھیک ٹھاک ہو کر جامعہ آئے تو دوستوں سے بڑی مایوسی کے عالم میں فرمایا کوئی کمبخت بڑا ہی بودا سانپ تھا۔ میری دو روپے کی دودھ جلیبی ضائع کروادی خاک جو نشہ چڑھا ہو۔ اس نشہ کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو فلک سیر کے عادی ہوں انہیں سانپ کا زہر کچھ نہیں کہتا الٹا ان کے لئے لطف کا باعث بنتا ہے۔ قبلہ وکعبہ مولانا جلیل صاحب مدظلہ سے تو ان کی دوستی تھی۔ ہمارے ابا سے بھی ان کا پرانا تعلق تھا۔ جب کبھی ہمارے ہاں تشریف لاتے ابا ہمیں بھگاتے کہ جاؤ بازار سے جلیبی لے کر آؤ۔ پھر اندر کہلواتے کہ دودھ میں جلیبی ملا کر باہر بھیج دیں۔ خوب آدمی تھے۔ خاموش اور اپنے آپ میں مگن۔ مگر بائبل کا ذکر آتا تو جیسے شیر ہو جاتے۔ قرآن کے حافظ تو ہم نے بہت دیکھے شیخ صاحب بائبل کے حافظ تھے۔ اب ہم نے جس زمانہ میں انہیں دیکھا وہ ہمارے بچپن یا حد لڑکپن کا زمانہ تھا ہم ان کے مرتبہ اور مقام سے آشنا نہیں تھے مگر اپنے بزرگوں کو ان کا حد سے زیادہ احترام کرتے دیکھا۔

اور اب بات ایک ایسے عالم پر آ گئی جس کے بارہ میں لکھنا آسان لگتا تھا مگر لکھنے لگا ہوں تو مشکل میں ہوں کیا لکھوں؟ وہ شخص محض عالم ہی نہیں تھا ہمسایہ بھی تھا ایسا ہمسایہ جس پر سارے ہی فخر کرتے تھے اور ہیں۔ حسب دستور ہماری اور ان کی عمروں میں بہت تفاوت تھا مگر ہم پر مہربانی فرماتے تھے۔

یہ ان کی ذرہ نوازی تھی ورنہ میں کیا میری حقیقت کیا۔مولوی محمد دین صاحب ۔صدر صدر انجمن احمدیہ۔ جوانی میں امریکہ میں مبلغ بھی رہے۔ ہمارے سکول کی زندگی سے پہلے ہیڈ ماسٹری بھی کی ہم نے جب سے انہیں دیکھا بزرگ اور عمر رسیدہ ہی دیکھا۔انگریزی زبان سے بہت شغف رکھتے تھے انجمن کے دفتر میں صدر کی کرسی پر تھے ہم نے انہیں کبھی کتاب کے بغیر نہیں دیکھا ہاں آخری بیماری سے قبل بہت کمزور ہو گئے تھے مگر دفتر آنا جانا جاری تھا ڈاکٹروں نے عرق ریزی سے کام کرنا منع کر دیا ہوگا اس لئے خاموش اور اکیلے بیٹھے ذکر الٰہی کرتے رہتے تھے کیونکہ ان کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیتے تھے۔

حضرت مولوی صاحب کا لباس نہایت سادہ ہوتا تھا ہم نے اپنی ہوش میں انہیں اچکن پہنے نہیں دیکھا سادہ سا کرتا اور ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہنتے تھے۔ پاؤں میں بھی سادہ دیسی جوتا ہوتا تھا۔ ہمارے ابا بھی اللہ بخشے لباس کے معاملہ میں بالکل دیہاتیوں جیسے طور رکھتے تھے شلوار تو حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ناظر بناتے وقت حکماً پہنائی۔شلوار میں بہت بے آرامی محسوس کرتے تھے اس لئے تہبند باندھتے تھے۔گھر میں تہبند اور اس کے اوپر بنیان مہمان بھی آتے تو اسی لباس میں ان سے ملتے تھے بے تکلفی ان کے مزاج کا حصہ تھی تقریبات سے اسی لئے گھبراتے تھے کہ ان میں لباس کا تکلف کرنا پڑتا ہے۔سرکاری افسروں سے بھی اسی شان سے جا ملتے تھے اور افسران ان کی وجاہت اور دبدبہ کی وجہ سے ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ بات حضرت مولوی محمد دین صاحب سے چلی تو ان کے پڑوسی کو لپیٹ میں لے لیا۔ان کا مکان ہمارے گھر کے سامنے ہی تو تھا اکیلے ہی رہتے تھے دفتر اور گھر بس ان کی ساری تگ و تاز یہیں تک تھی۔بی اے کے امتحان کے دنوں میں ایک دو بار ان سے انگریزی کا کوئی محاورہ پوچھنے کی ضرورت پیش آئی مگر اس کے لئے اگلے دن صبح تک انتظار کرنا پڑا کہ دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلیں گے تو ان سے پوچھیں گے۔طبیعت میں اس بات کا بہت حجاب رہتا تھا کہ دروازہ

کھٹکھٹانے پر انہیں خود دروازہ کھولنے کے لئے آنا پڑے گا۔ ایک تانگہ انہیں لینے کے لئے آتا تھا اس میں دفتر جاتے تھے۔ اباجی ربوہ میں ہوتے تو انہیں اپنی جیپ میں لے جاتے۔ صدر صدر انجمن احمدیہ نے کبھی اس بات کی خواہش نہیں کی کہ انہیں لینے کو موٹر بھیجی جائے۔ تانگہ کی سواری پر خوش اور قانع تھے عجیب صوفیانہ زندگی کرتے تھے جیسے زندگی کی آسائشوں سے انہیں کوئی علاقہ ہی نہ ہو۔

ہماری ہی گلی میں حضرت مولوی عطا محمد صاحب تھے اپنے نسیم سیفی صاحب کے والد گرامی۔ ایک اور نابغہ۔ جامعہ میں غیر ملکی طلباء کو اردو پڑھانے پر مامور تھے۔ ان کا طریق تدریس ایسا سادہ تھا کہ غیر ملکی لڑکے دنوں میں ہی فر فر اردو بولنے لگتے تھے۔ مولوی صاحب بھی دیہاتی بود و باش رکھتے تھے گھر پر تو تہبند باندھتے مگر جامعہ جاتے وقت شلوار کرتا پہن لیتے پاؤں میں وہی دیسی جوتی۔ سر پر پگڑی نہیں صافہ باندھتے تھے گھر سے نکلتے تو ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھے جامعہ کا رخ کرتے ذکر الٰہی باقاعدگی سے کرتے ایک دو بار انہیں بہ آواز بلند بھی ذکر الٰہی کرتے سنا۔ واپس آتے تو گھر میں وہی دیہاتیوں والا لباس پہن لیتے۔ نمازوں کے لئے باقاعدگی سے مسجد میں جاتے کڑکتی دوپہر میں جب چیل انڈا چھوڑتی ہے انہیں مسجد کی طرف رواں دواں دیکھا۔

پیچھے ہندی کا ذکر ہوا تو مہاشہ فضل حسین صاحب کا چہرہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ مہاشہ فضل حسین صاحب کو جس زمانہ میں ہم نے دیکھا اس زمانہ میں ان پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا دائیں ہاتھ پر فالج کا اثر تھا چلنے میں بھی دقت ہوتی تھی مگر اپنے کام میں مگن رہتے تھے۔ سلسلہ کی بہت سی مفید کتابیں انہی کی چھاپی ہوئی ہیں۔ بہت احتیاط سے مواد اکٹھا کرتے اور چھاپتے تھے۔ ربوہ کی وسط والی پہاڑی کے عین دامن میں بسوں کے پرانے اڈہ کے قریب ان کا مکان تھا گرمیوں میں ربوہ کا یہ حصہ آگ کا ٹکڑا بن جاتا ہے مگر مہاشہ صاحب کو ہم نے اس گرم مکان میں بھی ٹھنڈے دل سے کام کرتے دیکھا

ہے۔ایک بار ایسا ہوا کہ چلنے میں دقت کے باوجود مہاشہ صاحب حضرت مرزا بشیر احمد صاحب سے ملنے کے لئے ان کے مکان پر تشریف لائے۔حضرت میاں صاحب ان کا بہت خیال رکھتے تھے اس روز خاص طور سے ان کے آنے پر ممنونیت کا اظہار کیا۔مہاشہ محمد عمر صاحب ایک اور ہندی کے وِدوان تھے ان کا بیٹا ہمارا کلاس فیلو تھا مگر مہاشہ صاحب ربوہ سے باہر سکھر میں اپنی تبلیغی مہم پر تھے اس لئے ان سے زیادہ استفادے کا موقع نہ ملا۔

ہندی کے ودوان تو ہماری لپیٹ میں آ گئے فارسی والے بچ گئے۔مگر تا بکے؟ میاں عبدالحق رامہ ناظر بیت المال تھے مگر ہمارے انجمن سے چلے جانے کے بعد ناظر بن کر آئے۔ ہمارا خیال تھا اکاؤنٹنس کے آدمی ہیں ادب سے کہاں تعلق ہوگا مگر یہ نہ سوچا کہ اردو کی تاریخ حساب دان ادیبوں شاعروں سے بھری پڑی ہے۔مرزا محمد ہادی رسوا ریاضی دان اور مہندس تھے (بلوچستان کی ٹیڑھی میڑھی مشکل ریلوے لائن کا نقشہ رسوا صاحب ہی کا بنایا ہوا ہے) جناب پروفیسر دل محمد تو ہماری ہوش کے زمانہ تک مشہور رہے تھے جن کے دل الجبرا کا نام سن کر ہی ہم دل چھوڑ بیٹھے تھے۔رامہ صاحب فارسی کا صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے حضرت صاحب کی درثمین فارسی کے تو حافظ تھے۔آپ نے اس پر تحشیہ کیا تھا جو اب آ کر ان کی آل اولاد نے چھپایا ہے اور اس کام کی تکمیل میں کچھ ہماری بھی تلقین وتحریص شامل تھی۔ان کے سارے بیٹے ہی ہمارے شاگرد ہوئے،نعیم،سفیر،منا اور سب سے چھوٹا (غالباً عزیز الحق نام ہے) جو آج کل شاید شاہ تاج میں ہے۔رفیعہ ہماری بیگم کی شاگرد ہوئی۔ہم جاپان جانے لگے تو اس نے ایک گرم سویٹر ہمارے لئے بُن کر ہمیں دیا جو مدتوں ہمیں اس کی یاد دلاتا رہا۔اب تو اس کے ابا کی کتاب ان سب بچوں کو یاد دلانے کے لئے ہمارے شیلف پر رکھی ہے۔

رامہ صاحب کے ہاں پہلی بار حاضر ہوئے تو دیکھا کہ ایک لمبی چوڑی میز کے پاس بیٹھے ہیں اور

ساری میز پر کاغذ بکھرے ہوئے ہیں۔اردگرد فارسی کے دواوین ہیں حافظ رومی انوری خاقانی بے دل غالب اور خدا معلوم کون کون۔رامہ صاحب نے وہ درثمین بھی دکھائی جس پر آپ نے تحشیہ کا کام کیا تھا۔ یہ کام جماعت کے فارسی ادب میں انمول اضافہ ہے۔

بات اردو کی بجائے فارسی کی طرف مڑ گئی تو بھائی مبشر احمد راجیکی یاد آئے۔آپ حضرت مولانا راجیکی صاحب کے فرزند ارجمند تھے اردو فارسی میں یکساں روانی سے شعر کہتے تھے۔ان کے فارسی اشعار میں ان کے والد ماجد کے تصوف کا رنگ جھلکتا تھا۔

فارسی ہمارے سلسلہ کی ادبی روایت کا اہم جزو ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام کا معتد بہ حصہ فارسی میں ہے اور اپنی شگفتگی و رنگینی میں اساتذہ کے کلام سے لگا کھاتا ہے۔اس لئے ہم احمدی ہونے کے ناطے سے بھی فارسی سے قطع تعلق نہیں کر سکتے۔ہمارے فارسی شعرا میں سے حضرت حکیم عبیداللہ صاحب بسمل کا ذکر ہندوستان کے فارسی گوشعرا کے تذکروں میں بڑے احترام سے کیا گیا ہے۔ابھی حال ہی میں حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر کا انتقال ہوا ان کی فارسی نظمیں سلسلہ کے ادبی سرمایہ کا بیش بہا حصہ ہیں۔فارسی کی طرف کماحقہ توجہ دینا ضروری ہے ورنہ ہمارے علم کلام کا کثیر حصہ لوگوں کی نگاہ سے اوجھل رہ جائے گا۔ہمیں تو یونہی لگتا ہے ہمارے ہاں فارسی جاننے والے بہت کم رہ گئے ہیں۔

ایک بار ہمارے گھر کے سالانہ مشاعرہ میں ہمارا ایک شاگرد طاہر مرحوم ایک بزرگ کو اپنے ساتھ لوالایا۔کہنے لگا میرے نانا ہیں پنڈی میں رہتے ہیں اور فارسی میں شعر کہتے ہیں۔تعارف ہوا تو ماسٹر عبدالرحمن خاکی نکلے۔ان کا کلام سلسلہ کے پرانے جرائد میں نظر سے گذر چکا تھا ان بزرگ سے وہ پہلی اور آخری ملاقات تھی اس مشاعرہ میں تنویر صاحب مرحوم بھی موجود تھے ان کی خوشی قابل دید تھی۔

بات ربوہ سے نکل کر پنڈی پہنچ گئی تو لاہور کے دو تین خاموش عالموں کا ذکر بھی ضروری ہے۔اپنے شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی، شیخ عبدالقادر صاحب بائبل سکالر اور بھائی محمد احمد پانی پتی۔شیخ اسماعیل پانی پتی حالی کے ہموطن تھے ان کے شاگرد تھے مگر شعر نہیں کہتے تھے۔لاہور کے ادبی حلقوں میں ان کا اور ان کے بیٹے شیخ محمد احمد پانی پتی کا نام بڑے وقیع نام تھے۔نقوش والوں نے جو اتنے بڑے بڑے ضخیم نمبر چھاپ رکھے ہیں ان کی ترتیب وتدوین میں شیخ صاحب کی عملی معاونت بھی شامل ہے۔شیخ صاحب سے ہمارا تعارف ان کے صاحبزادے مبارک محمود پانی پتی کی وساطت سے ہوا۔کئی بار لاہور جانا ہوتا تو ان کے ہاں نمبر 4 رام گلی میں قیام کا موقع ملتا قبلہ شیخ صاحب سے گھر پر تو کبھی ملاقات نہ ہوئی کیونکہ وہ صبح صبح اپنی ادبی فتوحات پر نکل جاتے تھے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلا رکھتے جس میں کتابیں مسودے اور پتہ نہیں کیا کیا بھرا رہتا۔سر پر پھندنے والی سرخ ٹوپی پہنتے۔پاؤں میں گردآلود جوتا، بر میں شیروانی۔شیخ صاحب بہت تیز تیز بولتے تھے ان کی باتوں کو سمجھنے کے لئے خاص مشق بہم پہنچانا پڑتی تھی ورنہ یونہی لگتا تھا الفاظ ان کے منہ سے ایک ہزار لفظ فی سیکنڈ کی رفتار سے نکل رہے ہیں۔ہمیں سالک صاحب مرحوم کی بات یاد آتی ہے جو انہوں نے حسرت موہانی کے بارہ میں کہی تھی کہ ''ان سے پہلی بار ملنا ہوتو میں بھونچکا رہ گیا یا اللہ یہ ہوتے ہیں حسرت موہانی؟''بس شیخ صاحب کو دیکھ کر بھی یہی احساس ہوتا تھا مگر صاحب کیا بلا کے عالم تھے۔ان کا چھوٹا سا کتاب خانہ تھا نام شاید اس کا حالی بک ڈپو تھا یا کچھ اور۔اب ٹھیک سے یاد نہیں۔مبارک محمود پانی پتی نے ابا کی وفات کے بعد اس کو چلانے کی کوشش کی تھی مگر کہاں؟ وہ شیخ صاحب والی علمیت کہاں سے آتی؟ ویسے مبارک محمود پانی پتی لاہور کی جماعت کا بڑا فعال کارکن تھا اللہ مغفرت کرے۔شیخ صاحب کے بڑے صاحبزادے محمد احمد پانی پتی عربی سے ترجمہ کرنے میں فرد تھے۔دیکھتے دیکھتے اس نحیف ونزار شخص نے عربی ادب کی

شاہکار کتابیں اردو میں منتقل کر دیں اور ساری دنیا دیکھتی رہ گئی۔ پے در پے ان کے ترجمے شائع ہوئے تو دھوم مچ گئی۔ہم نے پہلی بار انہیں دیکھا تو حیران رہ گئے۔جسم نحیف ونزار مگر ذہن توانا۔خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود کا مضمون ہوا۔اس نابغہ کو جانے کس کی نظر کھا گئی؟ ان کا جوانی ہی میں انتقال ہوا تو ہم نے بوڑھے باپ کو صبر جمیل کا نمونہ دکھاتے ہوئے دیکھا۔اللہ تعالیٰ باپ بیٹا دونوں کے درجات بلند فرمائے۔اب تو ہمارا دوست مبارک محمود بھی انہی رفتگاں میں شامل ہو گیا ہے۔شیخ محمد احمد پانی پتی کی اولاد میں ایک بیٹا تھا طاہر محمود۔بی ایس سی کر کے ربوہ میں کسی کام پر مستعد ہے خدا کرے باپ کے علمی ورثہ کا امین ہو!

اور اب بائبل سکالر شیخ عبدالقادر صاحب محقق کا ذکر خیر۔ہم اپنے شاگرد ڈاکٹر منیر احمد نذیر کے ہاں بیٹھے تھے کہ اندر سے شیخ صاحب تشریف لائے۔منیر نے بتایا میرے ماموں ہیں۔ہم شیخ صاحب کے علمی مرتبے سے تو واقف تھے لیکن اس رشتہ کا علم نہیں تھا۔شیخ صاحب نے اس کے بعد ہمارے ساتھ زیادہ محبت اور شفقت کا سلوک روا رکھنا شروع کر دیا۔لاہور میں طالب علمی کے دوران مسجد میں ان سے علیک سلیک ہوتی رہتی تھی وہ مانے ہوئے محقق تھے اور ہم محض طالب علم مگر جب کہیں ہمارا کوئی مضمون کسی اخبار یا رسالہ میں دیکھتے جمعہ پر ہمیں ڈھونڈ کر ملتے اور حوصلہ افزائی کرتے۔لکھنے والے تھے اس لئے لکھنے والوں کی نفسیات سے واقف تھے۔شیخ صاحب نے اپنے ذاتی شوق وشغف سے بائبل کا علم حاصل کیا اور اس باب میں ان کی تحقیق اداروں کے کام پر بھاری ہے۔پیشہ کے لحاظ سے اکاؤنٹنس کے آدمی تھے مگر علمی لحاظ سے بائبل سکالر تھے۔''صحائف قمران'' پر آپ کی تحقیق شائع ہوئی تو عیسائی دنیا میں ایک تہلکہ برپا ہو گیا۔اگر شیخ صاحب کا کام انگریزی میں ہوتا تو بہت سی یونیورسٹیاں انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دیتیں۔ہمارے ہاں ایسا کون کرتا ہے۔شیخ صاحب کی موت سے ایسا خلا

پیدا ہو گیا ہے جو بظاہر پر ہوتا نظر نہیں آتا مگر خدائی سلسلوں کے کام کبھی رکتے ہیں؟۔

نوٹ: آپ پروازی صاحب نے کسرِ نفسی سے کام لیا اور خاموش علماء میں اپنے خسرِ محترم مولانا محمد احمد جلیل صاحب کا ذکر نہیں کیا وہ میرے جامعہ کے حدیث کے استاد باعمل باکردار نہایت عالم فاضل تھے نہایت گہرا علم رکھتے تھے جن کے ملنے سے خدا یاد آتا ہے وہ ان بزرگوں میں سے تھے اللہ غریق رحمت فرمائے

(صفدر نذیر جاوید گولیکی واقف زندگی کینیڈا پروف ریڈر۔)

اپنے اساتذہ کے بارے میں

اپنے استادوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔مگر قلم رک رک جاتا ہے۔کہیں ان کی شان میں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔سب سے پہلے جو استاد یاد آتے ہیں وہ ماسٹر حسن محمد صاحب تھے۔قادیان کے قریب ایک گاؤں کلوسوہل تھا وہاں سے اپنی پھٹیچر سی سائیکل پر تشریف لاتے تھے۔پرائمری سکول میں تیسری اور چوتھی جماعت کو پڑھاتے تھے۔نہایت شفیق اور مہربان مگر سبق کے معاملہ میں سخت گیر۔ان کا ایک ہاتھ کسی بیماری کے نتیجہ میں یا ویسے ہی مڑا ہوا تھا۔اس لئے ایک ہی ہاتھ سے لکھنے اور سزا دینے کا کام لیتے تھے۔مجھے یاد ہے سردیوں میں اگر کسی روز سبق یاد نہ ہوتا تو آپ پاؤں پر بائیں ہاتھ سے ضرب لگاتے تھے۔بعد کے زمانہ میں چنیوٹ کے اساتذہ کے ہاتھوں کنیر کی چھڑیوں سے ہاتھ سنسناتے ہوئے بھی محسوس کئے،مگر وہ بائیں ہاتھ کی پاؤں پر لگی ہوئی ضرب پھر کبھی نہ بھولی۔

ماسٹر حسن محمد صاحب ربوہ میں ہی ہمارے محلہ میں قیام فرما رہے۔جہاں کہیں مل جاتے نہایت شفقت سے پیار کرتے اور کندھے تھپتھپاتے تھے۔اللہ کے فضل سے لمبی عمر پائی اور ربوہ میں ہی پیوند

خاک ہوئے۔ان کے صاحبزادے حمید احمد چوہدری تعلیم الاسلام کالج میں انگریزی کے استاد رہے پھر نائجیریا چلے گئے اور آج کل شاید جرمنی میں مقیم ہیں۔قادیان کے زمانہ کے ایک اور استاد یاد آتے ہیں ماسٹر چراغ صاحب کھارے کے تھے۔اونچے لمبے اور وجیہ مگر ان سے پڑھنا یا مار کھانا یاد نہیں۔ایک اور استاد ماسٹر سونگی صاحب کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔غالباً محمد بخش نام تھا۔قادیان کے سکول میں بہت سے اساتذہ کو دیکھا مگر پرائمری کے بچے کی یادداشت کیا؟ مگر سکول کا ماحول یاد ہے۔ اساتذہ کی شفقت، ماٹے کے چنے، ولایت حسین کے گلاب جامن یا ماسٹر زراعتی صاحب یاد ہیں۔ ماسٹر اللہ بخش صاحب زراعت پڑھاتے تھے۔مگر زراعتی صاحب کے نام سے موسوم تھے۔اوراب بھی ہیں۔ان کے صاحبزادے مجید طاہر نے ہمیں بتایا کہ جب سویڈن میں ہمارا دل کا آپریشن ہوا تو اتفاق سے زراعتی صاحب جرمنی میں آئے ہوئے تھے۔ہر نماز سے پہلے سب کو بار بار تاکید کرتے کہ ناصر کے لئے بہت دعائیں کرو وہ میرا چہیتا شاگرد ہے بلکہ میرا بیٹا ہے۔ایسے استاد کس کو نصیب ہوتے ہیں؟

تقسیم کے بعد اپنے گاؤں کے سکول میں ماسٹر عبدالرحمن صاحب سے کچھ دیر پڑھنا یاد ہے۔ ماسٹر عبدالرحمن صاحب ہمارے پھوپھا راجہ عبدالرؤف خاں صاحب کے بڑے بھائی .... تھے۔تھوڑے عرصے میں ہمیں پاس کے قصبہ قاضیاں کے مڈل سکول میں منتقل ہونا پڑا۔قاضیاں اب تو بڑا شہر بن گیا ہے۔اس زمانہ میں چھوٹا سا قصبہ تھا۔قاضیاں سکول کے دو اساتذہ یاد ہیں۔قاضی اکرم صاحب ہیڈ ماسٹر تھے۔قاضی صاحب انگریزی پڑھاتے تھے۔ہاتھ کی انگلی میں انگوٹھی پہنتے اور دوسرے ہاتھ کی انگلی سے اسے گھماتے رہتے۔سبق پڑھانے میں بھی گھمانے کا یہ عمل جاری رہتا۔ ماسٹر عبدالجلیل صاحب اہل زبان مہاجر تھے۔اور پتہ نہیں قاضیاں کیسے پہنچ گئے تھے۔ان کی ٹیڑھی

مانگ یاد ہے۔ پھر ہم ربوہ منتقل ہو گئے۔ ربوہ اس وقت کچے مکانوں کی آبادی تھی۔ ربوہ میں اس وقت ہماری عمر کے بچوں کا کوئی سکول نہیں تھا۔ چھوٹے بچے لڑکیوں کے ساتھ ہی پڑھتے تھے مگر ہمیں تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ میں جانا پڑتا۔ ربوہ سے ایک گاڑی صبح چھ بجے چلتی تھی ہم لوگ اس سے جاتے اور شام چھ بجے کے قریب واپس آتے۔ گاؤں میں تھے تو اتنا فاصلہ پیدل طے کرتے تھے۔ یہاں گاؤں کا ماحول نہیں تھا۔ اس لئے سارا دن گاڑی کا انتظار کھینچتے۔ سردیوں کے موسم میں صبح چھ بجے گاڑی سے چنیوٹ پہنچتے۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے اور کھیتوں سے گاجریں مولیاں اکھیڑتے اکھاڑتے اور کھاتے سکول پہنچتے۔ گیٹ پر ڈے ماسٹر سے ملاقات ہوتی اور شڑاپ شڑاپ چھڑیاں پڑتیں اور ہم سوں سوں کرتے ہاتھ ملتے کلاسوں میں جا پہنچتے۔ سکول کی دیواروں کے ساتھ کنیر کی باڑھ تھی ہمارے استادوں نے وہ ہمارے ہاتھوں پر صرف کر دی۔ اب وہ سکول لنڈ منڈ نظر آتا ہے۔

چنیوٹ سکول کی یادوں میں حضرت سید محمود اللہ شاہ صاحب کا بارعب چہرہ یاد ہے۔ حضرت شاہ صاحب اپنے دفتر سے کم ہی باہر نکلتے تھے۔ مگر جہاں کہیں نظر آ جاتے طلباء دبک جاتے۔ حالانکہ وہ کبھی طلباء سے تعرض نہیں کرتے تھے۔ نہایت وقار اور دھیمے دھیمے انداز سے چلتے تھے۔ سر پر ٹوپی آنکھوں پر کالی عینک، جسم پر سوٹ ان کا گھر سکول سے سامنے نظر آتا تھا اور خاصے فاصلے کے باوجود نظر آتا تھا اب تو درمیان میں بے شمار عمارتیں بن گئی ہیں۔ قبلہ شاہ صاحب سکول کھلنے کے وقت سے پہلے تشریف لے آتے تھے ہم نے کبھی انہیں سکول کھلنے کے بعد آتے نہیں دیکھا۔ اسمبلی میں نہایت وقار کے ساتھ خطاب کرتے تھے۔ مختصر الکلام تھے۔ زیادہ باتیں کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ سکول میں ماسٹر ابراہیم صاحب تھے جنہیں لوگ ان کی جموں کی رہائش کے لحاظ سے جمونی کہتے تھے۔ انگریزی

پڑھی۔ ماسٹر صاحب انگریزی خوب پڑھاتے تھے۔Tense یاد کروانا ان پر ختم تھا۔ اب بھی جو دو چار لفظ انگریزی کے آتے ہیں یہ انہی کا فیضان ہے ورنہ کالج میں استاذی مرزا خورشید احمد صاحب سے تو سوائے تلفظ کے اور کچھ نہیں سیکھا اور حالت یہ ہے کہ اب تک Th کی آواز نہیں نکال سکتے۔ (برا ہو بے تکلفی کا ہم اپنے استادوں سے بھی چھل کرنے سے باز نہیں رہ سکتے)۔صوفی محمد ابراہیم صاحب اور صوفی غلام محمد صاحب سے سائنس۔ مکرم ماسٹر سعد اللہ خان صاحب سے تاریخ و جغرافیہ، مرزا عنایت اللہ صاحب سے عربی، پروفیسر محمد ابراہیم صاحب ناصر سے حساب پڑھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ حساب کے باب میں تب بھی کورے تھے اور اب بھی کورے ہیں۔ ماسٹر نور الٰہی صاحب سے ڈرائنگ پڑھی۔ سیکھی ہوتی تو کچھ نہ کچھ کھینچنا آ جاتا۔ نہ آیا۔ ہاں جس شخص نے ادب کی چاٹ لگائی وہ ماسٹر نذیر احمد صاحب رحمانی تھے۔ اللہ اللہ کیا استاد تھے۔ سکول کا زمانہ۔ لڑکپن کی عمر۔ رحمانی صاحب غالب پڑھاتے تو یوں لگتا جیسے غالب نے ہمارے ہی لئے شعر کہہ رکھے ہیں۔ ذوق پڑھاتے تو زبان کی چاشنی اپنی زبان پر محسوس ہونے لگتی۔ حالی کا ذکر کرتے تو تمام باتیں سہل ممتنع میں بیان کرتے۔ رحمانی صاحب نے زبان و ادب کا ذوق پیدا کیا۔ ان کے بیٹے سعید احمد خاں قادیان کے زمانہ سے ہمارے کلاس فیلو تھے۔ ہم لوگ اس طرح شیر وشکر تھے کہ سعید صاحب ہمارے گھر کو اپنا گھر اور ہم سعید کے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے۔ ہماری مائیں بھی ہمیں ایک جیسا پیار دیتی تھیں۔ وہ ہماری امی کو پھوپھی اور ہم اس کی امی کو پھوپھی کہتے تھے۔ بات رحمانی صاحب سے چلی تو پھوپھی صوفیہ تک چلی گئی۔ مگر وہ رشتے ہی اتنے پکے تھے۔ چار پانچ برس پہلے ہم بھائی رشید رحمانی کے گھر پھوپھی صوفیہ سے کوئی پینتیس سال کے بعد ملے۔ آپ نے اس طرح لپک کر ہمارا ماتھا چوما جیسے بچپن میں چوما کرتی تھیں۔ بہت ضعیف ہو گئی تھیں چونکہ ابا جان اور پھوپھی جی کی وفات کے ایک لمبا عرصہ بعد ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس لئے بھائی اور بہن کو یاد کر

کے آبدیدہ ہوگئیں۔افسوس کہ دوسال پہلے پھوپھی صوفیہ بھی اللہ کو پیاری ہوئیں! رحمانی صاحب تو کوئی پینتالیس برس پہلے رخصت ہو گئے تھے۔

سکول کے اساتذہ میں سے رحمانی صاحب کے بعد جس استاد نے زیادہ متاثر کیا وہ جمونی صاحب ہیں۔ پتلے جُثے کے آدمی ہیں۔ اچکن اتار دیں تو بالکل سینگ سلائی نظر آتے ہیں۔ ان کی کرکٹ پروری کا یہ عالم ہم نے دیکھا ہے کہ سکول کی ٹیم اندر کھیل رہی ہوتی تھی، ادھر میاں صاحب باہر سٹیج پر کھیلتے تھے۔ باؤلر کے ساتھ بال کرواتے اور بیٹ مین کے ساتھ بیٹنگ اور بعض اوقات لپک کر کیچ بھی لیتے اور ہم لوگ ٹیم کی کرکٹ سے زیادہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی کرکٹ سے محفوظ ہوتے تھے۔

عزیزم مولانا عطاء المجیب راشد کی صدارت کے زمانہ میں میں کالج یونین کا انچارج تھا۔ایک انگریزی مباحثہ میں ہم نے مکرم میاں صاحب کو جج کے طور پر مدعو کیا۔آپ بہت خوش ہوئے کہ شاگردوں نے اپنے سکول کے استاد کو کالج کے مباحثہ میں جج بنایا ہے۔میاں صاحب معمر آدمی ہیں مگر اللہ کے فضل سے ذہنی طور پر خوب مستعد ہیں۔مباحثہ کے بعد سٹاف روم میں چائے پیتے ہوئے کہنے لگے۔میاں! تم نے خوب چن کر مجھے مباحثہ کا جج بنایا! تمہیں معلوم ہے نا کہ میں ربوہ والوں کے لئے انگریزی کی ’ماں‘ ہوں! میں نے عرض کیا’’ درست فرمایا،آپ کی عمر کو پہنچ کر آدمی کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ ماں ہے کہ باپ ہے!‘‘ اس پر لمبا قہقہہ بلند ہوا اور سب سے بلند قہقہہ میاں صاحب کا تھا۔اللہ ان کی عمر میں برکت دے ہیڈ ماسٹری سے بھی ریٹائر ہوئے۔کرکٹ سے بھی اور امریکہ خدمت دین سے بھی! اب صرف مضمون لکھنے پر گزارا ہے۔اللہ انہیں خوش وخرم رکھے۔اب تو انہیں ہم سے رخصت ہوئے مدتیں ہوگئیں۔اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔آمین۔

کچھ بے نفس لوگ

حضرت مولوی شیر علی صاحبؓ کی سوانح پڑھتے ہوئے حضرت حکیم عبیداللہ رانجھا صاحبؒ کا نام سامنے آیا۔ زباں پہ بارے خدایا یہ کس کا نام آیا۔ قادیان کے زمانہ سے ہی ان سے گھر جیسے تعلقات تھے۔ ان کی بیگم پھوپھی رابعہ ہم سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ان کی بیٹیاں غالباً صفیہ اور رقیہ نام تھا ہمیں بھائیوں کی طرح چاہتی تھیں۔ کبھی ان کے گھر جانا ہوتا تو ہمارے آگے پیچھے پھرتیں اور ہمارے ناز اٹھاتیں۔ پھر ربوہ میں بھی محلہ داری رہی۔ دارالرحمت وسطی کی جنوبی جانب آخری گلی میں ان کا مکان تھا۔ مکان کیا ایک کمرہ سا تھا اس کے ساتھ صحن۔ یہاں بھی ان کی محبتیں اسی طرح قائم رہیں۔ ہماری پھوپھی جی بیگم جی اور پھوپھی رابعہ کا بڑا دوستانہ تھا اس لئے کئی بار ان کے ہاں جانے کا حکم ہوتا تھا اب پھوپھی رابعہ سے یہ کہہ کے آؤ اب پھوپھی رابعہ کے ہاں یہ چیز دے کر آؤ۔ اور پھوپھی رابعہ اور ان کی بیٹیاں ہم سے اتنا پیار کرتی تھیں کہ ہمیں کئی کئی بار ان کے ہاں جانا کھلتا نہیں تھا۔

حکیم صاحب کو ہم حکیم صاحب ہی کہتے تھے۔ ان کی باتوں میں اتنی ملائمت ہوتی تھی کہ ہمیں ان جیسا ملائم گو اور کوئی یاد نہیں۔ دھیمے مزاج کے بزرگ تو ہمارے ہاں سارے ہی تھے مگر بچوں سے جس ملائمت سے حکیم صاحب پیش آتے وہ ان کے لئے خاص تھا پھر حکیم صاحب ہمارے پھوپا جی حضرت مولوی غلام نبی مصری صاحب کی طرح ہر وقت ذکر الٰہی کرتے رہتے تھے۔ حکیم اپنے نام کے ساتھ لکھتے تھے تو حکیم ہوں گے بھی مگر ہم نے انہیں کبھی طبابت کرتے دیکھا نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم ان کے گھر تو جاتے رہے ان کے مطب نہیں گئے۔ حکیموں میں سے تو ہمیں اپنے گھر میں ابا جی محلہ میں حضرت حکیم عبدالعزیز صاحب طبیہ عجائب گھر والے یاد ہیں۔ سنا ہے حضرت حکیم عبیداللہ بسمل صاحب

بھی ہمارے محلہ دار تھے مگر ان کی کوئی یاد ذہن میں موجود نہیں۔انہوں نے لمبی عمر پائی۔ ہمارے ابا کے حکمت میں استاد تھے اور ابا جی اکثر ان کا ذکر گھر میں کرتے تھے۔حکیم عبید اللہ رانجھا صاحب حضرت مولوی شیر علی صاحب کے ہم وطن تھے اور پنجاب کے رہنے والے تھے مگر اردو بولتے تھے۔شاید حضرت حکیم نور الدین صاحب کی طرح حکمت کی تعلیم کہیں اردو بولنے والے علاقہ میں پائی ہو یا ہمارے پھوپھا جی کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے اردو بولنے کی عادت راسخ ہوگئی ہو کیونکہ ہم نے پھوپھا جی کو کبھی پنجابی بولتے نہیں سنا۔ پھوپھی رابعہ پنجابی بھی بڑی اچھی بولتی تھیں مگر وہ بھی ہمارے ساتھ اردو ہی میں بات چیت کرتی تھیں۔

حکیم عبید اللہ رانجھا صاحب کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ سر پر صافہ باندھتے تھے۔بعض اوقات کلاہ والی پگڑی بھی ہم نے ان کے سر پر دیکھی ہے مگر صافہ انہیں پسند تھا۔سفید ململ کا صافہ‘ سفید کرتا‘ ٹخنوں سے اونچی شلوار اور پاؤں میں دیسی جوتی۔ دور سے آرہے ہوں تو ہو بہو حضرت مولوی شیر علی صاحب لگتے تھے۔نظریں زمین پر رہتی تھیں ہونٹ ذکر الٰہی سے تر رہتے تھے چلتے تو ادھر ادھر نہیں دیکھتے تھے مگر تیز قدم تھے۔قد درمیانہ تھا اور جسم دبلا۔ہم نے حکیم صاحب کو جیسا قادیان میں دیکھا ویسا ہی ربوہ میں پایا۔دبلے پتلے اور مسکین طبع۔ان کے گھر کی خصوصیت یہ تھی کہ صوفیا کے ٹھکانوں کی طرح سامانِ دنیا سے بے نیاز تھا۔ہمیں حکیم صاحب کے گھر میں فرنیچر کے نام پر سوائے چارپائی کے اور کوئی چیز نظر نہیں آئی مگر بے سروسامانی اس وجہ سے نہیں تھی کہ توفیق نہ رکھتے تھے اللہ کے فضل سے توفیق رکھتے تھے مگر سامانِ دنیا کی حرص سے بے نیاز تھے۔

بزرگوں کے ہاں حاضری دیتے رہنا ہم نے حکیم صاحب سے سیکھا۔ان کے قریب ہی حضرت مولانا راجیکی صاحب کا دولت کدہ تھا۔آتے جاتے وہاں حاضری دیتے تھے۔ ہماری گلی میں سے گزر

ہوتا تو حضرت پھوپھا جی سے سلام کے لئے ضرور آتے۔ خاندان کے لوگوں سے عشق کی حد تک پیار کرتے۔ کوئی بچہ بھی سامنے آجاتا تو احتراماً کھڑے ہو جاتے۔ یہ وصف حضرت مولانا شیر علی میں بھی تھا پھوپھا جی میں بھی تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے سارے ہی اصحاب میں موجود تھا۔ بانی سلسلہ کے عشق کا رنگ ان کے ساتھیوں پر اتنا گہرا تھا کہ یہ لوگ ان کی اولاد بلکہ اولاد در اولاد کے لئے اسی عشق کا اظہار کرتے تھے۔

حکیم صاحب کو حکمت کرتے تو ہم نے دیکھا نہیں ان کی روزی کا کیا وسیلہ تھا ہمیں بالکل علم نہیں مگر اللہ کے فضل سے تونگر تھے اللہ تعالیٰ ان کی حاجتیں پوری کرتا تھا۔ جو اللہ پر توکل کیا کرتا ہے اللہ اس کے لئے بس ہے۔ وَمَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسۡبُہٗ ۔ ان کی بیٹیوں میں سے ایک غالباً صفیہ رانجھا، بعد کو اسکول میں استاد ہو گئی تھیں مگر بڑا ہو جانے کے بعد ان سے اس طرح رابطہ نہ رہا شاید پھوپھی رابعہ اور حکیم صاحب کی وفات کے بعد ان قریبی تعلقات کو بھی زوال آ گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مگر حضرت حکیم صاحب کی یاد دل کے کسی کونے میں موجود تھی اب حضرت مولوی شیر علی صاحب کے حالات پڑھتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی اور ابھر کر ذہن کی سطح پر آ گئی اور ہم نے بھی اس موقع کو غنیمت جانا کہ ایک بزرگ کا ذکر خیر کر کے کچھ نیکی ہی کما لیں۔ کیا خبر اللہ تعالیٰ اپنے ان محبوب دوستوں کے ذکر کے طفیل ہمارے لکھے کو کسی کی ہدایت کا موجب بنا دے۔

قادیان کے پڑوسیوں میں سے حضرت شیخ فضل احمد بٹالوی صاحب بھی تھے۔ ان کا بیٹا لطیف، ہمیں کب سے توجہ دلا رہا تھا کہ ہمیں شیخ صاحب کے ذکرِ خیر میں کچھ لکھنا چاہئے مگر ہم اسی حیلہ سے لطیف کو ٹالتے آ رہے تھے کہ وہ خود کیوں نہیں لکھتا؟ اب قادیان کے بے نفس اور خاموش لوگوں کا ذکر کرنے بیٹھا ہوں تو شیخ صاحب سامنے آ گئے ہیں۔ قبلہ شیخ فضل احمد صاحب بٹالوی حضرت اقدس مسیح

موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ میں سے تھے۔ ہمیں حضرت مولانا راجیکی صاحب کے افادات سے معلوم ہوا تھا کہ قبلہ شیخ فضل احمد صاحب کی پھوپھی جی محمدی بیگم سے پہلے بھی کوئی بیگم تھیں جن سے اولاد نہ ہوئی اور شیخ صاحب محض اولاد نہ ہونے کی خاطر انہیں طلاق نہیں دینا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا پردہ رکھ لیا اور ان کی وفات کے بعد شیخ صاحب نے دوسری شادی کی۔ اس بیگم سے جو اولاد ہوئی ان میں سے بھائی جان محمد احمد واقف زندگی ہیں۔ بیٹیاں آپا بشریٰ امینہ وغیرہ ہماری بڑی بہنیں تھیں۔ بیٹوں میں سے لطیف ہمارا کلاس فیلو اور ہم عمر ہے مبارک مرحوم ایک دو برس بڑا تھا۔ رشید چھوٹا تھا اور لئیق تو بہت ہی چھوٹا تھا (لئیق سے مراد مولانا لئیق احمد طاہر مبلغ انگلستان ہیں)۔ قادیان کے زمانہ سے ہم ہمسائیگی کے ناطے ان کے گھر میں یوں آتے جاتے تھے جیسے اپنا ہی گھر ہو۔ لطیف اور اس کے بہن بھائی ہمارے ابا کو ماموں اور ہم ان کی امی کو پھوپھی کہتے تھے۔ یہ تعلق ربوہ تک چلا بلکہ اب تک چلا آتا ہے۔ لطیف ربوہ سے نکلا تو افریقہ چلا گیا افریقہ سے نکلا تو جرمنی آ کر بس گیا۔ پچھلے برس اس کا ایک مضمون کینیڈا کے احمدیہ گزٹ میں چھپنے کے لئے آیا تو عزیزی ہدایت اللہ ہادی نے وہ مضمون ہمیں بھیج دیا کہ قادیان کے اہل محلہ کا ذکر ہے۔ اس بہانہ سے لطیف سے کوئی چالیس برس بعد رابطہ ہوا۔ بھائی جان محمد احمد سے ایک بار جرمنی کے جلسہ پر ملاقات ہوئی تھی اگرچہ ان کی خیر خیریت کی خبر عزیزم محمود احمد ملک سے ملتی رہتی تھی۔ ہمیں اس شتر گربہ کی کبھی سمجھ نہیں آئی کہ قبلہ شیخ فضل احمد صاحب بٹالوی شیخ کہلاتے تھے ان کی اولاد ملک کہلاتی ہے۔ ہم نے ایک دوست سے اس معمہ کا حل پوچھا تو اس نے کیا خوب صورت جواب دیا کہ بادشاہ لوگ ہیں جو چاہیں کہلائیں۔

شیخ صاحب کو ہم نے قادیان میں جس حال میں دیکھا ربوہ میں بھی عین مین وہی حال ان کا تھا۔ ہاتھ میں چھڑی، سر پر پگڑی۔ صافہ نہیں باندھتے تھے کلاہ والی پگڑی ہوتی تھی۔ مسجد کی طرف رواں

دواں۔قادیان میں ہم لوگ محلہ دار الفضل میں رہتے تھے مگر مسجد نور قریب پڑتی تھی اس لئے سب لوگ مسجد نور میں نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔شیخ صاحب گھر سے نکلتے ۔ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی سے دروازے کھٹکھٹاتے جاتے کہ چلو بھئی نماز کا وقت ہو گیا۔ربوہ میں بھی ریلوے روڈ کے دروازوں پر دستک کے نشانات اگر موجود ہوں گے تو قبلہ شیخ صاحب کی چھڑی کے نشانات ہوں گے۔ہم نے تو ہمیشہ انہیں بوڑھا ہی دیکھا۔ظاہر ہے صحابی تھے تو بڑی عمر کے ہوں گے مگر ان کی اولاد ہماری ہم عمر تھی۔ ان کی بیگم پھوپھی جی محمدی بیگم بڑی ٹھسے والی خاتون تھیں۔قادیان میں بھی محلہ میں ان کا دبدبہ تھا ربوہ میں بھی رہا۔پٹیالہ کی تھیں ۔پان کھاتی تھیں ان کا پاندان بھی ہمیں یاد ہے بہت بھاری ہوا کرتا تھا اور ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ ایک بار حضرت اماں جان ہمارے گھر تشریف لائی تھیں تو پھوپھی جی نے بھگایا تھا کہ جاؤ پھوپھی جی محمدی بیگم کے ہاتھ کا پان لے آؤ اور جب ہم نے پان مانگا تھا تو پان کے ساتھ ساتھ پھوپھی جی محمدی بیگم بھی کھینچی چلی آئی تھیں حضرت اماں جان قادیان کے ہر گھر میں بلا تکلف آیا کرتی تھیں۔ہمیں اپنے گھر میں ان کا ایک سے زیادہ دفعہ کا تشریف لانا یاد ہے۔ ہمارا گھر تو حضرت مرزا شریف احمد صاحب کی کوٹھی کے رستہ میں پڑتا تھا اس لئے شاید ستانے کے لئے رک جاتی ہوں۔لیکن نہیں وہ تھکتی کہاں تھیں؟ ہم نے حضرت اماں جان کو دور دراز کے محلوں تک بھی جاتے دیکھا ہے چلنے میں انہیں انقباض نہیں تھا۔حضرت مرزا شریف احمد صاحب نے شاید اپنی اماں سے یہ ورثہ پایا ہو مگر چلنا تو حضرت اقدس مسیح موعود کی سنت تھی۔حضور کی واحد ورزش چلنا تھی اور حضور بہت چلا کرتے تھے۔

قبلہ شیخ صاحب کی طبیعت میں سنجیدگی اور متانت کا غلبہ تھا۔ہم نے انہیں ہنستے نہیں دیکھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدانخواستہ سخت طبع یا سخت گیر تھے یا بچوں کے ساتھ درشتی سے پیش آتے تھے۔نہیں۔ طبیعت کی سنجیدگی کا مطلب یہ ہے ان کی باتوں میں سنجیدگی کا عنصر نمایاں رہتا تھا۔بحث نہیں کرتے

تھے مگر اپنی بات پر سختی سے قائم رہتے تھے۔ پھوپھا جی حضرت مولوی غلام نبی مصری سے انہیں بہت تعلق خاطر تھا ان کے پاس بیٹھتے تو علم حدیث کی باتیں کرتے رہتے۔ ہمارے ابا جی سے ملتے تو ان سے ان کے کام کی باتیں سنتے۔ ہمارے دادا کے پاس بھی آیا کرتے تھے۔ ہمارے دادا آم کے درخت کے نیچے بیٹھے قرآن پڑھتے رہتے تھے شیخ صاحب آتے تو ان کی پائنتی بیٹھ جاتے اور شاید کچھ باتیں بھی کرتے ہوں گے ہمیں اس کے بارہ میں وثوق نہیں ہے ہاں دادا جان کے پاس انہیں بیٹھا ہوا دیکھنا یاد ہے۔ ملک صلاح الدین صاحب کو تو ہم نے دادا جان کے پاس بیٹھ کر آم چوستے ہوئے دیکھا ہے۔

ربوہ میں آ کر آباد ہوئے تو سلسلہ کے دیگر بزرگوں کی طرح انہیں بھی قادیان بہت یاد آتا تھا ہر کسی سے یہی کہتے تھے دعا کرو جلدی قادیان جانا ہو۔ دراصل قادیان واپس جانے کی تمنا اس زمانے کی سب سے بڑی آرزو تھی ہر شخص جو قادیان سے نکلا تھا قادیان واپس جانے کا آرزومند تھا مگر اللہ تعالیٰ نے آزمائش کا دور لمبا کر دیا۔ خلافت ثانیہ اور ثالثہ میں یہ وقت نہ آیا خلافت رابعہ میں حضرت صاحب بڑی شان وشوکت سے قادیان تشریف لے گئے۔ اللہ کی باتیں اللہ ہی جانتا ہے۔ قادیان کی واپسی کی تمنا صرف شیخ صاحب سے مختص نہیں تھی سب لوگ اسی تمنا کے اسیر تھے مگر شیخ صاحب کو دیکھا کہ قادیان کے ذکر پر ایک آہ سی بھرتے تھے۔ ہمارے استاد ماسٹر نذیر احمد رحمانی مرحوم نے یہ نکتہ ہمیں بتایا کہ قادیان کا ذکر کرتے ہوئے اہلِ قادیان کے سینہ سے جو آہ سی نکلتی ہے اسے ہوک اٹھنا کہتے ہیں ہوک کا مطلب اس مثال سے ہمیں سمجھ میں آیا تھا۔

شیخ صاحب کے ذکر کا فیض ہے کہ اپنے دادا جان کے بارہ میں کچھ لکھنے کی تحریک ہوئی ہے ہمارے دادا جان مولوی محمد فضل خان چنگا بنگنیال ضلع راولپنڈی کے مالک راجپوتوں میں سے تھے اور

اللہ تعالیٰ کے فضل سے اپنے علاقہ کے معززین میں شمار ہوتے تھے .... ہمارے ابا کی پیدائش 1908 کے اوائل کی ہے۔ دادا جان نے حضرت اقدس کی خدمت میں بچے کا نام رکھنے کی درخواست کی۔ حضرت صاحب کی طرف سے خود حضرت صاحب کے دستخطوں سے جواب ملا کہ ”بچے کا نام احمد خان رکھیں اللہ تعالیٰ خادمِ دین بنائے“۔ یہ جواب جو ایک کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔ دادا جان کو عین اس روز موصول ہوا جس روز حضرت اقدس کے وصال کی خبر پہنچی۔ دادا جان کو دکھ ہوا کہ ماموروقت کو پہچانا مگر اس کی صحبت میں رہنا کم نصیب ہوا۔ بس اسی وقت سے انہیں لَو سی لگ گئی کہ اب سب کچھ تج کر قادیان چلنا چاہئے۔ چنانچہ اسی سال دادا جان قادیان اٹھ آئے۔ معاش کے لئے پہلے حضرت نواب مبارکہ بیگم کی دربانی اختیار کی اُس کے بعد حضرت مرزا شریف احمد کی کوٹھی بن گئی تو وہاں منتقل ہو گئے اور مدت العمر ان کے اور بوزینب کے دربان رہے۔ تایا جان محمد خان ان کی طرح نواب محمد علی خان کے دربان رہے۔ چھوٹے تایا حافظ لعل خان نے یکہ چلانا شروع کیا اور قادیان کے مہمانوں کو بٹالہ تک لاتے لے جاتے رہے۔ حافظ قرآن تھے ادھر سواری کو بٹھا کر روانہ ہوتے ادھر قرآن کی تلاوت شروع کر دیتے۔ قادیان کی منزل تک پہنچتے پہنچتے مہمان کو قرآن کی کئی منزلیں سنا دیتے۔ فرمایا کرتے تھے ایک تو مہمانوں کے کانوں میں دین کی باتیں پڑتی رہتی ہیں دوسرے میرے تانگہ میں لغو گفتگو کوئی نہیں کرتا۔ دادا جان اللہ تعالیٰ کے فضل سے اونچے لمبے اور جسم کے مضبوط آدمی تھے۔ بڑھاپے میں قد و خم کی کیفیت نمایاں ہوگئی تھی مگر اپنا کام خود کر سکتے تھے اور کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے انہیں کسی قسم کی محتاجی نہیں تھی بلکہ کئی بار دادی جان مرحومہ کی خدمت کے لئے وضو کے لئے پانی انہیں لا کر دیتے تھے۔ دادی جان بیچاری موتیا کی وجہ سے آنکھوں سے لاچار ہوگئی تھیں۔ قادیان سے ہجرت کے وقت ان کی عمر اسی برس کے لگ بھگ تھی۔ آنکھوں سے معذور تھیں مگر چھڑی کے

سہارے چل پھر لیتی تھیں۔ ہجرت کا صدمہ ایسا دل کو لگا کہ چارپائی سے لگ گئیں مگر چنگا بنگلنیال پہنچ کر جیسے ان کی توانائی عود کر آئی شاید اس لئے بھی کہ اپنے مستقر پر واپس آ گئی تھیں۔ ہر کام ان کے اشارے اور مرضی سے ہونے لگا۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں ان سے ملنے کے لئے آنے لگیں تو انہیں معلوم ہو گیا کہ اب انہیں اپنی پرانی مالکانہ ذمہ داریاں ادا کرنی ہیں۔ ان کا رعب داب ایسا تھا کہ مزارعین خود گھر آ کر ان کے واجبات ادا کر جاتے تھے۔ جوار باجرہ مکئی کی فصلوں کی بٹائی کا حصہ ملنے لگا تو ہم لوگ بھوکوں نہیں مرے ورنہ یوں لٹ پٹ کے واپس آ بیٹھنے پر کون کسی کا پرسانِ حال ہوتا؟۔ دونوں تایا یا زمینداری میں مشغول ہو گئے۔ گھر میں پھوپھا جی تھے وہ دعاؤں میں لگ گئے۔ غرض ابا جی کے ہندوستان سے رہا ہو کر آنے تک ہمارا وقت کشائش سے نہیں کٹا تو تنگی ترشی بھی اللہ کے فضل سے ہم نے نہیں دیکھی۔

دادا جان کے سپرد حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کا فارم بھی تھا ہم بے خوف وخطر اس فروٹ فارم میں جایا کرتے تھے مگر دادا جان کا رعب ایسا تھا کہ بھول کر بھی کسی پھل کو توڑنے کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی تھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہم بھی دادا جان کی طرح اس باغ کے نگران ہیں۔ دادا جان باغ میں بیٹھے قرآن پڑھتے رہتے۔ کام کرنے والے اپنا کام کرتے رہتے۔ ہم نے کبھی کسی شخص پر دادا جان کو ناراض ہوتے یا غصہ سے اونچی آواز میں بولتے نہیں دیکھا یا سنا۔ باغ میں ان کی موجودگی ہی اس بات کی ضامن ہوتی تھی کہ باغ کا رکھوالا چوکس ہے۔ یہ باغ فروٹ فارم کہلاتا تھا۔ اس کے آم بڑے لذیذ ہوتے تھے۔ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کا طریقہ تھا کہ آموں کے موسم میں اپنے دوستوں کو آموں کا تحفہ بھیجا کرتے تھے۔ ان دوستوں میں مولانا عبدالمجید سالک بھی تھے۔ ہم کسی اور مضمون میں کسی جگہ یہ ذکر کر چکے ہیں کہ سالک صاحب نے ایک بار اپنے مشہور عالم اذکار وحوادث میں لکھا تھا کہ ”قادیان

والے مرزا بشیر احمد صاحب کو قمرالانبیاء کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ وہ ہمیں ہر سال آموں کا تحفہ بھیجا کرتے ہیں وہ اتنے لذیذ ہوتے ہیں کہ ان آموں کو کھا کر ہم اس بات کے قائل ہو گئے

دادا جان کو حکمت میں بھی شغف تھا۔ جڑی بوٹیوں کی پہچان رکھتے تھے اور ان سے علاج وغیرہ بھی کرتے رہتے تھے۔ دم درود کرنے میں بھی انہیں مہارت تھی خاص طور سے سانپ کے کاٹے کا دم کرتے تھے اور لوگ دور دور سے ڈسے ہوئے لوگوں کو اٹھا کر لاتے تھے۔ دادا جان کے دم سے اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ ٹھیک ہو جاتے تھے۔

دادا جان کا ایک وصف ہم نے یہ دیکھا کہ ان کے داماد مولوی غلام نبی مصری بڑے عالم تھے دادا جان ان کا حد سے سوا احترام کرتے تھے۔ پھوپھی جی سے پوچھتے رہتے تھے کہ مولوی صاحب کو کوئی تکلیف تو نہیں اسی طرح ہمارے تایا لعل خان جناب احمد نور کابلی کے داماد تھے۔ وہ کبھی ہمارے گھر میں آتے تو دادا جان دوسروں سے بڑھ کر ان کی قدر کرتے ان کا خیال رکھتے۔ کہتے تھے انہوں نے شہید کی خوشبو سونگھی ہوئی ہے۔ احمد نور کابلی صاحب کی ناک کسی مرض کی وجہ سے جھڑ گئی تھی ان کے منہ پر پلاسٹک کی ناک تھی جس کی پھنگ پر سنہری عینک دھری رہتی تھی۔ بچے ان کی غنغناتی گفتگو پر ہنستے تو دادا جان بہت برا مانتے۔ ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ دادا جان کا انتقال ہوا تو ہمیں احمد نور کابلی صاحب کو اطلاع دینے کے لئے بھیجا گیا۔ وہ کہیں اندرون شہر میں رہتے تھے۔ غالباً دادا جان کو غسل دینے والوں میں وہ بھی شامل تھے۔

سید احمد نور کابلی صاحب حضرت صاحبزادہ عبداللطیف شہید کے شاگردوں اور جاں نثاروں میں سے تھے۔ سنگساری سے شہادت کے بعد شہید مرحوم کی نعش کئی دنوں تک وہیں پتھروں میں گڑی رہی۔ بادشاہ وقت کی طرف سے نعش مبارک کو وہاں سے ہٹانے کی ممانعت تھی۔ احمد نور صاحب نے کئی دنوں

کے بعد ان کی نعش کو وہاں سے نکالا اور قبرستان میں جا کر دفن کیا۔ ان کی زبان سے ہم نے سنا کہ اتنے دنوں کے بعد بھی نعش مبارک سے خوشبو آتی تھی۔ ظالموں کا بغض مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوا انہوں نے قبرستان میں سے ان کی نعش نکال کر کسی نامعلوم جگہ دفن کر دی کہ شہید مرحوم کی کوئی ظاہری یادگار باقی نہ رہے۔ شہید مرحوم کی یادگار تو تذکرۃ الشہادتین کی وجہ سے اب تک باقی ہے وہ ظالم کہاں ہیں؟ ان کا نام بھی مٹ گیا نشان بھی مٹ گیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

سید احمد نور صاحب کا چہرہ بہت نورانی چہرہ تھا۔ جریب ان کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ سر پر افغانوں والے صافہ کی بجائے پگڑی ہوتی تھی۔ لمبا چغہ سا پہنتے تھے۔ اواخر عمر میں شاید ذہن میں اختلال آ گیا تھا اس لئے کوچہ گرد ہو گئے تھے مگر ضعیف تھے جگہ بہ جگہ تھک کر بیٹھ جاتے تھے قادیان کے لوگ ان کے مرتبہ کو جانتے تھے اس لئے کوئی ان سے بدتمیزی سے پیش نہیں آتا تھا۔ ان کی باتیں بے ربط ہو گئی تھیں مگر کبھی کبھی ایسی کام کی بات ان کے منہ سے نکل جاتی تھی کہ لوگ سر دھنتے رہ جاتے۔ ان کے صاحبزادے چاچا جی سید محمد نور ربوہ میں لمبے عرصہ تک زندہ رہے۔ ان کی سلاجیت ربوہ میں بہت بکتی تھی۔ ان کی بیٹی جو ہماری تائی تھیں دو بیٹے چھوڑ کر جوانی ہی میں فوت ہو گئیں تو ہمارے تایا نے دوسرا بیاہ نہیں کیا۔ ان کی دوسری بیٹی جنہیں ہم خالہ آمنہ کہتے تھے ہمارے ساتھ بڑی محبت کا سلوک روا رکھتی تھیں۔ ان کی اولاد یہاں کینیڈا میں آباد ہے کبھی کبھار انگریزی محاورہ کے مطابق "نیلے چاند میں ایک دفعہ" ان سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔ چاچا جی سید محمد نور کے بیٹے یا بھانجے سید حسن نے ربوہ کی یادوں کے بارہ میں ایک بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔

خالہ آمنہ اللہ بخشے جب تک جیتی رہیں ہمارے ساتھ اسی محبت سے پیش آتی رہیں جیسے اپنے بھانجوں برکت اللہ سمیع اللہ سے پیش آتی تھیں۔ اب تو ان کے دونوں بھانجے بھی اللہ کو پیارے

ہوئے۔ان کی بیٹی زکیہ چھوٹی سی تھی اور مڈل کا امتحان دینے کے لئے ہم سے انگریزی پڑھا کرتی تھی خدامعلوم اب وہ کہاں ہے؟ ہمیں وہ منی سی لڑکی اب بھی یاد ہے۔خالہ آمنہ کا شفیق محبتوں والا چہرہ بھی یاد ہے۔حامد نور صادق نور بھی یاد ہیں۔خدا جانے سید احمد نور کابلی صاحب کا علمی ورثہ کہیں محفوظ ہے یا نہیں؟

ہماری مسجد کے امام ڈاکٹر محمد طفیل صاحب ہوا کرتے تھے۔ان کی گردن کوتاہ تھی۔تیز تیز چلتے تھے۔سر پر لنگی رکھتے تھے۔ہمیں یاد ہے کہ ادھر گھر سے نکلتے تو لگتا تھا بھاگ کر مسجد میں پہنچ گئے ہیں ہم لوگ اذان کے ساتھ گھر سے نکلتے تو مسجد تک پہنچتے پہنچتے ایک رکعت قضا ہو چکی ہوتی۔ڈاکٹر صاحب دراصل ماسٹر صاحب تھے اسکول میں پڑھاتے تھے۔ہمیں جو زمانہ یاد ہے اس میں ریٹائر ہو گئے ہوں گے۔لب سڑک ان کا مکان تھا۔مسجد نور اور ان کے مکان کے درمیان میں کالج کا میدان تھا۔وہ گھر سے نکلتے ادھر ادھر دیکھے بغیر مسجد تک جاتے ان کے جاتے ہی تکبیر کہی جاتی تھی۔لوگ کہتے تھے کہ ان کی آمد و رفت گھڑی کی سوئی کے مطابق ہوتی ہے۔ہمیں اس زمانہ میں اتنا شعور کہاں؟ مگر لوگوں سے سنی ہوئی بات ذہن میں رہ گئی ہے۔ڈاکٹر صاحب کی قرات بہت اچھی تھی نماز مختصر اور سنوار کر پڑھاتے تھے۔نماز میں تیزی نہیں دکھاتے تھے۔

ڈاکٹر محمد طفیل صاحب کا ذکر آیا تو اپنے چوہدری مظفر الدین صاحب یاد آئے جو اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر نہیں لکھتے تھے مگر ہمارے سب بچوں کے معالج تھے۔چوہدری مظفر الدین بنگالی، ریویو انگریزی کے ایڈیٹر تھے مگر دیکھنے میں نہ ایڈیٹر لگتے تھے نہ ڈاکٹر۔ان جیسے سادہ اور نرم و ملائم آدمی ہم نے دنیا میں کم دیکھے ہماری امی کو ان کے دستِ شفا پر بڑا اعتقاد تھا۔بچوں میں سے کسی کو چھینک بھی آجاتی تو فوراً کہتیں جاؤ چوہدری مظفر الدین صاحب سے دوا لے کر آؤ اور آفرین ہے چوہدری

صاحب پر کہ دوپہر ہو رات ہو ان کے آرام کا وقت ہو ہم کسی بھی وقت ان کا دروازہ جا کھٹکھٹاتے تھے ان کے چہرہ پر کبھی ناگواری کے آثار ہم نے نہیں دیکھے۔ سفید ململ کا کرتا پہنے بیٹھک کا دروازہ کھولتے۔ مرض کی کیفیت سنتے اور چھوٹی چھوٹی کاغذ کی پرچیوں میں ہومیو پیتھک دوائیاں بڑے سلیقہ سے ڈال کر ان کی پڑیاں بنانے لگتے۔ وہ تحمل کے ساتھ وہ منی منی پڑیاں بناتے رہتے اور زیر لب کچھ پڑھتے رہتے۔ ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی منی منی پڑیاں بڑی شفا بخش ثابت ہوتی تھیں اور یہ ساری خدمت وہ محض خدمتِ خلق کی غرض سے کرتے تھے کوئی مالی منفعت ان کا مقصود نہ تھی۔ ہومیو پیتھک علاج ان کا ذریعۂ روزگار نہیں ذریعہ خدمتِ خلق تھا اور ہم نے کم لوگوں کو اس خدمت کو بشاشت سے سرانجام دیتے دیکھا ہے۔ ہومیو پیتھک علاج کے سیاق و سباق میں ثابت قدمی اور بشاشت قلبی سے علاج کرنے والے حضرت مرزا طاہر احمد خلیفۃ المسیح الرابع بھی تھے۔ وہ مریض کی بات جس انہماک سے سنتے تھے اور جس طرح خوش دلی سے دوا دیتے تھے وہ اپنی جگہ ضرب المثل ہے۔ چوہدری مظفر الدین صاحب بنگالی قادیان کب آئے اور کب سے وقف کیا ہمیں علم نہیں ہم نے ربوہ میں انہیں دیکھنا شروع کیا۔ بال بچوں والے ہو گئے تو ان کے علاج سے استفادہ کا موقع ملا۔ ان سے زیادہ نرم خو کوئی نہ دیکھا۔

بنگال کے دو تین آدمی ہماری جان پہچان کے ہیں۔ اپنے صوفی مطیع الرحمن صاحب۔ امریکہ کے مبلغ رہے۔ ہم نے جب انہیں دیکھا اس وقت صاحبِ فراش تھے اور معذور۔ ان کا بیٹا خلیل ہمارا شاگرد ہوا۔ خلیل بیچارہ بھی اپنے باپ کی طرح معذوری تک پہنچا اور جوانی ہی میں اللہ کو پیارا ہوا۔ اللہ اس کے بال بچوں کا حافظ و ناصر ہو۔ آمین۔ اس کی بہنیں بہت سی تھیں خدا معلوم اب کہاں ہیں؟ دوسرے اپنے ماسٹر عبدالرحمن صاحب بنگالی۔ ہم نے ان سے انگریزی پڑھی۔ انگریزی کے اصل استاد تو میاں محمد ابراہیم صاحب جمونی تھے مگر کبھی کبھار ماسٹر بنگالی صاحب بھی کلاس لیتے تھے ان کی اولاد

میں سے کمال الدین مرحوم اور جمال الدین ہمارے شاگرد ہوئے۔ کمال الدین بیچارا جوانی میں نو جوان بچے چھوڑ کر راہیِ بقا ہوا۔ اب اس کی اولاد یہاں کینیڈا میں ہے۔ اس کی امی آپا امینہ اور چوہدری مظفر الدین صاحب کی بیگم آپا رشیدہ ہماری بہنیں ہیں۔ اب بات ایک اور بے نفس آدمی طرف مڑ گئی پہلے ان کا ذکر کرلیں تو بات آگے بڑھے۔

قادیان میں ہمارے محلہ میں ایک بزرگ اور بوڑھے رسالدار رہا کرتے تھے رسالدار سردار کرم داد خان۔ آپ فوج سے اعزاز کے ساتھ ریٹائر ہوئے تو حضرت صاحب کی حفاظت پر مستعد ہو گئے۔ ہم جلسہ سالانہ کی تصویروں میں سردار کرم داد خان صاحب کو اپنی وردی پہنے نمایاں طور پہچان سکتے ہیں۔ سردار کرم داد خان صاحب کی شادی حضرت پیر منظور محمد (صاحبِ یسرنا القرآن) کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹیاں چھوٹی ہی تھیں کہ ان کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت سردار کرم داد خان بڑھوتی کی عمر میں تھے مگر ان کی ضرورت اور اخلاص کو دیکھتے ہوئے ہمارے دادا خسر حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب حلال پوری نے اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی۔ ہماری ان پھوپھی کا نام عارفہ تھا اور وہ ربوہ میں لمبی عمر پانے کے بعد فوت ہوئیں۔ ان کی بیٹیاں آپا امینہ اور رشیدہ تھیں ایک ماسٹر عبدالرحمن بنگالی کے عقد میں آئیں اور ایک چوہدری مظفر الدین بنگالی کے حبالہ عقد میں۔ ہماری یہ بہنیں حضرت میر مسعود احمد میر داؤد احمد اور میر سید محمود احمد ناصر کی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ سردار کرم داد خان صاحب کو ہم قادیان کے زمانہ سے جانتے تھے اور انہیں پھوپھا جی ہی کہا کرتے تھے شاید اس وجہ سے کہ ہماری پھوپھی جی کی ایک بہن پھوپھی محمدی تھیں وہ سردار نذر حسین بلوچ سے بیاہی ہوئی تھیں جو ان کے عزیزوں میں سے تھے۔ ان کی بیٹی آپا طیفی تھیں جنھوں نے چنیوٹ میں سکول کی تعلیم کے دوران ہماری بہت دیکھ ریکھ کی۔ قادیان میں ہجرت کے وقت ہماری

بیٹھک میں ایک تو چچا رفیق حیات کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک وصلی تھی الیس اللہ بکاف عبدہ اور ایک آپا طیفی کی تصویر تھی جس میں وہ ہمیں گود میں اٹھائے بیٹھی ہیں۔ ہجرت کے کوئی بارہ تیرہ برس بعد ہم قادیان گئے بیٹھک میں وہ تصویر اور وصلی اسی طرح موجود تھیں کوئی سردار صاحب اس گھر میں مقیم تھے ہم نے کہا یہ ہمیں دے دیں کہنے لگے نہیں یہ لکھائی بہت خوب صورت ہے میں نہیں دے سکتا اور دوسری تصویر تو یہ میری بیٹھک کی واحد ڈیکوریشن ہے۔ ہم نے اسے بتایا کہ اس تصویر میں جو بچہ ہے وہ ہم ہیں۔ کوئی صاحبِ ذوق تھا کہنے لگا ”تو پھر گود سے نکل کر بھاگ جائیں۔ میں تصویر نہیں دے سکتا“۔

جن پھوپھی عارفہ کا ہم نے ذکر کیا وہ بھی بڑی صاحبِ ذوق تھیں۔ ایک روز خود سنانے لگیں کہ میں حلاپور گاؤں میں استانی تھی۔ لڑکیاں بہت بدتمیز اور جھگڑالو تھیں۔ ایک روز بہت شور مچا رہی تھیں۔ اور میں مسلسل انہیں چپ کروانے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ چپ ہو کے نہیں دیتی تھیں۔ سکول میں ایک مددگار کارکنہ تھی اس کو بڑا غصہ آیا۔ وہ کلاس کے اندر آ گئی اور لڑکیوں سے کہنے لگی ”تم کس قدر بدتمیز ہو استانی جی کب سے بھونک رہی ہیں اور تم سنتی تک نہیں ہو خبردار اب جو کسی نے منہ سے آواز نکالی تو میں سب کا گلا گھونٹ دوں گی“۔ کہنے لگیں اس بات پر سب سے زیادہ ہنسی اس کی ”محاورہ پسندی“ پر مجھے آئی مگر اس کی نیک نیتی تھی کہ لڑکیاں چپ ہو گئیں اور میں اب تک اس کے لطیفہ پر ہنس رہی ہوں۔

گودڑ میں کے لعل

جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح شہر اپنے مکینوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ شہر محض گلی کوچوں پر مشتمل نہیں ہوتے۔ ہر شہر کا اپنا مزاج ہوتا ہے اور وہ مزاج اس کے مکینوں کی افتادِ طبع سے معین ہوتا ہے۔ ایسے شہر اور بستیاں جہاں لوگوں کی وفاداری کسی ایک محور کے گرد گھومتی ہو

دوسرے شہروں سے نمایاں طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ رہنے کو تو ایسی بستیوں میں بھی افراد ہی رہتے ہیں مگر ان افراد کا مزاج دوسروں سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ لوگ غریب ہوں یا امیر، چھوٹے ہوں یا بڑے معاشرہ انہی سے بنتا ہے مگر ایسی بستیوں میں کنکروں کے ڈھیر میں سے ہیرے بہت نکلتے ہیں یعنی گودڑ میں سے ایسے ایسے لعل ہائے بے بہا نکل آتے ہیں کہ ان کی آب و تاب سے آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔ فارسی والوں نے اسی بات کو ذرا اور طریقے سے کہہ دیا کہ " خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر"۔ پھر خالقِ حقیقی کی سنت ہے کہ وہ ہر زمانہ میں بعض شہروں میں ایسے وجود پیدا کرتا رہتا ہے جو اپنے ارد گرد رہنے والوں کے لئے رشد و ہدایت کا موجب بنتے اور خاک کے ذروں کو کیمیا بناتے ہیں۔

آں را کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند!

یہ مضمون ایسی ہی بستیوں کے ایسے ہی افراد کے ذکر پر مشتمل ہے جو بہ ظاہر غریب لگتے تھے مگر اپنے مرشدِ کامل کی نظر سے کیمیا بن گئے تھے۔ رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ !

ہم نے برصغیر کی تقسیم سے قبل ایک چھوٹے سے قصبہ میں آنکھ کھولی۔ سنِ شعور کو پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ قصبہ تو چھوٹا ہے مگر اس کے بسنے والے چھوٹے نہیں ہیں۔ ہر شخص جو دیکھنے میں غریب اور مسکین نظر آیا چشمِ بینا کی نگاہ سے دیکھا تو اسے علم اور حلم میں یکتا پایا۔ ایک بزرگ تو خود اپنے گھر کے اندر تھے۔ طبیعت کے غریب مگر علومِ دینی سے مالا مال۔ مرشد نے کہہ دیا کہ فلاں کتاب کا ایک ہی نسخہ ہے جو اس وقت مصر کے کتب خانہ میں ہے ہمارے پاس وہ کتاب ہوتی تو خوب ہوتا۔ یہ غریب الطبع شخص اٹھا، سفر کی اجازت چاہی، پا پیادہ مصر کے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ یہ بیسویں صدی کی بات نہیں کہ ہر قسم کے وسائلِ سفر میسر ہوں۔ انیسویں صدی کے برصغیر کی بات ہے جس میں چار کوس کا سفر بھی کالے کوسوں کا سفر سمجھا جاتا تھا۔ افتاں و خیزاں، منزلیں مارتا، سفر کی صعوبتیں کھینچتا، مصر جا پہنچا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا

کہ اس کتاب کو روشنائی سے نقل کرنے کی اجازت نہیں۔ باریک کچی پنسل سے نقل کرنا شروع کیا گھر پہنچ کر اس باریک تحریر کو سیاہی سے روشن کرتا اور جزو بہ جزو اپنے مرشد کو بھیجتا اور دعائیں سمیٹتا رہا۔ پھر کتب خانہ والوں نے اس پر بھی پابندی لگا دی۔ کچھ حصہ اس کتاب کا باقی تھا۔ یہی طریق سوجھا کہ ہر روز کچھ حصہ اس کا حفظ کرتا اور گھر پہنچ کر اسے لکھتا اور مرشد کی خدمت میں ارسال کرتا رہا تا آں کہ کتاب مکمل ہوئی۔ جتنا عرصہ وہاں گزارا، علماء وصلحاء کی صحبت میں گزارا۔ مرشد کے حکم کی تعمیل کے بعد واپسی کا قصد کیا کہ اب وہاں رہنے کا کوئی جواز باقی نہ تھا۔ واپس پہنچے تو اپنے معاشرہ میں "مصری" کے نام سے موسوم ہوئے ایک دینی مدرسہ میں عربی زبان وعلوم اور حدیث کا درس دینے لگے۔ ہزاروں کو فیض پہنچایا۔ ہم نے ہوش سنبھالا تو ہر شخص کو ان کا احترام کرتے پایا۔ جدھر سے ان کا گزر ہوتا لوگ باگ از راہِ احترام راستہ چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے مگر ہم نے انہیں کبھی آنکھ اٹھا کر کسی کی طرف دیکھتے نہیں دیکھا۔ سر جھکائے، خاموشی سے گزرتے چلے جاتے۔ ہونٹ ہلتے رہتے، بعد کو ہم نے جانا کہ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْم کا ورد کرتے ہیں۔ اول تو محفلوں میں جانا انہیں کھلتا تھا مگر کسی دینی مجلس میں شریک ہوتے تو خاموش بیٹھے کہنے والوں کی باتیں سنتے رہتے۔ ان کا سکوت پہاڑوں کا سکوت ہوتا تھا۔ یہ بزرگ ہمارے پھوپھا تھے۔ ہمارے دادا، کہ ہم نے انہیں دو سو سے اونچے ہو گئے تھے مگر اس بڑھوتی کی عمر میں بھی توانا اور ٹانٹے تھے، قد بھی ساڑھے چھ فٹ سے زیادہ تھا، بڑے رعب داب کے انسان تھے مگر ہمارے ان پھوپھا سے جو ان کے داماد تھے ملتے تو نہایت عاجزی اور احترام سے انہیں ملتے۔ کہتے تھے عالم آدمی ہیں ہم ان کی برابری کہاں کر سکتے ہیں؟ پھوپھا گھر میں تشریف لاتے تو ہماری پھوپھی سے پوچھتے "ٹکڑا ہے؟" جو کچھ ہوتا وہ پیش کر دیتیں اور یہ بسم اللہ کہہ کے ماحضر تناول کر لیتے۔ تھوڑے کی شکایت یا مزید کی فرمائش کرتے ہم نے انہیں نہیں دیکھا۔ تقسیمِ ملک کے

بعد ہم لوگ اپنے آبائی گاؤں چنگا بنگیال میں جا بیٹھے۔ دادا کہ اس گاؤں میں زمین کے مالک تھے اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، آبائی زمین جو کچھ بھی تھی بٹائی پر تھی، سارے خاندان کو اسی بارانی زمین سے اپنا رزق کشید کرنا تھا۔ اس وقت میں ہم نے پھوپھا جی کو کئی بار باجرہ اور مکئی کی روٹی کو پانی میں بھگو کر چباتے دیکھا۔ بچوں کے لئے گھر والے لسی کا انتظام کر دیتے تھے مگر بڑوں کے لئے وہ لسی بھی کفایت نہیں کرتی تھی۔ ہارے ہمارے ابا جو سیاسی قیدی کے طور پر سرحد پار دھر لئے گئے تھے ایک ڈیڑھ سال کی مشقت کے بعد رہا ہو کر آئے تو ہمیں بھی اس مشقت سے نجات ملی اور ہم بھی گاؤں چھوڑ کر اس نئی بستی میں آ بیٹھے جو اولوالعزم مہاجرین نے ربوہ کے نام سے بسائی تھی۔

مگر اس بستی میں جو ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے صرف یہی ایک روشن جبیں نہیں تھے سارا شہر ہی چمکتی پیشانیوں والوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک بزرگ کو دیکھا ٹخنوں سے اونچی شلوار پہنے اپنی بھینس کو چارہ ڈال رہے ہیں۔ معلوم ہوا ایف ایس سی کالج کے گریجویٹ اور انگریزی کے عالم ہیں اور قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ ان کا دور دور تک مشہور ہے اور مستشرقین اس کا حوالہ فخر سے دیتے ہیں۔ مشہور تھا کہ سلام کرنے میں کسی کو پہل نہیں کرنے دیتے۔ ہم نے ایک بار اپنے بچپنے کی ترنگ میں اپنے ایک ساتھی سے مل کر یہ منصوبہ بنایا کہ ہر چہ بادا باد، آج ہم انہیں سلام میں پہل نہیں کرنے دیں گے۔ چنانچہ ہم نے دور سے دیکھا کہ وہ بزرگ اپنے خیالات میں مگن سر جھکائے چلے آ رہے ہیں۔ ہم لوگ ان کے گھر کی گلی میں کونے پر دبک کر کھڑے ہو گئے کہ آج بھلا یہ سلام میں پہل کیسے کریں گے ہم ان کے قدموں کی چاپ سنتے اور اندازہ لگاتے رہے کہ اب موڑ مڑے کہ مڑے، اتنے میں زور سے آواز آئی "السلام علیکم"۔ ہم نے وعلیکم السلام کہہ کر پوچھ ہی لیا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم لوگ یہاں دبکے کھڑے ہیں؟ مسکرائے، فرمایا "میں گلی کا موڑ مڑنے سے پہلے احتیاطاً السلام علیکم کہا کرتا ہوں آپ جواب نہ

دیتے تو کوئی فرشتہ جواب دے دیتا"۔ایسے لوگوں کو آدمی فرشتہ نہ کہے تو کیا کہے؟

ایک شاعر کو دیکھا کہ پریشان مو پھٹے حالوں پڑا پھرتا ہے۔ایک روز اطلس و کمخواب کا ایک بغچہ اٹھائے نظر آیا۔معلوم ہوا نواب بہاول پور نے ان کے کسی شعر پر خوش ہو کر خلعت بھیجی ہے اور یہ پریشان ہیں کہ یہ بلا کہاں سے نازل ہوئی؟ اس کا کیا کروں؟ دوستوں نے کہا پہنو! حقارت سے فرمایا ہم ایسے خاک نشینوں کو سزاوار نہیں کہ اس تکلف سے اپنے بدن کو آلودہ کریں۔یہ شاعر وہ شخص تھا کہ حفیظ جالندھری ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے بیٹھتا تھا۔گمانِ غالب ہے کہ حفیظ کو یہ خلعت ملتی تو حفیظ کا ردِعمل مختلف ہوتا۔اس شاعر کا یہ حال تھا سر ظفر اللہ جب وائسرائے کی کابینہ میں وزیر تھے تو ان کا سامنا ہونے پر اپنی گاڑی سے اتر آئے اور پیشکش کی کہ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جایئے، کہنے لگے روز روز مجھے ایسی سواری تو میسر نہیں آئے گی اس لئے بہتر ہے میں اپنی اوقات میں رہوں۔وزیر نے کہا میری کوٹھی پر چل کر رہئے۔کہا نہیں معاف رکھو کیوں فقیروں کی عادتیں بگاڑتے ہو! شہر سے اتنی دور رہ کر میرے دینی مشاغل میں خلل آجائے گا۔چھ کی دہائی میں جب سر ظفر اللہ خاں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر تھے، پریس والوں نے حسبِ روایت انہیں ڈنر پر مدعو کیا۔آپ نے انکار کر دیا۔ پریس والوں کا صدر ملنے آیا اور پوچھا کیا واقعی آپ ہمارے ڈنر میں نہیں آئیں گے؟ سر ظفر اللہ نے کہا ہاں اس لئے کہ اس سے میرے دینی مشاغل میں خلل آتا ہے۔کیا عجب کہ اس درویشِ بے پروا کی بات انہیں یاد ہو اور وہی ان سے یہ بات کہلوا رہی ہو!

بدیہہ گوئی میں اس شاعر کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ اقبال اس شاعر سے خط و کتابت رکھتے ہیں اور ان کے شعروں کی برجستگی کی داد دیتے ہیں۔حفیظ کے ہاں تو ان کے پس خوردہ کے نشانات بہت عیاں ہیں۔ہم نے اس شاعر کو صرف ایک بار دیکھا اور وہ بھی تقسیمِ ملک کے

بعد۔ داڑھی کو مہندی سے رنگتے تھے، لمبے بالوں کو کبھی رنگ لیتے کبھی یونہی چھوڑ دیتے۔ طبیعت میں انتہا کا استغناء تھا۔ غربت کے باوجود خوددار تھے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے بلکہ دینے والے بھی سوچ سمجھ کر اور وقت دیکھ کر کچھ دے دیتے تھے کہ ان کا دیا ٹھکرا نہ دیا جائے۔ موت آئی تو لائل پور میں آئی دفنانے والوں نے مٹی کی امانت مٹی کو سونپنے میں عجلت دکھائی۔ اب ان کی ڈھیرٹی کو بھی کوئی پہچاننے والا نہیں۔

پھر ایک دیہاتی وضع کے بزرگ کو دیکھا کہ تہمد باندھے دیسی جوتی پہنے سر پر پگڑی رکھے ہاتھ میں موٹا سا عصا پکڑے تیز قدموں سے چلتے ہوئے جا رہے ہیں مگر تیز قدمی کے باوجود چال میں وقار اور تمکنت ہے۔ مسجد میں نماز پڑھتے انہیں دیکھا تو سجدہ میں زار و قطار گریہ کر رہے ہیں گویا ان کی روح آستانہٴ الٰہی پر پگھل کر بہہ رہی ہے۔ ان کی دعا گوئی کا شہرہ صرف اس شہر میں ہی نہیں چار دانگِ عالم میں تھا۔ لوگ دور دور سے انہیں دعا کیلئے لکھتے اور یہ ان کے لئے دعا کرتے تھے اور بارگاہِ ایزدی میں ان کی دعائیں مقبول ہوتی تھیں۔ ہم نے جب انہیں دیکھا اس وقت ضعیف تھے ان کے گھر کے دروازے ہر کس و ناکس کے لئے کھلے رہتے تھے لوگ آتے، بیٹھتے، دعا کرواتے اور چلے جاتے تھے۔

ہمارا اپنا مشاہدہ ہے کہ دعا کے لئے کہا، آپ نے ہاتھ اٹھائے کہ آؤ مل کر دعا کرلیں، نہایت تضرع سے دعا کی اور فرمایا روشنی نظر آئی ہے بارگاہ ایزدی سے امید ہے دعا قبول ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ۔ یا یہ کہ کوئی اشارہ نہیں ہوا کوشش جاری رکھئے اور دعاؤں میں سستی نہ کیجئے۔ قبولیت دعا کو اپنی کرامت نہیں جتاتے تھے۔ کسی نے نذرانہ دیا کسی نے نہ دیا کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ بس فیض کا ایک دریا تھا جو بہتا تھا۔

متوکل اتنے کہ مرشد کی جانب سے کسی جگہ جانے کا حکم آیا۔ چل کھڑے ہوئے۔ گھر والے کہتے

ہی رہ گئے کہ گھر میں کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں، بچوں کی سکول کی فیس ادا ہونی ہے، آپ سفر پر جا رہے ہیں ہم کیا کریں گے؟ کہنے لگے اب میں خدا کی راہ میں چل پڑا ہوں اب میں رک نہیں سکتا۔ جس کی راہ میں نکلا ہوں وہی سب کا متکفل ہوتا ہے۔ ابھی گھر سے چار قدم ہی گئے تھے کہ ایک اجنبی دوڑتا ہوا آیا اور ان کے ہاتھ میں سو روپے رکھے کہ فلاں شخص نے اس تاکید کے ساتھ بھیجے ہیں کہ ان کا نام ظاہر نہ کیا جائے۔ اسی لانے والے کو ساتھ لیا اور راستہ میں سے گھر کے لئے خورونوش کا سامان لے کر اسے دیا کہ میرے گھر پہنچا دو باقی رقم گھر میں بھجوا دی کہ متفرقات میں کام آئے گی۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنے متوکلین کے ساتھ کیسا کیسا پیار کا سلوک روا رکھتا ہے۔ ایسا کئی بار ہوا اور ان کی خودنوشت سوانح حیات ''حیات قدسی'' ایسے خوارق سے بھری پڑی ہے۔ دیکھنے میں وہ ایک بالکل معمولی انسان لگتے تھے۔ علم کا دریا تھے بولتے تو سننے والے دم بخود ہو کر سنتے۔ ہم نے ان کی محفل میں لوگوں کو جاتے تو دیکھا مگر ان کے وعظ سے کسی کو اٹھتے نہیں دیکھا۔ ان کے خاندان کو لوگ سات پیڑھیے ولیوں کا خاندان کہتے تھے۔ رعب داب اتنا کہ بے خوف ہو کر مخالفین کی صفوں میں درانہ چلے جاتے اور کوئی ان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھ سکتا نہ دم مار سکتا۔ انیسویں صدی کے اواخر کا زمانہ مناظروں، مباحثوں مجادلوں کا زمانہ تھا ہر جگہ ہر آن مختلف نظریات رکھنے والوں میں مباحثے ہوتے۔ یہ ایسی مجلسوں میں بھی جہاں لپاڈگی یا سر پھٹول کا احتمال ہوتا درانہ چلے جاتے اور فریق مخالف کی شورش سے ذرا خوف زدہ نہ ہوتے۔ ان کے ہاں وہ خطیبانہ رنگ نہ تھا جو اس دور میں بڑا زود اثر سمجھا جاتا تھا اور لوگ منبر رسول پر کھڑے ہو کر اپنے جھوٹ کا تانا بانا بھی فصاحت و بلاغت سے بنتے تھے لفظوں کے طوطے مینا بناتے اور عام عوام سے واہ واہ وصول کرتے تھے مگر ان کی بات سادہ دیرپا تاثیر ہوتی تھی لفظوں کی جادوگری کی بجائے روحانیت کے خمیر سے اپنی باتوں کو جلا دیتے تھے۔ اسی لئے لوگ ان کی محفلوں میں جاتے تو جم کر بیٹھ جاتے تھے اٹھ

نہیں سکتے تھے۔ بڑے بڑے مباحثوں میں گئے اور واپس آ ئے توسینکڑوں کونورِ ہدایت سے منور کر کے آ ئے۔

انہیں اللہ تعالیٰ کی تائید بھی بہت حاصل تھی جو بات کہہ دیتے خدا اسے پورا کرتا۔ پورے وثوق سے اپنے روحانی تجربات کا ذکر کرتے اور لوگ ان تجربوں کے گواہ ٹھہرتے ۔ہم نے اس بزرگ صوفی کو عام لوگوں کی طرح چلتے پھرتے ،اور زندگی کرتے دیکھا مگر لگتا تھا اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس دنیا کے نہیں ہیں کسی اور دنیا کے باشندے ہیں۔ان کی وفات کے بعد یوں محسوس ہوا کہ ہمارے سروں سے قبولیت دعا کا سایہ اٹھ گیا اور ہم کڑی دھوپ میں ننگے کھڑے رہ گئے ہیں۔ ہمارے معاشرہ میں قبروں پر جا کر منتیں ماننے کا رواج نہیں ورنہ لوگوں سے بعید نہ تھا کہ پیر پرست لوگ ان کی ڈھیری کے مجاور بن بیٹھتے۔

ایک بزرگ کو دیکھا کہ سر پر بڑا سا پگڑ باندھے اور بر میں لمبا سا چغہ پہنے چلے آتے ہیں۔معلوم ہوا فقہ کے بڑے عالم ہیں اور دینی علوم میں تیرے ہوئے ہیں مگر باتوں میں وہ سادگی کہ دیکھنے والے کو ذرا گمان نہ گزرے کہ وہ کسی بڑے عالم اور محدث کے روبرو ہے۔اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ ۔کہ تم میں سے بڑا وہی ہے جو زیادہ متقی ہے۔ہم نے اپنے اردگرد ایسے بڑوں کو دیکھا تھا جو دیکھنے میں بڑے نہیں لگتے تھے۔اب تو وہ زمانہ آ لگا ہے کہ چھوٹے بھی بڑے بنتے ہیں۔ جو دو حرف پڑھ گیا وہ گویا مولوی اور محدث اور مولانا ہو گیا حالانکہ ایسا علم جس سے تکبر پیدا ہو اور جس کا حاصل کرنے والا متکبر ہو جائے اس قابل ہے کہ اس پر تین حرف بھیجے جائیں۔اور ایسے ہی خود ساختہ علماء کرام ہمیں لے بیٹھے ہیں

۔

ایک میانہ قد کے ذرا فربہی مائل شخص کو دیکھا کہ اردگرد سے بے نیاز ، اپنی دھن میں مست چلے آ

رہے ہیں۔سر پر پرانی وضع کی کرسٹی کی سرخ ٹوپی ہے۔ ہاتھ میں کتاب ہے پاؤں میں مٹی سے اٹا ہوا جوتا ہے۔انہیں کسی نے روک لیا ہے اور وہ اس کو کوئی مسئلہ سمجھا رہے ہیں۔بات دھیمی لہجہ دھیما، مضمون مشکل مگر سمجھانے والے کا کمال ہے کہ اس نے اس مشکل مسئلہ کو پانی کر دیا ہے۔ سننے والا مطمئن ہو کر اپنی راہ لیتا ہے سمجھانے والا اپنی دھن میں مگن آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ علم ادیان کے ماہر ہیں۔نماز کے بعد مسجد میں درسِ حدیث دیتے ہیں تو لوگ عش عش کرتے ہیں اور دور دور سے ان کے درس میں شامل ہونے کے لئے آتے ہیں۔ان کا تعلق دلی کے میر درد کے گھرانے سے ہے۔ایک دینی مدرسہ کے میر مدرس ہیں ۔یتیموں، بے آسرا لوگوں کے کفیل ہیں ، در در سے آٹا اکٹھا کرواتے اور بھوکوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ان بے آسرا لوگوں میں سے کئی اندھے ہیں کئی معذور ہیں مگر انہیں اپنے آذوقہ کی فکر نہیں ۔ ہر شخص اپنی جگہ بیٹھا ہوا اپنا کام کر رہا ہے۔بھئی کیا کام کر رہا ہے؟ دعا! اور ہم نے جس معاشرہ میں آنکھ کھولی تھی اس میں دعا کو ہی سب سے مقدم سمجھا جاتا تھا اور ہے۔

غیر ممکن کو یہ ممکن میں بدل دیتی ہے۔

اے لو یہ ایک اور بزرگ نظر آئے۔سادہ کپڑوں میں ملبوس سر پر کلاہ پر بندھی ہوئی لنگی ، وضع قطع سے بڑے بارعب لگتے ہیں۔ لاہور کے گورنمنٹ کالج کے پڑھے ہوئے ایم اے۔ انگلستان میں اسلام کی اشاعت بھی کر چکے ہیں۔اب ایک عجیب وغریب ہیئت کی لبے انجن کی گاڑی میں دھول میں اٹے بیٹھے ہیں۔معلوم ہوا انہیں مرشد کا حکم ہے کہ اپنے علاقہ سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں۔ بھلا ایسی پھٹیچر گاڑیوں پر الیکشن لڑے جاتے ہیں؟ مگر مرشد کا حکم ہے اللہ نے چاہا تو جیت انہیں کی ہوگی۔ اور ہوئی تقسیم ملک کے وقت یہ پنجاب اسمبلی کے رکن تھے مگر گرفتار ہوئے تو عام قیدیوں کی طرح انہیں سی کلاس میں سڑنا پڑا۔ ہمارے ابا بھی ان کے ساتھ قید میں تھے ان کا کہنا ہے کہ یہ ایم ایل اے (یعنی

ممبر لیجسلیٹو اسمبلی) غریب مفلوک الحال خارش زدہ قیدیوں میں جا بیٹھتا اور انہیں سمجھا تا رہتا، لوگ کہتے خارش چھوت کی بیماری ہے آپ کو لگ جائے گی جواب ملتا کیا فرق پڑتا ہے خارش ہی تو ہے کوئی مہلک بیماری تو نہیں ! یہ معمول قید کا سارا عرصہ جاری رہا۔ رہا ہو کر آئے تو اسمبلی کے اجلاس میں چلے گئے گویا پکنک سے واپس آئے ہیں۔ ہم نے انہیں اپنے ابا کی دوستی کے ناطے بہت قریب سے دیکھا۔ بڑے آسودہ حال زمیندار خاندان سے تھے مگر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دین کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر کے اس بستی میں اٹھ آئے تھے۔ اپنی وفات تک کام میں منہمک رہے۔ وقت آیا تو خاموشی سے جان جاں آفریں کے سپرد کر دی تقسیم ملک کے بعد کے زمانہ میں اس نئی بستی کے اردگرد کے ماحول کی تربیت کا کام ان کے سپرد تھا اجنبی لوگوں میں گھل مل کر بیٹھ جاتے۔ ان کی زبان میں ان سے گفتگو کرتے ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے۔ دیکھتے دیکھتے نئے ماحول کی اجنبیت ختم ہو گئی لوگ انہیں اپنا جاننے اور سمجھنے لگے جیسے برسوں کے یارانے ہوں!

ایک بزرگ روئی بھرا لمبا چغہ (جسے دلی والے دگلہ کہتے ہیں) پہنے چلے آ رہے ہیں۔ سن شریف اسی سے زیادہ ہوگا۔ لمبی سفید داڑھی ہے سر پر سبز رنگ کی پگڑی ہے۔ ہاتھ میں جریب نما لکڑی ہے۔ یہ بزرگ امریکہ اور دیارِ مغرب میں اسلام کا نام اونچا کر چکے ہیں۔ اب ضعیف ہو گئے ہیں مگر گھر میں بیٹھنا انہیں دوبھر ہے۔ نمازیں تو مسجد میں جا کر پڑھتے ہی ہیں صبح کی مشی ان کا معمول ہے۔ ان کی آواز میں بڑی ملائمت ہے۔ جوانی میں، اگر اپنے ملک میں ہوتے تو، شہر میں مستشرقین کے استقبال و مشایعت کا فرض انجام دیتے تھے۔ ہم نے ایک ہنگیرین مستشرق ڈاکٹر جولیس جرمانوش کی کتاب میں ان کا 1930 کا ایک فوٹو دیکھا جس میں یہ اپنے مرشد کے مزار پر دعا کرتے نظر آ رہے ہیں۔ ہو بہو وہی قد و قامت اور سراپا ہے۔ اس مستشرق کو اس بستی کی دو ہی چیزیں یاد تھیں ان کے مرشد سے ملاقات اور ان

کے ساتھ اس کی ملاقات ۔ ہم نے انہیں بھی عجز و انکسار و فروتنی کا پیکر پایا۔ علم کے پھل سے لدے ہوئے درختوں کی طرح جھکے ہوئے!

یہ وہ لوگ تھے جنہیں ہم نے اپنے بچپن اور لڑکپن کے زمانہ میں دیکھا اور سنا اور جن کی یادیں اب بھی آج بھی ذہن کو معطر رکھتی ہیں! ان میں سے اکثر کو ہم نے تقسیم ملک کے بعد اپنے نئے ماحول میں بھی چلتے پھرتے دیکھا مگر اب سڑک کے پار قبرستان کی جانب جانا ہوتو اس شہرِ خموشاں کا سناٹا بولتا اور ماضی کو آوازیں دیتا ہے۔ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں۔

(2)

شہروں اور قصبوں میں آمد و رفت کے ذرائع اب تو بہت ہو گئے ہیں ایک زمانہ تھا کہ سوائے بیل گاڑیوں یا یکوں تانگوں کے اور کوئی وسیلۂ سفر میسر نہ تھا۔ غالب کے زمانہ تک یہ حال تھا کہ غالب نے کلکتہ تک کا اکثر سفر بیل گاڑی کے ذریعہ یا گھوڑے پر طے کیا تھا۔ اس زمانہ میں صاحب استطاعت لوگ گھوڑوں یا گھوڑا گاڑیوں میں سفر کرتے تھے عام لوگوں کی سواری یکہ تھا یا بیل گاڑی۔ گھوڑے جن گاڑیوں کو کھینچ سکتے تھے ان میں تنوع آتا چلا گیا۔ رتھوں اور بہلیوں کی جگہ یکوں یا اکوں نے لے لی ۔ بات دور نکل جائے گی۔ ہمیں کہنا یہ ہے کہ جس بستی کے روشن جبینوں کا ذکر ہم نے کیا ہے اس تک پہنچنے کے لئے ریل تو بہت بعد میں آئی عام عوام وہاں تک پہنچنے کے لئے یکوں اور تانگوں میں بیٹھ کر جاتے تھے قریب ترین ریل کا سٹیشن بارہ میل کے فاصلہ پر تھا۔ عقیدت مند مرشد کی زیارت کے لئے آتے تو ریل انہیں بارہ میل پرے اتار دیتی وہاں سے آگے کا سفر تانگے یا یکے میں ہوتا یا پاپیادہ۔ بارہ میل کا سفر، نہ کوئی سڑک نہ کوئی پختہ پگڈنڈی، یکے والے اپنے اندازے سے سواری کو لے چلتے بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖ ھَا

وَمُر سَاہَا! کچھ دور تک نہر کی پٹڑی ساتھ دیتی پھر وہی اونچا نیچا کھیتوں میں سے گزرتا ہوا راستہ! مرشد کا بھی یہ عالم تھا کہ مہمان آتے تو بچھے جاتے، رخصت ہوتے تو مشائعت کی غرض سے نہر کی پٹڑی تک ساتھ جاتے اور دعائیں دے کر رخصت کرتے کہ جاؤ اللہ کو سونپا۔

اس بستی کے عالموں کا ذکر آپ سن چکے وہاں کے یکہ بانوں میں بھی عجیب لوگ پیدا ہوئے۔ایک صاحب تھے۔حافظ قرآن، ہاتھ پیر سے مضبوط۔کوئی اور کام کرنے کی بجائے یکہ چلانے لگے۔معمول یہ تھا کہ سواری بٹھاتے تو قرآن کی تلاوت شروع کر دیتے۔ہم نے اپنے ہوش میں انہیں یکہ بانی کرتے نہیں دیکھا کہ یہ کام وہ ترک کر چکے تھے اور زمیندارہ کا کام کرتے تھے وہاں بھی یہی عالم تھا کہ ہل جوتتے اور تلاوت کرتے رہتے۔بیلوں کو گالیوں کی بجائے دعائیں دیتے رہتے پھر وہ زمانہ بھی ہم نے اپنی آنکھوں دیکھا کہ قریب کے شہر تک جانے کی ضرورت ہوتی تو دوسروں کے یکہ میں نہ بیٹھتے، پیدل چلتے یا گدھے کی سواری اختیار کرتے۔کہتے تھے میں یکوں میں اس لئے سوار نہیں ہوتا کہ یکہ بان اپنی روزی کمانے والے جانور کو کوستے اور گالیاں بکتے رہتے ہیں۔

اپنی ہوش میں ہم نے ایک تانگے والے کو دیکھا کہ گم سم اپنے تانگے پر بیٹھا رہتا ہے۔سواری خود چل کر آئے تو آئے وہ کسی کو بلاتا نہیں۔ جو سواری مل گئی اس نے جو دے دیا سو لے لیا کبھی زیادہ کے لئے حجت نہیں کرتا۔ہم نے سوچا خوب آدمی ہے ایسے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے چنانچہ ہمیں جب بھی تانگہ لینے کی ضرورت ہوتی اسی کو زحمت دیتے۔اسے بھی عام تانگے والوں کی طرح باتیں کرنے کا لپکا نہیں تھا خاموشی سے گھوڑے کو ہانکتا رہتا۔کئی بار اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر وہ نہیں کھلا۔ایک بار ایک صاحب لاہور سے اپنی بچی کے جہیز کا زیور لے کر بس سے اترے۔یہی تانگہ موجود تھا اس میں بیٹھ گئے گھر میں اترے مگر زیور والا ڈبہ تانگہ میں بھول گئے۔تانگہ والا جا چکا تو انہیں یاد آیا کہ زیور تو

تانگے ہی میں رہ گیا۔ سیٹی گم ہوگئی دیوانہ وار بسوں کے اڈہ کی طرف بھاگے۔ کچھ دور گئے ہوں گے کہ وہی تانگہ والا انہی کی جانب واپس آتا دکھائی دیا۔ انہیں دیکھ کر رکا اور بولا، یا حضرت آپ بھی کمال آدمی ہیں بھلا اتنا بھی کوئی لا پرواہوتا ہے کہ اپنا سامان بھی تانگے سے نہ اتارے۔ میں اڈہ پر واپس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ آپ کی سیٹ پر کوئی چیز دھری رکھی ہے۔ وہ تو اللہ نے خیر کی کہ کوئی اور سواری ابھی تک نہیں بیٹھی اس لئے میری نگاہ پڑ گئی اس لئے الٹے پیر واپس ہوا ہوں اپنی امانت لیجئے اور اللہ کا شکر کیجئے۔ انہوں نے لپک کر زیور کا ڈبہ لیا اور بے صبری سے کھول کر دیکھا۔ اس پر تانگہ والے نے کہا اچھی طرح جانچ لیجئے کہ آپ کی کوئی چیز ضائع تو نہیں ہوئی میں نے تو کھول کر بھی نہیں دیکھا کہ اس میں کیا ہے۔ انہوں نے اسے کچھ انعام دینا چاہا تو اس نے نہیں لیا۔ بہت مصر ہوئے تو اس نے کہا اچھا ایسی ہی بات ہے تو مسجد کے چندہ میں دے دیجئے میں اپنے ذاتی صرفہ کے لئے امانت داری کا انعام نہیں لے سکتا۔ ایسے ایمان دار بہت ہوتے ہیں کہ دوسروں کی امانت لوٹا دیں مگر ایسے کتنے ہیں کہ کوئی اپنی خوشی سے کچھ دے تو اسے مسجد کے چندہ کے طور پر دے دیں۔ ہوں گے۔ مگر یقیناً ''الشاذ کالمعدوم'' کے حکم میں ہوں گے۔ ہمارے آس پاس ایسے لوگ شاذ نہیں تھے بہت تھے۔

ایک صاحب کو دیکھا کہ ریلوے میں کسی ادنیٰ ملازمت پر ہیں اور لاہور میں تعیناتی ہے، جمعہ کے روز لاہور سے نوے میل دور اپنے مرشد کے پیچھے جمعہ کی نماز ادا کرنے باقاعدگی سے سفر کرتے ہیں کسی نے کہا کیا لاہور میں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی ؟ کہنے لگے ہوتی ہے مگر میرا مرشد تو یہاں رہتا ہے مجھے ریلوے کا مفت سفر کرنے کا پاس ملتا ہے، رات کو ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گاڑی میں بیٹھتا ہوں، صبح اپنے مرشد کے شہر میں پہنچ جاتا ہوں لنگر خانہ سے تبرک کھاتا ہوں جمعہ پڑھ کر واپس گاڑی پر بیٹھتا ہوں اور ڈیوٹی کے وقت واپس لاہور پہنچ جاتا ہوں۔ اب بتایئے میرا کیا حرج ہوتا ہے؟ مفت کا ثواب لیتا ہوں!

یہ صاحب ریٹائر ہوئے تو اپنے بیوی بچوں سمیت اپنے مرشد کے شہر میں ڈیرے لگا لیئے۔ ہم نے بھی انہیں دیکھا، طبیعت کے نہایت مسکین، مزاج صوفیانہ، علم کا ذوق رکھنے والے، اپنے بیٹوں کو کالج کی تعلیم دلوائی اس ناطہ سے دونوں بیٹے ہمارے شاگرد ہوئے۔ چھوٹا بیٹا کہ بڑا نغز گو شاعر تھا، کالج سے فارغ ہوا تو بینک میں ملازم ہوا اور ایک روز اپنی ڈیوٹی پر جاتا ہوا بس کے حادثہ میں شہید ہو گیا۔ ہم پرسے کے لئے حاضر ہوئے تو باپ کا صبر دیکھ کر صبر جمیل کا مطلب سمجھ میں آیا۔ جزع فزع نہ بے صبری کا کوئی کلمہ! بوڑھا باپ کوہِ وقار بنا بیٹھا تھا۔ دوسرے صاحبزادے سکول میں پڑھاتے اور علم بانٹتے ہیں۔ ان کے ابا کی وفات ہوئی تو ہم نے تعزیت کا خط لکھا جواب آیا کہ ہمارے ابا آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔ ہم نے ان کی یاد کو یاد رکھا۔ آج ایسے غریب الطبع صالحین کا ذکر ہوا تو ان کا نام نامی سامنے آ گیا۔ اور لوگوں کی خوبیاں ہی تو یاد رہ جاتی ہیں!

اپنے سکول کالج کے زمانہ میں بعض ایسے کارکن دیکھے کہ حیرت ہوتی ہے وہ تھوڑے گزارے میں گذرا کیسے کرتے تھے؟ آمدن اتنی کم کہ آج کے دور میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا مگر وضع داری ایسی کہ مالی قربانیوں کے وقت سب سے آگے۔ ہمارے ایک استاد تھے، عربی فارسی کے منتہی، ادب کے عاشق، آمدن وہی جو ایک عام اوٹی کی ہو سکتی تھی مگر ہر مہینے اپنی تنخواہ کا چوتھا حصہ خدا کی راہ میں باقاعدگی سے دیتے تھے اور وصیت تھی کہ میرے ترکہ کا بھی چوتھا حصہ راہ مولا میں صرف ہو۔ ان سے ایک رشتہ اور بھی تھا کہ ان کا بیٹا جو (پاکستان کی آڈٹ سروس کے سب سے اونچے عہدے سے ریٹائر ہوا ہے) ہمارا کلاس فیلو تھا۔ اس طرح ان کے گھر میں آنا جانا تھا۔ ہمیں ان کے ہاں کسی تنگی کا احساس نہ ہوا شاید اس لئے بھی خود ہمارے ابا بھی اتنے ہی گزارے پر قانع تھے۔ دراصل وہ وقت ہی ایسا تھا کہ لوگ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے تھے قربانیاں بھی کرتے تھے اس لئے دینے والا ان کے رزق میں

برکت ڈال دیتا تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ ایک بار ہماری کوئی چیز کسی رسالہ میں چھپی ہوئی دیکھی۔ راستہ میں مل گئے تو باہیں پھیلا کر ہمیں اپنے سینہ سے لگا لیا اور اپنی جیب سے اپنا بٹوہ نکال کر ہمیں دے دیا اور فرمایا میں اتنا خوش ہوں کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ تمہیں دیتا ہوں۔ ہمیں اپنے ادب کے استاد کی یہ حوصلہ افزائی بہت خوش آئی اور آج تک یاد ہے۔ اس بٹوہ میں تو شاید صرف چار چھ آنے کی رقم تھی مگر اس رقم کے ساتھ جو پیار تھا وہ انمول تھا۔ ہمیں اللہ نے ایسے استاد دئے تھے۔ قبلہ شیخ منظور الٰہی صاحب درِ دلکشا نے ایک بار ہمیں لکھا معلوم ہوتا ہے بچپن میں آپ کو اچھے استاد میسر آئے کہ آپ بے تکان لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ہم نے انہیں یہی کہا ''جی الحمدللہ یہ سب استادوں کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ دو چار حرف لکھنے کا سلیقہ آ گیا ہے۔ اور استاد بھی ایسے استاد! کہ دنیا انہیں دیکھ کر دنگ رہ جائے''۔ ان کی زندگی دست بکار اور دل بایار کا نمونہ تھی فارغ وقت میں خالی نہ رہتے ذکر الٰہی کرتے رہتے۔ سکول سے فارغ ہوئے تو مسجد۔ ورنہ دینی کتب کا مطالعہ۔ کوئی نہ کوئی کتاب ہر وقت ان کے ہاتھ میں نظر آتی۔ ایسے استادوں کے تذکرے اب قصہ کہانیوں کی طرح رہ جائیں گے کیوں کہ قدریں بدل گئی ہیں۔ درس و تدریس اب کمائی کا ذریعہ بن گئی ہے اس لئے استادوں کے کہے میں برکت نہیں رہی۔ وہ استاد معدوم ہوئے جن کا فیض اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی سکھاتا تھا۔

انہی کی عمر کا ایک شیر فروش بھی یاد ہے۔ پٹھان۔ رعب داب والا آدمی۔ رزق کمانے کے لئے شیر فروشی کرتا تھا۔ سامنے بڑے کڑاہے میں دودھ پڑا ہے اس پر بالائی کی یہ موٹی تہہ جمی ہوئی ہے۔ جس نے جتنا دودھ لیا اس کے حصہ کی بالائی علیحدہ سے اس کے دودھ کے اوپر ڈال دیتا ہے۔ اپنے وطن میں خوش حال آدمی تھا مگر مرشد کے قدموں میں رہنے کی آرزو اس جگہ کھینچ لائی ہے۔ کڑاہے کے پاس بیٹھے قرآن شریف پڑھ رہے ہیں۔ گاہک آیا۔ اسے فارغ کیا پھر تلاوت میں مگن۔ بھلا ایسے نیک لوگ

دودھ میں ملاوٹ کیوں کرنے لگے؟ سادگی کا عالم یہ ہے کہ ہمارے ابا کی روایت کے مطابق ایک صاحب آئے اور ان سے کہا کہ مجھے حکیم نے ایک دوا کھانے کو تجویز کی ہے مگر اس کا بالائی کے ساتھ کھانا ضروری ہے، بالائی دے دیجئے، کہنے لگے بالائی تو نہیں ہے۔اس نے حجت کی کہ سامنے کڑاہا رکھا ہے اور اس پر بالائی کی یہ موٹی تہہ ہے آپ کہتے ہیں بالائی نہیں ہے۔ کہنے لگے میاں یہ بالائی ان لوگوں کے لئے ہے جو دودھ لینے آتے ہیں کیوں کہ یہ انہی کے حصہ کے دودھ سے اتری ہے میں آپ کو دوسرے کے حصہ کی بالائی کیسے دے دوں؟ دیر تک حجت ہوتی رہی۔فیصلہ اس بات پر ہوا کہ آپ کی مجبوری ہے کہ دوا کے لئے آپ کو بالائی چاہئے اس لئے میں بالائی تو دوں گا مگر اس بالائی کے پیسے نہیں لوں گا آپ وہ پیسے مسجد کے چندہ میں دے دیں۔اسی بزرگ شیر فروش کو پاکستان میں بھی ہم نے دیکھا مگر اب شیر فروشی چھوڑ دی تھی ان کا کہنا تھا اب خالص دودھ کا خریدنا اور بیچنا ممکن ہی نہیں رہا اس لئے کون اپنی عاقبت خراب کرے۔

ایک عمر رسیدہ خاتون اس بستی کی گلی کوچوں میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پھری پھرتی تھیں اور بلند آواز سے گاتی تھیں۔ فاطر العقل ہوں گی؟ نہیں جناب! اپنے ہوش وحواس میں ہیں، پوری ہوشمند۔فلمی گیت گاتی ہوں گی؟ جی نہیں کان لگا کر سنئے نعتیں پڑھ رہی ہیں۔ یا بہ آواز بلند ذکر الٰہی کر رہی ہیں۔بستی والے ان کا احترام روا رکھتے ہیں۔ یہ دن چڑھے سفید صاف ستھرے کپڑے پہن کر اپنی روند پر نکل پڑتی ہیں۔تھک جائیں گی تو کسی گھر کے سامنے دم لینے کو رکیں گی۔ گھر والی خاتون انہیں پانی وانی کا پوچھے گی، سادہ پانی تو قبول کر لیں گی مگر کوئی مشروب یا کھانے کی چیز نہیں لیں گی۔ کھانے کا وقت ہوگا تو سیدھی لنگر خانہ جائیں گی اور وہاں سے سیر ہو کر پھر صلیٰ علیٰ نبینا صل علیٰ محمد اس بزرگ خاتون کو ہم نے تقسیم کے بعد دیکھنا شروع کیا۔ان کا بیٹا ملک کا نامور صحافی تھا، بھلا سا نام تھا اس

کا ہاں یاد آیا ضیاء الدین احمد سلہری، جو زیڈ اے سلہری کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا تھا۔ ماں کی وفات ہوئی تو بھی اس بستی میں نہ آسکا کہ ملک سے باہر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ماں کے آخری دیدار سے بھی اسے محروم رکھا! ہاں اس کا پوتا ضرور آیا اور دادی کو مٹی دی۔ یہ خاتون بڑی مستجاب الدعوات تھیں دوسروں کے حق میں ان کی دعائیں بڑی قبول ہوتی تھیں مگر اپنے بیٹے کے باب میں ان کی تضرعات نہ سنی گئیں۔ یہ معاملہ تو سننے والے اور مانگنے والے کا اپنا معاملہ ہے۔

ایک بزرگ اور بھی تھے جسے چاہتے راہ میں روک لیتے اور وہی بات کہتے جو عین اس کے دل میں ہوتی، سننے والا ہکا بکا انہیں دیکھتا۔ فرماتے میں نجومی یا رمال نہیں ہوں اللہ کا ایک حقیر بندہ ہوں بس تم توبہ استغفار کا دامن پکڑو اور تقویٰ اختیار کرو میرا مقصد محض تنبیہ کرنا ہے کچھ مانگنا نہیں۔ لوگ ان کی بھی بہت عزت کرتے تھے دعاؤں کی درخواست کرنے ان کے در پر جاتے تھے ان کا وطیرہ یہ تھا کہ کوئی اپنی مرضی سے بھی نذرانہ دیتا تو قبول نہ کرتے۔ مشہور تھا کہ یہ بھی مستجاب الدعوات ہیں۔ ہم نے انہیں گلیوں کوچوں بازاروں میں دیوانہ وار ذکر الٰہی کرتے دیکھا۔ پیدل چلتے تھے۔ اپنے گھر سے بہت دور اپنے مرشد کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھنے آتے تھے سردی ہو یا گرمی ان کے معمول میں فرق نہ آتا تھا فرق صرف اس روز آیا جس روز ان کی سناؤنی آئی!

پرانے تذکروں میں بعض اولیاء اللہ کے بارے میں مذکور ہے کہ رزق کمانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھے مگر بہ باطن ولی ہوتے تھے۔ ہم نے ایک دو نہیں کئی اولیاء کو اپنے معاشرہ میں دیکھا۔ گدھے پر بار برداری کا کام کر رہے ہیں، نماز کا وقت آیا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مسجد میں پہنچے ہوئے ہیں، نماز ختم کی پھر اپنے کام میں مصروف اور لبوں پر درود اور ذکر الٰہی۔ دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود! جوتے گانٹھ رہے ہیں مگر لب ذکر الٰہی سے اور آنکھیں خشیت الٰہی سے تر ہیں۔ جسمانی

محنت مشقت کا کام کر رہے ہیں مگر اپنے دینی مشاغل سے غافل نہیں ہیں۔ لوگ باگ دور دور سے دعاؤں کی درخواست کرنے آتے ہیں۔ کریانے یا منیاری کی چھوٹی سی دکان ہے، نماز کا وقت ہوا تو سیدھے مسجد! پیسے کا گاہک ہے یا روپے کا، اب نماز ختم ہونے کا انتظار کرے۔ نماز کے وقت سارے شہر کے بازاروں میں کاروبار کا بند ہو جانا ہم نے اسی عجیب بستی میں دیکھا اور اس میں کسی جبر و اکراہ کا دخل نہیں۔ لوگ اپنے وقت پر نماز کے لئے خود اپنی دکان بڑھا دیتے ہیں۔

تقسیم سے پہلے کا ہمیں یاد ہے کہ بازار میں ہندو سکھ بھی تھے مگر وہ اونچے مینار سے نماز کا بلاوا سنتے تو اپنی دکانوں کے پردے گرا دیتے تھے۔ شہر کیا ہے اللہ والوں کا ڈیرہ ہے مگر یہ نہیں کہ صرف ان پڑھ یا کمی کمین یہاں بستے ہیں۔ آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے اور پی ایچ ڈی تک تعلیم یافتہ لوگ سب اس معاشرہ میں موجود ہیں مگر ان کی پہلی ترجیح دین کو دنیا پر مقدم کرنے کی ہے کہ اس بات کا عہد انہوں نے اپنے مرشد سے باندھا ہوا ہے۔

اب یہاں یورپ اور شمالی امریکہ کے دنیا دار معاشرہ میں ویسی بے نفسی، بے لوثی اور نیک طبعی کو ڈھونڈتا ہوں تو آنکھیں ناکام لوٹتی ہیں۔ کہاں گیا وہ زمانہ کہاں گئے وہ لوگ؟

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر۔

رشتۂ مودت

اللہ کے کچھ نیک بندوں کا ذکر آپ سن چکے مگر بات یہیں تک نہیں رہتی آگے بھی چلتی ہے۔ ان بستیوں میں جن کا ذکر ہم نے کیا، لوگوں کا آنا جانا بہت تھا، کوئی زیارت کے لئے آتا تھا کوئی تحقیقِ حق کے لئے آتا تھا۔ مرشد کا عالم یہ تھا کہ ہر آنے والے کی راہ میں آنکھیں بچھاتے، مہمانداری کرتے۔ ان

کا کہنا تھا کہ یہ مہمان میرے بلائے سے تو آئے نہیں خدا نے بھیجے ہیں ورنہ میں تو غریب وبیکس وگمنام و بے ہنر ہوں لوگ اسی کے بھیجے ہوئے آتے ہیں اس لئے ان کی مہمانداری فرضِ جان کر کرتا ہوں۔ اس مہمانداری کی روایت نے اس مرشد کے ماننے والوں میں مہمانداری کی ایک عظیم الشان روایت کی بنیاد رکھ دی جو اب ایک تناور درخت بن چکی ہے۔

آنے والوں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو ایک بار آئے تو پھر پاؤں توڑ کر یہیں بیٹھ رہے۔ ایک مریدِ باصفا ایسے تھے کہ اپنی حکمت اور طبابت کے بل بوتے پر بادشاہوں کے درباروں تک رسائی رکھتے تھے۔ مرشد سے ملنے آئے تو انہوں نے فرمایا اب تو آپ یہیں رہیں گے نا؟ اس شخص نے جس نے اپنے وطن میں اپنے نئے مکان کی نیو اٹھا رکھی تھی، پیچھے کہلا بھیجا کہ اب تعمیر ملتوی کر دو ہمیں مرشد کی جانب سے واپسی کا اذن نہیں ملا۔ مکان کی تعمیر ملتوی ہوئی، پھر ارشاد ہوا کہ آپ علمی ذوق کے آدمی ہیں اس جگہ آپ کو کتابوں کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہوگی اپنا کتب خانہ منگوا لیں، چنانچہ کتب خانہ آ گیا۔ پھر دونوں بیویاں آ گئیں۔ اس باوفا نے پھر بھول کر بھی اپنے وطن کو یاد نہیں کیا۔ وہی بستی ان کا وطن بن گئی اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ ہم نے ان کا مزارِ مبارک دیکھا ہے۔ اپنے مرشد کے پہلو بہ پہلو سو رہے ہیں۔

ایک وہ لوگ تھے جو آتے تھے کہ اپنی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھیں جس نے اس زمانہ کا مرشد ہونے کا دعویٰ کر رکھا ہے۔ لوگ آتے، مہمانخانہ میں ٹھہرتے، اپنے مرشد کی اقتداء میں نمازیں پڑھتے، ان کے ملفوظات سنتے، ان کے ارد گرد بیٹھنے اٹھنے والوں کو دیکھتے۔ اکثر لوگ اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیتے، کچھ ایسے بھی ہوتے کہ عہدِ بیعت باندھ کر واپس پہنچتے تو وطن میں ایک طوفانِ بلا ان کا منتظر ہوتا۔ ایسے ہی ایک نجیب الطرفین سید بزرگ کابل کی سرزمین سے اس چھوٹے سے قصبہ میں وارد ہوئے۔

بیعت سے مشرف ہوئے۔ رخصت ہوئے تو مرشد نہر تک مشایعت کی غرض سے آئے۔ جانے والا بار بار مرشد کے چہرے کی طرف دیکھتا اور کہتا تھا شاید یہ مبارک چہرہ مجھے دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہو۔ وہی ہوا۔ اپنے وطن واپس پہنچے تو طوق و سلاسل کو منتظر پایا۔ لوگ کشاں کشاں انہیں بادشاہِ وقت کے پاس لے گئے کہ مرتد ہو گیا ہے، کفر کو گلے لگا کر واپس آیا ہے۔ علماء سوء نے کافر و زندیق قرار دیا۔ بادشاہِ وقت نے کہ ان کے خاندان کا معتقد تھا بہت سمجھایا کہ توبہ کر لیں اور اپنے عہدِ بیعت کو توڑ لیں۔ اس نے کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہدایت پانے کے بعد پھر ضلالت کی جانب لوٹ آؤں؟ علماء نے فتویٰ دیا کہ ایسے کافر کی سزا یہ ہے کہ سر بازار سنگسار کیا جائے۔ بادشاہِ وقت کے حکم کے موافق ان کی ناک چھید کر اس میں نکیل ڈال دی گئی اور اسی نکیل کے ساتھ کھینچتے ہوئے مقتل میں لے گئے۔ لعنت ملامت کرتا ہوا تماشائیوں کا ہجوم ہمراہ گیا۔ کمر تک زمین میں گاڑ دئے گئے۔ بادشاہ نے آخری بار پھر پوچھا کیا اب بھی توبہ کرتے ہو؟ جواب ملا ہدایت سے توبہ؟ اس چار دن کی زندگی کی خاطر؟ تم جو کرنا چاہتے ہو کر گزرو، میں اپنے عہدِ بیعت سے منحرف ہونے کا نہیں۔ مکفر علماء نے بادشاہ سے کہا پہلا پتھر آپ چلائیں۔ بادشاہ نے کہا فتویٰ دینے والے آپ ہیں آپ ہی پہل بھی کریں اس پر اس معصوم پر پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ سنگسار کر دینے کے بعد ان کا بغض ٹھنڈا نہ ہوا۔ لاش چار دن تک وہیں پتھروں میں گڑی رہی۔ پانچویں دن ان کے ایک معتقد نے لاش وہاں سے نکالی اور دفن کی۔ شہید کی لاش سے شہادت کی خوشبو آتی رہی۔ مرشد کو اپنے اس باوفا مرید کی قربانی کی اطلاع ملی تو بہت آزردہ ہوئے مگر اس کے اہل وطن کو انتباہ بھی کیا کہ اے کابل کی سرزمین تو خدا کی نگاہوں سے گر گئی۔ اور یہ بھی کہ شہید کا خوں رائیگاں نہیں جائے گا۔ اور تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ رائیگاں نہیں گیا۔ کابل کی سرزمین زبانِ حال سے مرشد کی اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ ’’کوئی لطیف ہے ان پتھروں میں سویا ہوا۔‘‘

یہ تو ان جاں نثاروں کا احوال تھا جو وہیں کے ہو رہے یا اپنی جان کا نذرانہ دے بیٹھے۔ مگر دراصل ذکر اس چھوٹی سی بستی کے مہمانوں کا تھا۔ ایک بار رات کے وقت ایک مہمان دور کی منزلیں مارتا اس بستی میں پہنچا۔ مرشد کو معلوم ہوا کہ کوئی مہمان وارد ہوا ہے۔ کھانے پینے کا اہتمام کر چکے تو معلوم ہوا کہ چار پائیاں اور بچھونے تو پہلے سے موجود مہمانوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ مرشد نے لالٹین جلائی، ایک مزدور کو جگا کر بلایا، ان بنی چار پائی اس کے حوالے کی کہ لو میاں جلدی جلدی ہاتھ کے ہاتھ اسے بن دو۔ خود لالٹین ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو گئے کہ کسی اور کو کیوں تکلیف دیں، ادھر مہمان کو چار پائی ملنے میں توقف ہوا تو اس نے مہمان خانہ میں جھانکا کہ اس توقف کا سبب کیا ہے؟ دیکھا کہ اس کا مرشد لالٹین ہاتھ میں لئے کھڑا ہے اور کھٹ بنے سے کہہ رہا ہے میاں ذرا تیز ہاتھ چلاؤ مہمان کو تکلیف ہو رہی ہوگی۔ چار پائی بنی گئی مہمان کو دے دی گئی اور یہ سب کچھ یوں ہوا گویا کچھ ہوا ہی نہیں، بستی میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ رات مرشد نے ایک نو وارد مہمان کی مہمانداری میں کیا زحمت اٹھائی ہے۔ ایک مہمان کے بارہ میں رات گئے معلوم ہوا کہ زمرہ میں دار طبقہ سے متعلق ہیں اور رات کو سونے سے قبل دودھ پینے کی عادت ہے۔ مرشد اسی وقت اٹھے کسی خادم کو جگانے کی بجائے خود ایک گلاس دودھ کا بھرا اور مہمان کو جا کر دیا اور معذرت کی کہ آپ کی اس عادت کا علم پہلے نہ تھا اس لئے آپ کی خدمت میں دودھ پیش نہ کیا جا سکا۔ یہ تو اس وقت کی باتیں ہیں جب اس بستی کو اور بستی والے مرشد کو دنیا جانتی نہ تھی، پھر تو وہ رجوعِ خلائق ہوا کہ مہمان بھی بہت ہو گئے خدمت کرنے والے ان سے زیادہ میسر آ گئے۔ اس بستی میں دسمبر کے مہینہ میں ایک سالانہ جلسہ ہوتا تھا اس میں لوگ ہزاروں کی تعداد میں حاضر ہوتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد سالانہ جلسے میں حاضر ہونے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی۔ لاکھوں لوگوں کے قیام و طعام کا بندوبست کرنا کوئی آسان کام نہیں مگر ہوتا تھا، مشکلیں ہوتی تھیں

مگر آسان ہوتی چلی جاتی تھیں۔ایک بار کی بات ہمیں یاد ہے۔جلسہ پر لاکھوں مہمان حاضر تھے،ان کا کھانا تیار کرنے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں نانبائی درکار ہوتے ہیں،کسی دشمن نے خدا جانے ان نانبائیوں کے کان میں کیا پھونک دیا کہ ان میں سے آدھے لوگ ہڑتال کر کے بیٹھ گئے کہ ہم روٹیاں نہیں پکائیں گے۔منتظمین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ اب کیا ہوگا؟ نانبائی روٹی پکانے سے انکاری ہیں ادھر صبح کاذب کا وقت ہوا چاہتا ہے اب تک نصف سے زیادہ چولہے اور تنور روشن نہیں ہوئے صبح ہاہا کار مچ جائے گی۔مہمان کیا کریں گے؟ ہزاروں نہیں لاکھوں پر نوبت ہے،کیا بنے گا؟ ڈرتے ڈرتے مرشد کو خبر کی کہ یہ مسئلہ درپیش ہے۔لاکھوں مہمانوں کے لئے صبح دم روٹی مہیا کرنا ممکن ہی نہیں۔مرشد نے پوچھا ایک ایک روٹی مہیا کر سکتے ہو؟ منتظمین نے کہا جی ایک ایک روٹی تو مہیا کی جاسکتی ہے۔مرشد کی جانب سے اعلان ہوا کہ آج کوئی مہمان ایک سے زیادہ روٹی طلب نہ کرے۔مہمانوں نے ایک ایک روٹی کھائی اور جلسہ سننے کے لئے چل پڑے۔کچھ بھی نہیں ہوا،شام کے کھانے سے پہلے پہلے نانبائیوں کا مسئلہ حل ہوگیا۔سب کام اپنے معمول کے مطابق ہونے لگے۔یہ ابتلا آیا اور گذر گیا۔ہم ایک قیام گاہ میں مہمانوں کی مہمان نوازی پر متعین تھے۔اس فرودگاہ میں پنجاب کے اس علاقہ کے مہمان ٹھہرے ہوئے تھے جو دس دس بیس بیس روٹیاں تو بغیر ڈکار لئے کھا جاتے ہیں،اس روز صبح ہم نے دیکھا کہ ایک مہمان مہمان نوازی پر مستعد بچوں پر ناراض ہو رہے ہیں۔ہم نے پوچھا کیا ہوا؟ فرمانے لگے امام کا حکم ہے ایک روٹی کھاؤ اور یہ بچہ مجھے دو روٹیاں دے کر میرے ایمان کو آزمارہا ہے! جہاں مہمان نواز ایسے تھے وہاں مہمان بھی ان سے کم نہیں تھے۔

مہمان نوازی کا ذکر ہوا تو ایک بزرگ یاد آئے جو فیصل آباد کے کسی دور دراز کے علاقہ سے سائیکل پر آیا کرتے تھے۔بوڑھے آدمی تھے اپنی ہی ہم عمر سائیکل پر آتے تھے،پنجاب میں دسمبر کے مہینہ میں

خاصی سردی پڑتی ہے، مگر وہ ایک کمبل اوڑھ کر سائیکل پر بیٹھ جاتے اور چل میرے سائیکل بسم اللہ کہہ کر روانہ ہو جاتے۔ بستی میں وارد ہوتے تو سیدھے وہاں تشریف لاتے جہاں ان کے علاقہ کے لوگ قیام کرتے تھے اتفاق سے کئی برس ہمیں اس علاقہ کے مہمانوں کی مہمان داری کا شرف ملا۔ ہم نے کہا آپ اس سردی میں اتنی دور سے سائیکل پر آتے ہیں! فرمانے لگے دور سے؟ تمہارا کیا مطلب ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے مجھے دور جانا پڑتا تھا۔ اب تو اللہ میاں مرکز اور مرشد کے ڈیرہ کو کھینچ کر میرے پاس لے آیا ہے۔ فیصل آباد کون سا دور ہے یہی تین چار دن کا سفر ہے میں دنوں کا سفر تو نہیں! یہ لوگ اپنے مرشد کی باتیں سننے کو آتے تھے۔ سارا وقت جلسہ میں بیٹھے رہتے۔ اس بستی میں لہو ولعب تو ویسے بھی نہیں ہوتا تھا مگر جلسہ کے دنوں میں تو اس بستی میں روحانی رونقیں بہت ہوتی تھیں۔ درس ہے، تہجد ہے، نمازیں ہیں، جدھر نکل جاؤ اللہ رسول کا ذکر اذکار ہے۔ مگر مولویوں کو یہ سب کچھ ایک آنکھ نہیں بھایا۔ جب تک اس جلسہ پر پابندی نہیں لگوالی انہیں چین نہیں آیا۔ اب کے برس اس تسبیح کے بکھرے ہوئے دانے جرمنی میں جمع ہوئے۔ پچاس ہزار لوگ تھے۔ یورپ کے لئے یہ عجوبہ تھا کہ لوگ دور دراز سے محض اپنے مرشد کو سننے کے لئے کھچے آرہے ہیں اور جرمنی کے مقامی لوگ عجیب محبت کے ساتھ ان کی خدمت پر مستعد ہیں، مہمانوں کو اپنے گھروں میں ٹھہرا رہے ہیں ان کے کھانے پینے کے سفر حضر کے ذمہ دار ہیں۔ ان لوگوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ جرمنی میں تو باپ بھی اپنے بیٹے کو اپنے گھر میں بصد استکراہ ٹھہرنے کی اجازت دیتا ہے یہ کون لوگ ہیں جن کی روایتیں ایسی مہمان نوازی کی اجازت دیتی ہیں؟ جرمنی کے ایک سفیر ہمارے دوست ہیں انہیں باور ہی نہیں آتا کہ پچاس ہزار مہمانوں کو مفت قیام وطعام کی سہولت مہیا کی گئی۔ ہم نے کہا میاں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟ جاؤ اور جا کر کسی مہمان سے پوچھ لو کہ اس نے اپنے قیام وطعام کے لئے اپنے میزبان کو کیا ادائیگی کی ہے؟ وہ بھی پکے اور کھرے جرمن

ہیں۔ہم سے چھپ کر ایک دو لوگوں سے پوچھ بیٹھے جب لوگوں نے ان کو بتایا کہ لاکھوں مہمانوں کی مہمان داری کرنا ہماری روایت ہے تب انہیں یقین آیا۔ ورنہ ہماری باتوں کو باور کرنے پر وہ تیار نہیں تھے۔

ہمیں اپنے قیام جاپان کی بات یاد آئی۔ٹوکیو سے ہمارے جاپان کے امام نے ہمیں بتایا کہ جاپان کی کسی کمپنی نے ڈنمارک کی کسی کمپنی سے مشینری منگوائی ہے اس مشینری کو لگانے کے لئے ایک ہمارے ہم مسلک مسلمان انجینئر آئے ہوئے ہیں وہ اوساکا کی سیر کے لئے آنا چاہتے ہیں کیا آپ انہیں وقت دے سکیں گے؟ ہم نے کہا چشم ما روشن دل ما شاد! بسم اللہ تشریف لائیں۔قدم نما دفرود آ کہ خانہ خانۂ تست۔ وہ یورپ کے رہنے والے ہم جنوبی ایشیا کے باشندے! ایک دوسرے کو دیکھا ہے نہ جانتے ہیں۔وہ تشریف لائے ہم ریلوے سٹیشن پر انہیں لینے کو حاضر تھے۔ایک ''السلام علیکم'' کی آواز ابھری اور ساری اجنبیت ختم ہوگئی۔عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام! ہم لوگ ایسے ٹوٹ کر ملے جیسے برسوں سے آشنا ہیں۔اگلے روز ہم نے اپنے جاپانی رفقاء کار کو اپنے مہمان سے ملانے کے لئے اپنے گھر پر مدعو کر رکھا تھا ساتھ میں ہماری یونیورسٹی کے ڈینش زبان کے اساتذہ بھی مدعو تھے۔سب لوگ اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے رہے کہ آپ کس رشتۂ اخوت میں منسلک ہیں؟ ہم نے انہیں سمجھایا کہ یہ رشتہ دنیا کے باقی رشتوں سے زیادہ پائیدار ہے۔اسی طرح ایک بار پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام جاپان میں کیوتو کے مقام پر ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لائے۔ہم نے انہیں اپنی یونیورسٹی میں آنے کی دعوت دی وہ تشریف لائے۔اب پھر ہمارے رفقاء کو حیران ہونے کا موقع ملا کہ کہاں فرانس کا ایک نابغہ اور کہاں ادب کا ایک ادنیٰ استاد! دونوں میں کیا قدرِ مشترک ہے کہ ایک دوسرے کو یوں جانتے پہچانتے ہیں اور وہ نابغہ روزگار شخص جس سے ملاقات کا موقع حاصل کرنے کے

لئے لوگ سالوں انتظار کھینچتے ہیں اس شخص کی دعوت پر بلا تکلف کھینچا چلا آیا ہے ۔ وہ موقع ہماری یونیورسٹی کے لئے واقعی یادگار موقع تھا۔ جب پروفیسر سلام کو نوبل پرائز ملا تو ہمیں مبارکباد کا جو پہلا خط جاپان سے آیا وہ ہمارے انہی وائس چانسلر صاحب کا تھا یہ محبت کے رشتے یونہی قائم نہیں ہو جاتے ان کے پسِ پردہ کسی مرشد کی قوتِ قدسی کارفرما ہوتی ہے۔ اور سارے رشتے سارے تعلق اس تعلق کے آگے ہیچ ہو جاتے ہیں۔

مودت کا وہ رشتہ جو مرشد نے اپنے نمونہ سے اپنی جماعت کے اندر قائم کیا تھا اب بھی اسی طرح استوار ہے اور مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔ اچھی روایتیں یونہی قائم و دائم رہتی ہیں۔

خدا کے کچھ متوکل بندے

میں اپنی بستی کے روشن جبینوں کا ذکر کر رہا ہوں تو بار بار ان کے خوارق میرے سامنے آتے ہیں یعنی ان کی حیاتِ مبارکہ کے ایسے واقعات جو عام زندگی میں وقوع پذیر ہوتے نظر نہیں آتے۔ ان لوگوں کا اپنے خدا سے ایسا پختہ تعلق تھا کہ ان کا خدا بھی ان کے ساتھ ویسا ہی پیار کا سلوک روا رکھتا تھا۔ ہمارا معاشرہ بہ حیثیتِ قوم خوارق اور معجزات سے مایوس ہو چکا ہے اور اس مایوسی کی وجہ سے ہم اپنے مالک و خالق کو بھی اپنے جیسا مجبور و مقہور اور گونگا بہرا سمجھنے لگے ہیں حالانکہ وہ بولتا بھی ہے سنتا بھی ہے۔ **اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ!** کہ پکارنے والے مجھے پکاریں تو میں جواب دیتا ہوں۔

ان اللہ والوں کے ہاں توکل الی اللہ کی ایک صفت مشترک تھی، جسے دیکھا متوکل اور مطمئن پایا۔ ایک وجود کی خودنوشت سوانح حیات پڑھی تو سوائے اس کے کچھ نتیجہ نہ نکال پائے کہ اس شخص کو توکل کا جو مرتبہ حاصل تھا وہ ہر کسی کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ اپنے مطب میں بیٹھے ہیں، مرشد اپنے مستقر سے باہر دہلی

میں ہیں۔ حکم آتا ہے کہ ''فوراً دہلی پہنچیں''۔ وہیں اور اسی وقت اٹھ کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ تک نہیں کہ اندر گھر والوں کو اطلاع ہی کر دیں کہ مرشد کی طرف سے طلبی ہوئی ہے اس لئے دہلی جا رہا ہوں۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ جیب میں زادِ راہ بھی ہے یا نہیں؟ لباس کی، بستر کی ضرورت ہوگی۔ اتنا سوچنا تو دور کی بات تھی جوتا پہننے کی طرف بھی توجہ نہیں چلتے جاتے ہیں اور پاؤں سے اپنا جوتا سیدھا کرتے اور پہنتے جاتے ہیں۔ بارہ میل کا سفر طے کر کے ریل کے اسٹیشن تک پہنچے تو ایک شخص کو منتظر پایا اس نے کہا میرے گھر سے بیمار ہیں انہیں دیکھ لیجئے۔ فرمایا میں رک نہیں سکتا۔ اس نے کہا ابھی گاڑی کے آنے میں کچھ دیر ہے اتنی دیر میں آپ دیکھ سکتے ہیں میرا گھر قریب ہی ہے۔ گئے۔ مریضہ کو دیکھا نسخہ لکھ دیا۔ اس نے کچھ رقم بطور نذرانہ جیب میں ڈال دی ٹکٹ لینے لگے تو اتنی ہی رقم تھی جتنی انہیں ٹکٹ کے لئے درکار تھی۔ اتنے میں ان کا خادم ان کا سامان لے کر پہنچ گیا ورنہ یہ تو اسی بے سروسامانی کے عالم میں گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔

ان کے توکل کا عجیب ترین واقعہ وہ ہے جو انہیں ایک ریاست میں پیش آیا۔ مہاراجہ کے درباری معالج تھے اپنی داد و دہش اور صدقہ و خیرات کی عادت کی وجہ سے ایک بنیے کے تقریباً ایک ڈیڑھ لاکھ روپے کے مقروض تھے۔ ایک دوسرا بنیا جوان کا مریض بھی تھا انہیں ''سمجھایا'' کرتا تھا کہ بھگوان کی راہ میں خرچ کرنا اچھی بات ہے مگر کچھ اندوختہ بھی ہونا چاہئے کیونکہ ریاست کی نوکری ہے اور ویسے بھی آپ کے بہت سے لوگ دشمن ہیں جانے کیا لگائی بجھائی کریں۔ آپ سنتے اور مسکرا کر خاموش ہو جاتے۔ آخر وہی ہوا۔ دشمنوں کا وار چل گیا اور مہاراجہ نے انہیں اچانک ایک روز فارغ کر دیا۔ آپ اطمینان سے گھر آئے اور واپسی کے سفر کی تیاری کرنے لگے حالانکہ جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ وہ دوسرا بنیا خیر خواہ بن کر آیا اور کہنے لگا اسی دن کے لئے میں آپ کو متنبہ کیا کرتا تھا اب آپ اتنا قرضہ

کیسے ادا کریں گے اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کا قرضہ ادا کئے بغیر آپ کو یہاں سے جانے کون دے گا؟ اتنے میں مہارانی کا کارندہ کچھ رقم لے کر آیا کہ مہارانی نے بھیجی ہے۔کرایہ کی رقم کا تو اللہ نے انتظام کر دیا۔ابھی وہ بنیا وہیں حاضر تھا کہ اس قرض خواہ بنیے کا کارندہ آیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا حضرت مجھے اپنے مالک کی طرف سے ہدایت ملی ہے کہ آپ کو سفرِ حضر میں جتنی بھی رقم کی ضرورت ہو وہ حاضر کروں فرمایئے میں کیا خدمت کرسکتا ہوں۔وہ بنیا خاموش بیٹھا یہ سارے ''تماشے'' دیکھتا رہا۔آخر اس سے رہا نہ گیا کہنے لگا یہ بھگوان کے معاملے بھی عجیب ہیں انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ہم کسی کے مقروض ہوں تو قرض خواہ جان عذاب میں کر دیتا ہے اور ایک یہ ہیں کہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کے مقروض ہیں اور قرض دینے والا مزید روپیہ پیش کر رہا ہے۔غرض حکیم صاحب بڑی عزت آبرو اور اطمینان کے ساتھ ریاست کو چھوڑ کر اپنے وطن کو روانہ ہوگئے۔ہم نے حضرت حکیم صاحب کی تصویر دیکھی ہے ان کی آنکھوں میں توکل کی عجیب کیفیت نظر آتی ہے ان کی خودنوشت سوانح حیات ''مرقاۃ الیقین'' ایسے خوارق سے بھری پڑی ہے۔

ایک بزرگ ہیں جنہیں ہم نے اپنی ہوش میں بڑے قریب سے دیکھا۔وہی جو توکل علی اللہ، پاپیادہ مصر کے سفر پر نکل پڑے تھے۔ان کی عام زندگی بھی عجیب متوکلانہ زندگی تھی۔دست با کار دل با یار! ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے۔اپنے مرشد کی ایک تصنیف منیف کا عربی میں ترجمہ کر رہے تھے، اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے یہی دھن سوار رہتی کہ اس کام کو مکمل کرلیں۔اپنے مرشد کے طریق کی پیروی میں چلتے ہوئے لکھتے تھے۔ان کے مرشد کا طریق یہ تھا کہ ایک دوات کمرہ کے ایک کونہ میں اور دوسری دوات دوسرے کونہ میں رکھ لیتے اور قلم کو روشنائی میں تر کر کے لکھتے لکھتے دوسری جانب روانہ ہو جاتے، وہاں پہنچتے تو قلم کو روشنائی میں ڈبو لیتے اس طرح چلتے چلتے لکھتے تھے۔ان بزرگ کو بھی ہم نے

اسی طرح لکھتے دیکھا مگر ان کا خط اتنا پاکیزہ تھا جیسے موتی پروئے ہوں۔ عربی رسم الخط میں لکھنے کی عادت پختہ ہوگئی تھی۔ مصر میں اپنے مرشد کی مطلوبہ کتاب کو نقل کرتے کرتے یہ عادت راسخ ہوگئی۔ پاکستان بننے کے بعد تک ان کا ترجمہ کا کام جاری تھا۔ کتاب کے صفحات کو علیحدہ کر کے ہر صفحہ کے ساتھ ایک سادہ کاغذ جوڑ لیتے اور اس پر ترجمہ لکھتے جاتے، کاٹ چھانٹ کرتے ہم نے انہیں نہیں دیکھا۔ پانچ حصوں کی اس ضخیم کتاب کا ترجمہ کر کے دم لیا۔ ترجمہ ہو چکا تو یوں لگتا تھا اسی ترجمہ کے انتظار میں جی رہے تھے ادھر فارغ ہوئے ادھر بلاوا آ گیا۔ ہم نے ان کی وفات پر شہر بھر کو روتے دیکھا۔ زندگی میں ہم نے انہیں کبھی روپیہ پیسہ کا ذکر یا حساب کرتے نہیں دیکھا۔ جب گذارہ ملتا رومال میں لپیٹ کر لیتے اور اسی طرح اپنی اہلیہ کو دے دیتے۔ ملتان کے ایک رئیس ان سے حدیث کا درس لیا کرتے تھے ایک بار وہ انہیں ملنے کو آئے اور جاتے ہوئے علیحدہ بلا کر ایک لفافہ ہمیں دیا کہ جا کر اپنی پھوپھی جی کی خدمت میں پیش کر دوں۔ پھوپھی جی نے وہ خط کھولا تو اس میں نذرانہ کی کچھ رقم تھی ساتھ میں دعا کی درخواست۔ یعنی انہیں استغنا بھی اتنا تھا کہ کسی سے نذرانہ لینا بھی انہیں کھلتا تھا۔

ایک بزرگ تھے لاہور میں کسی کے ہاں مقیم ہوئے۔ واپسی کا عزم کیا تو میزبانِ مصر ہوا کہ کچھ دیر مزید ٹھہریں۔ مگر یہ واپسی کا عزم کر چکے تھے نہ رکے۔ ان کا سامان میزبان کی تحویل میں تھا اس نے روک لیا۔ یہ اپنے ساتھی کے ہمراہ چل پڑے اور پیدل چلتے چلتے مرید کے پہنچ گئے۔ آدھی رات کے وقت پہنچے ایک مسجد میں قیام کیا۔ بھوک سے برا حال تھا۔ اس وقت کون ان کو پوچھتا؟ اس پر طرہ یہ کہ ساتھی کو تیز بخار نے آلیا۔ ایک اور آزمائش کھڑی ہوگئی۔ وضو کر کے اللہ کے حضور کھڑے ہو گئے کہ وہی شافی اور کافی اور قریب ہے۔ نمازِ ختم کی تو دروازہ پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو ایک شخص تازہ تیار شدہ کھانے کا تھال لئے کھڑا تھا کہ لیجئے اور تناول فرمایئے۔ پوچھا برتنوں کا کیا ہوگا کہنے لگا یہیں رکھ دیجئے گا

میں بعد میں لے لوں گا، دونوں مسافروں نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ ایک مسافر اور بھی موجود تھا اس کو بھی کھانا نہیں ملا تھا اس نے بھی سیر ہو کر کھایا۔ ساتھی کی بھوک رفع ہوئی تو بخار بھی اتر گیا۔ فارغ ہو کر برتن ایک طرف رکھ دیئے۔ صبح نماز کے لئے اٹھے تو دیکھا کہ مسجد کا دروازہ اندر سے بند ہے اور برتن وہاں موجود نہیں ہیں۔

انہی بزرگ کا بیٹا بیمار ہوا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ بخار ہے کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ رات کا وقت ہے۔ بیوی نے کہا ڈاکٹر کو بلائیں ورنہ بچہ چٹ پٹ ہو جائے گا۔ کہنے لگے اس وقت ایک ڈاکٹر قریب ترین ہے اسی کو بلا سکتا ہوں اور بلاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وضو کر کے نماز کے لئے کھڑے ہو گئے اور اس وقت سلام پھیرا جب بچے نے خود آواز دے کر ان سے پانی طلب کیا سلام پھیرا تو بچہ ٹھیک ٹھاک بیٹھا کھیل رہا تھا اور بیماری کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اسی طرح ایک بار گھر سے کہیں دور سفر پر تھے ان کے ایک اور بچہ کو ٹائیفائیڈ ہو گیا اور 29 دن تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ آنکھیں متورم ہو گئیں حتیٰ کہ ان میں پیپ پڑ گئی۔ ڈاکٹروں نے کہا اول تو بچہ کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ بچ بھی گیا تو آنکھیں تو ضائع ہو ہی جائیں گی۔ بذریعہ تار انہیں واپس آنے کی ہدایت کی گئی۔ آئے۔ بچہ کو دیکھا۔ دل میں درد پیدا ہوا۔ آستانہِ الٰہی پر جھک گئے۔ کمرہ بند کر کے دیر تک گڑگڑاتے رہے آخر اللہ تعالیٰ نے تسلی دی۔ کمرہ کھول کر باہر آئے تو بچہ کا بخار جا چکا تھا ڈاکٹر تو بچے کی آنکھوں سے مایوس ہو ہی چکے تھے اس لئے اپنے نسخہ سے بچہ کی آنکھوں کا علاج شروع کیا اس کی آنکھیں صاف ہو گئیں۔ ان بزرگ کے یہ صاحبزادہ ہمارے دوست تھے۔ ہم نے انہیں دیکھا ہے ان کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکیلی تھیں۔ نظر بھی بہت تیز تھی۔ اس کی وجہ ان بزرگ کی خودنوشت سوانح حیات ''حیات قدسی'' پڑھنے پر معلوم ہوئی۔ ہمارے یہ دوست اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ باپ کی طرح متوکل اور دعا گو۔

ایک گاؤں کے بڑے زمیندار سے ملنے گئے۔اس نے ان کے مرشد کی شان میں بہت نازیبا کلمات کہے آپ نے اسے ٹوکا کہ اللہ والوں کے باب میں ایسا نازیبا کلام مناسب نہیں ہوتا کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی بڑی غیرت ہوتی ہے۔اس پر وہ زمیندار بہت برافروختہ ہوا اور ان سے بدتمیزی سے پیش آیا کہنے لگا میں بڑا زمیندار ہوں اتنی زمین میری ملکیت ہے کیا تم اور تمہارا مرشد میری زمین چھین لو گے؟ آپ وہاں سے اٹھ کر آ گئے۔کچھ عرصہ کے بعد یہ بزرگ لاہور میں اپنے ایک ہم عقیدہ وکیل کے ہاں بیٹھے تھے کہ دیکھا وہی زمیندار وہاں پھٹے حالوں اس وکیل سے استمداد کے لئے سائلوں میں بیٹھا ہے۔انہیں دیکھا تو لپک کر ان کے پاس آیا اور بتایا کہ وہ زمین سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور اب مقدموں میں پھنسا ہوا ذلیل ہو رہا ہے۔خدا کے لئے اس کے لئے دعا کریں کہ اسے ان مصیبتوں سے نجات ملے۔تب اسے یاد آیا ہو گا کہ اس نے ان کے مرشد کی شان میں جو گستاخی کی تھی اس کے سارے ابتلا اس کے نتیجہ میں وارد ہوئے ہیں۔ان کے مرشد کو اللہ تعالیٰ نے بشارت دی تھی کہ جو تمہاری اہانت کرے گا میں اس کی اہانت کروں گا اور جو تمہاری اہانت کے درپے ہو گا میں اس کو اہانت سے دوچار کروں گا۔ہم نے اس بزرگ کی حیاتِ قدسی میں بہت سے واقعاتِ اہانت کی وعید کے بارے میں پڑھے ہیں۔اور خود ہمارے اپنے تجربہ میں بھی بہت سے ایسے واقعات ہیں کہ جو کوئی بھی، اس مرشد کی اہانت کے درپے ہوا، خود اہانت کا شکار ہوا۔ اِنِّیْ مُھِیْنٌ مَنْ اَرَادَ اِھَانَتَکَ ! بھلا جن لوگوں نے اپنے خدا کے ایسے خوارق دیکھے ہوں وہ اپنے خدا کی قدرتوں پر توکل کیوں نہ کریں؟

سرخ رومال والا صوفی

ہم جن ہستیوں کو یاد کر رہے ہیں وہاں بڑے بڑے نابغے رہتے تھے، دیکھنے میں سیدھے

سادے، عاجزی انکساری اور فروتنی کے پیکر مگر باطن میں علم کا سمندر۔ کسی علمی مسئلہ پر گفتگو کیجئے تو معلوم ہو کہ دانائی اور حکمت کا بحرِ زخار ہیں۔ ہم ایک دو بزرگوں کا اشارۃً ذکر کر چکے ہیں مگر آج جس پیکرِ علم و عرفان کا ذکر کرنا مقصود ہے وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔ ادیب ایسے کہ اہل زبان ان کے سامنے پانی بھریں، سیرت نویسی پر وہ عبور کہ ان کی لکھی ہوئی ''سیرۃ خاتم النبیین'' سے زیادہ مستند اور کوئی سیرت نہ سمجھی گئی کیونکہ سیرۃ کی اس کتاب کا ماخذ قرآن ہے، ام الکتاب! تاریخ نویسی میں فردِ فرید۔ غرض صاحبِ اسلوب، صاحبِ طرزِ انشا پرداز تھے۔ اس ایک شخصیت میں بے شمار صفات یکجا ہوگئی تھیں۔ علوم ظاہری کی تحصیل میں بہ ظاہر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے عربی میں ایم اے کیا تھا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں فٹ بال بھی کھیلا تھا مگر مبدءِ فیض سے انہیں دانش اور علم و حکمت کے خزانے عطا ہوئے تھے۔ چہرے پر وہ تمکنت اور دبدبہ کہ ان کے سامنے بڑے بڑوں کے زہرے آب ہوں مگر طبیعت میں وہ فروتنی اور گفتگو میں وہ عاجزی اور اپنائیت کہ ان سے ہمکلام ہونے والے کو اجنبیت کا ذرا سا بھی احساس نہ ہو۔ جس بستی میں رہتے تھے اس کے مالکوں میں سے تھے مگر ان کی وضع قطع چال ڈھال سے بالکل محسوس نہیں ہوتا تھا کہ کون ہیں۔ ایک وضع داری البتہ ہم نے دیکھی کہ سرخ رومال گلے میں لپیٹتے تھے۔ کوٹ ہے تو کوٹ کی جیب میں سرخ رومال موجود ہے۔ یہ سرخ رومال ٹوپی کے ساتھ بھی ہم نے دیکھا پگڑی کے ساتھ بھی ہم نے دیکھا یہ رومال ان کے لباس کا جزو لاینفک تھا۔ اس کی لم ہمیں معلوم ہے نہ ہمیں ہمت ہوئی کہ ان سے پوچھ ہی لیتے۔ تقسیم سے قبل ہم نے انہیں دور سے دیکھا تھا۔ سٹیج کے آدمی نہیں تھے ان کا میدان قلم تھا۔ کتابیں البتہ ان کی اس وقت دیکھی تھیں۔ تقسیم کے بعد ہم جس بستی میں اٹھ آئے وہاں یہ وجود باجود بھی موجود تھا۔ اب پگڑی اوڑھتے تھے۔ پھر ہماری خوش نصیبی کہ ہمیں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل گیا۔ پہلے روز کام پر حاضر ہوئے تو سرسری طور سے

ہمارے مشاغل کے بارے میں پوچھا۔ جب ہم نے بتایا کہ لکھنے پڑھنے کا شوق ہے تو بہت خوشی کا اظہار فرمایا۔ اپنے بعض مضامین ہمیں امتحان کے طور پر لکھوائے اور پھر پڑھوا کر سنے۔ اس طرح ہمیں دہرا فائدہ ہوا لکھنے میں قلم رواں ہو گیا اور پڑھنے میں الفاظ کے لہجے کی پہچان کا سلیقہ آ گیا۔

ان کا اپنا عالم یہ تھا کہ جب تک کسی لفظ کے مفاہیم و مطالب کے بارے میں پورا یقین نہ ہوتا وہ لفظ استعمال نہ کرتے۔ لکھنے میں بہت احتیاط کرتے تھے فرماتے تھے جو لفظ جس طرح چھپ جاتا ہے وہ آئندہ نسلوں کے لئے سند بن جاتا ہے۔ بعد میں کوئی اس بات کی تحقیق نہیں کرتا کہ لکھنے والے نے کس سیاق و سباق میں یا قرینہ میں وہ لفظ استعمال کیا تھا۔ ہمیں اپنی بعد کی زندگی میں اس نکتہ نے بہت فائدہ دیا۔

پھر یہ بات بھی ہم نے اسی بزرگ سے سیکھی کہ جس لفظ کے بارے میں ذرا سا بھی شبہ ہو فوراً لغت دیکھو۔ جب تک اس کے معین معانی کے باب میں یقین نہ ہو وہ لفظ استعمال نہ کرو۔ ہم اس بات پر حتی الوسع عمل کرتے رہے۔ ہمارے طلباء اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ کلاس میں بھی اگر کسی لفظ کے معانی کے بارے میں ہمیں شبہ ہوا تو ہم نے اپنے بچوں سے برملا کہہ دیا کہ ہمیں اس لفظ کے معانی کے بارے میں وثوق نہیں لغت دیکھنے کے بعد دوبارہ اس لفظ کے بارے میں بتائیں گے۔ یہ احتیاط ہم نے انہیں بزرگ سے سیکھی اور یہ ان کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ قلم پکڑنے کا حوصلہ کر لیتے ہیں۔

ان کی طبیعت میں احتیاط اور غنا دونوں چیزیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ یہی دو صفات ہیں جو انسان کو درویش بناتی ہیں۔ اسی لئے قیام پاکستان کے بعد انہیں درویشوں کے کام کی نگرانی سونپی گئی۔ ان 313 درویشوں کے کام کی نگرانی جو ہماری بستی میں اپنے مرشد کے در پر دھونی رما کر بیٹھ گئے تھے۔ ان درویشوں کے اہل و عیال، ماں باپ، عزیز و اقارب پاکستان میں تھے وہاں وہ لوگ بتیس دانتوں میں

زبان کی طرح بیٹھے تھے۔ مجبور اور محصور۔ ہم نے اس بزرگ کو دیکھا کہ دن رات ان کے غم میں گھل رہے ہیں۔ اگر وہ درویش حالتِ خوف میں تھے تو یہاں ان کے مفادات کا نگہبان بھی حالتِ امن میں نہیں تھا۔ اگر درویشوں کے کسی عزیز کے بارے میں خبر ملتی کہ اسے فلاں تکلیف درپیش ہے تو جب تک اس کے ازالہ کے لئے پوری پیش بندی نہ کر لیتے انہیں کسی کل چین نہ پڑتا۔ ہجرت کے بعد سب لوگ ہی مہاجرت کے مصائب کا شکار تھے۔ ہر خاندان مصائب کا مقابلہ کر رہا تھا مگر یہ بزرگ تو تین سو تیرہ خاندانوں کے مسائل کا سامنا کر رہے تھے۔ جب ہم نے ان کے ساتھ خدمت شروع کی اس وقت ہجرت پر کافی عرصہ گزر چکا تھا مصائب کی شدت کم ہوگئی تھی مگر اس بوجھ نے ان کی اپنی صحت پر بڑا اثر ڈالا تھا۔ ان کے لکھنے پڑھنے کے مشاغل میں فرق آ گیا تھا مگر اس کے باوجود اتنا لکھتے پڑھتے تھے کہ ہم نوجوانوں کو رشک آتا تھا بھلا کوئی شخص اپنے ہر فارغ لمحہ کو کتاب کے مطالعہ میں صرف کر سکتا ہے؟ یہ بزرگ کرتے تھے۔ اگر پڑھ نہیں رہے ہوتے تھے تو لکھ رہے ہوتے تھے۔ یہ تو ہماری خوش نصیبی تھی کہ آپ نے کچھ مضامین ہمیں لکھوائے ورنہ ان کا کام تو کئی جلدوں پر محیط ہے۔

ان کے گھر میں ہمیشہ دو تین یتیم اور بے آسرا بچے پرورش پاتے تھے۔ یہ انہیں اپنے بچوں کی طرح پالتے پوستے اور ان کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھتے تھے۔ غریب پروری ان کا شیوہ تھا۔ شہر کے بیمار، نادار، یتامیٰ، مساکین، ضرورت کے وقت انہیں کی طرف دوڑتے تھے اور مایوس نہیں لوٹتے تھے۔ اس بات کا تجربہ ہمیں اس عرصہ میں ہوا جب ہم ان کے ساتھ خدمت کر رہے تھے۔ ایسے سفید پوش، جو کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے تھے مشکل وقت میں ان کے پاس آتے اور یہ بزرگ ان کی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھتے ہوئے ان کی دست گیری کرتے۔ ان میں سے کئی لوگوں کی اولادوں کو ہم جانتے ہیں کہ اب ماشاء اللہ لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔ اس نیکی کے اخفاء میں انہیں اس قدر غلو تھا کہ کانوں کان کسی کو

خبر نہیں ہونے پاتی تھی۔ہم تو اسی کام پر مامور تھے کہ رقوم کا ریکارڈ رکھیں اس لئے ہمیں تو پتہ چل جاتا تھا مگر ہدایت یہ تھی کہ بھول کر بھی کسی ضرورت مند محتاج کا نام زبان پر نہ آنے پائے۔حساب میں اتنے محتاط کہ ایک بار پانچ روپے کی ایک رقم کا دو بار اندراج ہو گیا۔اس پر باقاعدہ ایک کمیشن بٹھا کر تحقیقات کروائی کہ ایسا کیوں ہوا؟

علوِ مرتبت کے باوجود عالم یہ تھا کہ جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد میں جاتے تو جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے لوگوں کے کاندھوں کے اوپر سے پھلانگ کر جانا انہیں بہت کھلتا تھا۔مرشدِ قصبہ میں موجود نہ ہوتے تو انہیں امارت سونپ کر جاتے مگر یہ خطبوں کے لئے یا نمازوں کی امامت کے لئے دوسرے علما کو نامزد کر دیتے۔اپنی جائے نماز ساتھ رکھتے جہاں جگہ مل گئی مصلیٰ بچھا لیتے اور بیٹھ جاتے،خطبہ کو غور سے سنتے،نماز توجہ سے پڑھتے۔لوگ باگ لپک لپک کر ان سے مصافحہ کرتے اور یہ سب سے مصافحہ کرتے اور دعائیں دیتے جاتے مگر مصافحہ کرنے کے لئے رکتے نہیں تھے۔چلتے چلتے ہاتھ ملاتے تھے اور لوگ ان کے ہاتھ کے لمس کو ہی بہت جانتے تھے۔نمود سے بہت گھبراتے تھے۔جمعہ کا دن بظاہر چھٹی کا دن سمجھا جاتا تھا مگر یہ جمعہ کی نماز سے فارغ ہوتے ہی اپنا کام لے بیٹھتے دفتر کی ڈاک دیکھتے،تصنیف کا کوئی کام جاری ہوتا تو اس میں مصروف ہو جاتے،غرض ان کی زندگی کام سے عبارت تھی۔گرمیوں کے موسم میں ہماری اس نئی بستی کے کالے ننگے پہاڑ بھٹی کی طرح تپنے لگتے ان کے گھر کا رخ ایسا تھا کہ دھوپ سیدھی ان کے برآمدہ میں اترتی تھی،اس پر چقیں ڈال دیتے مگر اس سے روشنی تو رک جاتی تمازت کہاں رکتی؟اس لئے اپنے کمرہ میں پانی کا ٹب رکھوا لیتے اس ٹب میں برف کا ایک ڈلا تیرتا رہتا،اور بجلی کا سقفی پنکھا ہلکی رفتار سے چلتا رہتا اس طرح کچھ سکون میسر آ جاتا مگر گرمی کی شدت الامان والحفیظ!اب ہم انیس کی طرح یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ

''بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر''

مگر پہلے مصرعہ کی ہم عینی گواہی دے سکتے ہیں کہ

''گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر''۔

اس اضطراب کے باوجود ان کا کام جاری رہتا۔ ایک بار ہم نے گرمی کا شکوہ کیا تو فرمایا میاں ہمارے مرشد نے اس زمانہ میں اسی (80) تصنیفات مکمل کی تھیں جب بجلی تو دور کی بات ہے گرمی سے بچاؤ کے دوسرے مروجہ سامان بھی میسر نہ تھے اس لئے ہمیں شکوہ کرنا زیب نہیں دیتا۔ ہمیں تو سقفی پنکھا، برف اور چقیں میسر ہیں۔ ہمارے مرشد تو ہاتھ سے پنکھا جھلا کرتے تھے۔ اتنا کہتے کہتے آواز گلوگیر ہوگئی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ اسی کمرہ میں ان کے بڑے بیٹے نے جو بہت بڑے سرکاری افسر تھے اپنے ابا کی آسائش کے لئے ائیر کنڈیشنر لگوادیا۔ کام میں انہماک اسی طرح جاری رہا یہ نہیں کہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں نیند کے جھونکے آنے لگے ہوں۔ وہ آسائش بھی ان کی زندگی میں نہیں ان کے کام میں سہولت میسر کرنے کا باعث بنی۔ بعد کو اسی بزرگ نے بتایا کہ اللہ کا حکم ہے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا کرو اور یہ بھی تو اللہ کی نعمت ہی ہے کہ اس نے بیٹے کے دل میں باپ کی خدمت کرنے کی تحریک پیدا کی! کیسے شکر گزار لوگ تھے اور اللہ کی نعمتوں کا کیسے کیسے طریق سے شکر ادا کرتے تھے اسی لئے تو اللہ کا سلوک بھی ان لوگوں کے ساتھ ایسا ہی تھا۔ وہ جو ارشاد ہے کہ جو اللہ کے بندوں کا شکر گزار نہیں بنتا وہ اللہ کا شکر گزار کیسے ہوسکتا ہے؟ اس روز اس کی معنویت سمجھ میں آئی۔ بزرگوں کی صحبت میں رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان حکمت کی نئی نئی باتیں سیکھتا رہتا ہے۔ ہم نے اس بزرگ کی صحبت میں رہ کر بہت کچھ سیکھا۔ ایک عجیب بات ہم نے ان کے بارے میں پڑھی۔ ان کے خسر ان کے ہم عقیدہ نہیں تھے۔ ان کے ہاں آکر رہتے تو یہ کبھی ان سے عقیدہ کے بارے میں گفتگو نہ کرتے۔ پھر انہیں بھی ان

کے مرشد کے ہاتھ پر بیعت ہونے کی توفیق مل گئی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے بھول کر کبھی ان سے تبدیلئ عقیدہ کا نہیں کہا تھا وہ میرے اور میرے گھر والوں کے عمل کو دیکھتے رہے جب انہیں یقین ہو گیا کہ عقیدہ کے اختلاف کے باوجود ہم ان کا پورا احترام روا رکھتے ہیں تو وہ خود ہمارے مرشد کی اطاعت کے زمرہ میں آ گئے۔ ان کی طبیعت کی اس صفت کا اندازہ ہمیں اس دور میں بھی ہوا کہ ان کے گورنمنٹ کالج کے زمانہ کے دوست اور ساتھی جوان کے ہم عقیدہ نہیں تھے انہیں ملنے کو آتے تو اکرامِ ضیف کے طور پر ان کی خوب خدمت کرتے مگر بھول کر بھی عقیدہ کا ذکر درمیان میں نہ لاتے مبادا مہمان یہ سمجھیں کہ اکرامِ ضیف میں کوئی غرض شامل ہے۔

اختلافِ عقائد کے باوجود وہ حقدار کو اس کا حق دینا جانتے تھے، حمید نظامی ایڈیٹر نوائے وقت کا انتقال ہوا تو ان کی حق گوئی اور بیباکی کے بارے میں ایک زوردار شذرہ اخبار میں لکھ کر شائع کروایا۔ پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی ملنے کو تشریف لائے تو کسی نے تعارف کروایا کہ یہ مولانا ظفر علی خاں کے چھوٹے بھائی ہیں تو لپک کر ان کا ہاتھ دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور فرمایا پھر تو آپ سے ہمارا دوہرا رشتہ ہے! اور یہ دوہرا رشتہ اس لئے کہ ظفر علی خاں ان کے مسلک کے مخالف تھے۔ یہ بزرگ لوگ اپنی مثال آپ تھے ان کی زندگیاں ہزاروں لوگوں کے لئے مشعلِ راہ تھیں لوگ ان کا نمونہ دیکھ کر اپنی زندگی کی ڈگر بدل لیتے تھے۔ یہ اس زمانہ کے صوفیاء تھے جو دنیا میں رہ کر بھی دنیا میں ملوث نہیں ہوتے تھے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ

در میانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای
نیز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش!

کہ ہمیں دریا کی گہرائی کے درمیان تختہ بند کر کے چھوڑ دیا ہے اور اب کہتے ہو کہ ہشیار دامن تر نہ

ہونے پائے! یہ انہی ہشیار لوگوں میں سے تھے جن کا دامن دنیا میں رہنے کے باوجود دنیا سے آلودہ نہیں ہوتا اور ہماری خوش نصیبی کہ ہمیں ان کے ساتھ کچھ دیر کام کرنے اور ان کی خدمت کرنے کا موقع میسر آیا۔

مددگار کارکن

بعض الفاظ کسی ماحول کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ جاتے ہیں اور اس ماحول سے ہٹ کر استعمال میں آئیں تو لوگوں پر ان کے معانی واضح نہیں ہوتے حالانکہ الفاظ میں کوئی ہیر پھیر یا گنجلک نہیں ہوتی یہی حال سیاق وسباق کا ہے اور علم معانی والوں نے الفاظ کی صحیح روح کو سمجھنے کے لئے سیاق وسباق پر بہت زور دیا ہے یہ باتیں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بعض الفاظ جماعتِ احمدیہ کے ماحول کے ساتھ مخصوص ہیں اور دوسروں کے سامنے وہ الفاظ استعمال ہوں تو دوسرے ان لفظوں کو سمجھنے کے باوجود ان کی معنویت سے آشنا نہیں ہو پاتے ایسے دو لفظ ہیں ''وقارِ عمل'' اور ''مددگار کارکن''۔ ہمیں یاد ہے کالج کے ایک مباحثہ میں ہمارے دوست منور احمدی نے جو قائد حزبِ اختلاف تھے قائد ایوان کے ساتھیوں کو قائد ایوان کے مددگار کارکن کہہ کر مخاطب کیا تو سارا ہال بے حال ہو گیا مگر باہر سے آئے ہوئے مقررین بھتر بتر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ بات صرف اتنی تھی کہ ربوہ کے ماحول میں مددگار کارکن کا لفظ ایک خاص معنویت کا حامل تھا جس معنویت سے باہر والے آشنا نہیں تھے۔ اسی طرح وقارِ عمل کا لفظی ترجمہ ہے عمل کا احترام یا عمل کرنے کا اعزاز۔ مگر جماعت احمدیہ کے ماحول میں یہ ایک اصطلاح ہے جو اجتماعی خدمتِ خلق کے لئے استعمال ہوتی ہے ہاتھ سے کام کرنا۔ محنت کا کام کرنے میں عار محسوس نہ کرنا۔ خلقِ خدا کی خدمت کے لئے جسمانی مشقت سے بھی گریز نہ کرنا۔ وہ جو ذوق نے کہا ہے ''نام

مطلوب ہے گرفیض کے اسباب بنا۔ پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا'' یہ ساری باتیں جماعت کی اصطلاح میں ایک دولفظی ترکیب میں سمٹ کرآ گئی ہیں وہ اصطلاح ہے''وقارِعمل'' اورحقیقت یہ ہے کہ جماعت احمدیہ میں خدمتِ خلق ایک بنیادی عمل ہے دوسرے ایسے عمل کرتے ہیں نہ وقارِعمل کے معنوں ہی کو سمجھ پاتے ہیں۔اس مضمون کا اصل نکتہ تو''مددگار کارکن'' ہیں۔ایسے مددگار کارکنان جنہوں نے اپنی زندگیاں سلسلہ کے لئے وقف رکھیں اور تادمِ آخر خدمت پر مستعد رہے۔ مددگار کارکن کی اصطلاح حضرت مصلح موعود (خدا آپ سے راضی ہو) کی وضع کردہ ہے کہ ادنیٰ خدمت پر مامور ہونے والے کارکنوں کو احساسِ کمتری نہ ہو۔ یہاں سویڈن میں رہ کر احساس ہورہا ہے کہ ان لوگوں نے شاید یہ جذبہ جماعتِ احمدیہ سے سیکھا ہے۔ یہاں ہرکام کرنے والا برابر ہے کوئی کسی سے کمتر یا برتر نہیں۔ہم نے اپنی یونیورسٹی کے شعبہ میں صفائی کرنے والے کارکن کو صدرِ شعبہ کے دوش بدوش ایک ہی میز پر بیٹھے کھانا کھاتے دیکھا ہے پاکستان میں یا دوسرے اسلامی ممالک میں ایسی برابری یا رواداری کہاں؟ ہاں ربوہ میں ہم نے ناظروں اور مددگار کارکنوں کو ایک ہی صف میں بیٹھ کر کھانا کھاتے دیکھا ہوا ہے۔ ہم اس مضمون میں انجمن کے بعض مددگار کارکنوں اوران کے اخلاص کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔اپنی انجمن کی کلرکی کے دوران بیت المال کے کارکن سرفراز خاں سے ہماری دوستی ہوگئی۔سرفراز خاں اونچے لمبے قد کے چھریرے بدن کے آدمی تھے پنجابی بھی وہی پٹھانوں والی بولتے تھے۔نسوار کے بھی رسیا تھے۔ہم نے انہیں ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک ڈاک لے جاتے دیکھا ہے۔ان کی نسواران کی مستعدی پر ذرا اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ یہاں سویڈن میں سویڈش لوگوں کو جگہ جگہ نسوار تھوکتے دیکھتے ہیں تو سرفراز خاں کی نفاست یاد آتی ہے کہ نسوار تھوکنے کو گناہِ کبیرہ جانتے تھے۔کچے کوارٹروں کی بات ہے۔حافظ غلام محی الدین کے چائے خانہ میں چائے پیتے ہوئے سرفراز خاں کو دیکھا حضرت مولوی

مصلح الدین راجیکی ایک بنچ پر اکڑوں بیٹھے تھے ان سے مؤدب فاصلے پر سرفراز خاں بیٹھے تھے۔حافظ صاحب نے کوئی بات کی تو سرفراز خاں کہنے لگے حافظ صاحب ’’یہ بزرگوں کی اولاد سامنے بیٹھی ہے بس انہیں کو دیکھنے سننے کے لئے بیٹھا ہوں‘‘۔سرفراز خاں کی یہ بات ہمیں بہت اچھی لگی بالکل اکل کھرا چٹا ان پڑھ پٹھان مگر بزرگوں کی اولاد کا یہ احترام کہ پہروں سامنے بیٹھ کر انہیں دیکھتے رہنا۔جس زمانہ کی یہ بات ہے سرفراز خاں کی عمر پچاس پچپن برس تو ضرور رہی ہوگی۔اس کے بعد ہم نے انہیں مدتوں خدمت پر مستعد دیکھا۔سر پر صافہ لپیٹے تھے ایک سفید چادر کی بکل مار لیتے۔یہ میرا ذاتی خیال ہے کہ شاید بکل انہوں نے مولوی مصلح الدین صاحب کے تتبع میں اختیار کی ہو۔واللہ اعلم۔ہمیں سرفراز خاں کی اس ایک بات کے علاوہ اور کوئی بات یاد بھی نہیں مگر یہی ایک بات کیا کم ہے؟ پھر ہم نے حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کے مددگار کارکن بشیر کو دیکھا۔بشیر شاید انجمن کا کارکن نہیں تھا حضرت میاں صاحب کا ذاتی خدمتگار تھا مگر دفتر کی ڈاک گھر لے جانے اور گھر سے دفتر کی ڈاک واپس لانے کا کام اس کے سپرد تھا بھاری بھرکم جسم۔پاؤں میں ہوائی چپل۔بشیر دفتر آتا تو سب سے ہاتھ ملاتا اور مدتوں بعد جب تک وہ جیا جب بھی ہمارا آمنا سامنا ہوا بشیر نے لپک کر ہاتھ ملانے میں ہمیشہ پہل کی۔اس شخص کی باتوں میں حضرت میاں صاحب کی صحبت میں رہ کر اتنی ملائمت پیدا ہوگئی تھی کہ کسی شخص کے لئے اسے نظر انداز کرنا ناممکن تھا۔بشیر نام کا ایک اور مددگار کارکن دفتر الفضل میں بھی تھا جو تنویر صاحب یعنی روشن دین تنویر ایڈیٹر الفضل کا حد سے زیادہ خدمت گزار تھا اور تنویر صاحب اس کے ناز اٹھاتے تھے۔وہی تنویر صاحب کے گھر کا سودا سلف لاتا۔ڈاک لاتا ان کا حقہ بھرتا غرض ہر لحاظ سے خدمت کرتا تھا۔ہم نے بشیر کو جوانی سے بال سفید ہو جانے تک تنویر صاحب کی خدمت پر مستعد دیکھا تنویر صاحب کہا کرتے تھے اگر کوئی ’’دھوپ میں بال سفید کر لینے‘‘ کے محاورہ کی عملی تصویر دیکھنا چاہے تو ہمارے بشیر کو

دیکھئے‘‘۔

کالج کا مددگار کارکن بابا شادی تو اپنی ذات میں انجمن تھا۔زباں پہ بارے خدایا یہ کس کا نام آیا۔ اتنا مخلص۔اتنا مستعد۔اتنا جاں نثار۔دھن کا پورا۔کام کا پکا۔آدمی کیا تھا مولوی اسمعیل میرٹھی کی پن چکی تھی:

نہر پر چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری ہے کام کی پکی

شادی اور کالج لازم وملزوم تھے۔دونوں ایک دوسرے میں یوں مدغم تھے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن ہی نہیں تھا شادی دو چار دن کے لئے بھی کہیں کالج سے باہر چلا جاتا تو کالج کی فضا سونی سونی لگتی تھی۔وہ سٹاف اور طلباء میں یکساں مقبول تھا۔خدا جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا ہم نے کیا کسی نے بھی اسے تھکتے نہیں دیکھا۔ دن رات مستعد۔ دن میں کالج کی مددگار کارکن رات میں کالج کی چوکیداری۔اس کی چوکیداری کا یہ عالم تھا کہ ہم نے رات کے اوقات میں بھی اسے کم ہی سوتے دیکھا یا غافل پایا۔وہ اساتذہ اور طلباء کو ان کی چال سے پہچان لیا کرتا تھا اور اس کی یہ پہچان کبھی غلط نہیں ہوئی۔ ہم دو سال کالج کے ہوسٹل میں بھی رہے ہیں۔رات کو دیر سے ہوسٹل واپس آتے تو شادی کو چوکنا پاتے۔وہ بغیر دیکھے اپنے لحاف کے اندر سے ہی ہمیں نام لے کر پکارتا اور کہتا کہاں سے آ رہے ہو؟ طلباء میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پچھلے برس جرمنی میں کالج کے ایک پرانے طالب علم کے ہاں شادی کا ذکر آ گیا۔وہ اٹھا اندر گیا اور اپنے البم میں سے شادی کے دو فوٹو نکال لایا کہ یہ دیکھیں شادی کی تصویر۔کون کہتا ہے وہ مر گیا وہ ہمارے دلوں میں زندہ ہے۔ ہمارے ساتھ اس کی دوستی کی بہت سی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم نے شادی کے ہاتھوں میں کھیل کر کالج کی تعلیم حاصل کی تھی

اور پھراس کے سامنے ہی کالج کے سٹاف پر ہماری تعیناتی ہوئی تھی۔شادی اس تعلق پر بہت خوش تھا۔ ایک دو بار بعض لوگوں نے کہا بھی کہ یہ تم کیا اس کے لئے ہر وقت چائے ڈھوتے رہتے ہو؟ کہنے لگا یہ میری آنکھوں کے سامنے اسی کالج میں پڑھا اور اسی کالج میں پروفیسر بنا ہے اس لئے مجھے اچھا لگتا ہے۔ یہ شادی کی محبت تھی ہم بھی حتی الوسع اس کی دلجوئی کرتے رہتے تھے مگر خدا شاہد ہے کہ شادی نے ہماری خدمت کے عوض کبھی کسی معاوضہ کی توقع نہیں رکھی۔ اتنا بے لوث اور اتنا بےنفس آدمی ہم نے نہیں دیکھا۔ مدتوں بعد گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں ایک بہشتی ہماری خدمت پر مستعد ہوا۔ وہ ہمارے لئے بڑے دور سے ڈھوکر پینے کا پانی لاتا تھا۔ ایک بار ہم نے اسے انعام کے طور پر کچھ پیسے دینا چاہے تو اس نے انکار کر دیا کہنے لگا "پانی پلانے کے پیسے لوں"؟ ہمیں اس کی یہ ادا بہت بھائی۔ یونہی خیال آیا کہ اس کے طور اطوار احمدیوں والے ہیں یقیناً احمدی ہوگا جو خوفِ فسادِ خلق سے خاموش ہے اور ہمارا اندازہ درست نکلا۔ جس روز ملاؤں کی شہ پر کالج کے بعض لوگوں نے (ہمارے طلبا و طالبات نے نہیں) ہمارے خلاف احمدی ہونے کی وجہ سے ہنگامہ برپا کیا وہ چپکا کھڑا دیکھتا رہا جب امی جمی ہوگئی تو ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا "سر جی حضور کو دعا کے لئے لکھیں تو مجھے نہ بھولیں" خدا معلوم اب وہ کس حال میں ہے؟ ریٹائر ہو گیا ہوگا۔ بات شادی سے چلی تو اس بہشتی کی طرف مڑ گئی کیونکہ اس کا نام بھی شادی تھا۔ شاید شادی نام کے سارے کارکن ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شادی کا کالج میں رعب داب بھی بہت تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ سب لوگ اس کے گرویدہ تھے ایک بار حضرت خلیفۃ المسیح الثالث خلافت پر فائز ہونے سے کچھ ہی عرصہ قبل کئی دنوں بلکہ مہینوں تک کالج میں تشریف نہ لا سکے کیونکہ ان کے کندھوں پر انجمن اور جماعت کے دیگر اداروں کا بوجھ تھا۔ ایک روز ذرا سی فرصت ملی تو کالج تشریف لائے۔ گاڑی کاریڈور میں کھڑی کی اور دفتر میں جانے کے لئے بڑھے۔ شادی نے دیکھا تو دور سے ہی آواز

لگا یا "بسم اللہ بسم اللہ" اج فوجاں کدھر بھل پیاں نیں؟" یعنی آپ آج بھول کر کدھر نکل آئے ہیں؟ یہ شادی ہی کا جگرا تھا۔ حضرت صاحب نے مسکرا کر شادی کی طرف دیکھا اور دفتر میں چلے گئے۔ خلافت کے مقام پر فائز ہونے کے بعد حضرت صاحب کالج تشریف لائے۔ سارا اسٹاف استقبال کے لئے ایستادہ تھا شادی بھی ایک کونے میں دبکا کھڑا تھا۔ جب سٹاف سے مصافحہ کر چکے تو شادی نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور کہا "حجور صاحب جی ایک عرض کروں؟"۔ حضرت صاحب نے فرمایا ہاں شادی کہو کہنے لگا "بس اتنی ہی عرض ہے کہ مر جاؤں تو یہیں کہیں کالج ہی میں توپ تاپ دینا باہر نہ پھینکنا"۔ شادی نے اتنے خلوص سے یہ بات کہی کہ سب کی آنکھیں گیلی ہوگئیں۔ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کالج قومیا لیا گیا۔ شادی نے خدمت جاری رکھی مگر ریٹائرمنٹ کچھ ہی عرصہ کے بعد اپنے کسی عزیز کو ملنے کے لئے سرگودھا کے قریب کسی گاؤں میں گیا وہاں موت نے آلیا۔ کسی نے اس کی خبر بھی کالج والوں کو نہیں دی۔ شادی بے چارہ اجنبی زمین میں پیوند خاک ہو گیا ہمیں یقین ہے کہ شادی کالج میں مرتا تو کالج سے باہر نہ دفنایا جاتا۔ مگر شادی مرا کہاں ہے؟ کالج کے اساتذہ اور طالبعلموں کے دلوں میں زندہ ہے۔

اب ایک اور مددگار کارکن بابا شریف۔ اصلاح وارشاد کے دفتر میں مددگار کارکن تھے وہاں سے ریٹائر ہوئے تو مسجد مبارک میں خادم مسجد کے طور پر کام سنبھالا۔ جہاں ملتے بڑے پیار سے ملتے تھے۔ پرائیویٹ سیکرٹری کے دفتر کے دو مددگار کارکن یاد ہیں مگر ان کے نام یاد نہیں۔ دن رات خدمت پر مستعد مگر خوش۔ ہمارے ابا کے دفتر کے مددگار کارکن یعقوب تھے۔ ہمارے ابا جی مرحوم گھر میں ہمیشہ ایک دودھیل بھینس پالتے تھے۔ یعقوب دن میں دفتر کا کام کرتا اور شام کو بھینس کا چارہ کاٹ کر لاتا اس محنت کے اسے الگ سے پیسے دیئے جاتے۔ عیالدار آدمی تھا دن رات کی محنت سے بمشکل بچوں کا پیٹ

پالتا تھا۔ ابا جی مرحوم ہمیشہ اس سے سلوک کرتے رہتے تھے۔ ہمارے گھر میں اکثر گاؤں کے مہمان آتے رہتے تھے جو گھی، گُڑ، مکئی کے بھٹّے گنے لاتے رہتے تھے ان تمام تحفوں میں سے یعقوب کا حصہ پہلے اور الگ سے نکلتا تھا۔ ہمیں یاد ہے ابا جی کی وفات کے بعد بھی یعقوب ہمارے گھر کا کام کرتا رہا اور ہماری امی پابندی کے ساتھ اس کا معاوضہ اور اس کے حصے کے تحفے اسے دیتی رہیں۔ ہم سب بہن بھائیوں کو سختی سے تاکید تھی کہ یعقوب کے ساتھ ہمیشہ ادب و احترام سے پیش آیا جائے۔ اس باب میں ابا جی مرحوم کسی کا کوئی لحاظ نہیں کرتے تھے اب بھی ہم اور ہماری اولادیں سب یعقوب کا اسی طرح احترام کرتے ہیں۔

دو مددگار کارکن ایسے تھے جن کی اولادوں کو اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت عطا کی ایک تو ہمارے چوہدری محمد رمضان صاحب تھے جو تبشیر کے دفتر میں مددگار کارکن تھے مگر ان کی اولاد میں سے ماسٹر محمد اعظم مرحوم نے بہت نیک نامی کمائی۔ ماسٹر صاحب اپنے طلباء میں بہت مقبول تھے ان کا جواں عمری ہی میں انتقال ہوا تو ربوہ میں ان کا بہت سوگ منایا گیا۔ دوسرے بیٹے برادرم پروفیسر محمد ارشد نے فزکس میں ایم ایس سی کیا اور ہماری طرح ٹیوشنیں پڑھا پڑھا کر اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ پھر ربوہ کالج میں تعینات ہوئے وہیں سے افریقہ کے کسی ملک میں تشریف لے گئے آجکل ربوہ میں آباد ہیں اور الفضل انٹرنیشنل میں خوب خوب مضمون لکھ رہے ہیں۔ ان کے صاحبزادہ نے کینیڈا میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں بڑا نام پیدا کیا ہے اور ہم نے لوگوں سے ان کی بہت تعریف سنی ہے ہماری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یہ سب ان کے دادا کی خدمتگزاریوں کے صلے ہیں۔ اللھم زد فزد۔ دوسرے مددگار کارکن بابا غلام محمد تھے آپ مددگار تو نہیں تھے بہشتی مقبرہ میں گورکن تھے۔ ان کا بیٹا سلیم ہمارا کلاس فیلو تھا۔ اسے کالج کی تعلیم کے دوران جسمانی محنت و مشقت کرنے میں کبھی عار نہیں آئی۔ فارغ اوقات میں

لاریوں کے اڈے پر مزدوری کرتا اور نہ صرف اپنی تعلیمی ضرورتیں پوری کرتا بلکہ باپ کی خدمت بھی کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا صلہ یہ دیا کہ سلیم نے ایم اے تک تعلیم پائی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے اس کی شادی کینیڈا کے ایک مخلص گھرانے میں کروائی اور اسے کینیڈا بھیج دیا۔ سلیم نے وہاں بھی اپنی نیک نامی قائم رکھی۔ مدتوں بعد ہم سے ملاقات ہوئی تو اصرار کیا کہ ہم اس کے گھر آئیں اور اس کے بچوں سے ملیں مگر قدرت کو شاید یہ منظور نہیں تھا۔ پہلے سفر میں ہم اس کے ہاں نہ جاسکے دوسرے سفر سے پہلے سلیم ابدی سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس کے ابا باباجی غلام محمد جب تک زندہ رہے ہم پر شفقت فرماتے رہے اب تو سلیم کی اولاد ماشاءاللہ بڑی ہے اور دنیاوی لحاظ سے بڑی خوش حال ہے یہ بھی ان کے دادا اور نانا کی قربانیوں کی برکتیں ہیں جو ان کی اولاد سمیٹ رہی ہے۔

یہ مضمون یہیں تک لکھا تھا مگر بعد میں میاں احمد دین بہت یاد آئے۔ میاں احمد دین حضرت مولانا جلیل صاحب کے کسی دفتر کے مددگار کارکن تھے مگر جب تک جیا کئے مولانا صاحب کے گھر کے کام کاج کرتے رہے۔ میاں احمد دین دبلے پتلے آدمی تھے۔ بڑھاپے نے اور زیادہ کمزور کر دیا تھا مگر غلہ منڈی سے رنگش رنگش کرتے چلتے اور جامعہ احمدیہ میں قبلہ مولانا جلیل صاحب کے دولت کدہ تک آتے تھے۔ گھر کا سودا سلف لانے میں انہیں خوب مہارت تھی اور تھے بھی انتہا کے دیانتدار آدمی۔ ہماری ساس جنہیں ہم امی کہتے تھے میاں احمد دین کی خاطر تواضع بھی بہت کرتی تھیں۔ میاں احمد دین آتے تو سب سے پہلے انہیں چائے کا ایک پیالہ پیش کیا جاتا ساتھ ان کے بڑھاپے کی رعایت سے کوئی خوردنی چیز۔ رس یا بند یا روٹی جو کچھ میسر ہوتا دیا جاتا۔ میاں احمد دین کھانے کے بعد اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہو جاتے۔ بوڑھے آدمی تھے مگر یہ نہیں کہ کام کو ٹالتے ہوں۔ اگر انہیں کوئی ایسا سودا لانا پڑتا جو گول بازار سے یا قریب کی دکانوں سے نہ ملتا تو غلہ منڈی کی طرف چل پڑتے اور جب تک مطلوبہ چیز مل نہ

جاتی انہیں چین نہ آتا۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ میاں احمد دین کے ذمہ کوئی کام کیا گیا ہو اور وہ نہ ہوا ہو۔ میاں احمد دین کو ہمارے بچوں کے ساتھ انتہا کا پیار تھا کیونکہ سب ہی ان کی آنکھوں کے سامنے پلے تھے۔ میاں احمد دین نہایت دیندار، نیک اور خدا ترس آدمی تھے۔ ہم نے کم از کم تیس پینتیس سال تو انہیں آتے جاتے دیکھا۔ سر پر صافہ باندھے پاؤں میں لیترے ہلگائے ایک سفید چادر اوڑھے دنیا و مافیہا سے بے خبر رواں دواں رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے انہوں نے ہماری اور ہمارے بزرگوں کی اور ہمارے بچوں کی بہت بے لوث خدمت کی ہے۔ جماعت احمدیہ کے یہ بظاہر چھوٹے کارکن تھے مگر درحقیقت بڑے لوگ تھے ان کا مقام ان کے خلوص، دیانت، تقویٰ، محنت اور نیکی کی وجہ سے بہت بڑا مقام ہے اور یہی لوگ ہیں جو آئندہ نسلوں کے لئے روشنی کا مینار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے فیضان کو جاری رکھے۔ آمین۔

اگرچہ سر بتراشد قلندری داند

مشتاق احمد یوسفی نے ہمارے بزرگ دوست شیخ منظور الٰہی صاحب در دلکشا کو "درویش بے ریا دریش" کہا ہے۔ ہمارا اپنا تجربہ بھی یہی کہتا ہے کہ وہ واقعی "اگرچہ سر بتراشد قلندری داند" کے مصداق ہیں۔ ہم جن ہستیوں کا ذکر کر رہے ہیں ان میں بھی ہم نے دو ایک ایسی ہی ہستیوں کو دیکھا کہ دیکھنے میں ولی والوں کے محاورہ کے مطابق "كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ" کی تصویر ہیں مگر دل کے غنی اور درویش تھے اور درویش بھی ایسے کہ ان کے سامنے بڑے بڑے درویش سر تسلیم خم کرنے کو اپنے لئے اعزاز جانیں۔ ہمارے یونیورسٹی اورئینٹل کالج لاہور میں پروفیسر وزیر الحسن عابدی تھے، لوگ انہیں داڑھی منڈا ولی کہا کرتے تھے۔ غرض ہم نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے مگر جن لوگوں کا ذکر ہم کرنے چلے ہیں وہ اپنے

اس وصف میں بھی یکتا تھے۔ عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں؟

ایک بزرگ کو دیکھا کہ سر پر روی ٹوپی اوڑھے، سفید براق شلوار قمیص پر ہاف کوٹ پہنے، بڑے وقار سے اپنے دفتر کی سب سے اونچی افسری کی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ داڑھی تقریباً منڈی ہوئی ہے۔ زیر لب کچھ پڑھ رہے ہیں کاغذات دیکھتے اور فیصلے صادر کرتے جاتے ہیں۔ رائے میں اصابت ہے فیصلے دوٹوک ہیں جیسے گہرے تدبر اور غور وخوض کے بعد صادر کئے گئے ہوں۔ بعد کو جب ان سے واسطہ پڑا تو معلوم ہوا کہ ان کے فیصلوں کے پسِ پردہ ان کی تیز بصیرت کارفرما تھی معاملہ کی تہہ تک پہنچنے میں انہیں زیادہ بحث وتمحیص میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں تیز فہمی کا ہنر دیا تھا مگر وہ فیصلے صادر کرتے وقت زیر لب استغفار پڑھتے رہتے تھے۔ ایک بار ہمارے اپنے افسرِ اعلیٰ رخصت پر تھے ان کی عدم موجودگی میں بعض اہم معاملات میں ہمیں ان سے فیصلہ کروانے کی ضرورت پیش آئی۔ تب یہ عقدہ کھلا کہ وہ فیصلہ کرتے وقت استغفار کا دامن نہیں چھوڑتے۔ خدایا یہ کیسا داڑھی منڈا ولی ہے؟ ان کے حالات پڑھے تو معلوم ہوا کہ اپنے باپ کے تتبع میں سرکاری نوکری کی، انگریزوں کے زمانہ میں عدالت کی کرسی پر بیٹھے، وہاں بھی یہی عالم رہا کہ فیصلہ کرنا ہوتا تو استغفار کا دامن پکڑ لیا کہ اے خدا تو ہی بندوں کی پردہ پوشی کرنے والا اور بخشش کرنے والا ہے اگر میرے اس فیصلہ میں کوئی سقم ہے تو اس کی پردہ پوشی فرما اور غلطی ہے تو اس سے درگزر فرما۔ ہم نے ایسا افسر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دنیا میں تو ایسا ہونا انہونی بات سمجھی جاتی ہے مگر ہم نے ایسی انہونی ہوتے دیکھی ہے۔

پھر ہم نے یہ بھی دیکھا کہ وہی افسر ایک روز چلتا چلتا ہمارے دفتر میں آیا۔ ہم احترام کے طور پر اٹھنے ہی کو تھے کہ جلدی سے ہمارے کندھوں پر ہاتھ رکھ کے روک دیا۔ کہنے لگے تمہاری ایک ادبی چیز ایک ادبی رسالہ میں دیکھی تھی مجھے پسند آئی اس کی داد دینے آیا ہوں ابھی ہم اس بے پناہ داد کے

"صدمہ" سے سنبھل نہیں پائے تھے کہ وہ برق کے کوندے کی طرح جس طرح اچانک آئے تھے اسی طرح واپس چلے گئے۔الٰہی کیسا افسرِ اعلیٰ ہے کہ اپنے ایک ادنیٰ ماتحت کی حوصلہ افزائی کرنا نہیں بھولتا؟ اس کے بعد بھی بہت مرتبہ ایسا ہوا کہ اپنے اس افسرِ اعلیٰ سے داد ملی مگر اس پہلی داد کا نشہ اب تک نہیں اترا۔راہ چلتے دیکھا تو سڑک کے کنارے خراماں خراماں چلے آ رہے ہیں۔ادھر ادھر دیکھنے کی قسم ہے۔ سواری سے گھبراتے ہیں اس لئے پیدل چلنا پسند ہے۔ایک دو بار ہمارے ابا نے اپنی جیپ میں لفٹ دینے کی پیشکش کی۔مسکرا کے ٹھکرا دی۔دونوں میں بے تکلفی تھی دوستی تھی۔احترام کا رشتہ دونوں جانب استوار تھا۔ہمارے ابا بیمار ہوئے تو جن بزرگوں کو دعا کرنے کی درخواست کی ان میں ایک یہ درویش بھی تھے۔عیادت کے لئے بھی سب سے پہلے جو گھر پر آئے اور پیدل چل کر آئے۔وہ یہی بزرگ تھے۔

طبیعت کے دھیمے تھے ہم نے انہیں پندرہ بیس برس تو ضرور دیکھا ہوگا کبھی انہیں کسی پر خفا ہوتے دیکھنا ہمیں یاد نہیں۔زیادہ میل جول بھی انہیں پسند نہیں تھا بس اپنے لگے بندھے دوستوں میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ان کے پڑوس میں ایک بزرگ تھے کہ "شربیت حقہ" کے "کما حقہ" پابند تھے بس ان سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ان کے حجرہ میں تین "محققین" باقاعدگی اور پابندی سے جمع ہوتے، حسب توفیق دادِ تحقیق دیتے اور بس! زیادہ مجلسوں میں ہم نے انہیں نہیں دیکھا۔دور سے دیکھنے والوں کو ان کی باغ و بہار شخصیت کے شگفتہ پہلو نظر نہیں آتے تھے مگر قدرت نے انہیں صاف ستھرا ادبی ذوق عطا فرمایا تھا۔ ادب کے رمز شناس تھے۔خود کچھ لکھتے تھے یا نہیں ہمیں اس بارے میں کچھ پتہ نہیں مگر ان کے ابا اپنے وقت کے مانے ہوئے اور مستند ادیب تھے۔ہم نے ایک بار ان سے اجازت چاہی کہ اگر وہ اجازت دیں تو ہم ان کے ابا کے بعض قلمی مضامین کو جو مختلف علمی موضوعات پر لکھے گئے تھے، ایڈٹ کر کے

چھاپ دیں۔ کہنے لگے ان کا حقِ اشاعت میرے پاس نہیں۔ہم نے کہا کس کے پاس ہے فرمایا مجھے علم نہیں۔ وہ مضامین اب تک غیر شائع شدہ پڑے ہیں۔ہمیں یقین ہے کسی وقت پنجاب یونیورسٹی کا کوئی محقق ان کو کھود نکالے گا۔

ان کی اولاد میں سے ان کے بڑے بیٹے ہمارے استاد اور چھوٹے ہمارے کلاس فیلو تھے۔اس ناطہ سے ایک دو باران کے ہاں جانا بھی ہوا مگر گھر میں بھی وہ اسی طرح لئے دئے رہتے تھے جیسے دفتر میں یا باہر رہتے تھے۔ایک بار ہمارے ایک بزرگ انگلینڈ سے آئے تو ان کے لئے ڈن ہل کا ایک ڈبہ لیتے آئے۔ہم انہیں پیش کرنے کے لئے حاضر ہوئے تو لے کر جلدی سے اپنے تکیہ کے نیچے سرکا لیا۔ اپنے چھوٹے بیٹے کا نام لے کر فرمانے لگے اگر اس کو پتہ چل گیا تو غائب کر دے گا۔ہم نے اپنے اس دوست کو چھیڑا کہ تم تو کہتے تھے ابا کو میری اس عادت کا علم نہیں آج تمہارے ابا نے یہ فرمایا ہے۔ کہنے لگا حد ہوگئی میں تو پچھلے پانچ برس سے یہی سمجھتا رہا کہ انہیں میری اس علت پر آگاہی نہیں۔ خود ہمارے ساتھ ایسا ہی حادثہ ہوا۔ ہم بھی اپنی دانست میں اپنے ابا سے چھپ چھپا کر سگریٹ نوشی کیا کرتے تھے۔ یونیورسٹی کے زمانہ میں ایک بار وہ ہمارے ہاسٹل میں تشریف لائے سامنے ایک بہت بڑا چاندی کا کپ پڑا تھا جو ہم نے انہیں دنوں جیتا تھا۔ اس کے اندر ہمارے سگریٹ کے باقیات جمع رہتے تھے۔قبلہ و کعبہ نے کپ کو دیکھنے کی غرض سے اٹھایا اور اس کا ڈھکنا کھول کر اندر جھانکا۔ ہمارا تو وہ حال ہوا کہ ”کاٹو تو لہو نہیں بدن میں“۔مگر قبلہ و کعبہ کا حوصلہ تھا کہ اسی خاموشی سے کپ کا ڈھکنا رکھ دیا۔ پرانے بزرگوں کی کیا بات تھی زبان سے کچھ کہہ کے نہیں دیا کوئی اور ہوتا تو نصیحتوں کے دفتر کھول لیتا یا طعن و تشنیع کے تیر آزمانے لگتا۔ ہمارے بزرگ حوصلہ مند تھے پردہ پوشی کرنا حوصلہ مندوں کا کام ہی تو ہے!

دفتر میں ان کا مقام سب سے اعلیٰ افسر کا مقام تھا۔ لوگوں میں ان کا اتنا اعتبار تھا کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ میرا معاملہ ان کے روبرو پیش ہے تو مجھے کسی ناانصافی کا خدشہ نہیں اور حقیقتاً ایسا ہی ہوتا تھا۔ ان کا اپنا یہ حال تھا کہ ادنیٰ کارکن سے لے کر اعلیٰ کارکن تک سب سے یکساں ملاطفت سے پیش آتے۔ دعوتوں میں ہم نے ایسا بھی دیکھا کہ اپنے دفتر کے چپڑاسی کو اپنے ساتھ بٹھا رکھا ہے اور دونوں اکٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ ایک بے تکلف دوست نے ٹوکا تو فرمانے لگے ہمارے دیہات میں چھوٹے بڑے لوگ ایک ہی حقہ سے حقہ پیتے ہیں کیا ہم ایسے گئے گذرے ہیں کہ اتنی بھی رواداری ہم میں نہ ہو؟ ادنیٰ اور اعلیٰ کی تمیز ہمارے معاشرے میں ویسے بھی نہیں تھی مگر یہ بزرگ اس مساوات کے نمایاں علمبردار تھے۔ آخر کس دادا کے پوتے تھے؟ ان کے دادا کی سنت بھی تو یہی تھی کہ سب مہمانوں کے درمیان بیٹھ کر کھانا کھاتے اور جب سب لوگ اپنا اپنا کھانا نکال چکتے تو وہ اپنا پیالہ اٹھا کر سب سے غریب اور دور پیچھے بیٹھے ہوئے مرید کے پاس چلے جاتے کہ آؤ میاں اب ہم بھی کھانا کھالیں اور اسی پیالہ میں آقا کے ساتھ ان کا خادم بھی شریک ہو جاتا۔

ان کا وصال ہوا تو ان کی جگہ ایک اور ولی نے لے لی۔ ہم نے انہیں ان کی جوانی کے زمانہ میں اپنا الیکٹرانکس کا کارخانہ چلاتے دیکھا تھا یہ ان کی ہابی بھی تھی اور روزگار بھی۔ تقسیم سے پہلے ان کے کارخانہ کا بنا ہوا الیکٹرانک کا سامان دور دور تک مشہور تھا بلکہ دساور کو بھی بھیجا جاتا تھا مگر تقسیمِ ملک کے بعد انہوں نے زمینداری کی طرف توجہ کی۔ چاہتے تو اپنے کارخانہ کے عوض یہاں اچھے سے اچھا کارخانہ الاٹ کروا لیتے مگر ہماری بستی کے مکینوں نے اپنی متروکہ جائیدادوں کا کلیم داخل ہی نہیں کیا۔ نئی بستی کے ماحول میں ابتدا میں بجلی کے پنکھوں کا کارخانہ انہوں نے قائم کیا مگر خدا جانے کیا ہوا کہ اس کی صف لپیٹ دی اور زمینداری کرنے لگے اور اس ذوق وشوق سے کرنے لگے جیسے جدی پشتی زمیندارہ کرتے

آئے ہوں۔ چن چن کر غیر آباد زمینیں حاصل کرتے اور انہیں آباد کر کے سرسبز و شاداب بنا دیتے۔ ہم نے کئی بار انہیں دیکھا کہ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں، جب محاورہ کے مطابق چیل انڈا چھوڑتی ہے، یہ اپنے زمیندارہ کی طرف رواں دواں ہیں، کبھی گاڑی ہے کبھی گاڑی نہیں ہے، کبھی ٹریکٹر پر ہی ٹنگے ہوئے ہیں، مگر ان کا سفر جاری ہے۔ سر پر کھڑے ہو کر گندم کی فصل اگاتے اور اٹھواتے ہیں۔ تھریشر چل رہا ہے، گرد کے طوفان اٹھ رہے ہیں مگر یہ اپنے کام میں مگن ہیں۔ ہاں اس حالت میں بھی پان دبا ہوا ہے۔ پان کے رسیا ہیں، یہ ان کی دادی اماں کی دین ہے جو دلی والی ہیں یا ہوسکتا ہے ننہال کی نوابی کا کوئی اثر ہو مگر پان منہ میں ہے اور ان کی شخصیت کا جزو لاینفک ہے۔

ان کے کھانے کا طور بھی نرالا ہے، دل کے مریض ہیں مگر پراٹھے نہیں چھوڑ سکتے، ان کے لئے تو پکتے ہی ہیں اس سارے لاؤ لشکر کے لئے بھی پراٹھے ہی پکتے ہیں جو ان کی فصل کی کٹائی یا اگاہی پر مامور ہے۔ ہمارے ابا سے پرانا یارانہ ہے اور ہمارے گھر کا اچار انہیں بہت پسند ہے انہیں کیا ان کے اور ہمارے مرشد کو بھی بہت پسند ہے بلکہ مرشد کو تو پراٹھے بھی ہماری امی کے ہاتھ کے بنے ہوئے پسند ہیں جہاں یہ تینوں دوست اکٹھے ہو جاتے ہیں جشن کا سماں ہوتا ہے۔ زمیندارہ ہو یا شکار، پراٹھے، اچار اور لسی تینوں کی موجودگی ضروری ہو جاتی ہے۔ جس روز ابا کو ان دوستوں کے ساتھ جانا ہو گھر میں ہماہمی ہوتی ہے۔ ہمارے ابا مرحوم گھر میں ہمیشہ دودھیل جانور پالتے تھے اس لئے ہمارے گھر میں تازہ خالص دودھ اور خالص گھی مکھن موجود رہتا تھا۔ جب ان تینوں دوستوں کا پروگرام بنتا خالص گھی کے پراٹھے پکتے، اعلیٰ سے اعلیٰ تیل میں بڑے چاؤ سے ڈالا ہوا اچار نکالا جاتا۔ لسی کے دونے الگ سے تیار کروائے جاتے تب جا کر ان تینوں دوستوں کے کھانے کا اہتمام ہوتا۔ مگر ہمارے ابا مرحوم دل اور شوگر دونوں کے مریض تھے اس لئے اپنے لئے علیحدہ سے ایک "روکھا" پھلکا ساتھ رکھتے اور اچار سے

اسی رغبت سے نوش کرتے جس رغبت سے ان کے دوست پراٹھے تناول فرماتے تھے اور کہتے تھے اصل مزا تو دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں ہے!

گاڑیاں بھی اللہ نے کئی دے رکھی تھیں مگر ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ان کے کام کم آتیں دوسروں کے استعمال میں زیادہ رہتیں۔ ہماری بستی میں ایک آدھ ایمبولینس موجود ہے جو تھوڑے لوگوں کے لئے تو کفایت کرتی تھی جب آبادی بڑھ گئی تو اس کی مانگ زیادہ ہوگئی۔ ایسے وقتوں میں جب شہر میں ایمبولینس موجود نہ ہوتی ضرورت مند بلا جھجک ان کا دروازہ جا کھٹکھٹاتے اور گاڑی مریض کی خدمت کے لئے مل جاتی۔ ہم نے کسی کو ایسے موقعہ پر پریشان ہوتے نہیں دیکھا۔ جب اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمیں گاڑی میسر آگئی تو ہم نے بھی اس بے ریش ولی کی سنت پر عمل کیا کہ مریض کی خدمت کے لئے گاڑی درکار ہے تو حاضر ہے۔ ہمارے پاس ڈرائیور تو کوئی تھا نہیں اس لئے اکثر و بیشتر یہ خدمت بھی ہم ہی انجام دیتے تھے اور خدا گواہ ہے کہ جو لطف اس خدمت میں آتا تھا وہ کسی اور خدمت میں میسر نہ آیا۔ خدمت کا یہ انداز ہم نے اسی بزرگ سے سیکھا۔

یہ بھی دفتر کی اعلیٰ ترین کرسی پر بیٹھے تھے ان کا انداز بھی منفرد تھا۔ جس کا جی چاہتا چق اٹھا کر اندر آجاتا۔ خالی ہیں تو اپنے کام کی بات کرتا اور جواب باصواب سے متمتع ہوتا۔ خالی نہ ہوتے تو آرام سے بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرتا۔ رعب داب اتنا تھا کہ کوئی ان سے کوئی سبک بات نہ کرسکتا تھا، ذرا کسی نے طول کلامی سے کام لیا تو مسکرا کر فرماتے میاں اپنے مطلب کی بات کہو کیوں میرا وقت ضائع کرتے ہو۔ مگر اس سرزنش میں ملائمت ہوتی تحکم یا برہمی کا اظہار نہ ہوتا۔ خالی ہوتے تو دفتر سے باہر نکل کر ٹہلنا شروع کر دیتے۔ ان کا وہ انداز بہت بھلا لگتا تھا منہ میں پان ہے، ساتھ میں کوئی دوست ہمنشیں ہے جو باتیں کرتا جاتا ہے اور یہ خاموشی سے سنتے اور ہوں ہاں کرتے جاتے ہیں۔ چہرے پر عجیب دلنواز

مسکراہٹ ہے۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ مرشد کو حالات کے ماتحت ملک چھوڑنا پڑا امارت کا بوجھ ان کے کاندھوں پر آن پڑا اب یہ محض دفتر کے افسرِ اعلیٰ نہیں ہیں سارے ملک کے متبعین کی دینی رہنمائی بھی ان کے ذمہ ہے۔جس خوبی سے یہ فریضہ انہوں نے انجام دیا کیا کوئی دے گا؟ دیکھنے میں وہی درویش وجود لوگوں کو رشد اور ہدایت بھی دے رہا ہے، حوصلہ بھی دے رہا ہے، استقامت کا نمونہ بھی انہیں دکھا رہا ہے غرض ان کا اسوہ سب کے لئے مشعلِ راہ بنا ہوا تھا۔ہم نے ایسے بہت کم لوگ دیکھے ہیں کہ رہنمائی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو جائیں اور اپنی طبیعت کی مسکینی بھی قائم رکھ سکیں۔ یہ داڑھی منڈ وا ولی ایسا کر سکتا تھا اور اس نے ایسا کر کے دکھایا تھا جبھی تو ان کی وفات پر مرشد نے ان کو خراجِ تحسین ادا کیا تھا اور اب ان کا وہی بیٹا جوان کی امارت کا جانشین ہوا تھا اللہ کے فضل سے خلافت کے مقام پر سرفراز ہے اور کروڑوں کا مرشد ہے۔

ہم نے اپنے معاشرہ میں اپنے اردگرد ایسے ولی بہت دیکھے تھے اور ایسے ولی بہت موجود ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایک اور بے ریش ولی کا انتقال ہوا ہے۔نحیف سے آدمی تھے۔پھیپھڑوں کی بیماری نے ایک پھیپھڑا برباد کر دیا تھا محض ایک کے سہارے جی رہے تھے۔ جوانی میں اپنے گھر بار والوں خاندان والوں کے علی الرغم مسلک تبدیل کر لیا اور بی اے کرنے کے بعد خدمت کے لئے آ گئے۔ہمیں ان کے ساتھ دفتر میں کام کرنے کا موقع ملا۔افسر کیا تھے خادم تھے لہجہ میں اتنی انکساری تھی کہ بیان سے باہر ہے۔علمی ذوق کے آدمی تھے اسی لئے ہمارے ساتھ شفقت سے پیش آتے اور عمروں کے تفاوت کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ لائبریری کا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ اردو انگریزی دونوں زبانوں کا ذوق رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ لوگوں کو انگریزی کا سبق بھی دیتے رہے، خود اپنی اولاد میں بیٹیاں ہی تھیں ان کو اعلیٰ تعلیم

دلائی۔ریٹائرہونے کے بعدمسجد کے پاس گھر بنالیا کہ دور نہ جانا پڑے۔ان کے علمی ذوق کا عالم یہ تھا کہ کہیں سے کسی اچھی کتاب کی بھنک پڑتی تو فوراً لائبریری کا رخ کرتے نہ ملتی تو کالج میں ہمارے پاس تشریف لاتے کالج لائبریری میں بھی نہ ملتی تو لاہور میں تلاش کرواتے ،غرض جب تک وہ کتاب دیکھ پڑھ نہ لیتے انہیں چین نصیب نہ ہوتا۔ہم نے کئی کتابیں ان کی سفارش پر پڑھیں اوران کے ذوقِ سلیم کی داددی۔ان کی زندگی کا محور گھر تھا یا لائبریری۔ہمیں وطن چھوڑے بارہ برس ہونے کو آئے مگر ان کی یاد برابر آتی رہی۔سویڈن میں ہم نے پرانی کتابوں کی دکانوں سے کئی ایسی نایاب کتابیں خریدیں جن کو ہم ان کی سفارش پر پڑھ چکے تھے۔جی چاہتا تھا کہ وہ کتابیں انہیں بھیج دیں مگر غریب الوطنی میں ساری خواہشیں پوری تو نہیں ہوسکتیں۔اللہ تعالیٰ اس درویش بے ریش کی مغفرت فرمائے۔

ہاں ہمارے سکول کے ہیڈ ماسٹر بھی تو اپنی بزرگی اورتقویٰ شعاری کی وجہ سے اسی درویشی کے مرتبہ پر فائز تھے۔صبح سکول کی اسمبلی میں درسِ حدیث دیتے تو آنکھیں نم ہوجاتیں۔ہمیں اس وقت تو بچپن کی ناسمجھی میں ان کی رقت کی وجہ سمجھ میں نہ آتی اب سوچتے ہیں تو ان کا گداز سمجھ میں آتا ہے الٰہی کیسے کیسے لوگ تھے۔یہ صوفی بھی بے ریش صوفی تھے۔قلبِ مطمئنہ کی دولت سے مالا مال!اب ویسے لوگ کہاں؟ اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر!۔

خاموش کارکن

دنیا میں جہاں کہیں بھی کسی نظام کا وجود موجود ہو وہیں اس نظام کو چلانے کے لئے کارکنوں کا وجود بھی ضروری ہوتا ہے۔جماعت احمدیہ کا نظام اس لحاظ سے دنیا کا منفرد نظام ہے کہ اس نظام کو چلانے والے کارکن دنیاوی مفادات سے بے نیاز ہوکر کام کرتے ہیں۔اس نظام میں قوت کا سرچشمہ خلیفۃ

المسیح کی ذات ہے۔تمام کارکن خلیفۂ وقت کی ہدایت کے مطابق کام کرتے ہیں۔ پھر کارکنوں میں مراتب کا فرق ہے کوئی واقفِ زندگی کارکن ہے کوئی جز وقتی وقف کے تحت کام کرتا ہے اور کچھ کارکن ایسے ہوتے ہیں جو عملاً واقفین زندگی ہی کی طرح کام کرتے ہیں مگر لفظاً شاید واقفِ زندگی نہیں ہوتے۔ جماعت کا سارا نظام اخلاص اور وقف پر چلتا ہے اور چل رہا ہے۔اب تو اس قسم کے کارکنوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی ہے کیونکہ لندن میں حضرت صاحب کے اردگرد کام کرنے والے اکثر کارکن لفظاً واقفِ زندگی نہیں مگر عملاً سارے ہی کارکن واقفِ زندگی ہیں اور بلا معاوضہ رضا کارانہ طور پر جماعت کا کام کررہے ہیں۔امسال جلسہ سالانہ کے بعد برمنگھم میں عزیزی نصیر شاہ کے گھر ایک شعری نشست میں پاکستان کے ایک بہت بڑے شاعر'ضیا جالندھری' تشریف لائے ہوئے تھے جو پاکستان ٹی وی کے مینیجنگ ڈائریکٹر رہ چکے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ اس نشست کی ریکارڈنگ کے لئے ایم ٹی اے کی جو ٹیم لندن سے آئی ہوئی ہے اس کے سارے ہی کارکن رضا کار ہیں ایک بھی ملازم یا تنخواہ دار کارکن نہیں تو ان کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا کیونکہ وہ ٹی وی اور اس کے تقاضوں کو عملی طور سے جانتے تھے اور اس بات سے آگاہ تھے کہ یہ کام کتنی جانکاہی اور محنت اور دلسوزی چاہتا ہے۔ کہنے لگے جس جماعت کو اتنا وقت اور اتنی محنت دینے والے رضا کار کارکن میسر ہوں اس کی دن دونی رات چوگنی ترقی کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔

ربوہ میں جب ہم نے ہوش سنبھالا اور انجمن کے کارکن کی حیثیت سے خدمت شروع کی تو یہ احساس نمایاں تھا کہ اگر ہمیں جماعت کی خدمت کرنی ہے تو ہمیں عملاً بھی وقفِ زندگی کے نظام سے منسلک ہو جانا چاہئے چنانچہ بی اے کرنے کے بعد وقفِ زندگی کا فارم پر کر دیا۔ارشاد ہوا ایم اے کریں۔ایم اے حساب کتاب تو ان کا پیشہ تھا مگر ہندسے اتنے پیار سے لکھتے تھے گویا کوئی مقدس

نوشتہ رقم کر رہے ہوں۔ اپنے دوست چوہدری ظہور احمد ناظر دیوان پر تو چاہتا ہے علیحدہ مضمون لکھوں۔ چوہدری صاحب سے تعلق ان کی ماتحتی سے شروع نہ ہوا کالج کے زمانہ سے شروع ہوا۔ چوہدری صاحب حضرت صاحب کے دوستوں میں سے تھے اور صد سالہ جوبلی فنڈ کے کرتا دھرتا تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ساتھ کشمیر کمیٹی میں کام کر چکے تھے اس لئے کشمیر کمیٹی کی تاریخ پر سند سمجھے جاتے تھے اس سلسلہ میں ان کی کتاب بھی چھپ چکی ہے۔ ہمارے ابا سے بھی ان کی دوستی تھی۔ چوہدری ظہور احمد نے اپنا سفرِ دفتری کی حیثیت سے شروع کیا اور ناظر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ وضع دار آدمی تھے صاحبِ ذوق بھی تھے۔ لباس کے بارے میں نفاست کا مظاہرہ کرتے تھے سر پر کلاہ والی سفید پگڑی باندھتے تھے باتوں میں موہنی تھی مخاطب کو گرویدہ کر لیتے تھے سلسلہ کے علماء کا بہت احترام کرتے تھے کہتے تھے عالم نہیں ہوں عالم شناس ہوں اور واقعی علم کی پہچان رکھتے تھے رفتہ رفتہ ہمیں ان سے دوستی کا شرف حاصل ہوتا گیا حتیٰ کہ آخری عمر میں بعض اوقات طلب فرماتے اور فرماتے میرے ساتھ باتیں کرو۔ ناظر دیوان کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے کارکنوں کے مفادات کا تحفظ کرنا اپنا فرض جانتے تھے اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اپنے رنگ کے صوفی تھے نمود و نمائش سے متنفر اور عاری۔ جب ہم انجمن میں کلرک تھے چوہدری صاحب کارکن درجہ اول تھے پھر نائب آڈیٹر ہوئے پھر آڈیٹر پھر ناظر۔ انجمن کے بہت کم کارکنوں کا ترقی کا گراف ایسا ہے۔ حساب کتاب کی سوجھ بوجھ خود ان کی اپنی پیدا کردہ تھی کوئی ڈگری وغیرہ ان کے پاس نہیں تھی صد سالہ جوبلی کا فنڈ اور اس کا حساب کتاب بڑا ٹیڑھا مسئلہ تھا مگر چوہدری صاحب نے اسے بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ریٹائرمنٹ کے بعد بھی خدمت کرتے رہے مگر ایک روز اچانک اس سفر پر نکل گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ ان کے بیٹوں میں سے منور ہمارا کلاس فیلو تھا چھوٹے ہمارے شاگرد ہوئے عزیز لئیق احمد نیشنل بینک آف

پاکستان کا سینئر عہدیدار ہے اور پاکستان سائیکلنگ ایسوسی ایشن کا ''رشتہ دار'' ہے ہمارے دوست ڈاکٹر رشید احمد ان کے داماد تھے ان کی اولاد یہاں سویڈن میں آباد ہے۔ ہم پہلے پہل سویڈن میں آئے تو عزیزی ڈاکٹر انس رشید اور اس کی بیوی عزیزہ مسرت نے اتنی محبت سے ہمارا خیال رکھا کہ ہمیں ایک لحظہ کے لئے بھی اپنے بچوں سے یا وطن سے دوری کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزا دے۔

کالج کے کارکنوں میں سے جنید ہاشمی کا ذکر ہونا ضروری ہے۔ زباں پہ بارے خدایا یہ کس کا نام آیا۔ جنید صاحب حضرت قاضی محمد ظہورالدین اکمل کے صاحبزادے تھے۔ ادبی ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ شعر تو نہیں کہتے تھے مگر کبھی کبھار کالج کے مجلہ میں مضمون نویسی کرتے تھے۔ ادب کا بڑا ثقہ ذوق تھا شعروں کی چھوٹی چھوٹی جزئیات پر نظر رکھتے تھے۔ اگر جنید صاحب کسی شعر کے بارے میں کہہ دیتے کہ اس میں سقم ہے تو ہم تو ضرور آمنا وصدقنا کہہ دیتے تھے۔ ان کی زبان بڑی شگفتہ ہوتی تھی اور ان کا پان بڑا مستند سمجھا جاتا تھا۔ اور ان کا ہمہ وقت کا ساتھی۔ جنید صاحب کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا چھوٹے چھوٹے بچوں کو ماں اور باپ بن کر پالا اور اللہ تعالیٰ نے بیٹیاں بھی ایسی دیں کہ دسوں انگلیاں دسوں چراغ۔ فیروزہ، فائزہ اور قانتہ ہمیشہ یونیورسٹی اور بورڈ کے امتحانوں میں اول آتی اور پوزیشنیں حاصل کرتی رہی ہیں۔ ہم انہیں چھیڑا کرتے تھے کہ آپ کی بیٹیاں اپنی ماں پر پڑی لگتی ہیں کہ اتنی ذہین وفطین ہیں۔ مسکرا کر چپ ہو جاتے ورنہ جنید صاحب اور چپ ہو جائیں؟ بیٹوں میں سے نوید ہاشمی یہاں ٹورنٹو میں ہے۔ اس کی بیٹی کی شادی میں ہم کسی وجہ سے نہ جا سکے۔ ملا تو سخت ناراض تھا کہنے لگا میری بیٹی کی شادی میں آپ نہیں آئے تو مجھے یوں محسوس ہوا میرا باپ نہیں آیا۔ بڑا سعادت مند بچہ ہے اللہ اسے خوش رکھے۔

قریشی محمد عبداللہ صاحب جنید صاحب کے بعد کالج میں آئے۔مرنجاں مرنج اور خاموش۔ان کی اولاد سے تو دوستی کا تعلق تھا اور ہے۔قریشی صاحب سے محلہ داری تھی 'دارالرحمت وسطی' میں ان کا مکان "آشیانہ" ہمارا آشیانہ تھا۔قریشی صاحب نے ایک طویل خط ہمیں لکھا ہوا ہے اور ہدایت کی ہوئی ہے کہ میرے مرنے کے بعد مجھ پر مضمون لکھنا اور وہ خط چھاپ دینا۔ہم نے کہا اور اگر ہم پہلے مر گئے تو کیا ہو گا؟ کہنے لگے پھر تمہارا ذمہ نہیں ہوگا مگر میں اس خط میں مندرج باتیں اپنی زندگی میں بیان کرنا نہیں چاہتا کیونکہ اس میں خودستائی کا پہلو نکلتا ہے۔ہم نے کہا اس خط میں ہمیں تو کسی خودستائی کا سراغ نہیں ملتا۔کہنے لگے تمہیں نہ ملتا ہوگا مگر مجھے ملتا ہے۔اس لئے ہم نے قریشی صاحب کا وہ خط سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔اگر ہم ان کے بعد زندہ رہے تو انشاء اللہ اسے چھاپ دیں گے ورنہ وہ ہمارے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا (یہ کتاب مرتب ہوتے وقت قریشی محمد عبداللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔90 سال سے زیادہ عمر پائی)۔ہم نے ان سے کئے ہوئے وعدہ کے مطابق ایک مضمون ان کی وفات پر لکھ کر الفضل ربوہ کو بھیج دیا تھا ابھی تک تو چھپا نہیں مگر اتنی تسلی ہے کہ ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے)۔

جماعت کے یہ خاموش کارکن اپنے اخلاص اور اپنی خدمتگزاری میں کسی سے کم نہیں تھے اور اخلاص پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔قیس ہو کوہکن ہو یا حالی۔عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں۔

ہمارا مکتبِ عشق

قادیان میں ہمارے گھر کے بالکل پاس ایک کھلے میدان کے شمالی کنارے پر ایک عظیم الشان عمارت کھڑی تھی۔مسجد نور میں جانا ہوتا تو اسی طویل میدان کو قطع کر کے جانا ہوتا۔عمارت کی زیبائی اور خوبصورتی اپنی طرف کھینچتی کہ جا اینجاست۔مگر بچوں کو اس عمارت کے آس پاس پھٹکنے کی جرات بھی

نہیں ہوتی تھی۔ ہم لوگ چپکے سے گھنیرے بڑ کے چھتنار درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے مسجد تک جاتے اور واپسی پر اس عمارت کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گھر آ جاتے۔ بزرگوں سے معلوم ہوا کہ یہ تاج محل کسی زمانہ میں سکول کی عمارت تھی اب کالج کا مسکن ہے اور صرف وہ طلباء یہاں تعلیم پا سکتے ہیں جو میٹرک کے امتحان کا مرحلہ کامیابی سے طے کر چکے ہوں۔ بھلا پرائمری سکول کی تیسری چوتھی جماعت کے لڑکے کے ذہن میں کالج کی علو مرتبت کا کیا کیا تصور پیدا نہ ہوتا ہوگا۔ چلئے اس حیرت میں حسرت بھی شامل ہو گئی۔ جب ہمارے کالج تک پہنچنے کا زمانہ آیا تو ملک تقسیم ہو چکا تھا، ہجرت وقوع میں آ چکی تھی۔ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ تقسیم ملک کے کوئی گیارہ بارہ برس بعد قادیان جانا ہوا تو کالج کی عمارت اسی جگہ تھی مگر اس کی خوبصورتی گہنا چکی تھی۔ اس کو دیکھنے سے آنکھوں میں جو طراوت آتی تھی وہ مفقود تھی۔ ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد۔ ہماری مسجد، مسجد نور کے دروازے تیغہ کئے ہوئے تھے۔ بڑ کا درخت اپنی کہن سالی کی قیمت ادا کر چکا تھا۔ ساتھ کا سومنگ پول خشک اور بے آب تھا۔ بورڈنگ ہاؤس کی دیدہ زیب عمارت بھی "صورتِ ببیں حالت پرس" کی تصویر تھی۔ در و دیوار سے حسرت پڑی ٹپکتی تھی۔ ہمیں اپنے گھر کو دیکھ کر رونا نہ آیا تھا ان عمارتوں کی حالت نے رُلا دیا حالانکہ ان عمارتوں سے ہمارا محض آنکھ دیکھے کا رشتہ تھا۔ کالج میں پڑھے تھے نہ بورڈنگ ہاؤس میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ ربوہ میں یہ دونوں خوش نصیبیاں حصہ میں آئیں۔ مگر وائے غریب الوطنی کہ اب اس بستی سے آنے والے کہتے ہیں کہ کالج کے سامنے سے بھی گزریں تو آنکھیں بھر آتی ہیں۔ کہاں گئے وہ زمانے کہاں گئے وہ لوگ؟

ہم نے میٹرک کا امتحان چنیوٹ کے اس سکول سے دیا جو لاہور روڈ پر واقع ہے اور اب ''نارمل'' سکول کہلاتا ہے۔ ہمارے زمانے میں نارمل نہیں تھا ''ایب نارمل'' تھا کیوں کہ ایک ہی سال میں کسی

سکول کے طلباء نے یونیورسٹی کے میٹرک کے امتحان میں ''یک مشت'' اتنی نمایاں حیثیتیں حاصل نہ کی تھیں۔غضب خدا کا اول اس سکول کا لڑکا منور احمد۔تیسرا اس سکول کا لڑکا سعید احمد خاں۔ساتواں اس سکول کا لڑکا برکات الٰہی جنجوعہ۔دسواں اس سکول کا لڑکا عبدالغفور زاہد۔ان کے پیچھے پیچھے بھی بہت سی نمایاں کامیابیوں کا سلسلہ تھا جو ہمیں اس وقت یاد نہیں تاریخ میں ضرور محفوظ ہوگا۔ہیڈ ماسٹر کہ حافظ قرآن تھے زار و قطار رو کر اپنے سکول کے اس کارنامہ پر سجداتِ شکر بجا لا رہے تھے۔اخبار والے نمایاں کامیابیاں حاصل کرنے والے لڑکوں کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔اساتذہ اپنی جگہ خوش۔طلباء اپنی جگہ نازاں غرض شہر کا شہر خوش تھا اور تو اور چنیوٹ میں بھی جشن کا سماں تھا کہ ان طلباء نے آخر امتحان تو ہمارے ہی شہر سے دیا تھا۔یہ تو وہ ''ایب نارمل سکول'' تھا جس میں ہم نے تعلیم پائی۔اور وہ ادارہ جس کو ہم ''اپنا کالج'' یا ''اپنا مکتبِ عشق'' کہہ رہے ہیں کوئی کم حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ہم نے اس کالج کی عمارت کو اپنے سامنے تعمیر ہوتے اور اس کی تعلیمی اور تہذیبی روایتوں کو اپنے سامنے مستحکم ہوتے دیکھا تھا۔اس کالج سے ہمارا محض آنکھوں دیکھے کا رشتہ نہیں دانت کاٹی روٹی کا رشتہ تھا۔ہم نے اس کالج سے محض تعلیم ہی حاصل نہیں کی اس کا رزق بھی کھایا ہے اس لئے حقِ نمک سے ادا ہونے کی سعی کریں گے۔ریلوے لائن ربوہ شہر کے عین بیچ سے گزرتی ہے۔کالے کالے پہاڑ ایک جانب رہ جاتے ہیں۔شہر کے جنوب میں ریلوے لائن سے پرے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ایک بڑی لمبی چوڑی عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔دیکھتے دیکھتے اس عمارت نے سر اٹھانا شروع کیا اور دو تین برسوں میں ہی مکمل ہو کر ایک ادارہ کی شکل اختیار کر لی۔ہم اس عمارت کو ایک عجیب نیم درجا کے عالم میں بنتے دیکھتے رہے۔میٹرک کا مرحلہ ہم طے کر چکے تھے۔ہمارے ساتھی لاہور میں جا کر کالج کی تعلیم کے دو سال مکمل کر چکے تھے ہم پیچھے رہ جانے والے مسافر کی طرح اس بات کے منتظر تھے کہ کب کالج کی یہ عمارت بنے کب

تعلیم کا سلسلہ جاری ہو اور کب ہم بھی اس کالج کے طالب علم کہلانے کے قابل ہو سکیں۔ کالج کے پرنسپل جو آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے تھے کبھی کبھار اپنے ''عمو صاحب'' کو ملنے کے لئے ہمارے اس دفتر میں بھی قدم رنجہ فرماتے تھے جس میں ہم کلرک کے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی سعیٔ مسلسل میں مصروف تھے۔ ایک دو بار ہمیں دیکھا بھی چونکہ اخبار و رسائل میں ہمارے مضامین چھپنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اس لئے ایک دو بار حوصلہ افزائی کی نگاہ سے ہماری جانب نگاہ اٹھائی۔ ایک بار تو یہاں تک فرما دیا کہ آپ کی یہ جگہ نہیں کالج آجائے تو فوراً کالج میں داخل ہوں۔ اس لئے ہم اس عمارت کے بننے اور کالج کے جاری ہونے کے کیا کیا آرزو مند نہ تھے۔ بارے وہ وقت مسعود آیا کالج جاری ہوا داخلہ کا اعلان ہوا۔ ہم داخلہ کا فارم لے کر حاضر ہوئے۔ پرنسپل صاحب نے کچھ پوچھ کے اور کہہ کے نہیں دیا فارم پر کچھ نشان سے بنا دئے جو ہماری فہم سے بالاتر تھے۔ ہم وہ فارم لے کر کالج کے دفتر میں گئے۔ معلوم ہوا پرنسپل صاحب نے از راہِ ذرہ نوازی پوری فیس معاف کر دی ہے بلکہ کالج کی جانب سے مبلغ پانچ روپے مہینہ ہمارا وظیفہ بھی مقرر کر دیا ہے۔ ہم جو یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہے تھے کہ خدا معلوم کالج میں داخلے کے لئے کتنے روپے درکار ہوں گے یکا یک ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگے۔ نئے داخل ہونے والے لوگوں کو دیکھا کوئی سات سو نمبر لے کر آیا تھا کوئی ساڑھے سات سو۔ ایک سے ایک نابغہ کالج کے کوریڈور میں محوِ خرام نظر آیا۔ ہمیں ایک اور فکر نے گھیر لیا کہ ان اعلیٰ نمبر یافتہ لوگوں میں ہم کہاں ٹھہر پائیں گے؟ ایسا نہ ہو بیک بینی و دو گوش چلتے کر دئے جائیں۔ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی کہ سکول میں بھی تو ہمارے ساتھ اسی قسم کے ''از قسمے نابغہ ہائے روزگار'' لوگ تھے وہاں ہم ان سے نہیں دبے تو یہاں ان سے کہاں دب کے رہیں گے؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ یونیورسٹی میں کوئی اعلیٰ پوزیشن نہیں آئے گی تو وہ پہلے کب آئی تھی؟

ہم ابھی اپنے پانچ روپے مہینہ کے وظیفہ کی لم کا ہی سوچ رہے تھے کہ قبلہ جنید ہاشمی مرحوم نے کہ کالج کے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ تھے ہمیں ہاتھ کے اشارہ سے بلایا۔ ہمارا خیال تھا کچھ فرمائیں گے مگر منہ میں پان تھا فرماتے کیسے؟ ایک فائل ہمارے ہاتھ میں تھما دی اور پان کی پیک کو منہ میں ادھر ادھر دوڑاتے ہوئے ہمیں بتایا کہ یہ کالج کے مجلہ المنار کی فائل ہے اور یہ کہ ہم پہلے دن سے ہی اس مجلہ کی مجلسِ ادارت میں شامل کر دئے گئے ہیں۔ پرنسپل صاحب کا ارشاد ہے کہ پرچہ معیاری ہونا چاہئے اس لئے محنت سے مرتب کریں۔ مجلسِ ادارت میں اور کون کون ہے؟ فرمایا معلوم ہو جائے گا پچھلا پرچہ دیکھ لیں۔ ہم لائبریری میں گئے کہ المنار کا پچھلا پرچہ دیکھیں وہاں ہو کا عالم تھا۔ کتابیں البتہ الماریوں میں بند پڑی تھیں تالے لگے ہوئے تھے۔ یہ لمبے لمبے میز۔ ساتھ میں کچھ کرسیاں مگر سب خالی۔ اتنے میں ایک بارعب سے بزرگ ٹہلتے ٹہلتے اندر آئے ہم نے لپک کر کچھ استفسار کرنا چاہا تو وہ اسی تیزی سے باہر چلے گئے جس تیزی سے ہم ان کی جانب لپکے تھے مبادا ہم ان سے کوئی سوال کر ڈالیں۔

ہماری قسمت اچھی تھی کہ ہمارا اسکول کا ایک پرانا ہم جماعت ''ذہین فطین'' دوست نظر پڑا۔ اب وہ سینئر تھا اور ہم بہر حال فرسٹ ایر فول تھے اس نے تسلی دی کہ گھبرانے کی بجائے یہ موقع لوگوں کو فرسٹ ایر فول بنانے کا ہوتا ہے اس لئے ہمیں وقت کو ادھر ادھر پھر کر ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ ہم فرسٹ ایر فول ہونے کے باوصف دوسروں کو فول بنانے پر مستعد ہو گئے۔ یہ دھڑکا بہر حال لگا ہوا تھا کہ کہیں ہم خود تو فول نہیں بن رہے؟ اور یہ جو المنار کا پلندہ ہم اٹھائے پھرتے ہیں کہیں یہ ہمارے فرسٹ ایر فول ہونے کا محکم ثبوت تو نہیں؟ ''نیست ایڈیٹر و لیکن در بغل دارد............''

فول وول تو ہم نے لوگوں کو بہت بنایا مگر اس بات کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ جولڑ کا ملتا وہ ''وظیفہ خوار'' نکلتا۔ غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا۔ ہم جو اپنے وظیفہ خوار ہونے کو بڑا طرۂ امتیاز سمجھے بیٹھے تھے

بڑے پریشان ہوئے کہ یہ کالج ہے یا وظیفہ خواروں کی انجمن؟ معلوم ہوا کہ اس کالج کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ مستحق طلباء کو وظیفہ دیتا ہے اور اس میں کسی کے رنگ و نسل، عقیدہ و بدعقیدگی، نیکی بدی، بدعت، غیر بدعت کا امتیاز روا نہیں رکھتا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ مستحق طلباء علم سے محروم نہ رہ جائیں۔ پہلے روز ہی جس انبوہِ غفیر سے بسلسلہ ''فول گری'' ملاقات ہوئی وہ اسی زمرۂ ''وظفاء'' میں سے نکلے۔ اکثر لوگ تو عقیدۂ بھی محض ''عقیدۂ تن'' نکلے یعنی یہ بڑے بڑے تن و توش والے کالج کی روئنگ ٹیم کے چیمپئن لوگ کھانے پینے میں لاثانی ''تن کی دنیا ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں'' کے قائل۔ ہوسٹل میں ایسے لوگوں کی اکثریت پائی جو ہمارے عقیدہ سے اختلاف رکھتے تھے۔ کوئی کسی سے تعرض نہیں کرتا تھا البتہ ایک ''تکلیف'' سب کو تھی کہ ''آ گیا عین پڑھائی میں اگر وقتِ نماز'' تو نماز التزام سے پڑھنا پڑتی تھی۔ ہمارے ایک دوست (جو پیپلز پارٹی کے زمانہ میں وزیر ہو گئے تھے) کہا کرتے تھے کہ اقبال خود تو نماز پڑھتا نہیں تھا (من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا) ہمارے لئے ایک مصرعہ ایسا کہہ گیا ہے جو سانپ کے منہ میں چھچھوندر بن کر رہ گیا ہے۔ پڑھیں تو مشکل نہ پڑھیں تو مشکل۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ پڑھیں تو تیمم کرنا پڑتا ہے نہ پڑھیں تو دکھاوے کے لئے وضو۔ اور وضو کے مرحلہ سے گزر لئے تو دو نفلیں مار لینے میں کیا حرج ہے؟ (ہمارے یہی دوست جب پیپلز پارٹی سے نکل کر بہ امیدِ وزارت اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل ہوئے تو نمازیں پڑھ پڑھ کر ماتھے پر یہ بڑا اگٹا نماز کا ڈال لیا۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آنے کی بجائے ''مسجد'' میں آ گیا) وزارت بیچارے کو پھر بھی نہ ملی کیونکہ اسلامی جمہوری اتحاد والے نمازِ ''معبودِ زماں'' کی بجائے نمازِ ''ضیاعِ وزیاں'' کا شمار رکھتے تھے اور اب ''نہیں آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد'' یاد آتا ہوگا۔

کالج میں پہلا دن تو خیریت سے گزرا۔ دوسرے روز قیامت آ گئی۔ کوریڈور میں فرسٹ ایئر کے

لڑکوں کو گھیرے کھڑے تھے کہ ایک بزرگ استاد نے ہمیں گھیر لیا۔ سوال یہ تھا کہ ہم ننگے سر کیوں کھڑے ہیں؟ اب ہمیں اپنی برہنہ سری کا احساس تو تھا لیکن اپنے ''ننگِ سر'' ہونے کا گمان تک نہیں تھا۔ ہم نے ازراہِ تفنن بڑے ادب سے پوچھ لیا ''جناب آپ کس ''ننگے'' کا ذکر کر رہے ہیں ننگے کا یا ''ننگ'' کا؟'' اب بھلا وہ آ گئیں تو جائیں کہاں؟ قبلہ نے ہمیں ''زبان درازی'' کے جرم میں دھر لیا اور سیدھا پرنسپل صاحب کے پاس لے چلے۔ ہماری سٹی گم ہو گئی کہ ابتدائے عشق میں ہی کالج سے نکال دئے جائیں گے اور سارے ارمان دھرے رہ جائیں گے۔ ہم نے گھگھیا گھگھیا کر اپنے نا کردہ گناہوں کی معافی چاہی۔ غضب یہ کیا کہ معافی بھی غالب کے لفظوں میں چاہی کہ ''نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد۔ یا رب یہ اگر کردہ گناہوں کی سزا ہے؟'' قبلہ نے کردہ نا کردہ کی تکرار کو اور غالب کے شعر کو بھی ہمارے نامۂ اعمال میں درج کر لیا اور تیزی سے پرنسپل صاحب کے کمرہ کی جانب بڑھنے لگے۔ اتنے میں ہمارا کل کا ساتھی آ گیا اس نے قبلہ کو جھک کر سلام کیا اور پوچھا خیریت تو ہے آپ نے اس فتنہ سے اپنے دامن کو آلودہ کیوں کر رکھا ہے اس شخص نے تو عربی بطور لازمی مضمون کے اختیار کی ہے اور بی اے تک عربی میں آنرز کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ قبلہ نے یہ بات سنی تو ذرا رکے اور پوچھا کیا واقعی آپ نے عربی کا مضمون رکھا ہے ہم نے برملا اس گناہ کا اعتراف کیا تو وہ موم ہو گئے فرمانے لگے ''عزیزم عربی پڑھنا بڑا مشکل کام ہے اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں''۔ ہم نے کہا ''جی درست فرمایا ایک سخت مقام تو آج ہی آ گیا تھا۔'' ہمارے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ''یہ تو بڑا باتونی طالب علم لگتا ہے''۔ ہم نے عرض کی کہ جناب شاعر نے غالباً عربی پڑھنے کے بارہ میں ہی کہہ رکھا ہے کہ ''یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا''۔ فرمایا ''خوب ہے خوب ہے یہ والا شعر ذرا مجھے لکھوا دینا''۔ آپ نے قلم نکال کر اپنے ''خطِ بشارت'' میں

پورے صفحہ پر پھیلا کر یہ شعر نوٹ کر لیا اور ہمیں اجازت دی اس کے بعد ہم چار سال تک ان کی کلاس میں حاضر رہے۔ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد کا معاملہ رہا۔ نہ وہ اپنی نوک جھونک سے رکے نہ ہم نے اپنی سنت جاریہ سے انحراف کیا۔ تا آنکہ چار سال کے بعد یہ ''ننگِ کلاس'' کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد ہمارے قصور معاف تو نہیں ہوئے البتہ ان کی سزا میں خاصی تخفیف کر دی گئی یعنی جب کالج کے سٹاف پر آ جانے کے بعد ملاقات ہوتی ازراہِ کرم مسکرا کر ملتے اور ایک آدھ فقرہ بھی چست کرتے۔ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تم سا کہیں جسے؟ وہ اپنے اس عقیدہ میں بڑے پختہ تھے کہ جنت کی زبان عربی ہو گی اس لئے ہمیں خشوع وخضوع کے ساتھ یہ زبان سیکھنی چاہئے ورنہ مرنے کے بعد دقت پیش آئے گی مگر ہمارے اس استفسار کا جواب ان کے پاس بھی نہیں تھا کہ جنت میں عربی بولی جائے گی اور آپ عربی پڑھاتے تو ہیں مگر بولنا سکھاتے نہیں آپ کی پڑھائی ہوئی عربی کس کام آئے گی؟ زچ ہو کر فرماتے تھے یونیورسٹی والوں نے عربی بولنے کو کورس میں شامل ہی نہیں کیا تو اساتذہ عربی بولنا کیوں سکھائیں؟ اور ہم اپنی کج بحثی کی رو میں ان سے کہتے تھے کہ اللہ میاں کو جنت کے نصاب میں عربی بولنے کو لازمی قرار دینے سے پیشتر یونیورسٹی والوں سے مشورہ کر لینا چاہئے تھا۔ اس پر اور زیادہ زچ ہوتے اور عربی کے مشکل الفاظ سے ہمیں ڈراتے تھے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ اپنی ''انذاری'' گفتگو میں ''مقامات حریری'' کے فقرے کے فقرے بول جاتے تھے اور سننے والوں کو خاطر خواہ عبرت حاصل ہوتی تھی۔ یہ بزرگ کالج کے سینئر اساتذہ میں سے تھے۔ اپنے مضمون میں تیرے ہوئے تھے۔ مدتوں بعد ان کے ایک ہم جماعت دوست نے جو پچاس کی دہائی میں لاہور میں ہندوستان کے قونصل جنرل تھے، ہمیں بتایا کہ آپ نے جوانی میں آئی سی ایس کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی مگر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دین کو دنیا پر مقدم کرتے ہوئے خدمت کے لئے اس کالج میں آ گئے تھے۔ عربی کے سوا

کوئی اور ''گناہِ کبیرہ'' ان سے منسوب نہیں تھا۔نہایت مخلص، بے ریا، محبت پرور اور متقی آدمی تھے إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ کی عملی تفسیر۔

کالج کی پڑھائی شروع ہو گئی۔ ہم پکے اور کھرے بلکہ (پیش کے ساتھ) کُھرے ''مستشرق'' تھے اردو عربی فارسی کے ساتھ منہ کا ذائقہ خراب کرنے کے لئے پہلے اکنامکس رکھی پھر انٹر کے امتحان سے چند مہینے پہلے تاریخ رکھ لی اور فیل ہو جانے کے امتحان سے بچ گئے ورنہ اکنامکس تو ہمیں لے ڈوبتی۔ان مضامین کا ایک ایک کیا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ''شوقِ آوارگی'' کی تسکین کے لئے وافر مواقع میسر تھے۔جی چاہا تو کلاس میں چلے گئے نہ چاہا تو نہ گئے البتہ عربی کی کلاس سے غیر حاضری کے لئے ''شرعی'' بہانے تراشنا پڑتے تھے اور یہ بہانے تراشنے کے لئے ہم نے ''باب الحیل'' کا بالاستیعاب مطالعہ کر رکھا تھا۔کالج کے دوسرے سینئر استاد فلسفہ کے استاد تھے جن کے باب میں لوگوں نے ہمیں بہت ڈرا رکھا تھا کہ طبیعت کے بہت سخت ہیں۔''ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم۔رزمِ ''ادب وشعر میں''فولاد ہے مومن''۔

اردو کے بڑے نغز گو شاعر ہیں۔ہم نے سوچا شاعر ہیں تو اپنے کلام کے چھپنے پر بہت زیادہ خوش ہوں گے۔ان کی ایک غزل ان سے ایک محفلِ خاص میں سنی اور اپنے ذہن میں محفوظ کر لی۔گھر آ کر وہ غزل کاغذ پر اتاری اور المنار کے اگلے شمارہ میں بڑے طمطراق سے شائع کر دی۔ پرچہ کا چھپ کر آنا تھا کہ گویا بھونچال آ گیا۔سنا کہ قبلہ اپنے تمام تیر وتفنگ سمیت ہمیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کدھر ہے وہ ناہنجار ایڈیٹر جس نے میرا کلام بلاغت نظام میری اجازت کے بغیر چھاپ دیا ہے؟ مٹا کے خاک نہ کر دوں تو ''داغ'' نام نہیں۔ پرنسپل صاحب سے اس دوران آمنا سامنا ہو گیا مسکرا کر فرمایا کیوں میاں سنا ہے آج کل روپوش ہو؟ ہم نے کہا ''جی سنا ہے بزرگ میری تلاش میں ہیں''فرمایا تلاش ہی تلاش؟ خیر

مناؤ۔ابھی ہم اسی مکالمہ میں ''مبتلا'' تھے کہ وہ بزرگ استاد آ گئے۔ہمیں پرنسپل صاحب سے محوِ گفتگو دیکھا تو ٹھنڈے پڑ گئے کیونکہ پرنسپل صاحب سے ان کا افسر ماتحت کا نہیں عشق و محبت کا رشتہ تھا۔ پرنسپل صاحب نے ہمیں ان کے سپرد کیا کہ لیجئے آپ کا مجرم حاضر ہے۔اب ان کی کیا مجال کہ ہمیں کچھ کہیں۔ان کی آنکھوں سے برسات کی جھڑی لگ گئی۔ہم حیران پریشان اور سراسیمہ۔کالج کا کاریڈور طلباء سے اٹا اٹ بھرا ہوا۔ہم خاموش کھڑے ہیں اور وہ بزرگ دھاروں رو رہے ہیں۔بارے ان کی طبیعت میں ذرا سا ٹھہراؤ پیدا ہوا تو فرمایا آپ نے بہت ظلم کیا بہت ظلم کیا اب خدا کے لئے آئندہ ایسا ظلم نہ کیجئے گا اور یہ کہہ کر پھر رونے لگے۔وہ واپس ہوئے تو ہم ان کے پیچھے پیچھے ان کے حجرہ تک ساتھ آئے۔فرمایا جائیے میری جان چھوڑ دیجئے۔تب ہمیں معلوم ہوا کہ یہ شاعر بے بدل اپنا کلام سنانے یا چھپوانے کا قائل نہیں۔وہ جو کہتے ہیں ''اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں'' درست ہوگا مگر ان دو چار ملاقاتوں نے کم از کم دو سال کا وقت لیا۔دو سال کے بعد کالج کے ایک مشاعرہ میں ہماری ایک غزل سن کر پسیجے اور ہمیں ازراہِ کرم اپنے احباب کے زمرۂ خاصان میں شمار فرمایا۔پھر تو یہ حال ہوا کہ کلام چھپوانے کی بجائے ہمیں سنا کر پخت ہو جاتے تھے کہ چلو یہ چیز تو محفوظ ہو گئی۔سنا ہے ابھی پچھلے دنوں (اور یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں) کسی مشاعرہ میں فرمایا ہمیں شعر یاد نہیں رہتے اس فقیر کا نام لے کر فرمایا کہ وہ ہوتا تو یاد کرواتا کہ اس غزل کا فلاں شعر کیا ہے۔اب تو ہمارا اپنا یہ حال ہے کہ شعر تو دور کی بات ہے مصرعے تک یاد نہیں رہتے۔بقول شخصے ہمارا حافظہ اب دروغ گو والا ہو کر رہ گیا ہے۔''دروغ گو را حافظہ نہ باشد''۔

سائنس ہم نے پڑھی نہیں مگر گاڑھی چھنی تو سائنس کے اساتذہ کے ساتھ۔نصیر خان صاحب۔علی گڑھ کے بانکے سجیلے گریجویٹ، باسکٹ بال کے کھلاڑی اور کوچ۔یونین کے انچارج تھے اس لئے

ہمیں ان کے سایۂ عاطفت میں آنا پڑا۔ یونین کے مباحثوں میں حصہ لینے کا شوق چرایا۔ کچھ ٹول ٹال سکول کے زمانہ سے کر لیتے تھے کچھ زمانۂ بیکاری میں اپنے نوجوانوں کی تنظیم میں تقریریں کر چکے تھے اس لئے خیال ہوا کہ یونین میں تقریر کرنا کون سا مشکل کام ہے؟ مباحثہ کا اعلان ہوا تو ہم نے بھی نام لکھوا دیا۔ مددگار کارکن نے آ کر کہا نصیر خان صاحب یاد کر رہے ہیں؟ ڈرتے ڈرتے یونین کے دفتر میں گئے۔ ایک نہایت سرخ وسفید و وجیہہ صاحب تشریف فرما تھے چھوٹے ہی کہنے لگے ''آپ کے بارے میں بڑی بری بری باتیں سنی ہیں کیا وہ سب ٹھیک ہیں؟''۔ ہم نے کہا ''جی اگر بری بری باتیں سنی ہیں تو یقیناً ٹھیک ہوں گی کیونکہ کوئی اچھی بات تو ہمارے ساتھ منسوب نہیں ہو سکتی''۔ (زیر اور پیش) دونوں کے ساتھ کھل گئے فرمایا ''آپ کے غزل چھاپ دینے کا معرکہ مجھ تک پہنچ چکا ہے۔ اب کہئے مباحثوں میں آپ کیا کیجئے گا؟''۔ ہم نے کہا ''بحث کریں گے اور کیا کریں گے؟''۔ کہنے لگے ''اپنی تقریر لکھ کر مجھے دکھا دیجئے'' اب تقریر تو کرنے کی چیز ہوتی ہے لکھ کر پڑھی ہوتی ہے تو کیا پڑھی مگر اس سے مفر نہ تھا تقریر لکھی۔ پھر اس کو ''رٹا'' لگایا پھر سٹیج پر آئے۔ اور شومئ قسمت کہ عین منجدھار میں بھول گئے۔ بڑی تھری تھری ہوئی۔ مخالفین نے خوب لتے لئے۔ مگر نصیر صاحب خوش ہو گئے کہنے لگے جو مقرر بھولتا ہے اس میں اچھا مقرر ہونے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ ہمیں رٹا لگانے پر اعتراض تھا مگر بعد کو یہ پڑھا کہ چرچل بھی ہر تقریر پہلے لکھتا تھا پھر اسے رٹا لگاتا تھا۔ اس کی جتنی معرکۃ الآراء تقریریں ہیں اور اس نے بہ ظاہر فی البدیہہ کی ہیں ساری کی ساری لکھی ہوئی اور باقاعدہ آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر مشق کی ہوئی تقریریں ہیں۔ پہلے ہی مباحثہ میں ایک ایسے صاحب ہمارے حزبِ مخالف میں تھے جو تقریر کم کرتے اور ہاتھ زیادہ چلاتے تھے۔ ہم نے ان کی تقریر کے رد میں ان کی تقریر کو معرکۃ الآراء تقریر کی بجائے معرکۃ الاعضاء تقریر کہا تو نصیر صاحب نے بہ آوازِ بلند داد دی اور یونین کا انچارج

داد دے تو دوسروں کی کیا مجال ہے کہ داد نہ دیں چنانچہ وہ مباحثہ ہم نے ''لوٹ'' لیا۔ پھر ہمیں باہر کے کالجوں میں مباحثوں میں جانے کی اجازت ملنے لگی اور اس طرح ہمارا باہر کی دنیا کے دانش وروں سے تعارف ہوا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بخدا ہم ایک بے بہا دولت سے محروم رہ جاتے۔

سائنس کے آدمی تھے مگر سائنس والوں کی خشکی اور یبوست ان میں نہیں تھی ایسی یبوست کے لئے اور بہت تھے۔ سائنس والوں میں سے پروفیسر حبیب اللہ خان، علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے عثمانیہ یونیورسٹی میں کچھ عرصہ اردو میں کیمسٹری پڑھا بھی چکے تھے یہاں کا لیکچر یہاں بھی اردو میں ہونا چاہئے تھا مگر پنجاب یونیورسٹی کا دستور نرالا تھا ذریعۂ تعلیم اردو کی بجائے انگریزی تھا مگر حبیب اللہ خان صاحب ذرا جو اس باب میں پیٹے ثابت ہوئے ہوں کلاس میں کیمسٹری انگریزی میں پڑھاتے اور سائنسی مضامین پر کتابیں اردو میں لکھتے اور حکومت سے انعامات حاصل کرتے تھے غالباً کالج کے پہلے استاد تھے جنہیں ''خلا کی تسخیر'' اور ''سمندر کے عجائبات'' نامی کتاب لکھنے پر انعام ملا۔ ہمارے کالج میں ایک سے ایک نابغہ استاد بھرا ہوا تھا مگر کالج ربوہ میں منتقل ہوا تو بیالوجی میں سرے سے کوئی استاد تھا ہی نہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ طلباء میں سے ذہین فطین طالب علم خود تیاری کرتے اور اپنے ساتھیوں کو بیالوجی پڑھاتے تھے۔ عزیزم ڈاکٹر حمید احمد خان اللہ بخشے اتنا تیز طرار بچہ تھا کہ اپنی کلاس کو پڑھاتا بھی تھا اور اپنی پوزیشن بھی برقرار رکھتا تھا۔ پھر ان کے بعد بعض بی ایس سی پاس اساتذہ بیالوجی پڑھانے لگے۔ کیمسٹری کے استاد برادرم رفیق احمد ثاقب نے خاص طور سے بیالوجی پڑھ پڑھ کر لڑکوں کو بیالوجی پڑھائی تا آنکہ اپنے وقت کے نستعلیق اور وضع دار استاد ڈاکٹر چوہدری نصیر احمد بشیر پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے اور ربوہ کالج میں پڑھانے کے لئے آ گئے اس طرح بیالوجی ڈیپارٹمنٹ کی کمی پوری ہوئی۔

پروفیسر نصیر احمد بشیر کی وضع داری کی بات آئی تو یہ بتا دوں کہ وہ ربوہ کے آخری شمال مغربی کونے پر بنی

ہوئی ایک ڈھنڈار کوٹھی میں اکیلے رہتے تھے۔صبح صبح اپنا اکیڈیمک گاؤن زیب تن فرماتے، ننھے منے روسی ٹیریئر کتے کی زنجیر پکڑتے اور خراماں خراماں کالج کی جانب رواں دواں ہو جاتے۔گاؤن سے نئے نویلے سوٹ کی حفاظت ہو جاتی اور اس کتے کی خاطر خواہ مشی کا انتظام بھی ہو جاتا۔کالج پہنچتے تو بعض اوقات کتا بھی ہز ماسٹرز وائس کے کتے کی طرح کلاس میں یا لیبارٹری میں ان کے لیکچر کے لئے گوش برآواز رہتا۔نصیر احمد بشیر صاحب جلد ہی پی ایچ ڈی کے لئے امریکہ چلے گئے ان کے بعد سید حبیب الرحمن آئے پھر زوآلوجی میں ایک اور نابغۂ روزگار استاد محمد شریف خان صاحب آ گئے اور یہ حیاتیات کے شعبہ کی ''کمیٔ خون'' کا تدارک ہوا۔کالج میں انگریزی کے مضمون کی تدریس کے لئے اساتذہ کی ایسی کمی تھی کہ ایک استاد جو بہ ظاہر سیاسیات کے پرائیویٹ ایم اے تھے سٹاف پر لائے گئے وہ ایف اے کے طلباء کو انگریزی پڑھاتے تھے۔خود کسی کالج میں نہیں پڑھے تھے اس لئے ان کا تلفظ مشہورِ خلائق تھا۔Charlotte Bronte کا نام ''چارلوٹے برونٹے'' کر کے لیتے تھے۔ہم مزے لینے کے لئے جان بوجھ کر ان سے یہ نام بار بار پوچھا کرتے تھے۔پھر ایک سے ایک نابغہ انگریزی کے شعبہ میں آ گیا۔مرزا خورشید احمد تو انگریزی کے آدمی تھے کنور ادریس صاحب پولیٹیکل سائنس میں ایم اے ہونے کے باوجود ان سے بھی زیادہ انگریزی کے آدمی ثابت ہوئے۔ایسی نستعلیق زبان بولتے اور ایسی خوبی اور خوبصورتی سے بولتے کہ ہم لوگ کتاب دیکھنے کی بجائے ان کا روئے مبارک دیکھتے رہتے۔گویا ''ہم ہیں اہل کتاب چہروں کے''۔کہنے کو تو ہم نے ان سے انگریزی پڑھی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انگریزی ہی ہم نے ان سے نہیں پڑھی۔بس مکتبِ غم دل میں سبق لینے کا مضمون رہا۔وہ جلدی ہی سی ایس پی کو پیارے ہو گئے۔ان دنوں اپنی منگیتر ڈاکٹر کے عشق میں ''کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا ہے'' کی تصویر تھے اور سوز و گداز ان کی باتوں کا جوہر تھا۔جو بات کہتے سیدھی دل میں ترازو ہو جاتی

تھی۔ دیکھنے میں جو خط لکھا لگتا تھا۔ ہم کو وہ تیر بھی آ لگتا تھا۔ ان کے کالج سے چلے جانے کے بعد ہم دو چار دوست کافی عرصہ تک کلاس میں نہیں جا سکے یہی سوچتے رہے ’’تھی وہ اک شخص کے تصور سے۔ اب وہ رعنائیِ خیال کہاں؟‘‘

ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہد اپنی کیمسٹری کی تدریسی کتابوں کی وجہ سے مشہورِ خلائق تھے ان کا لیکچر تو ہم نے نہیں سنا البتہ ان سے یونین کے سلسلہ میں تعلق رہا کیا مرنجاں مرنج استاد ہیں اللہ ان کی عمر میں برکت دے لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر کے آئے تو ہم نے کہا ایک روایت یہ رہی ہے کہ جو لوگ باہر پی ایچ ڈی کرنے جاتے ہیں وہ یا ولایتی میم ساتھ لاتے ہیں یا گاڑی۔ آپ خالی ہاتھ کاغذ کا ایک پرزہ لے کر چلے آئے ہیں۔ فرمانے لگے یہ کاغذ کا پرزہ بھی تو اتنی آسانی سے نہیں ملتا۔ ان کے اس کہنے کی صداقت اس وقت آشکارا ہوئی جب خود اس مرحلہ سے گذرے یا بعد میں ڈاکٹر شریف خان صاحب گذرے۔ پروفیسر شریف خان صاحب جوانی ہی میں بین الاقوامی سائنسی ریسرچ جرنلز میں چھپنے لگے تھے۔ نہایت محنتی آدمی ہیں اور ہر وقت اپنے سانپوں کچھوؤں مینڈکوں میں گھرے اور چھپکلیوں سے اٹکھیلیاں کرتے رہتے ہیں۔ امریکہ کے ’’رینگنے والے جانوروں کے حلقۂ احباب‘‘ میں بہت نامور ہیں۔ ان کے سینکڑوں ریسرچ پیپرز ان ریسرچ جرنلز میں چھپ چکے ہیں۔ جب ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ یونیورسٹی میں پیش ہوا تو ان کے ممتحن وہ لوگ تھے جو ان کے ریسرچ پیپرز کا حوالہ دیتے نہ تھکتے تھے مگر جب انہیں ڈگری دینے کا وقت آیا تو انہیں چپ لگ گئی اور کچھوے کی طرح دم سادھ لیا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ چھ سات برس ان کی ڈگری جاری نہ کی گئی۔ ان کا بیٹا عزیزی محمد ظفر اللہ ان سے پہلے پی ایچ ڈی ہو گیا باپ کی ڈگری بیٹے کے ڈاکٹر بن جانے کے بعد جاری ہوئی۔ الحمد للہ کہ یونیورسٹی والوں کو خیال آ گیا ورنہ ان کے پوتے کے پی ایچ ڈی ہو جانے پر جاری کرتے تو ان کا کیا

بگاڑا جا سکتا تھا۔عزیزی ظفر اللہ سے ہم نے اس کا امریکہ کا پتہ پوچھا تو کہنے لگا پتہ یہ ہے میرا نام ’’زی‘‘ سے ظفر اللہ لکھئے گا۔ہم نے کہا بیٹے ہم وضع دار لوگ ہیں۔تمہارا نام ’’ظ‘‘ سے لکھتے آئے ہیں اسی سے لکھیں گے زی سے تو ہم لکھنے سے رہے زیادہ سے زیادہ اتنی رعایت کر دیں گے کہ زیڈ سے لکھ دیں اس سے زیادہ کی ہم سے توقع نہ رکھو۔

ہمارے دوست نصیر احمد خان نے روایت زمانہ برقرار رکھی ڈرہم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری اور اٹلی سے ایک نئی فوکس ویگن ساتھ لائے ورنہ ہمارے مرزا ’’گیسو دراز‘‘ صاحب کی طرح انہیں بھی سسرالی گاڑی پر اکتفا کرنا پڑتا۔اب کالج کے سٹاف پر کم از کم تین پی ایچ ڈی اساتذہ ہو گئے اور یہ ’’مفصلات‘‘ کے یعنی آس پاس کے چھوٹے شہروں کے کسی کالج کے لئے بڑا اعزاز تھا۔

کالج کے بزرگ اساتذہ کا بڑا علمی دبدبہ تھا۔ پروفیسر اخوند عبدالقادر انگریزی کے نامی اساتذہ میں سے تھے۔ پروفیسر میاں عطاء الرحمن کی علمی وجاہت کے آگے بڑے بڑے طبعیات دانوں کا زہرہ آب ہوتا تھا۔ پروفیسر بشارت الرحمن کی عربی دانی اور پروفیسر چوہدری محمد علی کی فلسفہ دانی کے آگے کوئی دم نہیں مارتا تھا۔کالج کے دو اساتذہ حسن ظہیر اور کنور ادریس سے رضا علی سی ایس پی میں چنے گئے اور بڑی نیک نامی پائی۔طلباء میں سے اکثر سپیریئر سروس میں آئے فنانس، اکاؤنٹس، ٹیکسیشن، ریلوے، پولیس سروس اور فارن سروس میں تو ہمارے شاگرد بھی پہنچے اور سفیر کے مرتبہ تک ترقی پائی۔کالج کے طلباء میں سے کئی عدلیہ میں سیشن جج کے مرتبہ تک پہنچے اور ہمارا ایک کلاس فیلو یار محمد اسلام بھٹی تو ہائی کورٹ کا جج ہو کر ریٹائر ہوا۔ ہمارے ملک میں امتیاز و تفریق کا دور دورہ نہ ہوتا تو کئی ایسے تھے جو ہائی کورٹ کیا سپریم کورٹ تک پہنچتے۔ابھی پچھلے دنوں کالج کے زمانے کے ایک پرانے دوست بیرسٹر مبشر لطیف یہاں کینیڈا آئے ہوئے تھے اس وقت لاہور ہائی کورٹ میں ان کے شاگردوں کی معتدبہ تعداد

جج کے مناصب پر سرفراز ہے۔غرض اس کالج کا دائرۂ فیضان قومی اور بین الاقوامی حلقوں تک ممتد ہے۔پولیس میں تو ہمارا ایک شاگرد طاہر عارف ماشاء اللہ آئی جی کے مرتبہ تک پہنچا ہوا ہے۔الحمدللہ۔ اور فوج میں ہمارے شاگرد بریگیڈیئر کے رینک میں ہیں۔اللھم زد فزد۔

کالج کا وہ مرتبہ تھا کہ بڑے بڑے عالم اساتذہ، افسر، جج، ادیب اور شاعر اس کالج کی دعوت پر کھچے چلے آتے تھے اور یہاں آنا اپنے لئے باعثِ افتخار گردانتے تھے۔اس کالج کی یہ روایت رہی کہ کانووکیشن کے لئے ہمیشہ علمی اورادبی شخصیتوں کو مدعو کرتا تھا۔پہلی کانووکیشن جو ربوہ میں ہوئی اس میں میاں افضل حسین وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی تشریف لائے۔ان کے ہاتھ میں انگریزی میں لکھا ہوا خطبہ تھا جب پرنسپل صاحب نے کالج کی روایت کے مطابق اردو میں خطبۂ استقبالیہ پڑھا تو میاں صاحب نے انگریزی میں چھپا ہوا خطبہ سامنے رکھ لیا مگر خطاب اردو میں فرمایا۔ سننے والوں کو ذرا احساس نہیں ہوا کہ وائس چانسلر کا خطبہ انگریزی میں تھا۔جب بعد کو وہ خطبہ لوگوں میں انگریزی میں تقسیم ہوا تو لوگ حیرت سے کہنے لگے کہ اتنی جلدی اس خطبہ کا انگریزی میں ترجمہ کیسے ہوگیا ہے یہ میاں افضل حسین کی وضع داری تھی۔آخر میاں افضل حسین پنجاب کے ایک نامور علمی سیاسی اور شریف خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔میاں افضل حسین ایک بار پھر فزکس کی پوسٹ گریجویٹ لیبارٹریز کے افتتاح کے لئے بھی تشریف لائے اور کالج کی قدم بہ قدم ترقی کو اپنی آنکھوں ملاحظہ فرمایا اور خوشنودی کا اظہار کیا۔لاہور ہائی کورٹ کے دو چیف جسٹس کالج میں آئے جسٹس کیانی اور جسٹس منظور قادر۔ججوں میں سے جسٹس شیخ بشیر احمد، جسٹس سجاد احمد جان اور جسٹس انوار الحق تشریف لائے۔وائس چانسلر تو اکثر و بیشتر آتے رہے۔میاں افضل حسین کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خان، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر زیڈ اے ہاشمی۔حکام میں سے وزراء سفر تو آتے ہی رہے ضلعی اور ڈویژن کی سطح کے حکام

جوآج کل ربوہ سے کنی کتراتے ہیں ایک ادنیٰ سے اشارے پر کالج میں آنے کو تیار رہتے تھے اوراس بات کو اپنے لئے فخر گردانتے تھے کہ ہم نے تعلیم الاسلام کالج میں طلباء کے ساتھ کچھ وقت گذارا ہے۔ یہ اسّی کی دہائی کی بات ہے کہ ایک اسٹنٹ کمشنر سے ہم نے کہا کہ ہمارے ہاں آؤ۔ کہنے لگا آؤں تو سر کے بل مگر لوگ الٹالٹکا دیں گے۔(ہم نے دل میں سوچا سر کے بل آنے والے کولوگ الٹالٹکائیں گے تو ''سیدھا'' ہو جائے گا)۔ میں نے کہا تمہارا جو کمشنر ہے وہ غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما چکا ہے اس کا سر تو سلامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذرا ذرا سے حکام ربوہ آنے سے جھجکنے لگے تھے تو اس کا صرف یہ مطلب تھا کہ اب ربوہ اور باہر کی دنیا کے درمیان جو پل کالج کی صورت میں بنا تھا وہ منہدم ہو گیا تھا اور کالج کو قومیانے کا بھی لازمی نتیجہ ہونا تھا۔ باہر کی دنیا میں کالج اور سکول قومیانے گئے تو علم اور طلباء کے مابین مفاہمت کا جو پل تھا وہ ٹوٹ گیا۔ ایک شخص کی انا پرستی نے ساری قوم کو کس طرح افراتفری کی دلدل میں دھکیل دیا بعض اوقات ایک عاقبت نا اندیش حاکم کا ایک فیصلہ کس طرح قوموں کو صدیوں پیچھے لے جاتا ہے۔

تعلیم کے میدان میں بھی ہمارے ادارہ کا امتیاز قائم رہا۔جس سال کالج ربوہ آیا ہے اسی سال منور سعید نے ایف اے کے امتحان میں اول پوزیشن حاصل کی تھی دوسال بعد حمید احمد خان نے پھر یہ کام کر دکھایا حالانکہ اسے بیالوجی پڑھانے کو کوئی استاد بھی میسر نہیں تھا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی اور میڈیکل کالج میں ہمارے طلباء کی تعداد ہمیشہ ہی معتدبہ رہی۔ ہم نے کالج کی تمام علمی اور عملی روایات کو اجاگر ہوتے دیکھا ہے۔ آخر اس کالج کا مانو بھی تو ''علم وعمل'' ہی تھا۔ اب پتہ نہیں کیا ہوگا؟ علم وعمل تو رہا نہیں۔ ہم کالج کے قومیائے جانے کے بعد 1975 میں اسی کالج سے جاپان کی اوساکا یونیورسٹی میں ڈیپوٹیشن پر گئے تھے واپس تو ان لوگوں نے آنے نہیں دیا اور ہمارے ''وزیرِ شاگرد'' کی ''سرتوڑ'' کوششوں کے

باوجود نہیں آنے دیا۔ (سرتوڑیوں کہ جس وزیرِ شاگرد نے ہمارے بارے میں حکم جاری فرمایا تھا کہ انہیں ربوہ کالج میں تعینات کر دیا جائے اسے اوپر سے جھاڑ پڑی۔ مجھ سے کہنے لگے ''سراب آپ اپنی بات پر اصرار نہ کیجئے گا مجھے تو ایسی جھاڑ پڑی ہے کہ ''سرٹوٹ'' گیا ہے) مگر بات کہہ دینے میں کیا حرج ہے۔ پروفیسر نصیر خان صاحب کہنے لگے کہ ہمیں اس زمانے کے کالج کے پرنسپل صاحب سے ازرہِ خلق ملاقات ضرور کرنی چاہئے۔ ہم گئے۔ دیکھا کہ پرنسپل کی کرسی پر (یعنی اس کرسی پر جس پر حضرت مرزا ناصر احمد، قاضی محمد اسلم، چوہدری محمد علی) جیسے پرنسپل بیٹھ چکے تھے ایک صاحب تشریف فرما ہیں یوں کہ ٹانگیں میز پر رکھی ہیں اور اخبار پڑھ رہے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر فرمایا اچھا تو آپ ہیں پروازی صاحب؟ ہم نے اپنے جرم کا اعتراف کیا تو فرمانے لگے مگر آپ کی تو اس کالج میں کوئی جگہ نہیں۔ ہم نے کہا ہم اسی کالج سے گئے تھے اس لئے اصولاً اسی کالج کے پرنسپل سے سلام روستائی کے لئے آئے ہیں۔ کہنے لگے ''وہ کیا ہوتا ہے؟'' ہم نے کہا ''بس ہوتا ہے''۔ قبلہ پرنسپل صاحب نے یہ تک نہیں فرمایا کہ بیٹھ جایئے۔ ہم اس کرسی کی اتنی رسوائی نہ دیکھ پائے اور سلام کر کے باہر آ گئے باقی جو کچھ آپ نے کہا سنا وہ بے معنی باتیں تھیں اس لئے ہم نے لکھنا بھی مناسب نہیں سمجھیں۔ کچھ دنوں کے بعد ہم سرگودھا بورڈ کے سیکرٹری سے ملنے کے لئے گئے۔ چٹ اندر بھجوائی تو سیکرٹری صاحب لپک کر خود دروازہ تک ہمارے استقبال کو آئے بڑی محبت سے اپنے بچھڑے ہوئے دوست کو اندر لے کر گئے۔ ہم اندر داخل ہوئے تو وہی پرنسپل صاحب بیٹھے تھے بہت حیران ہوئے کہ میں نے تو اس شخص کو بیٹھنے تک کو نہیں کہا تھا یہ سیکرٹری صاحب اس شخص سے اتنی ملاطفت سے کیوں پیش آ رہے ہیں؟ سیکرٹری صاحب نے جب اپنے مددگار کارکن کو ہمارے لئے اہتمام اور سلیقہ سے چائے لانے کو کہا تو نہ رہ سکے سیکرٹری صاحب سے کہہ ہی بیٹھے کہ جناب میں کب سے یہاں بیٹھا ہوں آپ نے مجھے تو پانی تک نہ پوچھا ان کے لئے چائے اور

بڑی مفصل چائے لانے کا آرڈر آپ نے دیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ سیکرٹری صاحب ہمارے پرانے دوست تھے انہیں تو آگ لگ گئی کہنے لگے پرنسپل صاحب آپ بورڈ کی میٹنگ کے لئے بورڈ والوں کے مہمان ہیں ڈاکٹر صاحب میرے پرانے اور ذاتی دوست ہیں ہم لوگ ربوہ بھی جائیں تو کبھی کالج والوں کو تکلیف نہیں دیتے ان کے گھر چلے جاتے ہیں جہاں ہمیں وقت بے وقت کھانا بھی میسر آ جاتا ہے اور چائے بھی مل جاتی ہے۔اب وہ چار سال کے بعد میرے پاس مجھے ملنے کو آئے ہیں تو میں ان کی اتنی بھی خاطر داری نہ کروں؟

پرنسپل صاحب نے نہایت چھچھوری بات کی تھی سیکرٹری صاحب نے منغض ہونے کے باوجود ان کی بات ٹال دی مگر پرنسپل صاحب کا اندرونی بغض کہاں چھپتا۔ ذرا سی دیر کے بعد ہم سے مخاطب ہوئے اور کہا ''ڈاکٹر صاحب مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ربوہ میں میرے خلاف باتیں کرتے پھرتے ہیں''۔ہم نے کہا ''جناب والا میرا کیا مرتبہ ہے کہ میں آپ کے خلاف باتیں کروں؟ میں آپ کا ماتحت نہیں، آپ کا رفیقِ کار نہیں، حتیٰ کہ آپ کو جانتا تک نہیں۔ایک بار کالج کے دفتر میں آپ سے ملنے کو گیا تھا تو آپ نے بیٹھنے تک کو نہیں کہا تھا اس لئے میں آپ کے خلاف کیا باتیں کروں گا؟''۔فرمایا ''مجھے معتبر لوگوں نے بتایا کہ آپ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ میں نے کالج کا ستیاناس کر دیا ہے''۔ہم نے پولے سے منہ سے جواب دیا ''مگر حضور والا یہ بات آپ کے خلاف کیسے ہوئی؟''۔کمرہ میں جتنے لوگ موجود تھے وہ سب ہنسنے لگے اور پرنسپل صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔تو جناب اگر اداروں کو ایسے ہی نااہل لوگوں کے سپرد کر دیا جائے تو یہی ہوتا ہے۔محکمہ تعلیم نے چن چن کر ایسے پرنسپل اس کالج میں بھیجے کہ اس کالج کی روایات کو ملیا میٹ کر دیں کہ الامان والحفیظ۔درمیان میں کچھ عرصہ کے لئے ہمارا مظفر گڑھ کے زمانہ کا رفیقِ کار اور دوست ایم اے مسعود چوہدری ایم اے کالج کا پرنسپل بن کر آیا تو کالج

والوں کو کچھ امان ملی۔ تھوڑے عرصہ کے لئے ڈاکٹر مظفر عباس بھی آئے۔ اب سنا ہے ہمارے شاگردوں کی نسل کا ایک طالب علم عزیزم مقبول احمد پرنسپل کی کرسی پر سرفراز ہے چنیوٹ کا شریف بچہ ہے اور تعلیم الاسلام کالج کے زینہ سے اوپر گیا ہے مگر اس کے لئے جائے ماندن نہ پائے رفتن کا معاملہ ہے، کس کو خوش رکھے۔ مولویوں کو؟ مگر یہ قوم تو خوش ہونے سے رہی۔ ایک بار ہم کسی کام سے چنیوٹ کے اسسٹنٹ کمشنر سے ملنے کو گئے۔ غالباً جاوید محمود ان کا نام تھا۔ ہم گئے تو اس وقت وہ عدالت کی کرسی پر متمکن تھے ان کی عدالت میں کم وبیش دس بارہ وکلا پیش تھے ہم داخل ہوئے تو سب کے سب ہماری جانب بڑی محبت سے متوجہ ہو گئے، اسسٹنٹ کمشنر صاحب عدالت برخواست کر کے اپنے چیمبر میں چلے گئے اور ہمیں باریابی کا شرف بخشا۔ کہنے لگے ''یہ چنیوٹ تو آپ کا مخالف شہر ہے مگر یہاں کے وکلا آپ کے بڑے مداح لگتے ہیں؟ ہم نے انہیں بتایا کہ جتنے وکلا تھے وہ اتفاق سے سب کے سب ہمارے شاگرد تھے اس لئے انہوں نے استاد کی جانب محبت آمیز التفات دکھایا تو اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے؟ کہنے لگے ''آپ کے شاگرد ہیں یعنی ربوہ کالج میں پڑھے ہوئے ہیں؟'' ہم نے انہیں بتایا کہ چنیوٹ شہر کے شرفا اپنے بچوں کو ربوہ کالج میں پڑھنے کے لئے بھیجتے تھے اب بھی بھیجتے ہیں اگرچہ اب وہ ''مولوی مدن کی سی بات نہیں''۔ چنیوٹ میں جو بھی پڑھا لکھا آدمی نظر آئے گا وہ ربوہ کالج کا پڑھا ہوا ہوگا ہمارا کالج شرفا کا کالج تھا اور چنیوٹ شہر میں صرف مولوی ہی نہیں رہتے شریف لوگ بھی رہتے ہیں۔

محکمہ تعلیم کی علی الاعلان پالیسی یہ رہی کہ اس کالج میں کسی احمدی کو نہیں لگایا جائے گا۔ جو ریٹائر ہو جائیں گے ان کی جگہ غیروں سے پر کی جائے گی جو باہر جائے گا خواہ وہ پی ایچ ڈی کے لئے گیا ہو یا پڑھانے کے لئے، واپسی پر اسے اس کالج میں تعینات نہیں کیا جائے گا۔ مرزا انس احمد جب ایم فل کر

کے آکسفورڈ سے واپس آئے تو اس کالج میں نہیں آئے۔انہیں حضرت صاحب نے جامعہ میں لگا دیا۔ جب ایسا تعصب پالیسی کا حصہ بن جائے تو اداروں کو بگڑتے کیا دیر لگتی ہے؟ پھر ایسے متعصب اساتذہ خاص طور سے دور دور سے تبادلہ کر کے اس کالج میں لائے جائیں جو اس کالج کی روایات کو مٹانے کے درپے ہوں۔طلباء کی دل آزاری کریں، روایتوں کا مضحکہ اڑائیں۔آفرین ہے اپنے بچوں پر بھی کہ یہ سب کچھ انگیز کر لیا مگر کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں دیا کہ تعلیم الاسلام کالج میں ہڑتال ہوئی ہے۔ یہ اس کالج کی روایت تھی کہ سارے کالج ہڑتالیوں نے بند کروا دئے ہوتے تھے مگر تعلیم الاسلام کالج میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری ہوتا تھا۔ایک بار میاں عطاء الرحمن صاحب کی قائم مقامی کے زمانہ کی بات ہے افواہ اڑی کہ چنیوٹ کالج میں ہڑتال ہوگئی ہے اور وہ لوگ ربوہ کی جانب بسوں میں بڑھ رہے ہیں کہ اس کالج کو بھی بند کروا دیں۔ ہمارا پیریڈ ہمیشہ سے پہلا پیریڈ ہوتا تھا اور کلاس کیا ہوتی تھی ایک انبوہِ کثیر ہوتا تھا کیونکہ لازمی اردو پڑھانے والا ہمارے علاوہ اور کوئی استاد تھا ہی نہیں۔میاں عطاء الرحمن صاحب نے اس خدشہ کا اظہار فرمایا کہ ایسا نہ ہو چنیوٹ والے فسادی آ پہنچیں اور کوئی ناگوار صورت پیدا ہو جائے آپ اپنا لیکچر ذرا لمبا کر دیں۔ہم نے اپنا پہلا پیریڈ ذرا لمبا کر دیا اتنے میں سیکنڈ ایئر والے اپنی کلاسوں سے فارغ ہو کر اپنے پیریڈ کے لئے آ پہنچے ہم نے انہیں بھی اندر بلا لیا اور ہال کھچا کھچ بھر گیا ہم نے شاعری کے کسی ’’لذیذ‘‘ موضوع پر لیکچر دینا شروع کر دیا اس روز کچھ زیادہ ہی زورِ بیان اللہ میاں نے دے دیا بچوں کو پتہ تک نہیں چلا کہ ایک نہیں تین پیریڈ گذر گئے ہیں اور ابھی ہمارا موضوعِ سخن تشنہ ہے اور بچے یہی چاہتے ہیں کہ ہم اس موضوع پر بولتے چلے جائیں جب شادی نے آ کر ہمیں جھڑکا کہ ’’بس کرو جی باقی استاد سٹاف روم میں بیٹھے آپ کو کوس رہے ہیں‘‘ تو ہم نے کلاس چھوڑی۔ بات رفت گذشت ہوئی نہ بچوں کو پتہ چلا کہ ہماری اس ’’طول کلامی‘‘ کی لم کیا تھی نہ ہڑتالیوں

کو کالج میں آ کر ہمارے بچوں کو گمراہ کرنے کا موقع ملا۔ یہ ہمارے کالج کی روایتیں تھیں۔ ایک استاد میں اتنا حوصلہ ہوتا تھا کہ وہ پانچ سولڑکوں کو اپنے لیکچر میں روکے رکھے وہ روکتا تھا بچے رکتے تھے اور اب کسی ایک طالب علم کو روک کر تو دیکھئے؟

بات ہم نے کالج میں پہلے دن سے شروع کی تھی مگر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ کالج میں کچھ دن تو فولنگ کی ہما ہمی رہی اس کے بعد زندگی ایک ڈگر پر چلنے لگی یعنی کلاسیں، مباحثے، مشاعرے، تقریبات۔ پہلی کانووکیشن کا ذکر تو ہو چکا، یونین کے پہلے مباحثوں کا ذکر بھی ضروری ہے کیونکہ ان کے انعقاد کے لئے کالج میں ہال تو تھا کوئی نہیں اس لئے لجنہ سے ہال مستعار لیا گیا تھا۔ انٹر کالجیٹ مباحثوں کا نام تو بہت سنا تھا دیکھے یا سنے نہ تھے ربوہ والوں کے لئے ویسے بھی یہ نام عجوبہ تھا خیر مباحثے ہوئے ہال کھچا کھچ بھرا رہا مگر اصل رونق تو شام کے ڈنر کی تھی۔ پروفیسر نصیر خان صاحب نے کالج کی چھت پر ایسا الف لیلوی انتظام کر رکھا تھا کہ بایدوشاید۔ روشنی کے لئے یوں تو ان کا رخ زیبا ہی کافی ہوتا مگر فرش پر دسترخوان بچھائے گئے اور قطار در قطار چراغ رکھے گئے۔ یوں بھی منڈیروں پر چراغاں کا سماں تھا۔ ہمیں یاد ہے باہر کے کالجوں کے جو مقرر اس میں شریک ہوئے وہ مدتوں اس الف لیلوی ڈنر کو یاد کرتے رہے۔ پھر پرنسپل صاحب یہ مہربانی فرماتے تھے کہ صبح کا ناشتہ مہمان مقررین کے ساتھ کرتے تھے اور ناشتہ بھی مالیر کوٹلہ کا نوابی ناشتہ ہوتا تھا۔ مالیر کوٹلہ کے نوابی ناشتہ سے یاد آیا کہ 1966 میں پروفیسر حمید احمد خان وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی جوہر آباد سے واپسی پر ربوہ رکے اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالث سے ملاقات کا شرف حاصل کیا حضرت صاحب نے ازراہِ بندہ پروری مجھے اور چوہدری محمد علی صاحب کو بھی ان کے ساتھ دوپہر کے کھانے پر مدعو کر لیا۔ وہاں مالیر کوٹلہ والوں کے خاص شاہی ٹکڑے میٹھے کے طور پر موجود تھے۔ ہم لوگ ہونٹ چاٹتے رہ گئے۔ حمید احمد خان صاحب حضرت صاحب کے بے

تکلف دوست تھے کہنے لگے ''مرزا صاحب سنا تھا مغلوں کے دسترخوان پر جنت کی نعمتیں موجود ہوتی تھیں آج دیکھ بھی لیا''۔ حضرت صاحب نے فرمایا لیکن یہ شاہی ٹکڑے میری بیوی نے مالیر کوٹلہ کے نسخہ سے تیار کروائے ہیں۔ ہاں یہ گاجر کا جو مربہ آپ نے کھایا ہے یہ مغلئی نسخہ ہے اس میں میٹھا خالص شہد کی مٹھاس کا ہے۔ حضرت آپا منصورہ بیگم کے ہاں کے شاہی ٹکڑے تو ہم نے پہلے بھی کھائے تھے لیکن اس روز کا مزہ ہی کچھ اور تھا شاید اس لئے کہ پہلے وہ پرنسپل کی بیگم کے طور پر تیار کرواتی تھیں اب ان میں خلافت کے مرتبہ کا تبرک بھی شامل تھا۔ یہ لکھتے لکھتے خیال آرہا ہے کہ ہمارا کالج بھی کیسا بابرکت ادارہ تھا کہ اس کا ایک پرنسپل منصبِ خلافت پر فائز ہوا اب ایک طالب علم منصبِ خلافت پر سرفراز ہے۔ ایک ادارہ کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا فخر و تفاخر و مباہات کی بات ہوسکتی ہے۔ وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

ہمارے کالج کا تشخص ایک خالص علمی ادارہ کا تھا۔ اس میں اس بات کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا کہ طلباء کو محض امتحانوں کے لئے تیار نہ کیا جائے بلکہ ان کے ذہنوں میں وسعت پیدا کرنے کے لئے زائد از نصاب سرگرمیاں جاری رکھی جائیں چنانچہ اس مقصد کے لئے یونین اور مجلسِ ارشاد کے علاوہ جو کالج گیر مجالس تھیں ہر مضمون کے طلباء کی علیحدہ بزمیں موجود تھیں۔ بزمِ اردو اگرچہ اردو پڑھنے والوں کی بزم تھی مگر اس کا دائرہ بھی سارے کالج تک ممتد ہو گیا تھا اور اس کے عہدیداروں میں ایسے طلباء بھی شامل ہوتے تھے جو اردو کے طالب علم نہیں تھے۔ اردو قومی زبان ہونے کے علاوہ احمدیوں کے لئے مذہبی اہمیت بھی رکھتی تھی اس لئے 1964 کی پہلی اردو کانفرنس کے موقع پر پرنسپل صاحب نے اس کانفرنس کو یہ نعرہ دیا تھا کہ ''اردو ہماری قومی زبان ہی نہیں مذہبی زبان بھی ہے'' اور یہ سلوگن اردو کانفرنس کے پیڈ پر اور ہر چھپے ہوئے پروگرام پر موجود تھا۔ 1967 کی دوسری اردو کانفرنس کے وقت تو

اس کانفرنس نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی اور اس میں سارے پاکستان سے کوئی دو سو سے زائد مندوبین شامل ہوئے۔ پاکستان ریلوے نے مندوبین کے لئے کرایہ میں خاص رعایت کا اعلان کیا۔ کراچی سے ہی جو قافلہ آیا اس میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر، شعبہ اردو کے سربراہ، اردو کالج کے پرنسپل اور انجمن ترقی اردو کے عہدیدار شامل تھے۔صدر ایوب سے پیغام بھیجنے کی درخواست کی گئی تھی وہاں سے پوچھا گیا اور کس کس کے پیغامات پڑھے جائیں گے؟ ہم نے بتایا سر فہرست تو حضرت امام جماعت احمدیہ کا پیغام ہے تو انہیں چپ لگ گئی۔کئی سال بعد میری قدرت اللہ شہاب سے ملاقات ہوئی جو صدر کے سیکرٹری تھے۔اسلام آباد کی ایک ادبی تنظیم ''دائرہ'' کے اجلاس میں ان سے ملاقات ہو گئی۔ میرا تعارف ہوا تو چونکنے لگے کہنے لگے آپ اردو کی بہت خدمت کر رہے ہیں۔ میں نے کہا نہیں میں نہیں میرا ادارہ اس نیک کام پر مستعد ہے مگر صدرِ مملکت تو پیغام بھیجنا گوارا نہیں کرتے۔ کہنے لگے اگر آپ ذراسی عقل سے کام لیتے تو پیغام آجاتا۔

ہم نے کہا وہ کون سی عقل کی بات ہے۔ کہنے لگے آپ سے کس نے کہا تھا کہ امام جماعت احمدیہ کے پیغام کا ضرور ذکر کریں بس اسی بات نے کام خراب کر دیا۔ہم نے کہا جناب والا اگر یہی بات ہے تو ایں گناہیست کہ درشہرِ شما نیز کنم ۔اور حافظ کا شعر بھی پڑھ دیا: ''عقل گر داند کہ دل دربندِ زلفش چوں خوش است۔ عاقلاں دیوانہ گردند از پئے زنجیر ما''۔ ہمارے لئے یہی بے عقلی بس ہے۔ بعد کو جب شہاب صاحب کی شہاب نامہ پڑھی تو معلوم ہو گیا کہ پیغام کی اس نارسائی میں شہاب صاحب کی اپنی متعصب ذہنیت کارفرما تھیں۔ہمیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔

نصیر صاحب یونین کے انچارج تھے تو وہ اس بات کا اہتمام کرتے رہتے تھے کہ مباحثوں میں جج صاحبان ایسے ہوں جو علمی اور ادبی لحاظ سے نمایاں ہوں مثلاً اس وقت میرے سامنے احسان دانش کی

خودنوشت جہانِ دانش کا دوسرا حصہ پڑا ہے اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ربوہ کالج کے مباحثہ میں وہ اور پروفیسر وقار عظیم جج کے طور پر لاہور سے تشریف لائے تھے وہاں ان کی ملاقات تیسرے جج ڈاکٹر عابد احمد علی صاحب سے ہوئی تھی۔ڈاکٹر عابد احمد علی گورنمنٹ کالج سرگودھا کے پرنسپل تھےاور ہمارے پرنسپل صاحب کے آکسفورڈ کے زمانہ کے ہم عصر تھے۔اس تعلق کی وجہ سے گورنمنٹ کالج سرگودھا اور تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں ایک خاص رشتۂ مودت قائم ہو گیا تھا۔ہمیں یاد ہے ایک بار اس کالج کی ہاکی ٹیم ربوہ میچ کھیلنے کے لئے آئی۔دفترِ امورِ عامہ کے پاس جو گراؤنڈ ہے اس میں میچ ہوا۔ہمارے پرنسپل صاحب نے خاص طور سے یہ اہتمام رکھا کہ اس کالج کی ٹیم کے ساتھ نہایت مربیانہ سلوک روا رکھا جائے۔اس میچ میں ڈاکٹر عابد احمد علی بھی تشریف لائے تھے ہمارے پرنسپل صاحب ہاکی کا یہ میچ دیکھنے کے لئے آئے حالانکہ انہیں صرف باسکٹ بال کے میچوں میں دلچسپی تھی۔پھر خان عبدالعلی خان گورنمنٹ کالج سرگودھا کے پرنسپل بن کر آئے تو وہ بھی آکسفورڈ کے ناتے سے ہاکی کی ٹیم کے ساتھ آئے۔پروفیسر غلام جیلانی اصغر سے تو ہمارا دانٹ کاٹی روٹی کا تعلق تھا فرسٹ ایئر میں ہم مباحثہ کے لئے گئے تو جیلانی صاحب نے کہ وہاں کی یونین کے انچارج تھے ہمیں اپنے سایۂ عاطفت میں رکھا یہاں تک پوچھ لیا کہ بچہ تقریریں ٹھیک طور سے رٹی ہوئی ہیں کہ نہیں؟ جیلانی صاحب پرنسپل ہو گئے تو ہمیں اپنے کالج کے مباحثہ میں جج کے طور پر بلایا اور ہمارے تعارف میں خاص طور سے کہا کہ میں اس شخص کو فرسٹ ایئر کے طالب علم کی حیثیت سے جانتا ہوں جب اس نے انٹر کالجیٹ مباحثوں میں پہلی تقریر اسی کالج کے سٹیج پر کی تھی

اب میں نے اسے اسی کالج کے مباحثہ میں جج کے طور بلایا ہے۔کیسے مہربان لوگ تھے۔جیلانی صاحب کا ہمارے کالج کے ساتھ ہی نہیں کالج کے طلباء اور اساتذہ اور پرنسپل صاحب سے والہانہ تعلق

تھا اب ایسی برکھا محبت کرنے والے لوگ کہاں ہیں؟ میں اب بھی سرگودھا میاں عبدالسمیع نون صاحب کو جو کالج کے اولڈ بوائے ہیں، خط لکھتا ہوں تو جیلانی صاحب کو ضرور سلام بھیجتا ہوں اور وہ بھی بزرگانہ شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب میں پیار بھیجتے رہتے ہیں۔ (نون صاحب تین چار برس پہلے کینیڈا آئے ہوئے تھے ملاقات ہوئی تو میں نے اپنے ساتھی سے ان کا تعارف کروایا کہ ہمارے کالج کے اولڈ بوائے ہیں۔ کہنے لگے تمہارے منہ میں گھی شکر، ذرا یہ بوائے والی بات پھر کہنا)۔

پہلے یا دوسرے مباحثہ کے موقع پر مولانا عبدالمجید سالک، شیر محمد اختر (مدیر قندیل) اور مشہور شاعر نازش رضوی جج کے طور پر آئے تھے۔ سالک صاحب کے والد اور دوسرے بھائی احمدی تھے مگر سالک صاحب حضرت صاحب کی بیعت میں نہ تھے مگر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ اور ان میں ہم عمری کی وجہ سے خاصہ دوستانہ تھا اور دونوں میں بے تکلفی بھی بہت تھی۔ مباحثوں کے بعد حضرت صاحب نے ان حضرات کو کھانے پر بلایا۔ نصیر صاحب نے بعد کو بتایا کہ کھانے کے بعد حضرت صاحب نے سالک صاحب سے فرمائش کی کہ اپنا کلام سنائیں۔ سالک صاحب نے اپنی مشہور غزل

”چراغِ زندگی ہوگا فروزاں، ہم نہیں ہوں گے۔
چمن میں آئے گی بادِ بہاراں، ہم نہیں ہوں گے“

اپنے مخصوص ترنم میں سنائی۔ نازش صاحب نے بھی کلام سنایا۔ شیر محمد اختر شاعر نہیں تھے محض تخلص رکھنے کے گنہگار تھے اس لئے وہ بچ گئے۔ اس کے بعد سالک صاحب حضرت صاحب سے کہنے لگے ”حضور اب آپ بھی کچھ سنائیں“۔ حضرت صاحب نے کہا بھئی میں کوئی شاعر واعر تو ہوں نہیں ہاں تبلیغ کے لئے کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہوں۔ سالک صاحب نے بیچ ہی میں بات پکڑ لی ”بس۔ بس۔ حضور ہم تین غیر احمدی آپ کے پاس حاضر ہیں ہمیں تبلیغ کریں“ چنانچہ حضرت صاحب نے اپنا کلام عطا فرمایا۔

اگلے روز ہم نے بزمِ اردو میں سالک صاحب سے اردو کے فکاہی ادب پر تقریر کروائی۔تقریر کے بعد میں نے سوال کر دیا کہ آپ کے فکاہیوں کی بڑی شہرت ہے کوئی فکاہیہ سنائیں۔فرمانے لگے فکاہیہ کوئی شعر تو ہوتا نہیں کہ یوں سنایا جائے اور ہر فکاہیہ کا ایک پس منظر ہوتا ہے وہ سامنے نہ ہو تو فکاہیہ میں معنویت پیدا نہیں ہوتی۔مثال کے طور پر آپ نے کہا کہ 1940 میں لاہور ریزولیوشن جسے قراردادِ پاکستان کہتے ہیں مسلم لیگ کے اجلاس میں منظور کیا گیا۔اس موقع پر کانگریس والوں نے راوی کے کنارے ایک اجلاس کر کے اکھنڈ بھارت کی قرارداد منظور کی۔کہنے لگے اس اکھنڈ بھارت کی قرارداد کی منظوری کے بعد میں نے فکاہیہ لکھا کہ کانگریس والوں نے راوی کے کنارے اکھنڈ بھارت کی جو قرارداد منظور کی ہے وہ ''دروغ برگردنِ راوی'' ہے۔سب لوگ اس بے ساختگی پر عش عش کر اٹھے اور کیمسٹری تھیئیٹر داد و تحسین کے نعروں سے گونجنے لگا۔

شیر محمد اختر کی ایک بات مجھے نہیں بھولتی۔کسی مباحثہ میں جج کے طور پر آئے ہوئے تھے مجھے کہنے لگے ''یار مجھے کسی دن میاں طاری سے ملواؤ''۔میں نے کہا آپ انہیں جانتے ہیں؟ کہنے لگے ہاں ہمارے باپ دادا ان کے دادا سے بیعت تھے اور میری امی میاں طاری کی تو بچپن سے عاشق تھیں کہا کرتی تھیں کہ اس لڑکے نے ایک دن خلیفہ بن جانا ہے۔میں زندہ رہی تو اس کی بیعت کر لوں گی۔اب وہ تو اس دنیا میں رہیں نہیں جی چاہتا ہے میں ماں کی طرف سے انہیں دیکھ لوں۔چنانچہ میں انہیں میاں صاحب کے پاس لے گیا اور بتایا کہ اپنی امی کی طرف سے آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔اگلی بات کہنے کا محل تھا نہ موقع مگر اس مرحومہ کی بات کیسی صحیح نکلی۔شیر محمد اختر کے باپ دادا تو احمدی تھے مگر انہیں کچھ عرصہ تک جماعت لاہور سے تعلق رہا پھر وہ بھی نہ رہا۔جماعت کے بارہ میں تعصب بھی ان کے اندر نہیں تھا اور نہ جو لوگ جماعت سے دور بھاگتے ہیں وہ ''بادشاہ سے زیادہ بادشاہ کے وفادار بننے

کی نیت سے‘‘ جماعت کی مخالفت بھی بہت کرتے ہیں۔شرفا ایسی باتوں سے دور بھاگتے ہیں۔مثلاً یہی شیر محمد اختر تھے، پروفیسر جیلانی کامران تھے۔

عارف عبدالمتین تھے۔یہ لوگ اپنے آبا واجداد کی احمدیت کا برملا اعتراف کرتے تھے مگر احمدیت یا بانیٔ سلسلہ کے خلاف ان کی زبان شوخی نہیں دکھاتی تھی۔مگر جو شوخ طبع لوگ احمدیت سے بھاگیں ان کا انجام وہی ہوتا ہے جس کا ذکر میں کرنے لگا ہوں۔زیداے سلہری جانے پہچانے صحافی تھے مگر ابھی کل ہی ایک دوست نے ان کی خودنوشت "Boys will be Boys" پر ان کی بیٹی کا تبصرہ ای میل سے بھیجا ہے کہ میرا باپ شراب پیتا تھا۔سور کھاتا تھا مگر اس ’’جنونی جرنیل زولوحق‘‘ یعنی ضیاء الحق کا بڑا مداح اور اسلام کا ’’شیدائی‘‘ تھا۔یہ گواہی کسی باہر کے فرد کی نہیں اس کی اپنی بیٹی کی ہے جو ایک عیسائی سے بیاہی ہوئی ہے۔اس شخص نے احمدیت کی مخالفت میں غیروں سے بڑھ کر زورِ قلم دکھایا اور ہمیشہ منہ کی کھائی۔ذلت ورسوائی نے مرنے کے بعد بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔فاعتبروا یا اولی الابصار۔

یادنویسی کی ایک مصیبت یہ ہوتی ہے کہ لکھتے لکھتے باتیں یاد آتی چلی جاتی ہیں اور ذہن کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔واپس لوٹ کر اپنی طالب علمی کی طرف آرہے ہیں۔ایف اے ایف ایس سی کے امتحان میں ہمارے ساتھ سائنس کے بڑے بڑے نابغے تھے وہ تو اپنی ایف ایس سی میں اچھے نمبر لے کر انجینئرنگ یا میڈیکل میں چلے گئے ہمارے حریف نابغے جو آرٹس کے امتحان میں شریک تھے پیچھے رہ گئے اور ہم ایف اے کے امتحان میں اپنے کالج میں اول رہے اور وظیفہ پایا۔اب ہاسٹل میں رہنے کا موقع ملا۔کیوبیکل نمبر ایک ہمارا کمرہ تھا اس زمانہ میں ہاسٹل کی کھڑکیوں کی جالیوں پر سبز رنگ کیا گیا تھا کہ دھوپ کی تمازت کم رہے۔ایک روز ہم لوگ نیاز مرحوم کے کمرہ میں بیٹھے حسبِ معمول سٹڈی کے وقت میں گپ لگا رہے تھے (یا شاید تاش کھیل کر پتے سمیٹ کر بیٹھے تھے) کہ یوں محسوس ہوا کوئی

صاحب باہر سے جالی پر آنکھیں ٹکائے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ہم تو دیکھ نہیں سکتے تھے کون صاحب ہیں اور کس مقصد سے جھانکا تاکی کر رہے ہیں۔ نیاز نے اپنی جاٹوں کی زبان میں کہا ’’ارے بھئی کون ہو؟نقلیں کیوں مار رہے ہو؟‘‘۔ باہر سے آواز آئی ’’مرزا ناصر احمد‘‘۔اب ہمارا تو وہ حال ہوا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔مگر ہمارے پرنسپل بڑے حوصلہ مند پرنسپل تھے۔مزید کچھ کہے سنے بغیر واپس چلے گئے۔اور کالج میں اس کا کچھ چرچا نہ ہوا کہ پرنسپل صاحب نے کس کمرہ میں کتنے چور پکڑے تھے؟

خدا خدا کر کے ہم تھرڈ ایئر میں پہنچے تو یونین کا الیکشن لڑنے کا خیال آیا۔کیونکہ سیکرٹری تھرڈ ایئر میں سے اور نائب صدر فورتھ ایئر میں سے چنا جاتا تھا۔صدر پرنسپل صاحب خود ہوتے تھے۔خدا کا کرنا یہ ہوا کہ یونین کے کسی اجلاس میں انچارج یونین نے کہ ہمارے پروفیسر نصیر احمد خان ہوتے تھے کسی بات پر ناراض ہو کر یونین کے کسی عہدیدار کو برطرف کر دیا۔ہم اس زمانہ میں نوائے وقت اخبار کے نمائندہ ہوا کرتے تھے ہم نے یہ خبر اخبار کو بھیج دی جو چھپ گئی۔اب ہماری شامت آ گئی کہ کالج کی خبر باہر کیوں چھپوائی ہے؟ ہم نے بہتیرا کہا کہ یہ کون سی ایسی خفیہ خبر تھی کہ اس کا چھپنا گناہ ہوتا؟ مگر نصیر صاحب آخر نصیر صاحب تھے کسی صورت میں ہمیں معاف کرنے پر راضی نہ ہوئے۔

پرنسپل صاحب بڑے مزے سے صاحبِ یونین اور ’’مقررِ یونین‘‘ کا تماشہ دیکھتے رہے تا آنکہ اسی مقرر نے تھرڈ ایئر میں پہنچ کر سیکرٹری کے طور پر الیکشن لڑنے کا ارادہ کر لیا۔خوب زوروں کی کنویسنگ ہوئی۔خیال تھا کہ شاید ہم جیت ہی جائیں گے مگر عین الیکشن سے دو روز قبل ایک نوٹس نوٹس بورڈ پر آویزاں پایا گیا کہ ہم نے کالج کی ایک خبر نوائے وقت میں چھپوائی تھی اور یہ ناقابلِ معافی جرم ہے اس لئے ہمیں الیکشن لڑنے کے لئے نااہل قرار دیا جاتا ہے۔کالج میں سنسنی پھیل گئی۔ پرنسپل صاحب باہر

تھے ان کے واپس آنے میں کئی روز کا وقفہ تھا الیکشن دو روز بعد ہونا تھا ہوا اور ہمارے دوست اور پرانے ساتھی مرزا انس احمد بلا مقابلہ سیکرٹری بن گئے۔ وہ جو خیال تھا کہ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پرنسپل صاحب واپس تشریف لائے تو اس سارے حادثہ کا انہیں علم ہوا آپ نے یونین کے انچارج صاحب کو اور ہمیں بلا کر ہماری صلح صفائی کروادی۔ بڑا مزا اس پیار میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔ وہ صلح صفائی ایسی دوستی میں بدل گئی جسے پھر کوئی گزند نہیں پہنچا۔ فورتھ ایئر میں ہمارا مقابلہ پھر انس کے ساتھ ہوا اس بار میدان میں ایک تیسرا امیدوار مبشر احمد اختر بھی تھا میاں غلام محمد اختر کا صاحبزادہ۔ اس کے بارے میں تو کسی کو گمان تک نہ تھا کہ دریں گرد سوارے باشد۔ وہ اچانک امیدوار بن گیا اور اس وقت تک ڈٹا رہا جب تک الیکشن کے تقریری مقابلہ میں ناکام ہو کر الیکشن کے لئے نااہل قرار نہیں دیا گیا۔ اس وقت اس کے حواریوں نے جن میں ہمارے تقسیم شدہ ووٹر بھی شامل تھے ہمارے حق میں بہت زور لگایا۔ مگر وقت گزر چکا تھا۔ الیکشن ہوا اور بڑے زوروں کا ہوا ہم اپنی روایت کے مطابق ہار گئے۔ ایک یا دو ووٹوں کا فرق تھا۔ دو تین بار گنتی ہوئی کہ گننے میں کوئی غلطی نہ رہ گئی ہو مگر نہیں تھی آخر انس کی کامیابی کا اعلان ہو گیا اور ہم انہیں مبارکباد دینے گئے۔ ہم نے انس سے کہا اب یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ ہم آپ کے مخالف ہیں ہم آپ کے سب سے بڑے حمایتی ہیں اور یونین کا سب سے زیادہ کام کریں گے چنانچہ ہم نے اس شکست کا بدلہ یوں لیا کہ اس سال یونین کی سرگرمیوں میں سب سے آگے آگے رہے اور بے شمار مقابلے اپنے یونین کے لئے جیتے۔ اس الیکشن سے ایک سال پہلے مقابلہ عطاء الکریم اور افتخار احمد شہاب کے مابین ہوا تھا۔ افتخار شہاب چنیوٹ کا بڑا ذہین لڑکا تھا المنار کے انگریزی حصہ کا غالباً ایڈیٹر بھی تھا۔ مقابلہ بڑا معرکہ کا تھا کیونکہ چنیوٹ اور ربوہ کے امیدواروں میں ٹھن گئی تھی۔ (احمدی یا غیر احمدی کا سوال نہ اٹھا نہ اٹھائے جانے کا سوال تھا)۔ پرنسپل

صاحب بہ نفسِ نفیس خلافِ معمول اس مقابلہ کے وقت ہال میں موجود تھے۔ جب معلوم ہوا کہ افتخار کامیاب نہیں ہوا تو پرنسپل صاحب نے اسی وقت ایک نیا عہدہ قائم کیا اور افتخار احمد شہاب کو یونین میں ''پرنسپل کا نمائندہ'' مقرر کیا۔ پروٹوکول کے لحاظ سے وہ نمائندوں میں سب سے سینئر قرار دئے گئے۔ اب اسی سنت کی پیروی میں پرنسپل صاحب نے ہمیں یونین میں اپنا نمائندہ مقرر کیا اور ہم ہارنے کے باوجود یونین کی عاملہ کے رکن رہے۔ ان تمام ہزیمتوں کا بدلہ ہم نے اپنے پرانے یار اور حریف سے یوں لیا کہ بی اے کے امتحان میں کالج میں اول رہے اور ان کے تمام حواری ان کے سمیت امتحان کے میدان کارزار میں کھیت رہے۔

کالج میں ہمارا طالب علمی کا دور اس لحاظ سے بڑا شاندار رہا کہ ہم تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں میں بڑی تندہی سے حصہ لیتے رہے۔ کھیلنے کو باسکٹ بال بھی کھیلا۔ فٹ بال پر بھی مشقِ ستم کرتے رہے۔ بزمِ اردو کے عہدیدار رہے۔ یونین کے مباحثوں میں بھی شریک ہوتے رہے اور اپنے پراکٹروں سے بھی چھیڑ چھاڑ جاری رکھی المنار کی ایڈیٹری بھی چار سال تک نبھائی مگر یہ قولِ شخصے اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیا۔ نیک نامی تو کمائی یا نہیں بدنامی نہیں کمائی حتیٰ کہ فیل تک نہیں ہوئے بلکہ وظیفے پاتے رہے پہلے کالج سے پھر یونیورسٹی سے۔ لیکچروں میں باقاعدگی سے نہ جانے کے باوجود کبھی ہمارے لیکچر کم نہیں ہوئے۔ کیوں نہیں ہوئے؟ ہمیں پتہ نہیں۔ ہم نے کبھی اپنی حاضری نہیں لگوائی ہماری موجودگی کا اساتذہ کو ویسے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ فتنہ کلاس میں موجود ہے اس لئے وہ تعرض نہیں کرتے تھے۔ اللہ بخشے مولانا غلام احمد بدوملہی والے بڑے دبنگ استاد تھے ان کی نگاہ بڑی دوربین تھی کان اس سے بھی زیادہ حساس۔ ایک بار دینیات کی لازمی حاضری والی کلاس میں ہم نے ایک ساتھی کی جگہ یس سر کہہ دیا۔ بغیر نظر اوپر اٹھائے ٹوک دیا کہ رول نمبر 23 تم رول نمبر 55 کی جگہ کیوں بول رہے ہو؟ انہیں

طالب علموں کا نام کیا ان کا شجرۂ نسب تک یاد رہتا تھا۔ شجرۂ نسب سے یاد آیا حضرت مولانا ارجمند خان دینیات کے استاد تھے کلاس میں ہم نے کوئی شوخی دکھائی تو فرمانے لگے میاں تمہارے باپ کا بھی استاد ہوں اب اگر تم نے ایسی حرکت کی تو اس کے بھی کان کھینچوں گا تمہارے بھی۔ ہم نے مزید شوخی کی کہ ہمارے ابا کے کان کھینچنے کے لئے آپ کو بہت اونچی کرسی پر کھڑا ہونا پڑے گا۔ بڑے مزے سے ہنسے اور فرمایا ''اوئے بدتمیز! کیا میں کرسی پر کھڑا نہیں ہوسکتا؟''۔ اتنا کہہ کر کرسی کی طرف دیکھا اور اس کی ناتوانی اور اپنے تن و توش کا خیال کر کے خود ہی بڑے زور سے ہنسے اور فرمایا لاحول ولاقوۃ۔ کیا سادہ دل استاد تھے۔ مہربان۔ شفیق اور دلنواز۔

اردو کے استاد پروفیسر محبوب عالم خالد تھے۔ اب ماشاء اللہ اپنے مرشد کے تتبع میں انجمن کے صدر ہیں اس زمانہ میں صدر کے سیکرٹری ہوئے تو اپنی کلاسیں ہمیں دے گئے کہ لو میاں خود ہی پڑھو اور خود ہی پڑھاؤ۔ اس مشقِ ستم نے ہمیں پڑھانے کا تجربہ مفت میں مہیا کر دیا۔ کلاسیں بھی چھوٹی چھوٹی تھیں وہ اردو کے لازمی مضمون بن جانے کے بعد کی کلاسیں نہیں تھیں کہ کلاس نہ لی جلسۂ عام سے خطاب کر لیا۔ ہال نہیں تھا تو کیمسٹری تھیٹر تھا اٹا اٹ بھرا ہوا۔ آواز کی رسائی کے لئے لاؤڈ سپیکر جسے انجمن ترقی اردو والے آلۂ مکبر الصوت اور ہمارے استاد ڈاکٹر سید عبداللہ آلۂ کریہہ الصوت کہا کرتے تھے۔ وہ بیچارا فزکس کا لیبارٹری اسسٹنٹ محمد علی سردیوں میں ٹھٹھرتا کانپتا احمد نگر سے صبح صبح لاؤڈ سپیکر لگانے آیا کرتا تھا اور شاید دس روپے زاید الاؤنس پاتا تھا۔ ہال میں تو عالم ہی اور ہو گیا تھا لاؤڈ سپیکر کا ہونا نہ ہونا برابر ہو گیا۔ ہمیں ویسے بھی پکار کر بولنے کی عادت پڑ گئی۔ مگر سب سے بڑا کام تو ہال میں اتنے جمِ غفیر کو قابو میں رکھنے کا تھا اس کے لئے ہم نے ایک خاموش طریقۂ سرزنش ایجاد کیا تھا جہاں سے شور کا شبہ ہوتا ادھر انگلی اٹھاتے اور شور کرنے والے کو اشارہ کرتے اور ہال سے باہر نکال دیتے۔ ایک سولی بھی ہال میں

موجود تھی یعنی اسٹیج پر یونین کے صدر کی اونچی کرسی پڑی رہتی تھی جس کو زیادہ زچ کرنا یا شرمندہ کرنا مقصود ہوتا اسے بلا کر اس کرسی پر بٹھا دیتے اور وہ سارا وقت لوگوں کے تیرِ نگاہ کا مرکز بنا رہتا۔لڑکوں کی اس سے جان جاتی تھی۔ یہاں کینیڈا میں ایک پرانے ''ٹوٹی'' شاگرد نے پوچھ ہی لیا کہ یہ بتائیں آپ تین سو ساڑھے تین سو لڑکوں میں سے مجرم کو کیسے پہچان لیتے تھے کیونکہ آپ کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوتا تھا۔ ہمیشہ صحیح مجرم (یعنی میں) ہی پکڑا جاتا تھا۔ہم نے کہا میاں اب تم سے کیا پردہ؟ ہم تو اندازہ سے اس جانب انگلی اٹھا کر ذرا رعب سے کہتے تھے آپ۔اور وہ ''آپ'' آپ ہی آپ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اگر کوئی کھڑا نہ ہوتا تو دوبارہ ذرا زیادہ زور سے کہتے اور وہ چپکے سے اٹھ کھڑا ہوتا۔کون۔ وہی جو اصل مجرم ہوتا کیونکہ مجرم کے دل میں چور ہوتا ہے۔اور انگلی کا اشارہ جو اسٹیج سے کیا جا رہا ہو سیدھا مجرم کے سینے پر لگتا تھا۔ وہ حضرت کہنے لگے ہم خوامخواہ آج تک پریشان ہوتے رہے کہ ان کے پاس کون سا جادو ٹونا ہے کہ سیدھے سبھاؤ ہمیں کو پہچانتے ہیں۔آج حقیقت کا پتہ چلا ہے تو اپنی بیوقوفی پر حیران ہو رہے ہیں کہ کئی لذیذ لیکچر محض اس اشارۂ عمومی کی بدولت ضائع کر دئے۔

کالج میں جو مہمان تشریف لاتے رہے ان میں دو ہمیں یاد ہیں ایک تو کوئی روسی سائنس دان تھے جو پاکستان سائنس کانفرنس میں شرکت کے لئے کراچی آئے ہوئے تھے نصیر خان صاحب انہیں اپنے ساتھ لوالائے۔کیمسٹری تھیٹر میں ہی ان کا لیکچر ہوا ان کے ساتھ ایک مترجم بھی تھا مگر روسی زبان ہی میں خطاب فرمایا۔ ترجمان ترجمہ کرتا تو سائنس دان صاحب کے چہرے کے صاف لگتا کہ اپنے ترجمان سے بہتر انگریزی سمجھتے ہیں مگر اپنی حکومت کی جانب سے انہیں روسی کے سوا کوئی اور زبان بولنے کی اجازت نہیں۔ دوسرے ایک امریکن تھے یہ حضرت مسٹر فلنٹ کے نام سے موسوم تھے اور لاہور میں امریکی قونصلیٹ کے رکن تھے۔ان کا موضوع تھا جمہوریت۔ جیسے آج کل امریکہ کے پیٹ

میں جمہوریت کا مروڑ اٹھا ہوا ہے اس وقت بھی تھا مگر اس کی شدت اتنی نہیں تھی۔ اس لیکچر کے میزبان پولیٹیکل سائنس سوسائٹی والے تھے۔

مسٹر فلنٹ نے اپنی تقریر ہی ابراہام لنکن کے اس مقولہ سے شروع کی کہ:

"Democrary is a form of Government, of the people, for the people, by the people."

جب سوال وجواب کا موقع آیا تو صاحب صدر نے صرف اتنا فرمایا

"any questions"

اور ہم کھڑے ہو گئے ہم نے سوال کیا کہ جناب والا کیا صدر لنکن نے اس مقولہ کے ہجے بھی بیان فرمائے تھے؟ فلنٹ صاحب چکرائے کہنے لگے میں آپ کا سوال سمجھا نہیں۔ ہم نے وضاحت کی جناب ہمارا خیال ہے ان کی مراد یہ ہوگی کہ:

"democracy is a farm of governmnet, off the people buy the people far the people."

ہم نے وضاحت کے لئے ایک ایک ہجہ علیحدہ علیحدہ کر کے بتایا۔ آف علیحدہ ڈبل ایف کے ساتھ۔ فار علیحدہ او کی بجائے الف کے ساتھ اور بائی علیحدہ یو کے ساتھ۔ سارا تھیٹر ہنسی سے گونجنے لگا۔ فلنٹ صاحب باسی ثابت ہونے یعنی چنگاریاں چھوڑنے لگے اور صاحب صدر ہمیں سرزنش فرمانے کی کوشش میں انگریزی کے تمام لفظ بھول گئے اردو میں فرمانے لگے بیٹھ جائیں۔ اور ہم بیٹھ گئے۔

کانووکیشن بھی ہمارے کالج کے یادگار ہوتے تھے۔ کالج والے افسروں کو بلانے کی بجائے علماء و فضلاء کو بلاتے تھے۔ مولانا صلاح الدین احمد، جسٹس کیانی، ڈاکٹر سید صفدر حسین، پروفیسر حمید احمد

خان، ڈاکٹر زیڈ اے ہاشمی، کون سا ایسا ماہرِ تعلیم تھا جو نہ آیا ہو۔ مولانا صلاح الدین احمد تو بزمِ اردو کی تقریبات میں تشریف لاتے ہی تھے، بزمِ اردو کی تقریبات میں ان تمام بزرگوں کے علاوہ ماسوا جسٹس کیانی کے سب ہی تشریف لاتے رہے، پھر سرکاری عہدیداروں کا آنا جانا بھی زیادہ تر بزمِ اردو کے زیرِ اہتمام ہوتا تھا۔ ہمارے ڈویژن کا ہر کمشنر بزمِ اردو کے زیرِ اہتمام ربوہ آیا یا بعد کو باسکٹ بال کے ناطے سے۔ ایک کمشنر تھے شیخ محمد حسین ان کا نام تھا قاضی صاحب یعنی پرنسپل قاضی محمد اسلم صاحب کے گورنمنٹ کالج کے زمانہ کے شاگرد تھے جب کالج کیمپس میں داخل ہوئے تو موٹر سے اتر گئے کہنے لگے میں اپنے استاد کے سامنے گاڑی میں بیٹھ کر نہیں جا سکتا۔ شیخ صاحب انگریزی کے آدمی تھے اردو پڑھ تو لیتے تھے مگر زیادہ سمجھ بوجھ انہیں ادب کی نہیں تھی۔ اپنے استاد کی زیارت کے شوق میں ہماری دعوت قبول کر لی تھی۔ ہم نے اپنا خطبۂ استقبالیہ پہلے سے بھیج دیا تھا کہ جواب لکھوا کر لا سکیں۔ ہم اس زمانہ میں پروفیسر نہیں تھے محض لیکچرار تھے اس لئے اپنے عہدہ کے اظہار کے لئے اپنے نام کے ساتھ ''استادِ ادبیاتِ اردو'' لکھتے تھے۔ شیخ صاحب اپنا خطبۂ صدارت پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو فرمایا کہ ''ابھی ابھی استادِ ادبیاتِ اردو نے جو کچھ کہا ہے............'' سامعین کے کان کھڑے ہوئے مگر لوگ سمجھے ''کتابت'' (خطابت؟) کی غلطی ہوگئی ہو گی جب کمشنر صاحب نے دو تین بار ادبیات اردو کی بجائے ادبیات اردو فرمایا تو لوگ محظوظ ہونے لگے قبلہ قاضی صاحب نے بڑے پیار سے انہیں سمجھا دیا کہ یہ لفظ ادبیات نہیں ادبیات ہے شیخ صاحب خود بھی مسکرائے کہنے لگے اردو کی یہی تو مصیبت ہے کہ ایک لفظ کے ادھر ادھر ہو جانے سے He کا she بن جاتا ہے۔

کمشنروں میں سے سید قاسم رضوی نہایت ادب نواز اور ادیب نواز کمشنر تھے ایسی شستہ و رفتہ اردو لکھتے اور بولتے تھے کہ کیا کوئی اردو کا پروفیسر بھی لکھے یا بولے گا۔ سرگودھا میں یومِ غالب کے موقع پر

اپنا خطبۂ صدارت غالب کے اسلوب میں خط کی صورت میں لکھا اور پڑھا اور اہلِ ذوق مدتوں اس کو یاد کرتے رہے ڈاکٹر انور سدید، محمد خالد اختر اور مشفق خواجہ کے جدید خطوط اس کے بعد کے ہیں۔ یہی قاسم رضوی بزمِ اردو میں بھی آئے اور دسویں قومی باسکٹ بال ٹورنامنٹ میں ڈویژن کا کمشنر ہونے کے ناطے سے میزبان کی حیثیت سے بھی آئے۔ میں ان دنوں باسکٹ بال کلب کا صدر تھا کیونکہ چوہدری محمد علی صاحب پرنسپل کی کرسی پر سرفراز ہو گئے تھے۔ کمشنر صاحب انتظامات کا معائنہ کرتے پھرتے تھے۔ ہم نے جلسہ سالانہ کی طرز پر ہوسٹل کے باہر کچھ عارضی بیت الخلا بھی بنوا رکھی تھیں وہاں پہنچے تو کہنے لگے یہ کیا بنا رکھا ہے؟ میں نے کہا ''بیت الخلا ہیں دستِ مبارک سے افتتاح فرمائیں''۔ کمشنر صاحب کی ساری کمشنرانہ تمکنت دھری رہ گئی قہقہہ مار کر ہنسے اور ہنستے چلے گئے۔ مدتوں بعد جب وہ ملتان میں کمشنر تھے میں انہیں کسی کام سے ملنے گیا اس وقت بھی وہ افتتاح والا لطیفہ انہیں یاد تھا۔ افسوس کہ بھٹو صاحب کی کینہ توزی کا شکار ہو کر ملازمت سے برطرف کر دئے گئے اور جلد ہی فوت بھی ہو گئے اور پاکستان ایک نہایت زیرک، محنتی اور ذہین افسر سے محروم ہو گیا۔ وفات سے ذرا عرصہ قبل لاہور میں سول سروس اکیڈمی کے ڈائریکٹر تھے کہ ایک روز اچانک ان کی برطرفی کے احکامات جاری ہوئے۔ دو روز بعد ان کی والدہ کی وفات ہو گئی میں اتفاق سے لاہور میں تھا میں تعزیت کے لئے پہنچا دیکھا کہ ڈائریکٹر کے وسیع و عریض بنگلہ میں تن تنہا غمگین بیٹھے ہیں۔ میں گیا تو میرے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ کہنے لگے صبح سے اکیلا بیٹھا ہوں تم پہلے شخص ہو جس نے اس گھر میں جھانک کر دیکھ لیا ہے۔ خدا جانے امی کے جنازہ میں بھی کوئی آئے گا یا نہیں آئے گا۔ میں نے بہت تسلی دی اور سارا دن ان کے ساتھ رہا اور دلداری کرتا رہا شام کو جنازہ اٹھا تو گنتی کے چند لوگ اور سول سروس اکیڈمی کے عہدیدار جنازہ کے ساتھ تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ان کی سناؤنی سنی۔ میں اس وقت کہیں باہر تھا خدا معلوم ان

کے جنازہ کے ساتھ کون تھا اور کون نہیں تھا۔ دنیا دار لوگ لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتے افسری کے ساتھ ہوتے ہیں۔

مشاعرے بھی ہمارے کالج کے یادگار ہوتے تھے۔ کچھ اس وجہ سے کہ معیار بہت بلند ہوتا تھا کچھ اس وجہ سے کہ پرنسپل صاحب کے علاوہ ان کی بیگم صاحبہ شعروں کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھیں (آخر کس ماں کی بیٹی تھیں؟)۔ ایک مشاعرہ کالج میں ہوتا ایک پرنسپل صاحب کے گھر میں ہوتا۔ ثاقب زیروی پرنسپل صاحب کے ذوق کو خوب پہچانتے تھے۔ کالج والے انہیں کہہ دیتے کالج کی گاڑی شعراء کو لینے چلی جاتی اور شعراء سر کے بل آتے۔ اردو کانفرنس کے مشاعرہ میں صوفی تبسم بھی آئے۔ اس وقت پرنسپل صاحب حضرت صاحب بن چکے تھے جب صوفی صاحب کی تشریف آوری کا علم ہوا تو مجھے خاص طور سے یاد فرمایا اور تاکید کی کہ صوفی صاحب میرے استاد ہیں ان کا بہت خیال رکھنا۔ صوفی صاحب نے اردو غزل کے علاوہ پنجابی کلام بھی سنایا۔

''سہاڈے حسن دے چمکدے لیکھاں اوتے ڈاھڈے غم دیاں سیاہیاں ڈھل گئیاں
جیہڑیاں حسن ترے چمکائیاں سن اوہ چانیاں راتاں رُل گئیاں''۔

دوسری اردو کانفرنس جو 1976 میں ہوئی بڑی عظیم الشان کانفرنس تھی، سارے پاکستان میں دورو نزدیک اس کا چرچا تھا۔ کانفرنس کے وقت ہال کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔ فیصل آباد اور سرگودھا سے تو بے شمار لوگ آتے کانفرنس سنتے اور واپس چلے جاتے۔ کھانے کا البتہ لنگر جیسا انتظام تھا مگر مینیو لنگر کا نہیں تھا۔ بڑے پُرتکلف کھانے پیش کئے جاتے تھے۔ دوسرے روز شام کی دعوت تو حضرت اقدس خلیفة المسیح الثالث کی جانب سے تھی اور انجمن کے مغربی لان میں جہاں اب گیسٹ ہاؤس بنا ہوا ہے، تھی۔ اس دعوت میں حضرت صاحب مہمانوں سے ذرا پہلے تشریف لائے تھے اور خود مہمانوں کا استقبال کیا

تھا۔مہمانوں میں ان کے پرانے رفقاء کار ماہرینِ تعلیم اور دوست شامل تھے مجھے یاد ہے ڈاکٹر سید نذیر احمد پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور تو لپک کر حضرت صاحب کے گلے لگ گئے اور بڑی دیر تک ان سے جدا نہ ہوئے۔صوفی تبسم صاحب نے بھی معانقہ کیا۔عابد علی عابد البتہ لئے دئے رہے۔یہ دعوت بڑی بے تکلفی کے ماحول میں ہوئی مگر کھانا حضرت صاحب کی توقعات کے مطابق تیار نہ کیا گیا تھا اس لئے حضرت صاحب نے گھر سے بھی بہت سی ڈشیں منگوائیں۔دیر تک مہمانوں سے گفتگو فرماتے رہے۔چلتے وقت ڈاکٹر سید نذیر احمد نے پھر اسی جوش وجذبہ سے معانقہ کیا۔ڈاکٹر صاحب خوب آدمی تھے دیکھنے میں بالکل سادہ مگر علم میں پختہ اور طلباء میں نہایت مقبول۔

کالج کے مشاعروں میں رونق بھی اپنے رنگ کی ہوتی تھی کیونکہ ہمارے مشاعروں میں وہ روایتی ہڑبونگ نہیں مچتی تھی۔لوگ داد ضرور دیتے تھے مگر بے داد سے مجتنب رہتے تھے اس لئے شعراء یہاں آنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے اور سارا سال منتظر رہتے تھے کہ کب کالج کے مشاعرہ کی دعوت آئے۔ایک بار علامہ لطیف انور تشریف لائے۔ان کی رباعی نے مشاعرہ لوٹ لیا:

دل سے تو بے شک اتارے گا مجھے
دور تک لیکن پکارے گا مجھے
مجھ کو ہے اپنے گناہ کا اعتراف
پہلا پتھر کون مارے گا مجھے؟

اتفاق یوں ہوا کہ اگلے سال کے مشاعرہ سے پہلے وہ دنیا چھوڑ گئے۔گلزار ہاشمی آئے اور دو غزلیں اپنے بے پناہ ترنم میں سنائیں۔ایک کی ردیف یاد ہے۔

''وقت ناساز ہے''۔کچھ غزلیں دردانگیز تھیں کچھ ان کا ترنم دردانگیز تھا سارا ہال اداس ہو گیا۔لوگ

مشاعرہ کے بعد بھی ان کی غزلیں انہی کے ترنم میں گنگناتے رہے۔اگلے سال کے مشاعرہ سے پہلے وہ بھی راہیِ عدم ہو گئے۔شعراء میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ جو شاعر زیادہ پسند کیا جاتا ہے وہ مر جاتا ہے۔کلیم عثمانی کی ایک غزل بہت مشہور ہوئی میں نے کہا کلیم بھائی آپ نے مشاعرہ لوٹ لیا۔آپ نے فوراً میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ’’ہش ایسی منحوس بات منہ سے نہ نکالو۔ابھی میں مرنا نہیں چاہتا‘‘۔

کالج میں علمی مذاکرے اور کانفرنسیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں مگر ہمارا کالج کھیلوں میں بھی کسی سے بیٹا نہیں تھا۔لاہور میں تھا تو روئنگ یعنی کشتی رانی کا چیمپئن تھا ربوہ آیا تو یہ اعزاز ساتھ لایا۔دریا کا کنارہ وہاں بھی تھا۔ یہاں بھی تھا۔ پرنسپل صاحب کو آکسفورڈ کے زمانہ سے اس کھیل سے دلچسپی تھی۔لاہور میں کالج کا مقابلہ عام طور سے اسلامیہ کالج سے ہوتا تھا۔ربوہ آئے تو بھی مقابلہ اسلامیہ کالج ہی سے رہا۔ بڑا جان توڑ مقابلہ ہوتا تھا اور پرنسپل صاحب کو اور کشتی رانی کے پروفیسر انچارج چوہدری محمد علی صاحب کو اس کھیل کھلاڑیوں سے اتنی دلچسپی اور محبت تھی کہ کھلاڑیوں کی نگرانی بھی بہت ہوتی تھی کہ پریکٹس سے غافل نہ ہوں اور خاطر تواضع بھی بہت ہوتی تھی سیروں کے حساب سے دودھ پلایا جاتا تھا، سویابین کا حلوہ اور پتہ نہیں کیا کیا انہیں کھلایا بلکہ بقول شخصے ’’ٹھسایا‘‘ جاتا تھا اور یہ تھا بھی ضروری کیونکہ کشتی کھیلنا بچوں کا کھیل نہیں اور وہ بھی پانی کے بہاؤ کے خلاف۔ مسلسل پریکٹس۔اچھی صحت اور مضبوط تن وتوش، اس کے لئے ضروری تھا۔صبح وشام ان کھلاڑیوں کو ورزش بھی خوب خوب کروائی جاتی تھی دیکھنے میں دیدار و جوان لگتے تھے ’’سینے گوشت سے لپے ہوئے، ڈنٹر قبضے بنے ہوئے، رانوں کے مچھلے الٹے ہوئے، پنڈلیاں کچالوسی بنی ہوئی، اپنے پرائے دیکھ کر خوش ہوتے تھے‘‘۔ یہ جو میں نے حوالہ درج کر دیا یہ شاہد احمد دہلوی صاحب نے دلی کے پہلوانوں کے بارے میں لکھا ہے مجھے یوں محسوس ہوا ہمارے روئنگ والوں کا ذکر ہے اس لئے میں نے ان کی کتاب ’’اجڑے دیار‘‘ میں سے

اچک کر یہاں درج کر دیا۔اس ساری ٹیم میں ایک نہ ایک نازک اندام کھلاڑی بھی ہوتا تھا جسے کشتی کی پھننگ پر بیٹھ کر کشتی کا رخ سیدھا رکھنا ہوتا تھا اسے سٹئیر کہتے تھے۔اس نازک اندام کی نازک اندامی کی حفاظت بھی بڑا جی لگا کر کی جاتی تھی کہ کہیں اس کا تن و توش نہ بڑھ جائے کیونکہ اس کا کام اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ ہلکا پھلکا مگر بازوؤں میں جان والا ہوتا کہ کشتی کو بدراہ ہونے سے بچائے رکھے۔زور آوروں کا سارا زور کشتی کھینے پر مرکوز رہتا تھا اور یہ نازک سا کھلاڑی کشتی کا رخ سیدھا رکھنے پر مستعد رہتا تھا کہ ذرا رخ میں کجی آئی سارے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔اسی کھیل کا ایک کھلاڑی تھا جسے پرنسپل صاحب نے پریکٹس کے وقت کبڈی کا میچ دیکھتے ہوئے دیکھ لیا اور سب کے سامنے اسے بیدوں پر دھر لیا۔ذرا جو اس نے چوں چرا کی ہو۔فوراً بھیگی بلی بن کر دریا کی طرف بھاگا۔لوگ دیکھتے ہی رہ گئے کہ اس پرنسپل کا کتنا رعب داب ہے کہ کالج کے تن آور کھلاڑیوں کو سر عام بید لگا سکتا ہے۔دراصل یہ سب ہمارے کالج کا فیض تھا دوسرے کالجوں میں ایسا ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔وہ کھلاڑی بعد کو پرنسپل صاحب کا چہیتا کھلاڑی بن گیا اور پرنسپل صاحب اس کی دلداری بھی دوسروں سے بڑھ کر کرتے تھے۔نازک اندام سٹئیر لڑکوں میں سے ایک ہمارا چہیتا شاگرد تھا نعیم شاہ۔جرمنی میں تھا۔ہم سویڈن میں تھے تو ہمارے لئے کتابیں فراہم کرنے کا بیڑا اس نے اٹھا رکھا تھا بس ہم کسی کتاب کے بارہ میں کہہ دیتے وہ خبر نہیں کیا کیا جتن کر کے وہ کتاب مہیا کر لیتا۔فاصلہ، قیمت، نایابی کوئی شے اس کا راستہ نہ روک سکتی۔پھر بیچارے پر برا وقت آن پڑا مگر اس کا حوصلہ پست نہیں ہوا۔کروڑوں میں کھیلتا تھا۔ایسا بجوگ پڑا کہ لاکھ کا گھر خاک ہو گیا مگر اس کی جبیں پر شکن نہ آئی۔اب رفتہ رفتہ پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو رہا ہے۔پاکستان سے باقاعدگی کے ساتھ فون کر کے ہماری خیریت دریافت کرتا رہتا ہے۔پچھلے دنوں ہماری علالت کی خبر سنی تو فون پر دھاڑیں مار مار کر رویا۔ایسے شاگرد کسے نصیب ہوتے ہیں؟ یہ اس کی

دین ہے جسے پروردگار دے۔کشتی رانی کی چیمپئن شپ ہمارے کالج کے ہاتھوں میں رہی۔اب پتہ نہیں کیا حال ہوگا؟ زوال تو ہمارے یار اسلم صابر کے زمانہ ہی میں شروع ہو گیا تھا جب عربی پڑھانے والے لوگ اس خیال سے کہ ماضی میں عرب جہاز ران سمندروں پر حکمرانی کرتے تھے،تو ہم کیوں نہ بمپنگ ، بوٹنگ کے انچارج بن جائیں؟ کشتی رانی کروانے لگیں تو یہ تو ہونا ہی تھا اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ ہاکی رشید غنی کھلاتے تھے۔اللہ اللہ غنی حساب پڑھائے گا ماتھیٹا سکھائیں یا ہاکی کی چالبازیاں سکھائیں؟۔فٹ بال البتہ ماسٹر فضل داد صاحب نے ایک عرصہ تک خوب خوب کھلایا مگر بوڑھے آدمی تھے جب ان کی ٹانگیں کمان بن گئیں تو اس علت سے جان چھڑا کر باسکٹ بال کے کھلاڑیوں کو پریڈ کروانے لگے۔باسکٹ بال نے کالج کے نام کو چار چاند لگا دئے۔پنجاب کی ٹیم کے نوے فیصد کھلاڑی ہمارے کالج کے ہوتے تھے، آرمی پولیس حبیب بینک یہ سب ٹیمیں ہمارے کھلاڑیوں کے بل بوتے پر چلتی تھیں۔ربوہ پاکستان میں باسکٹ بال کا سب سے اہم مرکز بن گیا تھا۔ نصیر خان صاحب چوہدری محمد علی صاحب کے علاوہ کچھ ہم جیسے ’’آؤٹ سٹینڈنگ‘‘ یعنی باہر کھڑے ہونے والے،کھلاڑیوں کو باسکٹ بال کھیلنا اور کھلانا پڑا تِلۡكَ الۡاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيۡنَ النَّاسِ۔

کالج قومیا لیا گیا تو بس یوں سمجھ لیجئے صرف ہمارے کالج کا ہی نہیں پاکستان میں تعلیم اور نظام تعلیم کا جنازہ اٹھ گیا۔ہماری قومی زندگی کا سقوطِ تعلیم کا یہ سانحہ سقوطِ مشرقی پاکستان سے بڑا المیہ ہے۔

کالج قومیایا گیا تو اس وقت حضرت صاحب نے ارشاد فرمایا کہ جو واقفِ زندگی جہاں کام کر رہا ہے وہیں کام کرتا رہے جس جس کی ضرورت ہوگی اسے جماعت طلب کر لے گی مگر ایک سانحہ ایسا اچانک ہوا کہ واقفین زندگی میں بہت سے لوگوں کو انجمن کو طلب کرنا پڑا۔ہوا یوں کہ 29 مئی کے واقعہ ربوہ کے بعد حکومت پنجاب کی رگِ انتظامیہ پھڑکی اور اس نے کالج کے سارے سٹاف کو ادھر ادھر

تبدیل کر دیا اور اس باب میں مہاراجہ پٹیالہ جیسی حرکتیں بھی کیں۔ مثلاً ایسی جگہوں پر ایسے سینئر سٹاف کو تبدیل کر دیا جہاں اس مضمون کی کلاسیں ہی نہیں تھیں۔ مثلاً پروفیسر بشارت الرحمن صاحب جیسے سینئر ترین پروفیسر کو چک نمبر 41 ج ب کے انٹرمیڈیٹ کالج میں بھیج دیا جہاں عربی پڑھنے والا ہی کوئی نہیں تھا۔ اسی طرح کسی کو کہیں کسی کو کہیں بغیر سوچے سمجھے تبدیل کر دیا۔ ہم خدا معلوم کس وجہ سے بچ گئے یعنی سارے سٹاف کا تبادلہ ہو گیا اور ہم ٹی آئی کالج سے منسلک رہے۔ چنیوٹ کالج میں ہمارے ایک جونیئر سے دوست تھے جن کا بیٹا ہمارے کالج میں پڑھتا تھا اور ہمارا شاگرد تھا۔ وہ ٹی آئی کالج کے پرنسپل بنا کر بھیج دیے گئے۔ اب سٹاف کیا کرتا؟ یا تو چارج چھوڑ دیتا اور نئی جگہوں پر جا کر اپنا چارج لے لیتا یا کالج سے چھٹی لے لیتا چنانچہ سوائے ہمارے سب کالج سے چھٹی لے کر غائب ہو گئے اور ہماری ذمہ داری یہ ٹھہری کہ ہم نئے پرنسپل صاحب کو جو پرنسپلی کا چارج لینے کے لئے بیتاب ہیں باتوں میں لگا کر بہلائے رکھیں اور چارج نہ لینے دیں۔ چنانچہ ہم نے یہی کیا صبح صبح کالج پہنچ جاتے۔ پرنسپل صاحب چنیوٹ سے تشریف لے آتے ہم انہیں سٹاف روم میں بٹھا کر ادھر ادھر کی ہانکتے رہتے۔ کچھ کاغذوں پر ان کے دستخط بھی ہوتے رہتے مگر چارج ہم نے انہیں نہ لینے دیا۔ وہ باب الحیل جو ہم نے طالب علمی کے دوران کلاسوں سے غائب ہونے کے لئے پڑھا تھا اب بہت کام آیا تا آنکہ حکومت کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا اور سارے تبادلے منسوخ ہوئے تب ہماری جان میں جان آئی۔ اس کی سزا ہم نے جاپان سے واپس آنے کے بعد پائی۔ (ہمارے کالج کے سپرنٹنڈنٹ محمود اسلم صاحب ہماری مساعی کے گواہ ہوں گے کہ ہم نے ایک حاضر پرنسپل کو کس طرح غیر حاضر بنائے رکھا تھا)۔

کالج قومیایا گیا تو سٹاف کی سینیارٹی لسٹ یہ تھی، اتفاق سے وہ لسٹ ہمارے پرانے کاغذوں میں دستیاب ہے اس لئے درج کرتے ہیں کہ کالج نے کتنا اچھا زمانہ دیکھا تھا۔ میاں عطاء الرحمن صاحب

اور پروفیسر حبیب اللہ خان صاحب ریٹائر ہو چکے تھے۔

پروفیسر چوہدری محمد علی پرنسپل

پروفیسر بشارت الرحمن پروفیسر عربی

ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہد ایم ایس سی پی ایچ ڈی لندن۔ پروفیسر کیمسٹری

ڈاکٹر نصیر احمد خان ایم ایس سی علیگ پی ایچ ڈی ڈرہم۔ پروفیسر فزکس

ڈاکٹر ناصر احمد خان پروازی۔ بی اے آنرز ایم اے پی ایچ ڈی (پنجاب)۔ پروفیسر اردو

مسعود احمد عاطف۔ لیکچرار فزکس

مبارک احمد انصاری۔ لیکچرار کیمسٹری

مرزا مجید احمد۔ لیکچرار تاریخ

چوہدری عطاء اللہ۔ لیکچرار فارسی

چوہدری حمید اللہ۔ لیکچرار حساب

مرزا خورشید احمد لیکچرار انگریزی

سعید اللہ خان۔ لیکچرار شماریات

عبدالرشید غنی لیکچرار حساب

چوہدری سلطان اکبر لیکچرار عربی

منور شمیم خالد لیکچرار سوکس

سید حبیب الرحمن، لیکچرار بیالوجی

محمد اسلم صابر لیکچرار عربی

محمد شریف خان لیکچرار بیالوجی

عبدالجلیل صادق لیکچرار انگریزی

محمد عثمان صدیقی لیکچرار اسلامیات

محمد اسلم شاد (منگلا) لیکچرار عربی

مرزا انس احمد لیکچرار فلسفہ (اعلیٰ تعلیم کے لئے چھٹی پر)

چوہدری صادق علی لیکچرار بیالوجی

سعود احمد خان لیکچرار تاریخ

محمد ظفراللہ لیکچرار حساب

مبشر احمد خان لیکچرار فزکس

آصف علی پرویز لیکچرار فزکس

محمد علی تاؤنی۔ لیکچرار فزکس

منور احمد لیکچرار فزکس

مرزا محمد لقمان لیکچرار فزکس

محمد احمد انور لیکچرار اسلامیات ڈی پی ای

رفیق احمد ثاقب۔ لیکچرار کیمسٹری۔ (چھٹی پر)

اختر حسین انصاری لیکچرار کیمسٹری

خادم حسین لیکچرار فزکس

سلطان احمد چوہدری لیکچرار اکنامکس

اظہر وحید لیکچرار کیمسٹری

مبارک احمد طاہر لیکچرار فلسفہ

مبارک احمد عابد لیکچرار اردو

پروفیسر ملک مبارک احمد جز وقتی لیکچرار عربی

اب پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ان لوگوں میں سے کوئی ایک آدھ ہی کالج کے سٹاف پر ہوگا، نصیر احمد خان پروفیسر بشارت الرحمن، مسعود احمد عاطف، چوہدری عطاء اللہ اور جز وقتی استاد پروفیسر ملک مبارک احمد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرزا مجید احمد صاحب کالج چھوڑ گئے۔ چوہدری حمید اللہ مرزا خورشید احمد، محمد اسلم شاد منگلا صاحبان کو جماعت نے خدمت کے لئے طلب کر لیا۔ فزکس کے نوجوان اساتذہ اکثر پی ایچ ڈی کر کے باہر کے ملکوں میں بس گئے کہ واپس جا کر کیا کرتے؟ باقی لوگ ایک ایک کر کے ریٹائر ہوتے گئے۔ اب تو سنا ہے سٹاف کے سب سے آخری سٹاف ممبر عزیزی مبارک احمد عابد بھی ریٹائر ہو گئے ہیں۔ کالج کے در دیوار رہ گئے ہیں وہ بھی سنا ہے کھنڈر ہو چکے ہیں۔ روح جاتی رہے تو یہی ہوتا ہے۔ اڑ گیا روح کا طائر تو یہ صورت نکلی۔ استخواں رہ گیا انساں کی طرح رکھا ہوا۔

ہمارے دکاندار!

کچھ سال پہلے لندن کے ''جنگ'' اخبار میں ایک مذاکرہ شائع ہوا جس میں بعض علمائے کرام نے برسرِ منبر یہ الزام لگایا تھا کہ ربوہ اور قادیان میں ہر دکان پر لکھا ہوتا تھا کہ یہاں کسی غیر احمدی کو سودا فروخت نہیں کیا جاتا۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں قادیان میں پیدا ہوا، پلا اور بڑھا پھر ربوہ میں تعلیم پائی اور یہیں کے کالج میں پندرہ برس سے زیادہ پڑھانے کا موقع ملا مجھے تو ربوہ میں کبھی

کوئی ایسا بورڈ نظر نہیں آیا تھا۔مگر اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ ربوہ اور قادیان کے دکانداروں کے ذکر میں کچھ لکھنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ یہ وہ طبقہ ہے جو عام طور پر مضمون لکھنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ان کی شکایتیں تو لوگ کرتے ہیں ان کی خوبیوں کا ذکر کوئی نہیں کرتا۔

ابھی کچھ دن ہوئے گول بازار کے دکاندار خلیل احمد صاحب کے انتقال کی خبر تھی۔ ان کے صاحبزادوں میں سے نصیر اور حمید سے ہمارا تعلق رہا۔ان سے دودھ دہی اور بعض اوقات لسی خریدنے کا اتفاق ہوتا رہا۔نہایت ایماندار آدمی تھے۔دودھ والوں کے بارہ میں عام تاثر یہ ہے کہ کوئی ہی ایسا رہا ہوگا جو دودھ میں پانی کی ملاوٹ نہ کرے۔ بلکہ ہم نے لوگوں کو دودھ میں پانی کی ملاوٹ کرتے دیکھا ہے۔خلیل صاحب کے ہاں نہایت خالص دودھ ملتا تھا۔ان کے ہاں کی دہی کی لسی اسی لئے دوسروں سے ممتاز ہوتی تھی۔کہ اس میں جو دہی استعمال ہوتا تھا وہ خالص دودھ سے تیار کیا جاتا تھا۔ان کا ذکر آیا تو اپنے کچے بازار کے دکاندار اور دوست فیض کرمانی صاحب کا ذکر بھی نوکِ قلم پر آ گیا۔فیاض خان صاحب کم گو دکاندار تھے۔دراصل ربوہ کے ابتدائی دنوں میں اردگرد کے دیہات سے جو خواتین دودھ لے کر ربوہ میں بیچنے آتی تھیں انہیں ملاوٹ کے طور طریقوں کا پتہ نہیں تھا۔اس لئے نسبتاً آسانی سے خالص دودھ مل جاتا تھا۔ پھر وقت نے انہیں خرانٹ بنا دیا پھر تو وہ وقت بھی آیا کہ ربوہ میں ہمارے یورپ کی اصلاح کے مطابق ہلکا اور فالتو توانائی سے مبرا دودھ ملنے لگا۔مگر ہمارے دکانداروں نے اپنی روایتوں کو نہیں چھوڑا حتیٰ الوسع خالص دودھ خریدتے اور بیچتے تھے۔

قادیان کے دکانداروں میں سے ہمیں بازار کے بہت سے دکاندار یاد آ رہے ہیں۔مگر ہم اتنے چھوٹے تھے کہ ان کے بارہ میں کوئی رائے قائم کرنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔مگر افضل برادرز کی دکان یاد ہے۔ بھائی احمد علی، محمد علی کی سائیکلوں کی دکان یاد ہے۔ پنساریوں میں سے ایک ہندو پنساری تھے ان

کی دکان سے ہمہ وقت قسما قسم کی دواؤں کی خوشبو آتی رہتی تھی۔ پیارے دی ہٹی غالباً کسی ہندو زرگر کی دکان تھی۔ یہ سب لوگ بازار میں نہایت آرام سے دکانداری کرتے تھے۔ وہ جو آج کل کے دکانداروں کے ہاں کاروباری رقابت اور دشمنی ہوتی ہے وہ عنقاء تھی۔ چچا رفیق حیات بلا تکلف ہمسائے کے ہندو پنساری سے دوا منگوا لیتے تھے۔ قادیان کے ماحول کا سب پر ایک جیسا اثر تھا۔ محلہ کے دکانداروں میں ہم نے کئی جگہ اپنے شاگرد ہدایت اللہ ہادی کے والد سید ولایت حسین شاہ صاحب کا ذکر کیا ہے کہ ان کے گلاب جامنوں کا ذائقہ اب تک زبان پر مستحضر ہے۔ شوگر کا مریض ہونے کے بعد تو اب صرف ذائقہ یاد کر لینے پر گزارہ ہے۔ (رہا ہمارا کولیسٹرول؟ وہ تو چکنی چپڑی باتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے)۔

قادیان کے زمانہ میں ابھی یہ کوکا کولا کی بدعت شروع نہیں ہوئی تھی۔ سوڈے کی بوتلیں ہر بازار میں بنتی اور بکتی تھیں۔ قادیان میں دیانت سوڈا واٹر فیکٹری کے نام سے ہمارے ہمسائے چچا عبدالرحیم اور چچا عبداللہ کی فیکٹری تھی۔ دیانت سوڈا واٹر فیکٹری میں رنگا رنگ کی بوتلیں بھری جاتی تھیں۔ سبز رنگ کی بوتلیں کیلے کی بوتلیں کہلاتی تھیں۔ سبز رنگ کی بوتل میں شاید انار کا ایسنس ڈالتے تھے۔ پیلے رنگ کی بوتل میں سنگترے کا ایک ذائقہ ومٹو کہلاتا تھا۔ خدا جانے کس چیز کا ذائقہ تھا۔ کھاری بوتل بھی دستیاب تھی۔ یعنی صرف خالص پانی اور گیس۔ ایسی بوتل بدہضمی کے علاج میں استعمال ہوتی تھی۔ یوسفی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ سوڈے کی بوتلیں بدہضمی یا ہندو مسلم فساد میں استعمال ہوتی تھیں۔ ان کے ہاں ایسا ہوتا ہوگا۔ قادیان میں ہندو مسلم فساد کبھی نہیں ہوا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی ان بوتلوں کا چلن رہا مگر آہستہ آہستہ نئی روشنی کی بوتلیں ''کولا کولا'' کر کے آ گئیں۔ لاہور میں ہم نے ایک پا کولا کی بوتل بھی دیکھی۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ شرفاء شکر کے شربت کو بھی شکر کولا کہنے لگے۔ سب اسی زلف کے

اسیر ہوئے۔رفتہ رفتہ دیسی بوتلوں کا چلن ختم ہو گیا۔اور کولا کی بوتلیں چھا گئیں۔ان بوتلوں کی خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ ہمارے ہاں خالص چینی استعمال ہوتی تھی۔پھر سیکرین آئی پھر اور قسم قسم کے مٹھاس کے ذریعے نکل پڑے جن کی وجہ سے بوتلوں والے کولا کا مقابلہ نہ کر سکے۔ویسے بھی ملٹی ملین ڈالر انڈسٹری کا مقابلہ کوئی ایک گھریلو سوڈا واٹر فیکٹری کیسے کر سکتی ہے؟ ہمارے چچا عبدالرحیم اور چچا عبداللہ کی بوتلیں خالص چینی سے تیار کی جاتی تھیں۔اگر ان میں چینی کی جگہ کوئی اور چیز ہوتی تو ہم نے جتنی مقدار میں ان کا سوڈا واٹر ڈکار ا ہے کب کے جاں بحق تسلیم کر چکے ہوتے۔

قادیان کے دکانداروں میں سے چھابڑی والے بابے ''ماٹے'' کے چنے یاد ہیں۔صاف ستھرے ابلے ہوئے چنے،مرچ مصالحے بھی صاف ستھرے اور خالص اور ان پر کھٹائی کا چھینٹا،ہم لوگ سکول کی آدھی چھٹی کے وقت کھاتے تھے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان چنوں سے پیٹ میں درد ہوا ہو یا بدہضمی کی شکایت ہوئی ہو۔ورنہ چنیوٹ میں آکر صرف ایک بار کسی چنے والے سے چنے کھائے تھے اس نے ناکوں چنے چبوادئے۔

چچا عبداللہ نے فیکٹری ایریا ربوہ میں اپنی سوڈا واٹر کی بساط پھر بچھائی مگر وقت بدل گیا تھا۔اس لئے انہیں یہ بساط لپیٹنا پڑی۔ہم نے ایک دو بار چچا سے کہا کہ کوئی اور کاروبار آپ کیوں نہیں کر لیتے؟ کہتے ''بیٹا کسی اور چیز کا تجربہ نہیں اور اب ہماری عمر نئے تجربے کرنے کی نہیں،ہمیں کسی پرانے شاعر کی رباعی یاد آئی۔

چرخ اب ہمیں جو دے ہے نہیں لیتے ہم
کونین بھی گو دے ہے نہیں لیتے ہم!
ہم لیتے ہیں جس ڈھب سے نہیں دیتا وہ

جس ڈھب سے کہ وہ دے ہے نہیں لیتے ہم

یہ پرانے بزرگوں کی وضع داریاں تھیں۔ان کے ساتھ ہی ان کا چلن بھی ختم ہوا۔

قادیان کے افضل برادرز والے قریشی محمد اکمل صاحب اور قریشی محمد افضل صاحب ربوہ میں آ کر بیٹھے۔یونہی سا خیال آ رہا ہے کہ قادیان میں ان کی دکان کا نام غالباً افضل جنرل سٹور تھا؟ ایک جنرل سٹور ذہن میں ہے جسے ہم اپنی دانست میں جرنل سٹور پڑھا کرتے تھے۔پاکستان میں آ کر تو ''جنرل'' کا لفظ اتنا عام اور بدنام ہو گیا کہ اس لفظ کے معانی ہی بدل گئے۔حالانکہ ربوہ میں کئی جنرل سٹور کھلے اور اب تک کھلے ہیں۔

دودھ دہی والوں کے بعد ہوٹلوں کی باری آتی ہے ہم کسی مضمون میں کچے بازار کے ہوٹلوں کا ذکر کر چکے ہیں۔مگر یہ فیاض کرمانی صاحب دراصل دودھ دہی نہیں بیچتے تھے۔ان کی چائے سیلونی کے مقابلہ میں کم چلتی تھی مگر جو لوگ سیلونی کے ہاں نہیں جاتے تھے۔وہ ان کی خاموش گفتگو سننے کے لئے ان کے ہاں آتے تھے، پھر گول بازار میں خواجہ ریسٹوران کھلا۔خواجہ صاحب،خواجہ عبداللہ سیٹھ صدیق صاحب کے داماد تھے اور صاف ستھری چیزیں بیچتے تھے۔پھر ہمارے خان میر صاحب افغان کے بیٹے بھائی حبیب نے جمال بیکری کے اوپر ایک فردوس ریسٹوران کھولا۔ یہ خواجہ حنیف صاحب والا ریسٹوران ''النعمت'' بہت بعد کی بات ہے۔ربوہ کے سارے ریسٹورانوں کی خصوصیت یہ رہی کہ یہاں دوسرے شہروں کی طرح ٹپ کا کوئی رواج نہیں تھا کیونکہ خدمت کرنے والے ٹپ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ہمیں یاد ہے کہ ایک بار ہمارے ایک دوست یورپ سے گئے ہوئے تھے۔ ایک ریسٹوران میں ہم لوگوں نے چائے پی۔اٹھنے لگے تو بیرے کی ٹپ کے لئے دو روپے میز پر چھوڑ دیئے۔وہ بیرا ہمارے پیچھے بھاگتا بھاگتا آیا کہ صاحب آپ میز پر دو روپے بھول گئے ہیں۔انہوں

نے کہا بھولے نہیں تمہارا انعام ہے۔ کہنے لگا کس چیز کا انعام؟ میں تنخواہ دار کارکن ہوں۔ اور مجھے اسی چیز کی تنخواہ ملتی ہے۔ اس کے برعکس ہم لاہور میں پڑھنے کے لئے گئے تو ہمارا اٹھنا بیٹھنا پاک ٹی ہاؤس میں تھا کیونکہ یہی ایک ادیبوں شاعروں کا ٹھکانا تھا۔ چائے پیتے تو ٹپ بہر حال دینا پڑتی۔ ایک بار ہم نے ایک بیرے سے کہا کہ یار آج ہمارے پاس ٹپ کے پیسے نہیں ہیں کہنے لگا کوئی بات نہیں اگلی بار دے دیجئے گا۔ ادھار سہی۔ پاک ٹی ہاؤس میں مالک سے ہی نہیں بیروں سے بھی ٹپ کا ادھار چلتا تھا۔ ٹی ہاؤس کا ذکر آ گیا تو بتاتے چلیں کہ لاہور کے اچھے شعراء سے ہمارا تعارف یہیں ہوا۔ اور یہ جو ہم ربوہ میں اتنے بڑے بڑے شاعروں کو بلا معاوضہ مشاعروں میں بلاتے اور پڑھواتے رہے یہ اسی دوستی کا فیضان تھا۔ اسی ٹی ہاؤس میں آخری کلام جو ہم نے سنا وہ اقبال ساجد کا تھا۔ اب تو وہ ظالم گزر گیا مگر کیا غزل اس نے سنائی تھی کہ ہم ہی نہیں ہمارے قریب کی میز پر بیٹھے ہوئے لوگ بھی آبدیدہ ہو گئے تھے۔

''پچھلے برس بھی بوئی تھیں لفظوں کی کھیتیاں۔ اب کے برس بھی اس کے سوا کچھ بھی نہیں کیا غربت بھی اپنے پاس ہے اور بھوک ننگ بھی۔ کیسے کہیں کہ اس نے عطا کچھ نہیں کیا''

یہ مضمون ہم آزاد تلازمۂ خیال کی تکنیک میں لکھ رہے ہیں۔ اور ایسے مضامین میں یہی ہوتا ہے۔ کہ ذہن اچانک کسی دوسری بات کی طرف مڑ جاتا ہے اور اہل ادب کہتے ہیں کہ ایسی باتوں کا کوئی نہ کوئی باطنی رابطہ ضرور ہوتا ہے اس لئے ذہن کو جھٹکنا نہیں چاہیے۔ جو بات آ جائے اسے لکھ دینا چاہیے۔ چنانچہ ہم بھی اسی طرح کر رہے ہیں تا کہ مضمون کی دلچسپی برقرار رہے۔

ریسٹورانوں سے چلے تو ربوہ کے کریانے والوں تک بات پہنچی۔ کچے بازار میں شیخ برادران تھے۔ دو بھائی تھے ایک کا نام شاید قدرت اللہ تھا دوسرے کا عصمت اللہ۔ بڑے بھائی کے بیٹے سمیع ہمارے ساتھ سکول میں تھے۔ اب خدا معلوم وہ لوگ کہاں ہیں مگر ان کی دکان واحد دکان تھی۔ جہاں

سے کریانہ کا سامان دستیاب تھا۔اس زمانہ میں ملاوٹ کا لفظ صرف کتابوں میں ملتا تھا پھر کتابوں سے نکل کر لوگوں کی زبان پر آ گیا اور ہر شے میں ملاوٹ ہونے لگی۔مگر ربوہ میں چیزیں خالص ملتی تھیں۔ بزرگوارم سردار مصباح الدین صاحب اور کئی دوسرے بزرگ جو چنیوٹ میں رہتے تھے ربوہ سے کریانہ کا سامان خریدتے تھے۔کہ بلا سے ذرا سا مہنگا ہے تو ہو خالص تو ہے۔سبزی والے خواجہ محمد شریف صاحب کچے بازار میں اکیلے ہی تھے مگر سبزی صاف ستھری اور تازہ بیچتے تھے۔گاہکوں سے مروت اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ان کی دکان عین مسجد کے سامنے تھی نماز کا وقت ہوتا تو سب سے پہلے مسجد میں پہنچتے۔اگر ایسے وقت میں کسی کو کچھ خریدنا ہوتا تو اسے انتظار کرنا پڑتا۔ان کے بیٹوں میں سے سلیم ہمارا کلاس فیلو اور دوست تھا باقی تو بڑے تھے۔اب ان کے بیٹوں میں سے جمیل، بسوں کے اڈہ پر چائے کی دکان کھولے بیٹھا ہے۔خواجہ حنیف ہیرو کہلاتے تھے۔اور کبڈی کے کھلاڑی تھے۔وہ اور ان سے چھوٹے خواجہ مجید اللہ کو پیارے ہو گئے۔خواجہ شریف صاحب نے جوان بیٹے خواجہ حنیف کی وفات کا صدمہ دیکھا۔مگر ہم نے انہیں صابر شاکر اور راضی برضا پایا۔پھر گول بازار اور غلہ منڈی کی بنیاد پڑی۔کریانہ والوں میں لاہور ہاؤس بہت مشہور ہوا۔مگر پھر وہ کریانہ کی بجائے لوہا بیچنے لگے۔ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا! خواجہ عبدالحئی ہمارے خواجہ عبدالمومن صاحب اور خواجہ باسط اور جلیل کے والد بھی کریانہ کا کام کرتے رہے۔خواجہ عبدالمومن صاحب تو کپڑے کے کاروبار میں رہ کر ناروے آ بیٹھے۔خواجہ عبدالباسط ڈنمارک والوں کا ننگ ڈھانپنے کی تگ ودو میں ہیں۔

خیاطوں میں بھائی عبدالسلام بھی ربوہ میں جانے پہچانے تھے۔حضرت صاحب کی شیروانیاں آپ ہی سیتے رہے۔ایک بار لندن کے جلسہ سالانہ پر ملاقات ہو گئی۔بہت خوش تھے کہ حضرت صاحب کی خیاطی کے ناطے جلسہ سالانہ پر آنے کا موقع مل گیا۔اسی جلسہ پر بھائی عبدالرزاق کریانہ

والے بھی ملے۔ان کی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ لندن کا سفر اختیار کر سکتے مگر اللہ تعالیٰ نے ایسا جذبہ دیا تھا کہ جلسہ پر آ گئے۔ ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے زندگی کا کیا پتہ سوچا حضرت صاحب کے دیدار سے آنکھوں کو روشن کرلوں۔اتنا کہہ کر آواز رندھ گئی۔کچے بازار میں کریانہ کی معمولی سی دکان تھی مگر خلوص و اخلاص کی دولت سے مالا مال تھے۔

مٹھائی والوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کیونکہ ہم میٹھے سے اتنے ڈرے ہوئے ہیں کہ میٹھی میٹھی باتوں سے پرہیز روا رکھتے ہیں۔ بھائی عبدالکریم صاحب کی برفی اللہ اللہ اس کا ذائقہ، دور دور تک جاتی تھی۔مگر ان کے ساتھ بھی وہی ہوا۔یعنی برفی چھوڑ کر لوہے پر آ گئے۔ان کے بیٹے ہمارے شاگرد ہوئے۔عبدالکریم صاحب نہایت دعا گو مسکین طبیعت آدمی ہیں۔ہم نے کبھی انہیں مطلب سے زیادہ بات کرتے نہیں دیکھا۔ان کی برفی کا چراغ گل ہوا تو البشریٰ کے چوک میں محمود صاحب کی برفی مشہور ہوئی۔مٹھائی کی اور دکانیں بھی ربوہ میں رہیں۔منڈی میں بھائی اللہ بخش صاحب بہت مشہور تھے۔ان کے بیٹے ہمارے شاگرد تھے۔ پان اور تمباکو کی دکانیں ربوہ میں تھی ہی کتنی؟ گنی چنی تھیں۔ جب تک ہم سگریٹ نوشی کی علت میں مبتلا تھے ایک دو دکانداروں کی دکان ہی ہمارے دم قدم سے چلتی تھی۔منڈی میں بھائی غلام احمد کے بچوں کی دکان اور گول بازار میں خواجہ صاحب کی دکان۔ پان منڈی کے بھائی غلام احمد کا ہی زیادہ چلا، کہ اس محلہ میں پان خوروں کی اکثریت تھی۔حکماء بھی ربوہ کی پہچان رہے۔حکیم خورشید احمد صاحب تو بہت بعد میں حکمت کے میدان میں آئے مگر آگے نکل گئے کیونکہ کاروباری سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ہمارے دوست اسلم فاروقی کی حکمت تو صرف حکمت چھانٹنے تک محدود رہی اب سنا ہے خوب چل رہی ہے۔ڈاکٹر محمد احمد سرساوی کا بیٹا احمد سنا ہے حکمت میں بڑا رواں ہے۔ربوہ میں سب سے پہلے دواخانہ خدمتِ خلق کھلا۔قبلہ سید بشیر احمد شاہ صاحب اور بھائی

عبدالعزیز دو ہی دواخانہ خدمتِ خلق کے کارکن تھے۔ دونوں کی اولاد ہماری شاگرد رہی۔ ناصر دواخانہ والے حکیم محمد رفیع ناصر صاحب گول بازار میں آ کر بیٹھے۔

ربوہ کے ڈاکٹروں میں سے ایک ڈاکٹر بشیر احمد صاحب ملٹری کراس والے خاصے مشہور ڈاکٹر تھے۔ ان کے ہاتھ میں شفا بھی بہت تھی۔ ڈاکٹر صاحب اپنا نسخہ خود تیار کرتے تھے۔ وہ پیٹنٹ دوائیوں پر انحصار نہیں کرتے تھے۔ یہی حال ڈاکٹر محمد احمد سرساوی صاحب کا تھا۔ اب تو ربوہ میں ڈاکٹروں کا وہ عالم ہے کہ دور دور سے لوگ علاج کروانے ربوہ آتے ہیں۔ کسی زمانہ میں صرف ڈاکٹر حشمت اللہ خان صاحب اور میاں منور احمد صاحب ہوتے تھے۔ ہمارے دوست ڈاکٹر لطیف احمد قریشی پہلے سپیشلسٹ تھے جو ایم آر سی پی کر کے ہسپتال میں آئے اور بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئے (اب وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایف آر سی پی ہیں)۔ پھر ڈاکٹر مرزا مبشر احمد ایف آر سی ایس کر کے آئے پہلی ایم بی بی ایس لیڈی ڈاکٹر ہماری ڈاکٹر فہمیدہ عظمت آئیں ان کے بعد ڈاکٹر نصرت جہاں ایف آر سی ایس کر کے آ گئیں۔ غرض اب تو ہسپتال سپیشلسٹوں سے بھرا پڑا ہے۔ لیبارٹریاں بھی کھل گئی ہیں۔ پھر آبادی بڑھی تو ضروریات بڑھیں اور اب تو گلیاں بازاروں میں تبدیل ہوگئی ہیں اور ہر کارنر پلاٹ دوکان یا مارکیٹ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر راجہ جو کہ ہمارے دوست بھی ہیں نے سب سے پہلے اپنے شفا خانہ کا شعبہ حیوانات کھولا۔ اکسیرِ اپھارہ ان کی دوا بہت مشہور ہوئی اور ان کا یہ مصرعہ اس سے بھی زیادہ کہ ''راجہ سے کہو بھیج دے اکسیرِ اپھارہ''۔ پھر تو ان کے ہاں کیوریٹو کی وہ ریل پیل ہوئی کہ اب مریضوں کو محض دوا سونگھا کر ہی شفا یاب کر لیتے ہیں۔ لندن میں ان سے ملاقات ہوئی تو ہم نے انہیں کہا کہ آپ کا اشتہار پڑھ کر ہماری تو دل کی تکلیف رفو چکر ہوگئی ہے۔ آپ کون سی سیاہی استعمال کرتے ہیں؟ حسب عادت ہنس دیئے۔ جواب نہیں دیا سوچتے ہوں گے اس کا منہ بند کرنے کے لئے کوئی کیور ایجاد کروں تو

یہ چپ ہو۔ بہر حال ہمارے عزیز دوست ہیں اور ہم دوستوں سے چھیڑ چھاڑ نہ کریں تو کس سے کریں؟ اب تو مرحوم ہوئے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے اپنی وضع کے آدمی تھے۔

جنرل سٹور بھی ربوہ میں بہت کھلے۔ افضل برادرز تو قادیان سے چلے ربوہ میں آ کر رکے۔ مگر قریشی افضل صاحب اللہ تعالیٰ انہیں صحت سلامتی سے رکھے تو کہیں باہر تھے ان کے بھائی قریشی اکمل صاحب نے کام شروع کیا۔ ان کے بیٹے قریشی انور کی تصویر دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ اس شخص نے تو دھوپ میں سفید کر لیے اللہ اس کی مساعی میں برکت ڈالے سنا ہے نہایت کامیاب مربی ہیں۔ اللہ کا احسان ہے۔ پھر ایک داؤد جنرل سٹور والے داؤد اور بشارت دو بھائی تھے۔ پنڈی چلے گئے تھے اب سنا ہے کینیڈا میں جا بسے ہیں مگر ہم سے تو ان کا آمنا سامنا نہیں ہوا۔ (بات پرانی ہوئی اب تو داؤد صاحب سے اکثر ملاقات رہتی ہے سلسلہ کے کاموں میں مستعد ہیں)۔ ان کی دکان کی جگہ اب نوید جنرل سٹور ہے۔ نوید صاحب کے بیٹے پچھلے برس جرمنی میں ملے اور ہماری خوب خدمت کی اللہ انہیں خوش رکھے۔ اعزاز جنرل سٹور تو اعزاز کے باسکٹ بال کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوا۔ اب اعزاز بھی جرمنی ہے ہمیں دعوت پر اس نے بلایا جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا چار منزلیں سیڑھیاں کی چڑھنی پڑیں گی ہم معذرت کر کے واپس آ گئے، کہ سیڑھیاں چڑھنا منع ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ چڑھتے چڑھتے ویسے ہی چوتھے آسمان پر پہنچ جائیں۔ منڈی میں ہمارے شاگرد آفتاب نے فینسی جنرل سٹور کھولا۔ آفتاب بڑا نفیس اور خاموش طبع لڑکا ہے۔ اس کی دوکان بھی خوب چلی پھر خدا معلوم کیا ہوا وہ دوکان بیچ کھوچ کر کہاں گیا؟۔ دارالخیر جنرل سٹور والے امین صاحب تو منڈی سے اٹھ کر عین ہمارے پڑوس میں اپنی دکان سجا کر بیٹھ گئے۔ ہاں ہمارے پیر مبارک اللہ بخشے ان کا مون لائٹ جنرل سٹور بچوں میں بہت مقبول تھا۔

ہم نے دو آئرن سٹوروں کا ذکر تو کیا مگر مجید آئرن سٹور کو بھول گئے۔ حالانکہ مجید صاحب کے بچے

ہمارے بچوں کے ہم عمر ہی نہیں لنگوٹیے بھی ہیں۔ بلکہ ان کے پوتے تو ہمیں دادا جان کہا کرتے تھے۔ بجلی کی دکان والوں نے اپنی روایت قائم رکھی۔یعنی جس طرح بجلی بے اعتباری ہے یہ لوگ بھی بے اعتبار ہی رہے۔ ہمارے شاگرد مجید جب احمد الیکٹرک سٹور کے نام سے اپنی دوکان کھول کر بیٹھے تو ہم نے کہا بیٹے! اس پیشہ میں مثال قائم کرو مگر اسے موت نے فرصت نہ دی۔ جوانی ہی میں گزر گیا۔نصیر بندہ بھی باسکٹ بال کھیلتے کھیلتے اب البرق میں بیٹھا ہے بجلی کے ذکر میں ہم نے بے اعتباری کا ذکر کیا ہے تو اپنے ضمیر جعفری صاحب یاد آ گئے۔ ان کا شعر واپڈا پر ہر حرفِ آخر ہے ''یا الہ العالمین کوئی خوشی خالص بھی دے برق پیدا کی ہے تو پھر واپڈا پیدا نہ کر''۔

ربوہ کے دوکانداروں کی جس خصوصیت کا ذکر ہم نے کیا وہ پھر دہرا رہے ہیں کہ ان لوگوں میں دوسرے شہروں کے دوکانداروں میں نمایاں فرق یہ تھا۔ کہ ان کے بارہ میں گاہک کو یقین رہتا تھا کہ وہ اسے دھوکا نہیں دے رہے۔ کالج کے غیر از جماعت طلباء سے بڑھ کر ان دوکانداروں کے بارہ میں کون گواہی دے سکتا ہے۔ ہمیں سینکڑوں ایسے غیر از جماعت شاگرد ملتے رہے جو ربوہ کے دوکانداروں کی تعریف ہی کرتے رہے۔ ایسے لوگ بہت شاذ ملے جنہیں ان لوگوں سے شکایت رہی ہو۔ ہمارے شاگردوں میں سے اکثر طلباء جماعت سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ کالج میں ہم لوگ احمدی اور غیر احمدی طلباء میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتے تھے۔ ہم دو بار کینیڈا گئے دونوں بار غیر احمدی طلباء کی ایک معتدبہ تعداد ہمیں دور دور سے ملنے کو آئی۔ احمدی طلباء تو جماعت کے جلسہ پر آئے ہوئے تھے۔ غیر احمدی طلباء نے محض ہماری ملاقات کے لئے سفر کی زحمت اٹھائی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزا دے۔ اب کے چوہدری محمد علی صاحب بھی تشریف لے گئے تو امریکہ سے غیر احمدی طلباء انہیں ملنے کے لئے آئے۔ تعلیم الاسلام کالج محض کالج نہیں تھا ایک مکمل انسٹی ٹیوشن تھا۔ ان میں سے ایک بچے نے کہا کیا ربوہ میں اب

بھی نماز کے وقت دکانیں بند ہو جاتی ہیں؟ ہم نے کہا ہوتی تو ہیں مگر دھڑکا ہی لگا رہتا ہے، کہ کہیں کسی کے جذبات نہ مجروح ہوتے ہوں۔ وہ بچے اب بھی ربوہ کے ماحول کو یاد کرتے اور دو کانداروں کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ بات کیا کم ہے؟ ربوہ کے دو ایسے دکاندار تھے، جن کی اجارہ داری تھی۔ جمال بیکری والے میاں خدا بخش اور خوشی محمد اور کبابوں والے عبدالمنان! مگر ان کی اجارہ داری ان کی کوالٹی پر کبھی اثر انداز نہیں ہوئی۔ ہم نے امریکہ کے دو باشندوں کو جمال بیکری کی روٹی اور منان کے کبابوں کو یاد کرتے دیکھا اور خوش ہوئے۔ یہ لوگ اپنے رنگ میں ربوہ کا نام روشن رکھے ہوئے ہیں۔ ربوہ کے خیاط رہے جاتے ہیں حالانکہ یہی لوگ ہیں کہ ہمارے کپڑے سیتے اور ہمارا ننگ ڈھانپتے رہے۔ ابتداء میں ایک چچا مہر دین ہوتے تھے ان کا بیٹا ہمارا دوست تھا۔ آج کل انجمن کے کسی دفتر میں خدمت پر مستعد ہے۔ جامعہ میں قبلہ حضرت مولانا جلیل صاحب کے ساتھ رہائش اختیار کی تو پڑوس میں عبدالرزاق صاحب جامعہ کے پی ٹی رہتے تھے۔ ان کے بھائی عبدالستار اور ابا، بابا جی نام ذہن سے اتر رہا ہے کیونکہ سب انہیں ہمیشہ ہی بابا جی کہتے تھے۔ بابا جی نہایت مشاق خیاط تھے۔ اس باب میں بڑی بے فکری رہتی تھی کہ کپڑا وقت پر اور عمدہ سلا ہوا گھر بیٹھے بٹھائے مل جاتا تھا۔ عبدالرزاق صاحب نے تو

پی ٹی کروانے کے ساتھ اپنے بیٹے عزیزی عبدالرؤف کے نام سے بچوں کی لکھنے کی کاپیاں بنانے کا کام شروع کر رکھا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس میں بڑی برکت دے رکھی تھی۔ اب تو رؤف بک ڈپو اچھا خاصہ ادارہ ہے۔ بھائی عبدالستار کے صاحبزادے عزیزی عبدالماجد طاہر لندن میں خدمت سلسلہ پر مستعد ہیں اور داماد عزیزی عبدالکریم خالد صاحب لاہور میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ ایک بار ان کی ایک نہایت خوبصورت نظم الفضل میں چھپی تو ہم نے انہیں داد کا خط لکھا بڑی محبت کا جواب آیا۔ اس کے

بعد اب لمبی چپ اور تیز ہوا کا شور۔

جفت سازوں میں سے بھائی بشیر کا ذکر کسی جگہ ہو چکا ہے۔ بابے مانجھے کا ذکر تو حضرت صاحب نے کسی خطبہ میں فرمایا ہے۔ اپنی وضع کے آدمی ہیں یا تھے۔ پاؤں سے معذور تھے۔ لائبریری کے سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھتے تھے۔ سردی گرمی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ ربوہ میں سب سے پہلے محمد احمد نظام صاحب نے فوٹو گرافی شروع کی۔ نظام صاحب کے صاحبزادے اطہر نے یہ کام جاری رکھنے کی کوشش کی مگر زمانہ بدل گیا۔ اب تنویر سٹوڈیو والے احمد زمان تنویر ہمارے حافظ محمد رمضان صاحب کے صاحبزادے ربوہ والوں کی تصویریں کھینچتے ہیں ورنہ وہ وقت بھی تھا۔ کہ کالج کی تقریبات کی تصویریں کھنچوانے کے لئے لاہور سے فوٹو گرافر منگوائے جاتے تھے۔ جوتوں کی دکانیں تھیں ہی کتنی؟ البتہ رشید بوٹ ہاؤس والے بھائی رشید ہمارے استاد مولانا غلام احمد صاحب بدوملہوی کے بیٹے تھے۔ ان کی اولاد نے ان کا کام غالباً نہیں سنبھالا اور نوکریاں کرنے لگے۔ ربوہ کی پہلی پہلی کپڑے کی دوکان حبیب کلاتھ ہاؤس یاد آئی۔ حبیب اللہ خوب وضع دار آدمی تھے۔ ان کے صاحبزادے مولوی بشیر احمد صاحب سیالکوٹی حضرت میاں بشیر احمد صاحب کے دفتر کے ہیڈ کلرک اور ہمارے ''افسر'' تھے۔ اپنے ابا کی وفات پر ابا کا کاروبار سنبھال کر بیٹھ گئے۔ انہیں بابا جی حبیب اللہ کی ایک صاحبزادی انگریزی کی پروفیسر ہوتی تھیں سعیدہ حبیب۔ ہمارے دوکاندار طبقہ کے لوگ بھی بچوں کی تعلیم و تربیت سے غافل نہیں ہوتے تھے۔ ربوہ کالج کی متعدد برکتوں میں سے یہ ایک برکت ہے کہ اہل ربوہ کی ہر نئی نسل پڑھی لکھی نسل ہوتی ہے۔ ربوہ کو اب بھی پاکستان میں سو فیصد تعلیم کا جزیرہ کہا جا سکتا ہے۔ لڑکیاں ہوں یا لڑکے سب ہی زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوتے ہیں۔ بلکہ ایک مدت تک تو ربوہ میں ایم اے پاس لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ رہی۔

بھائی محمد اسحاق صاحب احمدیہ ماڈرن سٹور والے ابتدائی جنرل سٹور والے تھے۔ پھر گھڑی سازی پر آ گئے۔ ویڈیو اور ٹی وی بھی بیچتے رہے۔ ان کے داماد ڈاکٹر ظفر اللہ اپنے زمانے میں حساب کے اور پان کے رسیا تھے۔ اب امریکہ کی کسی یونیورسٹی سے منسلک ہیں۔ حساب سے اتنے شغف کے باوجود ہمارے چہیتے شاگرد تھے۔ بہت غربت میں پرورش پائی مگر اللہ نے اب خوب کشائش دے رکھی ہے۔ ان کے بھائی اشرف بھی الحق صاحب ہی کے داماد ہیں۔ ربوہ کے دکانداروں کا ذکر آیا تو حکایت دراز تر ہو گئی۔ یہ لوگ بھی معاشرہ کا اہم جزو ہوتے ہیں اور توجہ کے مستحق ہوتے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو اہل ربوہ کی خدمت کی جزا دے۔ خدمت اور دیانت اور شرافت کے اعلیٰ اخلاقی معیار پر قائم رکھے۔ آمین۔

جلسہ سالانہ اور آب خورے

ہم نے جس بستی میں آنکھ کھولی وہ عجیب بستی تھی۔ آبادی تھوڑی تھی مگر مہمانوں کا آنا جانا بہت تھا۔ جاپان کے اوساکا شہر کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس کی آبادی دن میں ایک کروڑ اور رات میں پانچ لاکھ ہوتی ہے یعنی اس شہر کی دن کی آبادی میں کمیوٹرز یعنی عارضی طور پر سفر کر کے آنے والوں میں اور مستقل قیام کرنے والوں میں ایک اور بیس کا تناسب ہوتا ہے لوگ تیز رفتار گاڑیوں سے آتے اور اپنا اپنا کام کر کے اپنے اپنے مستقر پر واپس چلے جاتے ہیں۔ ہم جس بستی کا ذکر کر رہے ہیں اس میں لوگوں کا آنا جانا بھی اسی حساب سے ہوتا تھا۔ مہمانوں میں اور مقیموں میں ایک اور بیس کا تناسب تھا۔ وہاں یہ تناسب سال بھر قائم رہتا تھا سال کے آخری مہینے میں تو مہمانوں کا وہ اژدھام ہوتا کہ سکونت کی سہولتیں ہر سال کم پڑ جاتیں اور مکینوں کو وَسِّعْ مَکَانَکَ کا اہتمام کرنا پڑتا۔ وجہ یہ تھی اس بستی میں سال

کے سال ایک سالانہ جلسہ ہوتا تھا جس میں لوگ دور دور سے شرکت کے لئے آتے تھے۔ دسمبر کا مہینہ پنجاب میں خاصی سردیوں کا مہینہ ہوتا ہے اس لئے مہمان آتے تو اپنا اپنا بستر ہمراہ لے کر آتے جلسہ کے منتظمین ان کے سونے لیٹنے کے لئے پرالی کا فرش بچھا دیتے اور وہ لوگ اسی پر سکڑ سمٹ کر آرام پاتے دن کو جلسہ میں شرکت کرتے رات کو چین کی نیند سوتے۔ چھوٹے بڑے فرشِ زمین پر مگن ہو کر سوتے۔ کھانے کے لئے بھی برتن کہاں سے آتے منتظمین مٹی کے عارضی برتن بنوا رکھتے پیالے، جن میں سالن ڈالا جاتا اور آب خورے جن میں پانی پیا جاتا۔ مدتوں بعد یورپ میں ایک یورپی بزرگ سے ملاقات ہوئی انہوں نے ایک چیز سینت سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ کہنے لگے ایک نادر چیز دکھاؤں؟ تبرک ہے۔ دیکھا تو مٹی کا ایک آب خورہ تھا۔ کہنے لگے جب میں پہلی بار جلسہ پر 1944ء میں گیا تھا تو نشانی اور تبرک کے لئے لے آیا تھا۔ ہم نے بھی اس آب خورہ کو اٹھایا اس میں وطن کی مٹی کی خوشبو آئی۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ اس میں پانی پیتے ہوئے وہ ٹھنڈک اور تازگی محسوس نہ ہوئی جو وہاں جلسہ کے آب خوروں سے مخصوص تھی مگر یہی کیا کم تھا کہ وطن کی مٹی تھی اور جانے اس ارضِ مقدس کے کس ''حسن کوزہ گر'' نے اس کو بنایا تھا، بعض چیزیں کس طرح نایاب ہو جاتی ہیں اور ان کی قدر و قیمت وقت گزرنے کے بعد متعین ہوتی ہے۔ آب خورے تو عارضی ضرورت کے تحت بنائے جاتے تھے لیکن اس یورپی دوست کی عقیدت نے اس عارضی چیز کو ایک دوام دے دیا۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی چھوٹی نہیں رہتیں بڑی ہو جاتی ہیں۔ ہمیں یاد ہے جلسہ ختم ہو جاتا تو ہم بچے ان آب خوروں کو اکٹھا کر کے زمین پر پٹختے اور ان سے کھیلتے پھرتے تھے کیونکہ جانتے تھے کہ ان کا مصرف ختم ہو چکا اب اگلے برس نئے آب خورے بنیں گے۔

ہمیں بچپن ہی سے جلسہ سالانہ کے موقع پر مہمانوں کی خدمت کی توفیق ملتی رہی۔ چھوٹے تھے تو

صرف پانی پلانے کی خدمت ملتی اس لئے جلسہ سالانہ کے ساتھ ہمارا تعلق آب خوروں کی وجہ سے قائم تھا۔ ذرا بڑے ہوئے تو کھانا پیش کرنے کی خدمت ملنے لگی۔ پیش کرنا کیا؟ ہوتا یہ تھا کہ بالٹی میں سالن اٹھا کر زمین پر بیٹھے ہوئے مہمانوں کی قطار تک پہنچتے اور باری باری ہر ایک کے مٹی کے پیالے میں سالن یا دال جو کچھ بھی ہوتا وہ حصہ رسدی ڈالتے جاتے۔ ختم ہو جاتا اور مزید کی ضرورت ہوتی تو مہمان پیار سے آواز دیتے کہ بیٹا سالن چاہئے۔ اس خدمت میں اتنا لطف آتا کہ اب تک اس خدمت کو ترستے ہیں۔ روٹیاں تنوروں میں پکتیں اور مہمانوں تک گرما گرم پہنچائی جاتیں۔ لنگر خانہ سے مہمانوں کی فرودگاہوں تک انہیں کیسے لایا جاتا تھا ہمیں اس کے بارہ میں اتنا ہی پتہ ہے کہ ٹوکروں کے ٹوکرے خدام سروں پر اٹھا کر لاتے اور فرودگاہوں کے پاس لا کر رکھ دیتے وہاں سے ہم لوگ جو خوردسال تھے روٹیاں اٹھا اٹھا کر اندر تہ در تہ لگا دیتے اور کھانے کے وقت مہمانوں میں تقسیم کرتے۔ کچھ بچے روٹی تقسیم کرتے کچھ سالن۔ جو بہت چھوٹے ہوتے انہیں پانی پلانے کی ڈیوٹی سونپی جاتی۔

جلسہ سالانہ سے بہت پہلے محلوں میں انتظامات شروع ہو جاتے کہ کون کتنے مہمان اپنے گھر میں ٹھہرا سکتا ہے؟ لوگ باگ بڑے اخلاص کے ساتھ مہمانوں کے لئے اپنے گھروں کو پیش کرتے اور مرکزی تنظیم والوں کو مطلع کر دیتے کہ ہمارے ہاں اتنے کمرے ہیں اور ہم ان کمروں میں سے اتنے کمرے مہمانوں کی خدمت کے لئے پیش کر سکتے ہیں۔ ہمارے اپنے گھر کا عالم یہ تھا کہ ایک بڑا کمرہ تھا اور ایک چھوٹا سا کوٹھڑی نما کمرہ۔ ساتھ میں ایک چھپر سا تھا جسے باورچی خانہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا بعد میں سڑک کے رخ ایک کمرہ اور بن گیا جسے ہم لوگ بیٹھک کہا کرتے تھے۔ اس ڈھائی کمرہ والے مکان میں اللہ کے فضل سے ہم، ہمارے امی ابا، ہمارے پھوپھا پھوپھی جی، بھائی جان محمد احمد ہمارے دادا اور دادی سب کی سمائی رہتی تھی۔ جلسہ کے لئے سب لوگ ایک بڑے کمرے میں سمٹ

جاتے بیٹھک ان مہمانوں کے لئے وقف کر دی جاتی جو جماعت کے انتظام کے تحت ہمارے ہاں قیام کے لئے آتے تھے۔ہمیں یاد ہے مرزا عبدالرحیم بیگ صاحب کا خاندان ہمارا مہمان ہوتا تھا۔ پھر بابا برکت علی صاحب برما والے بھی آتے رہے۔ یہ مہمان ان مہمانوں کے علاوہ ہوتے تھے جو جلسہ کے موقع پر چنگا بنگیال اور راولپنڈی کے اور علاقوں سے ہمارے ہاں تشریف لاتے۔ بھائی فیض عالم خان چنگوی بھائی ہدایت اللہ بنگوی یہ سب لوگ اپنے اپنے خاندانوں سمیت آتے اور جلسہ کے دنوں میں خوب رونق رہتی۔ جلسہ گاہ ہمارے گھر سے بالکل قریب پڑتی تھی تعلیم الاسلام کالج کے میدان میں۔ اینٹوں سے عارضی سٹیڈیم سا بنایا جاتا اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو دو تین سیڑھیوں والے پشتے بنائے جاتے اوران پر لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر رکھ کر بیٹھنے کی جگہ بنا دی جاتی وہ زمانہ تھا کہ لاؤڈ سپیکر نئے نئے آئے تھے اس لئے ان کا انتظام بھی ہوتا تھا مگر جلسہ گاہ اس طرح بنائی جاتی تھی کہ لاؤڈ سپیکر کے بغیر بھی آواز سب لوگوں تک پہنچ جائے۔اس زمانہ میں پچاس ساٹھ ہزار آدمیوں تک آواز پہنچانا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا اب وہ دن آ گئے ہیں کہ پانچوں براعظموں میں بیک وقت امام کی آواز نشر ہوتی اور پہنچتی ہے۔

اوپر جن بابا جی برکت علی برمی کا ذکر ہوا یہ برما کے رہنے والے تھے اور ہمارے ابا جب برما میں مبلغ تھے تو ان کی تبلیغ سے احمدی ہوئے تھے۔ ابا جی بتایا کرتے تھے کہ میں ان سے بہترا کہتا کہ امام مہدی کے آنے کے تمام نشان ظاہر ہو چکے مگر ان کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہر نشان کو ظاہر میں پورا ہوتا دیکھنا چاہتے تھے کہ ہاتھ اور کان گز گز بھر کے ہو جائیں گے جو کچھ انہوں نے اپنے علماء سے سنا ہوا تھا انہیں بہ صورتِ ظاہر نظر نہیں آتا تھا۔ ابا کہتے ہیں ایک بار وہ رنگون سے کوئی دو تین سو میل کے فاصلہ پر واقع کسی شہر غالباً مانڈلے گئے۔ ابا جی کو اللہ تعالیٰ نے تدبیر سجھائی۔ آپ نے انہیں فون کیا اور کہا بابا جی

میں رنگون سے بات کر رہا ہوں اور صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کے کان اتنے لمبے ہو گئے ہیں کہ آپ تین سومیل سے میری بات سن رہے ہیں۔اتنا کہہ کرفون بند کر دیا۔ بابا جی نے واپس آتے ہی ابا جی کو بلا بھیجا اور بیعت کر لی۔ یہ بڑا مخلص خاندان تھا پھر توان کے بیٹے محمود صاحب ہماری ایک منہ بولی بہن آپا عزیزہ سے بیاہے گئے۔ (یہ آپا عزیزہ عزیزم مبارک احمد عابد کی خوش دامن ہیں) بابا جی برکت علی برمی کا خاندان جلسہ کے ناطے سے ہمارے ساتھ متعارف ہوا۔اسی طرح مرزا عبدالرحیم بیگ صاحب کا خاندان اسی ناطے سے ہمارا مہمان ہواان کے قبلہ والد صاحب غالباً عبدالحکیم ان کا اسم گرامی تھا پہلی بار جلسہ کے انتظام کے تحت ہمارے ہاں قیام کے لئے تشریف لائے تھے۔مہمانداری کا وہ سلسلہ عمر بھر کی شناسائی اور دوستی میں بدل گیا۔ربوہ میں بھی بھائی مرزا عبدالرحیم بیگ شروع شروع میں ہمارے ہاں ہی قیام فرماتے رہے۔ یہ برکتیں جلسہ کے ساتھ مختص تھیں۔اب دوسرے مما لک میں ان کا ایک ادنیٰ سانمونہ تو نظر آ جاتا ہے مگر وہ رونقیں کہاں سے لوٹ کر آئیں؟ ہر ملک میں جلسہ ہونے لگتا ہے تو وہاں کے امیر دوستوں سے کہتے ہیں کہ باہر سے آنے والے مہمانوں کے لئے اپنے مکانوں میں جگہ پیش کریں لوگ کرتے ہوں گے اس طرح نئی اخوتیں اور نئے تعلقات جنم لیتے ہوں گے جو پہلے سے موجود احمدیت کے رشتہ میں مزید استواری کا موجب بنتے ہوں گے۔اب تو جماعت اللہ کے فضل سے اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہر ملک میں ایک ایک خاندان کے کئی کئی جاننے والے اس ملک کے مرکز میں موجود ہوتے ہیں مگر دو چار برس پہلے جرمنی میں جو نظارہ دیکھنے میں آیا وہ بھی عجیب نظارہ تھا کم وبیش پچاس ہزار آدمی جلسہ پر پہنچے ہوئے تھے۔فرینکفرٹ اورمن ہائم اور ہائیڈل برگ کی اپنی آبادی تو اس قدر نہیں کہ اتنے مہمانوں کوفرودگاہیں فراہم کرسکتی مگر لوگ سما گئے اور کوئی دقت نہیں ہوئی ہو تو ہوئی ہو کم از کم رہائش کی کوئی دقت نہیں ہوئی نہ کھانا فراہم کرنے میں کوئی دشواری ہوئی۔ہم نے ایک

جرمن دوست کو بتایا کہ مہمان داری کی روایت ہماری جماعت کی دیرینہ روایت ہے وہ کہنے لگے روایت اپنی جگہ زمینی حقائق اپنی جگہ آخر اتنے لوگوں کی سمائی گھروں میں کہاں سے ہوگئی ہوگی؟ وہ جرمنی گئے تو واپس آکر بتایا کہ انہوں نے وہاں کئی ایسے لوگوں سے گفتگو کی ہے جن کے گھروں میں اجنبی احمدی مہمان ٹھہرائے گئے تھے اور ان خاندانوں نے بطیب خاطر ان کی مہمان داری کا فریضہ سر انجام دیا۔ ہماری بستی تو خیر چھوٹی تھی ٹرانسپورٹ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر ان ملکوں میں تو ٹرانسپورٹ کا مسئلہ بڑا مسئلہ ہے جرمنی میں جلسہ گاہ من ہائم کی مارکیٹ میں بنتی ہے جو فرینکفرٹ سے چالیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے مرکز فرینکفرٹ ہے مگر لوگ دور دراز سے وہاں وقت پر پہنچتے ہیں۔ اگرچہ ہم جیسے کوتاہ قدم بعض تقریریں نہ سننا چاہیں تو دیر سے پہنچنے کا بہانہ کر سکتے ہیں۔ کہاں کی کوتاہ قدمی۔ ہم نے جان بوجھ کر اپنے عزیز دوست اور شاگرد عبیداللہ باجوہ کی تقریر کا وقت رستہ میں گزار دیا تھا اور کہہ دیا تھا رستہ میں دیر ہوگئی۔ (خوئے بدرا بہانہ بسیار۔) جو لوگ جلسہ پر پہنچ جاتے ہیں ان کو پھر سارا وقت وہیں گزارنا ہوتا ہے اس لئے منتظمین کو دن بھر کی مصروفیت کا اہتمام رکھنا پڑتا ہے۔ جلسہ سننا' کھانا کھانا نمازیں پڑھیں' دوستوں بزرگوں سے میل ملاقات کی کہ سال بھر کے بعد دوستوں کے یکجا ہونے کا موقع بھی ایک بار ہی آتا ہے۔ لندن میں بھی یہی عالم ہے کہاں مرکز اور کہاں ٹلفورڈ۔ اسلام آباد۔ غالباً اتنا ہی فاصلہ ہے۔ ہم نے پہلی بار یہ جگہ دیکھی تو بھیڑوں کا گلہ وہاں چر رہا تھا اب مسیح محمدی کی بھیڑیں وہاں تھیں وسیع و عریض خیموں میں سارا انتظام تھا۔ ہیچری کی لمبی لمبی بیرکوں میں مہمان ٹھہرے ہوئے تھے اسلم صابر سے ملاقات ہوئی ہم نے بہترا چاہا اسے بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لندن لے جائیں مگر وہ کہنے لگا جلسہ کی بیرکوں میں ٹھہرنے کا جو مزہ ہے وہ گھر کے آرام میں کہاں؟ اس لئے ہماری خواہش کے باوجود وہ راضی نہ ہوا۔ جلسہ کے بعد البتہ ہم اسے لندن کے گلی کوچوں میں لئے لئے پھرے اور ہم تواضع

بھی اتنی ہی کر سکتے تھے کیونکہ ہم خود سویڈن سے مہمان کے طور پر گئے ہوئے تھے۔ امریکہ کا جلسہ دیکھا۔ وہی عالم تھا لنگر جاری تھا لوگوں کی رہائش البتہ ہوٹلوں میں تھی۔ ہم تو فدا صاحب کے ہاں متمکن تھے مگر باقی دوستوں سے جس سے پوچھا اس نے یہی کہا فلاں ہوٹل میں ہوں فلاں موٹل میں ہوں۔ دراصل واشنگٹن میں مسجد کے آس پاس رہنے والے اتنے احمدی لوگ ہیں ہی نہیں جو اپنے مکان پیش کر سکیں اگر دور دور ہی ٹھہرنا ہے تو کیوں نہ قریب کے ہوٹلوں میں ڈیرہ لگا یا جائے اور اس میں جماعت اپنا حصہ ادا کرتی تھی تا کہ جماعت کی میزبانی کا فرض ادا ہوتا رہے ہمیں وثوق سے تو علم نہیں غالباً ہوٹل والے بھی جلسہ کے مہمانوں کے لئے خصوصی رعایت کا اعلان کرتے ہیں اپنی جماعت کا خط دکھایئے وہ آپ کو رعایتی نرخ پر رہائش مہیا کریں گے دور کی ریاستوں سے آنے والے یہی کرتے ہیں اور اسی میں آسائش بھی ہے۔ کینیڈا میں بھی ہم نے یہی دیکھا لوگ گھروں میں ٹھہرتے ہیں مگر جو لوگ زیادہ دور نہ ٹھہرنا چاہیں وہ ہوٹلوں میں جگہ بنا لیتے ہیں۔ اب کے جلسہ انٹرنیشنل سینٹر میں تھا جو احمدی لوگوں کی رہائش گاہوں سے دور ایک جگہ ہے اس کے قریب قریب ٹھہرنے کی جگہ ملنی مشکل تھی۔ ہمارے دوست مرزا انس احمد بھی کوئی ایک گھنٹے کی مسافت پر اپنی بیٹی کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے البتہ ڈاکٹر عنایت اللہ منگلا قریب کے ایک ہوٹل میں تھے مبادا دیر ہو جائے اور جلسہ کی تقریر کا موقع ہاتھ سے نکل جائے۔ انتظامات خوب تھے بلکہ لوگ باگ اس جلسہ گاہ پر اتنے خوش ہوئے کہ بیک آواز امیر صاحب سے کہا کہ اگلے برس بھی یہی جگہ ریزرو کروالیں۔ گرمی سے آسائش رہتی ہے اور دیگر ضروریات بھی بطریق احسن مہیا ہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر ہم سوچتے ہیں یہ لوگ کھانا کھلانے کے لئے جو کاغذ کے گلاس اور پلیٹیں مہیا کرتے ہیں ان میں اور ہمارے آب خوروں اور پیالوں میں کتنا فرق ہے۔ کاغذ میں مٹی کی خوشبو تو نہیں پیدا ہو سکتی؟ ہمیں ہمارے آب خورے ہی یاد آتے رہے اور جس جلسہ پر جائیں وہاں

انہیں کو یاد کرتے ہیں۔مٹی کی کشش ہے یا جلسہ کی برکت ہے یا کیا ہے؟ آپ جو چاہیں علاج درددل کرتے رہیں۔ہم پرانوں کو وہی نسخہ پرانا چاہیئے۔

مالک رام کی احمدیت

اردو زبان کے جن نامور محققین نے اردو ادب کی تاریخ پر گہرے نقوش مرتب کئے ان میں کا ایک نام جناب مالک رام کا ہے۔غالب کے بارہ میں ان کی تحقیق کو استناد کا درجہ حاصل ہے۔غالب کے احوال وآثار پران کی تحقیق کا حوالہ دیئے بغیر کوئی محقق ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ان کی زندگی میں اوران کے انتقال کے بعد ان کے مذہب کے بارہ میں بہت ردوقدح ہورہی ہے۔ان کے ورثا نے ان کے عقیدہ کے برعکس انہیں مسلمانوں کی طرح تجہیز وتکفین کا مورد کرنے کی بجائے ہندووانہ رسوم کے مطابق نذرِآتش کردیا۔خیراس سے مرنے والے کوکیا فرق پڑا کہ اسے تو خاک ہونا ہی تھا مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ان کے عقیدہ کے بارہ میں آج بھی وہی بے یقینی کی کیفیت جاری ہے اور کوئی شخص جرأت کے ساتھ بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔

اس قضیہ کی ابتدا تو اس وقت ہوئی جب جناب مالک رام نے امام جماعت احمدیہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اوراپنا کوئی اسلامی نام رکھنے کی درخواست کی۔حضرت صاحب نے فرمایا اس نام یعنی مالک رام کے نام میں کوئی مشرکانہ عنصر موجود نہیں اس لئے اس نام کو برقرار رکھیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔چنانچہ سلسلہ کے ریکارڈ میں (مثلاً تحریک جدید کے دفتر اول میں) ان کا نام اسی طرح درج ہے۔مالک رام صاحب اسی نام سے جانے جاتے رہے۔بعد کے زمانہ میں انہوں نے نام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اخفا کو قائم رکھا اور غالباً حضرت صاحب کی اجازت سے قائم رکھا۔کیونکہ راقم

الحروف کے علم کے مطابق ایسی مثال قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک پیروکار کی موجود ہے کہ جس نے اپنے ایمان کو اخفا میں رکھا اور فرعون کو مشورہ دیا کہ وہ خدا کی پرستش کرنے والے لوگوں کو ایذائیں نہ دے۔ ہوسکتا ہے مالک رام صاحب نے یہی سوچ کر اس اخفا پر استقلال اختیار کیا ہو۔ میرے اپنے علم اور تجربہ کے مطابق انہوں نے اپنے احمدی دوستوں سے کبھی اپنی احمدیت کو چھپایا نہیں لیکن دوسروں میں غیر ضروری طور پر اس کا اعلان بھی نہیں کیا۔

حال ہی میں اردو کے نامور محقق ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب ''شخصیات و مشاہدات''، فضلی سنز لمیٹڈ کراچی کی طرف سے پہلی بار شائع ہوئی ہے اس میں ایک طویل مضمون ہے جس کا عنوان ہے ''مالک رام کا مذہب''۔ دیباچہ میں آپ لکھتے ہیں: ''مالک رام کا مذہب ایسا موضوع ہے جس پر جسارت کرکے میں نے لکھنے کی پہل کی۔ متعدد حضرات نے اس پہلو پر لکھا۔ میں نے ڈائجسٹ کے طور پر سب کی تحریروں کے ضروری اقتباس جمع کر دیئے ہیں۔ خوفِ فسادِ خلق سے اپنی رائے محفوظ رکھی۔ ہوشمند قاری ان اقتباسات کو پڑھ کر اپنی رائے قائم کرسکتا ہے'' (صفحہ 8)۔ ڈاکٹر گیان چند جیسے محقق کی بات بہت وزن رکھتی ہے انہوں نے قاری پر نتیجہ اخذ کرنے کی ذمہ داری ڈالتے ہوئے بین السطور بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ میں ان کی تصریحات کا مختصر سا جائزہ جماعت احمدیہ کے لٹریچر میں ریکارڈ کی غرض سے معرضِ تحریر میں لا رہا ہوں۔

جناب ڈاکٹر گیان چند نے ''ہماری زبان'' دہلی مؤرخہ 22 مئی 1994ء میں ''مالک رام کے مذہب کی بحث کا جواز'' کے عنوان سے لکھا ''ہماری زبان کے بعض مراسلوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ میرے لئے مالک رام کے مذہب کی بحث اٹھانا مناسب نہیں تھا۔ میرے بزرگ پروفیسر سرور نے مجھے ایک نجی خط میں لکھا ہے ''مالک رام کے مذہب کا مسئلہ آپ نے نہ جانے کیوں چھیڑا؟'' چونکہ میں

سرور صاحب کا نہایت احترام کرتا ہوں اس لئے ضروری ہے کہ اپنا موقف واضح کر دوں۔ مالک رام کی وفات کے چھ سات مہینے بعد تک میں نے اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا لیکن جب ضلع مظفر نگر کے ایک رسالے میں ایک مبینہ خط شائع کیا گیا کہ وہ وفات سے پانچ دن پہلے با قاعدہ مسلمان ہو گئے تھے تو میں نے حقیقت جاننے کی کوشش کی۔ مضمون لکھنے سے پہلے میں نے خلیق انجم صاحب کو لکھ کر پوچھا کہ اگر وہ اس موضوع پر میرا مضمون 'ہماری زبان' میں چھاپنے کو تیار ہوں تو میں لکھ دوں۔ ان کا اثبات میں جواب آنے پر ہی میں نے مضمون سپردِ قلم کیا۔ حسنِ اتفاق سے انہیں دنوں خلیق انجم صاحب لکھنؤ آئے۔ رام لعل کے گھر ان سے ملاقات ہوئی ان کے ساتھ محمد افضل ایم پی بھی تھے۔ میں نے مضمون کے اہم حصے خلیق انجم کو پڑھ کر سنائے انہوں نے کسی بیان پر اعتراض نہیں کیا۔ میں نے مضمون ان کے حوالے کر دیا اور انہوں نے اسے چھاپ دیا.................اگر مالک رام کے مذہب کا مسئلہ نجی خطوں میں اٹھایا جاتا رہا ہے ادیبوں کی صحبتوں میں موضوعِ بحث بنتا ہے تو تحریر میں اسے کیوں نہ کھل کر کھنگال لیا جائے تاکہ آئندہ محققین کی رہبری ہو۔ بڑے ادیبوں کی زندگی کا ہر پہلو اور ہر گوشہ پبلک کی ملک ہوتا ہے اور اس میں زندہ زعمائے ادب بھی شامل ہیں۔ .... مالک رام کے مذہب کی حقیقت جاننے کا یہ مقصد نہیں کہ ان کے مذہب یا اس مذہب میں ہونے سے 'ذکرِ غالب' یا 'تلامذۂ غالب' کی قدر و قیمت پر کوئی اثر پڑے گا۔ مقصد صرف سچ تک پہنچنا ہے۔ میں حقیقت کو مقدس جانتا ہوں خواہ وہ فتنہ انگیز یا بے مصرف ہی کیوں نہ ہو' (ہماری زبان 22 مئی 1994ء)

مالک رام کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ادبی دنیا کے دستور کے مطابق 1971ء میں ایک ارمغان 'ارمغانِ مالک' کے نام سے شائع کیا گیا اور ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس کی پہلی جلد میں جناب سید علی جواد زیدی کا ایک مضمون ان کے مذہبی علوم سے شغف کے بارہ میں شائع ہوا۔ اس میں وہ

لکھتے ہیں ''مالک رام کی مذہبی تعلیم کی ابتدا ہر ہندوستانی کی طرح آغوشِ مادر ہی سے شروع ہوئی۔ پھر چار برس کے سن تک گوردواروں میں گوروبانی کا ربانی پیغام سننے لگے۔ ہندو دھرم اور آریہ سماجی اصلاحی تحریک پر کتابیں پڑھیں۔ وزیر آباد کے دورانِ قیام میں ملک احمد حسن رہتاسی سے یارانہ ہو گیا۔ یہ ہم جماعت بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان کا اردو اور فارسی کا مطالعہ بھی اچھا تھا۔ یہ اکثر مالک رام کو کتابیں پڑھنے کے لئے دیتے رہتے تھے۔ ایک دن انہوں نے مذہب اسلام کے بارہ میں ایک کتاب مالک رام کے ہاتھ میں دیکھی۔ ملک احمد حسن خود جماعت احمدیہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے احباب کے پاس اسلامی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ انہوں نے کئی کتابیں مالک رام کو پڑھنے کو دیں۔ مالک رام کا ذوقِ تحقیق و تجسس بڑھتا ہی گیا۔ ان کا یہ مطالعہ بعد میں 'آریہ گزٹ' کی ادارت کے زمانے میں بھی ان کے کام آیا اور ویسے بھی مذاہب کے تقابلی مطالعے میں مفید ثابت ہوا۔ مالک رام کی اسلامی معلومات اتنی بڑھ گئی تھیں کہ اس سلسلے میں قادیان کے خلیفہ جناب مرزا بشیر احمد محمود احمد (صحیح اسم گرامی مرزا بشیر الدین محمود احمد ہے) سے ان کی ملاقات ہوئی۔ وہ قادیان گئے تو وہیں چوہدری محمد ظفر اللہ خاں سے بھی تعارف ہوا اور وہ بھی ان کی ذہانت اور وسعتِ نظر کے گرویدہ ہو گئے۔ جب بعد کو اخبار 'بھارت ماتا' سے علیحدہ ہوئے تو وہ ظفر اللہ خاں کی طلبی پر شملہ بھی گئے اور وہاں ان کے مہمان رہے اسی زمانے میں انہوں نے ایک دوست سید دلاور شاہ بخاری سے قرآن مجید کے سترہ پارے ترجمے کے ساتھ پڑھے''
(''ذکرِ مالک'' مشمولہ 'ارمغانِ مالک''، پہلی جلد، نئی دہلی 1971ء ص 32-33)۔

راقم الحروف کو یاد ہے کہ مالک رام نے ''وہ صورتیں الٰہی..........'' کے عنوان سے خاکوں کی جو کتاب لکھی تھی اس میں پہلا مضمون ہی ملک احمد حسن صاحب اور ان کے ساتھ تعلق کے بارہ میں تھا اور میں نے اس کی بنیاد پر الفضل ربوہ میں ایک مضمون لکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ملک احمد حسن صاحب

مشہور شاعر حسن رہتاسی ہیں لیکن بعد میں قبلہ مولانا محمد احمد صاحب جلیل مدظلہ نے بتایا کہ یہ ملک احمد حسن اور بزرگ تھے لیکن اس بات کی تصدیق فرمائی تھی کہ احمدیت سے مالک رام کا تعارف انہیں کے ذریعہ ہوااور انہیں قبولِ حق کی توفیق ملی۔

محولہ بالا ارمغان میں ایک مضمون ڈاکٹر محمد باقر کا ہے جس کا عنوان ہے ''مالک رام میرا دوست اور انسان دوست''۔ڈاکٹر باقر لکھتے ہیں''اس وقت مالک رام کا ادبی شغف نہ صرف اردو فارسی عربی بلکہ قرآن سے بھی بہت بڑھ چکا تھا۔اس نے اسلام اور اس کے مختلف فرقوں پر خاص توجہ کی۔اس ضمن میں اسے احمدیہ تحریک سے بہت دلچسپی پیدا ہوگئی یہاں تک کہ وہ جب ایک مرتبہ مرحوم حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد کی لاہور میں آمد پر انہیں ملنے گیا تو اس نے مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ہم دونوں حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔۔۔۔مالک رام تقریباً ایک گھنٹے تک قرآن کے مطالب اور اسلام کے مختلف موضوعات پر حضرت صاحب سے باتیں کرتا رہا اور میں صرف خاموشی سے سنتا رہا۔یہ غالباً 1934ء کی بات ہے''(''مالک رام میرا دوست اور انسان دوست''ایضاً صفحہ 86)

کرنل بشیر حسین زیدی صاحب نے جو''مالک نامہ''مرتبہ کیا اور دہلی سے شائع کیا ہے اس میں ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد''مالک رام''کے عنوان سے لکھتے ہیں، غالباً 1964ء میں میں نے قرآن شریف پڑھنے کا عزم کیا ظاہر ہے کہ مالک رام سے بہتر قرآن پڑھانے والا کہاں سے میسر آتا میں نے ان سے درخواست کی انہوں نے قبول کرلی۔اس ضمن میں جو بات مجھے آج تک متاثر کررہی ہے اور جس پر میں آج تک عمل پیرا ہوں یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے سورہ فاتحہ شروع کرانے سے قبل ہی مجھے قرآن شریف کو ہاتھوں میں اٹھانے اور میز پر رکھنے کے آداب سے آشنا کیا کلام پاک کا احترام تو مجھے ابتدا ہی سے گھر میں سکھایا گیا تھا لیکن مالک رام صاحب نے میری تعلیم کی ابتدا اس احترام سے کی

اور سورہ فاتحہ پڑھانے سے قبل ہی مجھے روحِ مذہب سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔'' (مالک رام، مشمولہ ''مالک نامہ''مرتبہ کرنل بشیر حسین زیدی دہلی 1987 صفحہ 11)

حبیبہ بانو نے اسی ''مالک نامہ'' میں ان کی اولادوں کے نام اوشا، ارونا، بشریٰ، آفتاب اور سلمان'' لکھے ہیں۔(ایضاً صفحہ 242) ناموں کے سلسلہ میں شیخ منظور الٰہی صاحب ''درِ دلکشا'' نے بھی سلسلۂ روز وشب میں اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے کہ ''اتنے میں ایک بچے نے کمرے میں آکر پہلے مالک رام کے ساتھ چہلیں کیں پھر کتابوں سے بے تکلفی کرنے لگا، مالک رام صاحب نے بشریٰ کو آواز دی کہ آ کے صاحبزادے کو لے جائے۔ بچوں کے نام رکھنے میں ان کی وسیع المشربی کو دخل ہے آفتاب، سلمان، اوشا، ارونا اور بشریٰ۔'' (سلسلۂ روز وشب صفحہ 143)۔ مالک رام کے صاحبزادہ نے ڈاکٹر گیان چند کے ایک خط کے جواب میں ناموں کی توضیح یوں کی: ''والد صاحب نے کہا تھا کہ ناموں میں ایک تسلسل ہے اور اوشا، ترکا (دراصل شفق) ہے ارونا سورج کی شعاعوں سے آفتاب تک ہم بشریٰ جیسے نام کو قبول کر سکتے ہیں۔ سلمان دوسری جنگِ عظیم کے ختم ہونے پر پیدا ہوا تھا سلمان کے معنیٰ ہیں امن، عبرانی میں شالوم امن ہے۔ اگر اتفاق سے ہمارے نام مسلم نام ہیں تو ان کے یہ معنی نہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اوشا کی دو لڑکیوں کو بشریٰ اور زکی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اور بشریٰ کی دو لڑکیوں کا نام مہر النساء اور سمیرا ہے۔ اس طرح ہمارے گھر میں دو بشریٰ ہیں۔'' (مکتوب بنام ڈاکٹر گیان چند مورخہ 7 جون 1994)۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ کے جناب ضیاء الدین احمد اصلاحی کا مراسلہ بعنوان ''مالک رام کا مذہب'':

''میرے کانوں میں بھی اس کی بھنک پڑی تھی کہ ان کو قادیانی کہا جاتا ہے اسی لئے کئی بار چاہا کہ ان کے دین و مذہب کے بارے میں ان سے براہِ راست دریافت کروں مگر اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ان کی وفات سے دو تین برس پہلے ایک دفعہ کچھ اسی طرح کی باتیں ہو رہی تھیں تو میں یہ عرض کر ہی

بیٹھا کہ آپ کے عقیدہ و مذہب کے بارے میں عجیب عجیب باتیں سننے میں آتی ہیں۔فرمایا جی ہاں میں بھی سنتا ہوں کچھ لوگ مجھے قادیانی کہتے ہیں اور بھی باتیں میری نسبت کہی جاتی ہیں خیر لوگ جو بھی کہیں مجھ سے اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ مجھے بخش دے گا۔اس سے یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ وہ قادیانی نہیں تھے'' (ہماری زبان 18 اپریل 1994)۔اس بات سے جناب ضیاء الدین احمد نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ ان کا ذاتی خیال ہے۔راقم الحروف جماعت احمدیہ کے علمِ کلام سے ذاتی واقفیت کی بنا پر وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ مالک رام کا یہ فقرہ ہی ان کے احمدی ہونے پر دال ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ مجھے بخش دے گا۔'' اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ کہنا اور لکھنا فی زمانہ جماعت احمدیہ کے علمِ کلام کی خصوصیت ہے۔

اسی مضمون میں ڈاکٹر گیان چند جین نے انیسویں نمبر پر اپنے ایک مراسلہ کا حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے بعض باتوں کا تجزیہ کیا ہے۔لکھتے ہیں ''مالک رام صاحب سے متعلق میرے مضمون کی اشاعت کے بعد مجھے دو خطوط ملے جن میں مالک رام کی احمدیت کا دعویٰ کیا گیا ہے۔اپنے 24 فروری 1994 کے مکتوب میں ترقی اردو بیورو کے شیخ سلیم احمد نے مجھے لکھا کہ ایک بار سید برکات احمد مرحوم (عرب ممالک میں سابق سفیر ہند) کے ساتھ امیر جماعت قادیان ان کے گھر آئے جب آخر الذکر جانے لگے تو انہوں نے کہا ''مالک رام صاحب کے یہاں جا رہا ہوں، سید برکات احمد قادیانی تھے شیخ سلیم احمد نے برکات احمد سے پوچھا کہ کیا مالک رام بھی قادیانی ہیں؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔'' دوسرے خط کا حوالہ درج کرنے سے قبل میں سید برکات احمد صاحب کا تعارف کروا دینا چاہتا ہوں۔سید برکات احمد دلی کے مشہور خانوادہ سید شفیع احمد اور بیگم شفیع کے صاحبزادے تھے ان کی ہمشیرہ بیگم نسیم سعید ہمارے ہاں کی مشہور مضمون نگار ہیں اور سلسلہ کے لٹریچر میں ان کی کتابیں بہت مشہور

ہیں۔ سید برکات احمد تقسیم ملک کے وقت پاکستان نہیں آئے بلکہ وہیں دفترِ خارجہ سے منسلک رہے اور سفیرِ کبیر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ کی کتاب مذہب کے نام پر خون کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ سید برکات احمد کی گواہی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جناب ڈاکٹر گیان چند نے جس دوسرے خط کا حوالہ دیا ہے وہ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ 1972 میں یا اس کے بعد کے ایل گابا (سابق کنہیا لال گابا مسلمان ہونے کے بعد خالد لطیف گابا) دلی آئے۔ رستوگی ان سے ملے تو گابا نے کہا ''ہندو (کذا) میں لچک ہوتی ہے میں ہندو تھا اور ہوں مگر مالک رام ابھی تک قادیانی ہے۔ رستوگی نے جب مجھے مالک رام کے قادیانی ہونے کی بات لکھی تھی اس کے بعد انہوں نے انجمن احمدیہ قادیان سے رجوع کیا اور وہاں سے بھی تصدیق ہوگئی۔''

ڈاکٹر گیان چند مزید لکھتے ہیں میں نے ''ارمغانِ مالک'' میں مالک رام کی سوانح کو بہ نظر غور پڑھا 1936 سے کچھ پہلے مالک رام قادیان گئے اور احمدیوں کے خلیفہ جناب مرزا بشیر الدین محمود سے ملاقات کی۔ وہیں چودھری محمد ظفر اللہ خان سے ان کا تعارف ہوا اور ظفر اللہ خان ان کی وسعتِ نظر کے گرویدہ ہوگئے۔ 1936 میں وہ ظفر اللہ خان کی دعوت پر شملہ گئے اور انہیں کے مہمان رہے۔ 1938 میں ظفر اللہ خان حکومت ہند کے کامرس اور ریلوے کے ممبر تھے مالک رام نے انہیں خط لکھ کر کسی مناسب ملازمت کی درخواست کی۔ ظفر اللہ خان نے انہیں حکومت ہند کی مصر کی اسامی پر مقرر کر دیا۔ ظفر اللہ خان قادیانی تھے کیا وہ مالک رام کی اس لئے سر پرستی کرتے تھے کہ ان کی رائے میں مالک رام قادیانی تھے؟'' (ہماری زبان 22 اپریل 1994) یہاں پھر راقم الحروف کو کچھ کہنا ہے۔ چوہدری انور

احمد کاہلوں نے اپنے محسن سر ظفر اللہ کے بارے میں ''ظفر اللہ خان میرا مربی'' کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ وہ اس وقت چودھری صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر ان کے ساتھ یورپ جا رہے تھے۔ لکھتے ہیں کہ ''یورپ جاتے ہوئے وہ اور سر ظفر اللہ اسکندریہ میں رکے جہاں حکومت ہند کی تجارتی سفارت تھی۔ وہاں انہیں کمرشل قونصل کے علاوہ جناب مالک رام بھی ملے جو احمدی تھے اور چوہدری صاحب نے کچھ وقت ان کے ساتھ گزارا مالک رام کی والدہ بھی ان کے ساتھ تھیں چودھری صاحب نے مالک رام کو والدہ کا بہت خیال رکھنے کی تلقین کی اور انہیں اسلامی تعلیمات یاد دلائیں۔ ان کی والدہ اگرچہ ایک ہی گھر میں ان کے ساتھ رہتی تھیں مگر ان کی رسوئی علیحدہ تھی کیوں کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کھانا کھانا پسند نہیں کرتی تھیں۔'' (ظفر اللہ خان میرے مربی۔ صفحہ 35)۔ میں اس کا حوالہ پہلے الفضل میں اپنے ''مالک رام کا ذکرِ مکرر'' والے مضمون میں بیان کر چکا ہوں۔

اکیسویں نمبر پر پروفیسر مختار الدین احمد کے مضمون کا حوالہ ہے۔ عنوان ہے ''مالک رام کچھ ذاتی تاثرات''۔ لکھتے ہیں ''میں نے ایک بار نہیں لکھا کہ میرے کام وقت پر نہیں ہوتے سیمینار کا مقالہ آخری رات لکھتا ہوں اور ریڈیو کی تقریر کا کچھ حصہ ٹرین اور کچھ نشر گاہ پہنچ کر مکمل کرتا ہوں۔ بہت سے کام یا تو ہوتے نہیں یا ادھورے رہ جاتے ہیں۔ کوئی ترکیب بتایئے۔ جواب حسبِ معمول فوراً آیا۔ انہوں نے لکھا آپ کے مرض کا علاج بتا دیتا ہوں کرنا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔ آپ نمازیں پابندی سے وقت پر پڑھیں اور زیادہ بہتر ہے اگر پانچوں وقت کی نمازیں مسجد جا کر باجماعت ادا کریں۔ میں حیران ہوا کہ یہ مشورہ مالک رام دے رہے ہیں یا بہار کے مشہور محقق اور اہلِ حدیث عالم مولانا عبد المالک آروی'' (''آج کل''۔ گوشۂ مالک رام۔ اپریل 1994 ص 4)۔

ستائیسویں نمبر پر پروفیسر محمد اسلم صاحب کے مضمون ''ذکرِ مالک رام'' کا حوالہ ہے۔ لکھتے ہیں

''ایک بار مالک رام کسی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے کابل گئے ہوئے تھے۔ وہاں دو تین مسلمانوں نے ان سے کہا کہیں وہ در پردہ مسلمان تو نہیں ہو گئے۔ انہوں نے کہا اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو انہیں اس پر کیا اعتراض ہے؟۔۔۔ مالک رام صاحب کے گھر میں آیت الکرسی اور قرآنی آیات کے قطعات آویزاں تھے جناب خالد شمس الحسن نے ایک ویڈیو کیسٹ تیار کی ہے جس میں ان قطعات کی بھی عکاسی ہے۔ان کے ڈرائنگ روم کا ماحول خالصتاً اسلامی تھا اور اس میں ہندو معاشرے کی کوئی معمولی سی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔۔۔ جو مسلمان انہیں ملنے آتے تھے ان کے لئے جائے نماز بھی رکھی ہوتی تھی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے ان کا معاملہ خدائے عظیم و برتر کے ساتھ ہے۔ قرآنِ حکیم کی سورہ الفتح کی پچیسویں آیت میں یہ ارشاد ہے کہ ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں موجود ہیں جنہیں تم نہیں جانتے یعنی ان کے ایمان کا صرف خدا کو علم ہے۔ شاید مالک رام بھی اسی زمرہ میں شامل ہوں'' (قومی زبان اپریل 94 ص 60-62)۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ سورہ الفتح کی آیت یہ ہے: وَلَوۡلَا رِجَالٌ مُّؤۡمِنُونَ وَنِسَآءٌ مُّؤۡمِنَٰتٌ لَّمۡ تَعۡلَمُوهُمۡ أَن تَطَـُٔوهُمۡ فَتُصِيبَكُم مِّنۡهُم مَّعَرَّةُۢ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ (الفتح 25)۔ اسی سلسلہ میں انور سدید صاحب نے اپنے مضمون ''مالک رام کے نام کام اور ادبی مقام کو دوام حاصل ہے'' میں ڈاکٹر ریاض مجید کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ''وہ دہلی سے لوٹے تو میں نے پوچھا کس ادیب سے مل کر آپ کو سچی خوشی ہوئی؟ ریاض مجید نے بلا تامل جواب دیا پنڈت مالک رام سے۔ ہم سبھی ان کے دولت خانے پر سلام روستائی کے لئے حاضر ہوئے۔۔۔ ریاض مجید نے ان کے گھر میں جس مشرقی تہذیب کا جلوہ دیکھا اس کی اساس پر کہنے لگے کہ مجھے تو مالک رام اندر سے مسلمان نظر آتے ہیں'' (قومی زبان اپریل 94 ص 79-80)

بتیسویں نمبر پر جناب ڈاکٹر گیان چند کے نام ڈاکٹر محمد حسن صاحب کا ایک مراسلہ ہے۔ ڈاکٹر محمد

حسن لکھتے ہیں ''چونکہ اس موضوع کے بارے میں ایک سے زیادہ موقعوں پر مالک رام سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا تھا اس لئے میرا کچھ عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ مالک رام نے 'اسلامیات' سے متعلق کوئی کتاب شائع کی تھی اس پر عبدالمغنی صاحب نے غالباً مخالفانہ تقریر یا تبصرہ کیا تھا۔ ایک بار مالک رام صاحب سے اس کا ذکر ہوا جو کچھ انہوں نے کہا وہ ان کے تصورِ مذہب کے بارے میں بھی اہم تھا۔ انہوں نے کہا کہ ان کے نزدیک قرآنِ مجید میں واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ دین ایک مکمل اور قدیم سچائی ہے جو مختلف زبانوں میں مختلف پیغمبروں کے ذریعہ انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجی جاتی رہی قرآنِ مجید میں واضح طور پر مختلف ملکوں اور زمانوں میں مختلف پیغمبر بھیجے جانے کا ذکر ہے اِنْ مِنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیہَا نَذِیرٌ ۔ اور اس کی بھی صراحت ہے کہ ان کے علاوہ بھی دوسرے ممالک اور معاشروں میں ایسے پیغمبر بھیجے گئے جن کا ذکر قرآن میں موجود نہیں۔ مالک رام صاحب ہندوستان کے اوتاروں کو بھی شامل سمجھتے تھے اس عقیدے کے مطابق معمولاتِ مظہری میں مرزا مظہر جانجاناں نے ہندو اوتاروں کو پیغمبر اور ہندوؤں کو ان پیغمبروں کا مقلد کہا ہے۔ ہمارے آپ کے زمانے میں مولانا حسرت موہانی کرشن جی کو خدا کا اوتار یا پیغمبر مانتے تھے۔ مثالیں اور بھی مل جائیں گی۔ گویا مالک رام کے نزدیک اسلام الگ مذہب نہیں ہے۔ اور کبھی بھی اس کا دعویدار نہیں رہا بلکہ وہ اس دینِ فطرت کا تسلسل ہے اور اسی ابدی دین کا تسلسل ہے جو شروع سے چلا آتا ہے اور جس کی مختلف شکلیں یہودی اور عیسائی مذہب میں ملتی ہیں۔ ان سب مذاہب کو بھی الگ سمجھنے کے بجائے مالک رام صاحب اسی کے پیش رو دائرے میں شامل جانتے تھے اور یہ باتیں میں ان سے گفتگو کی بنیاد پر عرض کر رہا ہوں میری رائے یا تبصرہ اس میں نہیں ہے''۔

''وہ یہ کہتے تھے کہ قرآنِ مجید اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ ہم نے ہر دور ہر معاشرے میں اپنے پیغمبر

بھیجے ہیں اس نصِ قطعی کی روشنی میں بھی ہندوستان میں رام کرشن اور بدھ کا پیغمبر ہونا ثابت ہے۔(اور ثابت نہ بھی ہوتو کم سے کم قرینِ قیاس ضرور ہے) اس اعتبار سے ہندو رہ کر بھی کوئی شخص اسلام یعنی آخری مبعوثہ مذہب کے راستے پر چل سکتا ہے''۔

''یہ تو ہوا اسلام کے مذہب کے بارے میں ان کا رویہ۔ اسلام کے بعد کے دور میں وہ مرزا غلام احمد قادیانی کے قائل تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ پیغمبر دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو الگ شریعت الگ صحیفہ اور الگ نظامِ ہدایت ساتھ لاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو یہ سب ساتھ نہیں لاتے بلکہ اپنے سے پہلے پیغمبروں کی شریعت صحیفے اور نظامِ ہدایت کی ہی توضیح کرتے ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی کو وہ دوسری قسم کے پیغمبروں میں شمار کرتے ہیں اور دو باتوں کو سند کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ ایک تو مرزا غلام احمد کی آنکھیں نیلی تھیں اور ان میں غیر معمولی کشش تھی اور اس قسم کی آنکھیں ان کے نزدیک کسی پیغمبر ہی کی ہوسکتی تھیں۔ دوسرے انہوں نے اپنی کسی کتاب میں دہی کو مختلف امراض کے لئے اکسیر بتایا ہے اور اسی بنا پر مالک رام صاحب نے کسی مرض کے سلسلے میں دہی کا استعمال کیا اور فائدہ ہوا۔ اس کے علاوہ بھی مختلف واقعات مرزا صاحب اور ان کے صاحبزادے کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔ پروفیسر اختر اورینوی کا بیان ہے کہ انہوں نے مالک رام کے ساتھ احمدیوں کی کسی مسجد میں دریا گنج میں نماز ادا کی تھی''۔

''اب انہیں دونوں تصورات کو ملایئے تو تصویر یہ بنے گی کہ جس طرح قبلِ اسلام دور میں اسلام کے علاوہ مختلف مذاہب مثلاً یہودی اور عیسائی مذاہب بھی الہامی تھے اور دراصل اسلام ہی کا حصہ تھے اسی طرح ہندوستان میں بدھ، رام چندر جی، اور کرشن جی کے لائے ہوئے مذاہب بھی اسلام ہی کا حصہ بلکہ اس کے پیش رو مذاہب ہیں اور ہدایت کے مشترکہ سلسلہ سے وابستہ ہیں۔ اور یہی نہیں یہ سلسلہ

اسلام کے بعد بھی جاری رہا اور اس کے بعد بھی مرزا غلام احمد قادیانی کی شکل میں پیغمبر یا ہادی آتے رہے جو گو اپنے ساتھ کتاب نہیں لائے تھے مگر اسی مشترکہ مذہب کی اشاعت اور تبلیغ کررہے تھے جو ازل سے آج تک مبعوث ہوتا آیا ہے۔اس طرح مالک رام صاحب کا عقیدہ ہندو اور مسلمانوں کے معتقدات کا مجموعہ ہی نہیں تھا بلکہ مختلف مذاہب کی ظاہری تفریق میں ایک اندرونی مشترکہ بنیاد پر مبنی تھا‘‘(’’ہماری زبان‘‘ 8اگست1994)۔

جناب ڈاکٹر محمد حسن کا یہ طویل مراسلہ اپنے موضوع پر بڑا واضح مراسلہ ہے۔ جہاں تک جماعتِ احمدیہ کے عقائد کا تعلق ہے جماعتِ احمدیہ حضرت بدھ علیہ السلام، حضرت کرشن جی علیہ السلام اور حضرت رام چندر جی کو اللہ کے برگزیدہ اوتار سمجھتی ہے بلکہ حضرت مرزا صاحب کے دعوے کے مطابق وہ اس زمانہ میں مثیلِ کرشن ہیں۔دوسرے ڈاکٹر صاحب نے یہ بات بھی ٹھیک لکھی ہے کہ حضرت مرزا صاحب کا دعویٰ کسی تشریعی نبوت کا نہیں وہ اپنے آپ کو پیغمبرِ اسلام کا ظل اور بروز قرار دیتے ہیں۔ان کی نبوت کا دعویٰ اسلام سے علیحدہ کوئی شے نہیں۔اس لئے ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کی تصدیق جماعت کے عقائد سے بھی ہوسکتی ہے۔ڈاکٹر اختر اورینوی صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی نہایت مخلص احمدی خاندان کے فرد تھے اس لئے ان کے بیان پر یقین کرنے میں کوئی امر مانع نہیں کہ انہوں نے مالک رام کے ساتھ احمدیوں کی مسجد میں نماز ادا کی تھی۔

اس مضمون میں تیسویں نمبر پر جناب بشیر ساجد کا ایک مراسلہ درج ہے’’1942 میں راقم دہلی میں تھا وہاں ایک صاحب فضل محمد خاں جالندھری سے گاہے گاہے ملاقات ہو جاتی تھی۔فضل محمد خاں نے بڑے وثوق سے کہا کہ مالک رام مسلمان ہو چکے ہیں لیکن اپنی خاندانی مصلحتوں کے پیشِ نظر اپنے اسلام کو پردۂ اخفا میں رکھے ہوئے تھے کیوں کہ ان کے والدین اور دوسرے رشتہ دار ہندو تھے۔بعض

آثار وقرائن بھی فضل محمد خاں جالندھری کے مالک رام کے اسلام کے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔۔۔ممکن ہے 47 کے بعد بھارت کی آزادی ہندو غلبہ اور مسلمانوں کے خلاف عداوت اور تشدد و تعصب کی وجہ سے مالک رام نے آخری دم تک اسلام کو چھپانے ہی میں مصلحت سمجھی ہو۔آخری بات فضل محمد خاں جالندھری کے بارے میں بھی کہہ دوں کہ یہ صاحب کٹر قادیانی تھے اور دہلی کی قادیانی جماعت کے پروپیگنڈ اسکرٹری اور مبلغ تھے‘‘۔

(ماہنامہ سیارہ لاہور اشاعت خاص سالنامہ فروری 1994 ص 364-365)۔

(فضل محمد خاں صاحب ہمارے حسن محمد خاں عارف کے والد گرامی تھے۔چونکہ بسلسلہ ملازمت شملہ میں مقیم تھے اس لئے جماعت میں فضل محمد خاں شملوی کے نام سے جانے جاتے تھے)۔

جناب ڈاکٹر گیان چند جین نے چوبیسویں نمبر پر الفضل ربوہ میں چھپنے والے ایک مضمون کا حوالہ بھی دیا ہے جو عزیزی یوسف سہیل شوق مرحوم نے لکھا تھا اور جو سیارہ لاہور کے کسی پرچہ میں مکرر چھپ کر کسی مراسلہ کی صورت میں ڈاکٹر صاحب تک پہنچا تھا۔اس مضمون میں سہیل شوق مرحوم نے پہلی بات تو میرے حوالے سے لکھی تھی کہ میں کسی کانفرنس کے سلسلہ میں ہندوستان گیا اور جناب مالک رام مجھے اپنے ساتھ لوالے گئے۔اس ملاقات کا حال جناب مالک رام کے ارشاد کے مطابق اخفاء میں رہا لیکن میں نے اس کا ذکر اپنے بعض شاگردوں سے کیا جن میں یوسف سہیل شوق بھی تھے۔مالک رام صاحب کے احمدیوں کے ساتھ باجماعت نمازیں پڑھنے کا تو میں گواہ ہوں۔یوسف سہیل شوق نے دوسری گواہی جناب سید ظہور احمد شاہ مرحوم رکن ادارہ الفضل کی درج کی ہے جنہوں نے قاہرہ میں جناب مالک رام کے ہاں جمعہ کی نماز پڑھی تھی۔چونکہ یہ مضمون الفضل ربوہ (3 اکتوبر 1993) میں چھپا تھا اس لئے رسالہ سیارہ لاہور والوں نے فروری 1994 کے پرچہ میں اس مضمون کو درج کیا اور اس کا

عنوان لگایا ''مالک رام قادیانی تھے الفضل کا انکشاف'' میں اس طویل مضمون کو درج نہیں کرتا کیونکہ یہ سلسلہ کے لٹریچر میں پہلے موجود ہے۔

ڈاکٹر گیان چند صاحب نے پچیسویں نمبر پر جمیل الدین عالی کے ایک اظہاریئے کا حوالہ درج کیا ہے ''یہ ہمیشہ ایک معمہ رہا ہے کہ مالک رام صاحب کو اسلام سے اتنا شغف کیوں تھا؟ ان کی زندگی میں شبہ یہ کیا جاتا تھا کہ دل سے مسلمان ہیں بھارتی حالات کے سبب کھل کر ظاہر نہیں کرتے۔ایک افواہ یہ تھی کہ قادیانی ہیں اس لئے ظاہر نہیں کرتے حالانکہ چند برس سے پاکستان میں تو احتیاط کر سکتے ہیں بھارت میں کریں بھی تو کیوں کریں'' (جنگ کراچی 28 مئی 1993 ۔ بہ حوالہ قومی زبان کراچی مالک رام نمبر اپریل 1994 ص 12)۔

اس تمام مواد کو جمع کر دینے کے بعد قبلہ ڈاکٹر گیان چند صاحب نے اپنی رائے محفوظ رکھی ہے۔مگر مضمون کے آخر میں جو محاکمہ درج کیا ہے وہ سب کچھ کہہ دیتا ہے ''مالک رام کے مذہب کے موضوع پر میں نے ہندوستان اور پاکستان کے مختلف اہل الرائے حضرات کی رائیں درج کر دی ہیں۔ان میں رسالہ سیارہ لاہور میں بشیر ساجد اور سہیل شوق کے مراسلے مالک رام کے فرزند آفتاب بویجہ کے میرے نام چار خطوط ہماری زبان 8 اگست 1994 میں ڈاکٹر محمد حسن کا مراسلہ اور سید علی جواد زیدی کا مکتوب بنام خلیق انجم بہ طورِ خاص معلومات افروز ہیں۔تنہا ڈاکٹر محمد حسن کا مراسلہ اس موضوع پر جتنی روشنی ڈالتا ہے اتنی کوئی اور تحریر نہیں ڈالتی۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین جملہ نگارشات کو پڑھ کر اپنے طور پر کوئی رائے قائم کر سکیں گے''۔(تجدید کلکتہ پہلا شمارہ اکتوبر تا دسمبر 1995)۔

مالک رام مرحوم کے بارے میں یہ معلومات جمع کر دینے کا بڑا اجرات مندانہ کام جناب ڈاکٹر گیان چند جین نے انجام دیا اللہ تعالیٰ انہیں خوش رکھے۔ان کی خوشہ چینی کر کے مالک رام کا ذکرِ خیر

کرنے میرا مقصد یہ ہے کہ احباب ِجماعت دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس مخلص عالم اور بے نفس انسان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔آمین۔

پاکستان میں اردو ادب اور جماعت احمدیہ

1947ء میں برصغیر ہند کو آزادی ملی تو دو ملک وجود میں آئے۔ بھارت اور پاکستان! مگر دونوں ملکوں کی ثقافت مشترکہ ہونے کے باوجود اپنا جدا جدا تشخص رکھتی تھی۔اردو، برصغیر کی مفاہمتی زبان تھی اور ہندوؤں، مسلمانوں میں خیبر سے لے کر راس کماری تک بولی جاتی اور سمجھی جاتی تھی۔اس زبان کا ادبی سرمایہ بھی مشترکہ تھا۔میر وسودا، ذوق وغالب، میر حسن و دیا شنکر نسیم،سب ہی شاعری کے میدان کے شہسوار تھے، برج نارائن چکبست کی نظمیں ہمارے اسکول کے زمانہ تک نصاب میں اسی طرح شامل تھیں جیسے اقبال وحالی کی نظمیں۔جوش کے ساتھ ساتھ رگھو پتی سہائے فراق گورکھپوری کے کلام کو بھی یکساں مقبولیت حاصل تھی۔فیض کے نام کے ساتھ بھارت میں رہ جانے والے شعراء، ساحر لدھیانوی اور علی سردار جعفری کا نام بھی لیا جاتا تھا۔غرض دومختلف ثقافتیں رکھنے والی قومیں ایک نقطہ پر آ کر مل جاتی تھیں اور وہ نقطہ ادب تھا!

تقسیم کے بعد ہمارا تشخص اجاگر ہوا تو وہاں یہ رسم بھی چلی کہ ادب کو بھی سرحد کے پار کا اور سرحد کے اندر کا ادب کہا جانے لگا۔حالانکہ ادب تو سرحدوں کو توڑتا ہے، دلوں کو جوڑتا ہے۔ 1947ء کے بعد تقریباً بیس برس تک دونوں ملکوں میں ادبی کتابوں کا تبادلہ بھی بند رہا۔ جو مہاجر ادیب اور شاعر پاکستان آ گئے وہ پاکستانی ادیب اور شاعر بن گئے۔ابتدا میں چند برس تو بھارت میں رہ جانے والے شعراء میں سے جگر مرادآبادی ادھر آتے رہے اور ادھر کے شعراء میں سے بعض ادھر جاتے رہے پھر یہ

شاعروں کا آنا جانا بھی بند ہو گیا گویا سیاست نے نا قابلِ عبور دیوار تعمیر کر دی۔ جس طرح ادب میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے نعرے تفرقہ پیدا کرنے کا موجب ہوئے تھے وہاں پاکستانی اور ہندوستانی ادب کے نعرے بھی لگنے لگے۔ بایں ہمہ اردو ادب، برصغیر میں پنپتا رہا اگرچہ پاکستان میں بادی النظر میں اردو ادب زیادہ مقدار میں تخلیق ہوا مگر ادب کے پرانے مراکز دہلی اور لکھنؤ کا طنطنہ اسی طرح قائم رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو ادب میں جتنا تحقیقی کام بھارت میں ہوا اور ہوتا رہا اتنا کام پاکستان میں نہیں ہوا۔ اور اب تو اردو ادب کا پھیلاؤ یورپ اور امریکہ کینیڈا تک ممتد ہے۔ اردو ادب دنیا کی پانچویں بڑی زبان ہے۔

پاکستان کے قیام کے فوراً بعد، پاکستان میں ادب کی جس صنف نے مقبولیت حاصل کی وہ افسانہ تھا۔ اور افسانہ میں بھی زیادہ تر ایسے افسانے جن کا تعلق کسی نہ کسی طریقے سے تقسیم کے حوادث سے تھا۔ پھر نظم مقبول ہونا شروع ہوئی۔ مگر پچھلے پچیس برسوں میں نظم کی دو صورتوں، معریٰ یا غیر معریٰ کے مقابلہ میں غزل نے اپنے پاؤں مضبوطی سے جمائے۔ ایک وقت تھا کہ مشاعروں میں وہ شاعر ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے جو ترنم کے دھنی تھے۔ اور وہ وقت بھی آ گیا کہ لوگ ترنم سے گھبرانے لگے! اب لوگ شعر کی معنویت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ افسانہ میں سے علامتی افسانے نے بہت مقبولیت حاصل کی، ناول ایک دور میں بڑی مقبول صنف سمجھی جاتی تھی، ہمارے اپنے احمدی ادیبوں میں سے سید شفیع احمد دہلوی نے ''دوربین'' جیسا ناول لکھ کر بہت شہرت حاصل کی تھی۔ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کے خسر حضرت مولانا غلام حسن پشاوری نے بھی ایک ناول لکھا تھا جو ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا تھا، نام میرے ذہن سے محو ہو گیا ہے، مگر پاکستان بننے کے بعد شرر کے تتبع میں تاریخی ناول زیادہ لکھے گئے، ہمارے احمدی ادباء میں سے قمر اجنالوی اپنے تاریخی ناولوں کی وجہ سے خاص طور سے ''چاہِ بابل''

نامی ناول کی وجہ سے بہت مقبول ناول نگار سمجھے گئے۔ یہ دو تین نام تو محض اتفاق سے معرضِ اظہار میں آ گئے ورنہ میں پاکستان میں تخلیق ہونے والے اردو ادب کا ذکر کر رہا تھا۔ پاکستان میں ہجرت کر کے آ جانے والے شعراء پاکستانی شاعر بن گئے۔ لاہور ہمیشہ سے ہی اردو ادب کا مرکز رہا تھا۔ بڑے ادبی رسائل، عالمگیر، ادبی دنیا، مخزن وغیرہ یہیں سے شائع ہوا کرتے تھے اس لئے پاکستان کے شعراء کو ایک بنا بنایا ادبی میدان میسر آ گیا۔

جماعت احمدیہ کے جو بزرگ شعراء پاکستان تشریف لائے ان میں حضرت حافظ مختار احمد شاہجہاں پوریؒ، حضرت قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکملؓ اور حضرت مولانا ذوالفقار علی خان گوہرؓ کے نام نمایاں تھے۔ حضرت حافظ مختار احمد شاہجہاں پوریؒ امیر مینائی کے نمایاں شاگردوں میں سے تھے۔ اور لکھنؤ کے اکابر شعراء کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاں زبان کو برتنے کا جو سلیقہ تھا وہ کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ قادر الکلامی اس پر مستزاد۔ ان کا کلام محض تبرک نہیں تھا، اپنی استادانہ شان کی وجہ سے ممتاز تھا۔ آج بھی ان کا کوئی شعر سامنے آ جائے تو اہل ذوق جھومنے لگتے ہیں! حضرت قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکملؓ، جماعت کے نہایت بزرگ اور پر گو شاعر تھے "نغماتِ اکمل" کے نام سے ان کا کلام یکجا ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ مولانا ذوالفقار علی خان گوہرؓ، علی برادران میں سب سے بڑے تھے، ان کا کلام بھی ان کے صاحبزادے پروفیسر حبیب اللہ خان نے "کلامِ گوہر" کے نام سے چھاپ دیا۔ حضرت حافظ مختار احمد شاہجہاں پوریؒ کا کلام غالباً مکرم سلیم شاہجہاں پوری مرتب کر رہے تھے یا جمع کر رہے تھے۔ خدا معلوم وہ کام کس منزل میں ہے؟ کون سی منزل میں ہے؟ کون سی وادی میں ہے عشقِ بلاخیز کا قافلہ سخت جاں؟ حیدر آباد کے ایک بزرگ ذوقی صاحب تھے جن کی نظم "اسلامی اصول کی فلاسفی" کے بارے میں بہت مشہور ہوئی۔ ان کا انتقال پاکستان میں آ کر ہوا۔

انہی بزرگ شعراء میں حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر کا نام نامی بھی آتا ہے۔مظہر صاحب فارسی زبان کے قادر الکلام شاعر تھے۔مگر ان کے شعروں کی بجائے ان کا علمی کام زیادہ وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور نہ صرف پاکستان کے علمی حلقوں میں بلکہ دنیا بھر کے مستشرق حلقوں میں ان کی عربی کو ام الالسنہ ثابت کرنے کی سعی مشکور جانی گئی۔ جماعت احمدیہ کے علمِ کلام کو دنیا سے روشناس کروانے میں حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر کا بہت حصہ ہے۔اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔آمین

ہمارے ہاں بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی تک فارسی گوئی کی روایت چلی آرہی تھی پاکستان کے ادبی حلقوں میں اس روایت کا چلن نہ رہا مگر ہمارے ہاں مظہر صاحب، اور حضرت مولانا راجیکی، ان کے صاحبزادے مبشر احمد راجیکی، ڈاکٹر اختر اورینوی، مولانا ابوالحسن قدسی اور ماسٹر عبدالرحمن خاکی نے اس روایت کو دیر تک نبھایا۔ جماعت کے پرچوں میں فارسی کی نظمیں چھپتی رہیں۔پھر وہ وقت بھی آگیا کہ پاکستان کی ادبی روایت میں سے فارسی بالکل ہی خارج ہوگئی اور اس زبان کے جاننے والے خال خال رہ گئے!اور شعر کہنے والے؟ صرف ہمارے ہاں ہی نہیں ہماری ساری ادبی روایت میں سے فارسی یوں خارج ہوگئی ہے جیسے کسی نے لوکا لگا دیا ہو!

مگر جماعت احمدیہ کے جو شعراء تقسیم سے پہلے سے ادبی حلقوں میں معروف تھے ان میں سے دو نام بہت نمایاں ہیں۔ روشن دین تنویر اور سعید احمد اعجاز۔ یہ دونوں شعراء اپنے وقت کے مشہور ادبی پرچوں میں چھپا کرتے تھے۔تنویر صاحب پر تو پنجاب یونیورسٹی نے ایم۔اے اردو کا مقالہ لکھنے کی اجازت بھی دی تھی۔اور ہماری ایک احمدی بچی عزیزہ صفیہ کلثوم نے ان پر مقالہ لکھا تھا۔ یہ مقالہ جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صدر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی کی نگرانی میں لکھا گیا تھا۔سعید احمد اعجاز کی فلسفیانہ نظمیں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ان کا اصل میدان حکیمانہ شاعری تھا۔خدا معلوم ان کا کلام ان کی اولاد

نے چھپوایا یا نہیں؟ ان دونوں شعراء کا کلام پاکستان بننے کے بعد بھی جماعتی پرچوں میں چھپتا رہا اور داد وتحسین حاصل کرتا رہا۔ عبدالسلام اختر صاحب کے والد چوہدری علی محمد سرور جو بی ٹی صاحب کے نام سے معروف تھے ان کا کلام بھی نہ چھپا۔

بزرگ شعراء میں سے اب عبدالمنان ناہید ہی ایسے رہ گئے ہیں جن کا کلام تقسیم سے پہلے کے ادبی پرچوں میں چھپتا تھا ورنہ قیس مینائی، فیض چنگوی، نسیم سیفی وغیرہ ہم تو رخصت ہو چکے۔ چوہدری محمد علی صاحب بھی پرانی نسل کے نئے لہجے کے شاعر ہیں مگر تقسیم سے پہلے یا تقسیم کے بعد بھی کم کم ہی چھپنے میں آتے تھے۔ چھپنے میں طاق تھے اس لئے ان کا کلام زیادہ تر پاکستان بننے کے بعد ہی ابھر کر سامنے آیا۔

ثاقب زیروی صاحب اپنے "دورِ خسروی" کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے۔ اس کو شاہنامہ احمدیت بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس ناطے سے ثاقب زیروی صاحب ہمارے فردوسی ہیں۔ ثاقب زیروی صاحب کا مجموعہ کلام "شہابِ ثاقب" چھپ کر قبولِ عام حاصل کر چکا ہے۔ میجر منظور احمد اور پیام شاہجہاں پوری کے نام بھی جماعت احمدیہ کے شعراء میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مجموعوں کا نام یاد نہیں۔ عبدالرشید تبسم کی ایک یادگار، ان کے پندرہ روزہ مشاعرے تھے۔ جو باقاعدگی سے ان کے دولت کدہ پر منعقد ہوتے رہے۔ لاہور کے بیشتر معروف شعراء ان کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ مگر تبسم صاحب کی وفات کے بعد "آں قدح بشکست وآں ساقی نماند" کا عنوان ہوا۔ جماعت کے پرچوں میں جس شخص کا کلام سب سے زیادہ چھپا وہ حضرت مولوی مصلح الدین احمد راجیکی تھے۔

عبدالسلام اختر بھی تقسیم سے پہلے کے ادبی پرچوں میں چھپتے تھے۔ ناگپور یونیورسٹی کے ایم اے

تھے۔ وہیں سے معروف ہوئے۔ حضرت بانی سلسلہ کی سیرت کے بعض حصوں کو آپ نے نظم کیا تھا۔ اور یہی ایک کتاب تھی جو بزرگوارم میاں عبدالسمیع نون کی اعانت سے چھپی بھی تھی مگر اختر صاحب غزل بھی اچھوتی کہتے تھے نہایت شگفتہ اور رواں جماعت کے پرچوں میں ان کا کلام بالالتزام چھپتا تھا۔ بزرگوارم سلیم شاہجہاں پوری کا پاکستان سے قبل کا کلام میری نگاہ سے نہیں گزرا مگر آپ پاکستان میں بہت مقبول ہوئے۔ نواب شاہ میں آ کر بیٹھے اور ”ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت“ کا نمونہ دکھا دیا۔ حکیم سید عبدالہادی بہاری بھی بڑے پرگو شاعر تھے۔ مولانا دوست محمد شاہد کے خسر ماسٹر محمد ابراہیم شاد جماعتی موضوعات پر ثابت قدمی سے لکھنے والے شاعر ہیں۔ صاحبزادہ سید ابوالحسن قدسی کے صاحبزادے نعیم قدسی بھی نہایت اعلیٰ شعر کہنے والے تھے مگر ذہنی دباؤ کا شکار ہو کر آپ اپنی آگ کا خس و خاشاک ہو گئے۔ مرحوم ہونے والوں میں ایک نام اور بھی تھا عبدالمنان شاد! ان کا کلام ان کے بھائی کریم نون نے ان کی وفات کے بعد اب آ کے شائع کیا ہے۔ ”ہم احمدی بچے ہیں کچھ کر کے دکھا دیں گے“ والی مشہور نظم انہی کی ہے۔ ایک اور بزرگ پیام شاہجہاں پوری تھے شاعر بھی تھے اور صحافی بھی ان کا رسالہ تقاضے تھا۔

پاکستان میں جس شخص نے ادبی حلقوں میں اپنی پہچان حاصل کی وہ غالب احمد ہیں۔ غالب احمد کا نام ادبِ لطیف کے حوالہ سے بہت معروف ہوا۔ ان کے ماموں مکرم ملک عبدالرحمن خادم صاحب، خود شعر کہتے تھے یا نہیں کہتے تھے ان کے ذوقِ لطیف اور مزاح کا چرچا بہت تھا۔ آپ نے ہی استاد امام دین گجراتی کا دیوان اپنے حواشی کے ساتھ مرتب کیا تھا مگر یہ تو تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔ گجرات ہی کے شیدا گجراتی کا نام بھی خاصا مقبول ہوا۔ غالب احمد جدیدیت اختیار کرنے والوں میں بہت نمایاں نام ہے۔ پھر غالب احمد کے استاد پروفیسر چوہدری محمد علی کا کلام بلاغت نظام آہستہ آہستہ منظرِ عام پر

آنے لگا۔ ادبی حلقوں کی جچی تلی رائے یہ ہے کہ چوہدری محمد علی اور ناصر کاظمی دو ہمزاد نام ہیں۔ ایک نے اخفا میں رہنا پسند کیا دوسرے نے پاکستان کی چوتھی دہائی تک پاکستان کے ادبی حلقوں میں تہلکہ برپا کئے رکھا۔ چوہدری محمد علی مضطر صاحب تو اخفائے کلام کے سلسلہ میں بیسویں صدی کی چھٹی دہائی تک بڑے کٹر نظریات رکھتے تھے۔ اب خلافتِ رابعہ کے دور میں کھل کے سامنے آئے ہیں اور چھپنے لگے ہیں۔ مگر ان کا کلام صرف سلسلہ کے پرچوں ہی میں چھپتا ہے۔ ایں ہم غنیمت است۔ تعلیم الاسلام کالج کے اساتذہ میں سے پروفیسر نصیر احمد خاں، بہت نغز گو شاعر تھے۔ ان کا مجموعہ "رودِ چناب" چھپ کر ملک کے ادبی حلقوں سے تحسین حاصل کر چکا ہے۔ جنرل محمود الحسن صاحب ایمن آبادی اپنے مخصوص اندازِ فکر کے ممتاز شاعر ہیں ان کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ "شہدِ سم"!!

میں شعراء کا ذکر کرتے ہوئے جماعت کے ادیبوں کو نظر انداز کر گیا۔ ادیبوں سے مراد ایسے ادیب نہیں ہیں جو محض ادب تخلیق کرتے ہیں۔ میری مراد ایسے لوگوں سے ہے جن کی تحریروں میں ادبی شان موجود ہوتی ہے۔ ان ادباء کے سالار تو قمر الانبیاء حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ ہیں۔ حضرت میاں صاحب کی تحریر میں ایک خاص استادانہ دل آویزی تھی۔ انہیں لفظوں کو برتنا آتا تھا۔ ان کی نثر میں بھی لفظ نگینوں کی طرح جڑے ہوئے تھے۔ جماعت کے علمِ کلام کو ہر کہہ و مہ تک پہنچانے کا کام انہیں کو سزاوار تھا۔

جماعت کے علماء میں سے حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب جالندھری، حضرت قاضی محمد نذیر صاحب لائلپوری بھی مناظراتی ادب میں منفرد تھے۔ مولانا دوست محمد شاہد نے تاریخ نویسی میں اپنے اسلوب کا لوہا منوایا۔ جن لوگوں نے ادبی حلقوں میں اپنی انفرادیت منوائی ان میں مکرم شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی بہت منفرد ہیں۔ شیخ صاحب حالی کے ہم وطن ہی نہیں ان کے معنوی شاگرد بھی تھے۔

شیخ صاحب ہی کے صاحبزادے محمد احمد پانی پتی نے عربی کی مستند تاریخی اور علمی تصانیف کو اردو میں منتقل کیا اور پاکستان کے علمی وادبی حلقوں میں اپنی شناخت پیدا کی مگر ”خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود“ کا عنوان ہوا۔قمر اجنالوی صاحب نے ناول نگاری کے علاوہ صحافت میں اپنی فکاہیہ نگاری کا لوہا منوایا۔عبدالمجید سالک نے ان کے ایک فکاہیہ سے خوش ہوکر اپنا کالم افکاروحوادث انہیں بخش دیا تھا۔

حضرت ماسٹر محمد حسن آسان دہلوی (دہلی کے ایک ہندو تذکرہ نگار نے انہیں بلبلِ ہزار داستان کا خطاب دے کر اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے) اوران کے نامور صاحبزادے مسعود احمد خاں دہلوی نے دہلی کی ٹھیٹھ بامحاورہ زبان میں اپنی امتیازی حیثیت اور شان برقرار رکھی۔سیٹھ محمد اعظم دکن کی تہذیب کے نمائندے تھے انہیں دکن کی مٹی سے بہت انس تھا۔ان کے ہاں صاف ستھری زبان لکھنے کا چلن قائم رہا۔جس طرح بھائی مسعود احمد خاں دہلوی نے دہلی کے اجڑے دیار کی یاد قائم رکھی،سیٹھ محمد اعظم صاحب لیلائے دکن کی محبت کے گن گاتے رہے۔افسوس کہ ان کے مضامین بھی شاید دیمک کی غذا ہی بن گئے ہوں گے۔کوئی انہیں یکجا کرنے اور شائع کرنے والا نہ ہوا۔میاں عبدالسمیع نون صاحب اپنے منفرد انداز میں جماعتی پرچوں میں لکھتے رہتے ہیں۔جنید ہاشمی اور شیخ عبدالقادر محقق بھی نثر نگاروں میں نمایاں رہے۔آج کل محمود مجیب اصغر صاحب بھی خوب لکھ رہے ہیں۔مولانا بشیر احمد رفیق کا لکھنے کا اپنا اسلوب ہے۔

احمدیوں کے ہاں خودنوشت کا سب سے مشہور اور عمدہ نمونہ تو حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل دہلویؓ کی آپ بیتی ہے مگر حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحبؓ کی ”تحدیثِ نعمت“ کو بھی اردو کی منفرد اور ممتاز خودنوشت سمجھا جاتا ہے۔مکرم میاں محمد ابراہیم صاحب کی خودنوشت بھی اچھی قابلِ قدر کتاب ہے۔ملک محمد عبداللہ صاحب نے بھی اپنی یادوں کو جمع کر دیا ہے اسی طرح جماعت کی بعض اہم

شخصیات کے بارہ میں ان کے تاثرات محفوظ ہو گئے ہیں۔

تاریخ نویسی بھی جماعت میں قائم رہی۔حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ نے جماعت کے ابتدائی ریکارڈ کو محفوظ کرنے کا اہم کام کیا تھا مگر اس سلسلہ میں اب سب سے زیادہ اہم اور وقیع کام پاکستان کے قیام سے لے کر اب تک ملک صلاح الدین صاحب اور مولانا دوست محمد شاہد صاحب نے کیا۔"تاریخِ احمدیت" مولانا کا نام رہتی دنیا تک قائم رکھے گی۔

پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب کی جلسہ کی تقریریں جماعت احمدیہ کے علمِ کلام کا عمدہ نمونہ ہوتی تھیں۔اسی طرح موجودہ دور میں دو چار اساتذہ نے معاشرتی مسائل پر قلم اٹھایا ہے اور پڑھنے والوں سے داد حاصل کی ہے۔ پروفیسر مرزا مجید احمد صاحب اور پروفیسر میاں محمد افضل صاحب، پروفیسر راجہ نصر اللہ خان صاحب اور پروفیسر عبد الکریم خالد کے ہاں خلوص، سادگی اور سچائی نمایاں ہے اس لئے ان کی نثر میں تاثیر ہے۔کیا جانے دل کو کھینچیں ہیں کیوں شعر میر کے۔ کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں!! ان سب حضرات کے مضامین کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ پروفیسر سعود احمد خاں اور پروفیسر محمد ارشد چوہدری اور اب پروفیسر طاہر احمد نسیم مختلف تاریخی اور سیاسی اور سائنسی مسائل پر لکھتے رہتے ہیں۔کینیڈا سے زکریا ورک سائنسی مضامین پر خوب لکھ رہے ہیں ڈاکٹر عبد السلام پر ان کا تحقیقی کام نمایاں ہے۔ پاکستان کے ادیبوں میں مرزا خلیل احمد قمر اور مولانا حنیف محمود صاحب اور مولانا صفدر نذیر جاوید گولیکی خوب فعال ہیں۔انجینئر خالد سیف اللہ آسٹریلیا میں بیٹھ کر معلوماتی مضامین کے انبار لگا رہے ہیں۔الفضل ربوہ میں نئے نثر نگاروں کی ایک کھیپ تیار ہو رہی ہے۔نثر نگاروں کا مختصر تذکرہ کرنے کے بعد پھر شعراء کی طرف لوٹتا ہوں۔ پاکستان کی پہلی دہائی میں سلسلہ کے پرچوں میں چھپنے میں ہمارے احمدی شعراء میں جو لوگ نمایاں ہوئے ان میں دو نام جامعہ احمدیہ سے متعلق تھے۔

مکرم مولوی ظفر محمد صاحب ظفر جن کا مجموعہ کلام چھپ چکا ہے۔اور مولوی عطاء الرحمن طالب۔طالب صاحب سلسلہ کے بعض پرچوں میں چھپتے رہے لیکن ان کا کلام یکجا نہ ہوا۔اسی طرح مابعد والوں میں سے مولانا محمد شفیع اشرف اور ڈاکٹر نذیر احمد ریاض تھے۔اس وقت کی نئی نسل میں سے راجہ نذیر احمد ظفر، امین اللہ خاں سالک آگے آئے مولانا مصلح الدین احمد راجیکی کی شاعری کا چرچا قادیان کے زمانہ سے تھا مگر ربوہ کے ابتدائی دنوں میں ان کا کلام سلسلہ کے اخبارات ورسائل کی زینت بنتا رہا۔راقم الحروف کو انہی سے تلمذ حاصل ہے۔ان کے ہاں دردمندی کی جو کیفیت ابھرتی ہے وہ فانی کے سوا اور کسی میں نظر نہیں آتی۔انہی کے چھوٹے بھائی مبشر احمد راجیکی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں پوری قدرت کے ساتھ شعر کہتے رہے۔حافظ سلیم اٹاوی بھی بہت عمدہ شعر کہنے والے تھے۔جناب آفتاب احمد بسمل اور احسن اسماعیل صدیقی صاحب بھی اس عہد کے ممتاز شاعر ہیں۔جماعت کے علماء میں سے مولانا محمد صدیق امرتسری بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ان کے ہاں روانی اور سلامت بہت تھی۔"نغماتِ صدیق" کے نام سے کلام چھپ چکا ہے۔چوہدری شبیر احمد بھی وقتاً فوقتاً شعر کہتے رہتے ہیں۔ارشاد احمد شکیب اور سید ادریس احمد عاجز عظیم آبادی بھی ان کے ساتھ کے شاعر تھے۔مولانا محمد دین ناز بھی شعر کہتے ہیں۔ہم نے ان سے درخواست کی تھی کہ اپنا کلام چھپائیں تو اس کا نام کلامِ ناز کی بجائے "خرامِ ناز" رکھیں۔ان کے بعد کا دور بالکل جدید شعراء کا دور ہے۔ان کا ذکر کرنے سے پہلے یہ بات کہنا چاہوں گا کہ جماعت احمدیہ کے کچھ شعراء ایسے ہیں جو ادبی میدان میں بہت فعال رہے اور ادبی پرچوں میں خوب خوب چھپے۔مگر جماعت کے پرچوں میں ان کا کلام کم کم ہی چھپا ہے ان میں رشید قیصرانی، اکبر حمیدی، حامد برگی، اور عبید اللہ علیم جیسے شعراء شامل ہیں۔جن کے مجموعہ کلام چھپ چکے ہیں۔رشید قیصرانی چونکہ تعلیم الاسلام کالج کے اولڈ بوائے ہیں اس لئے المنار میں ان کا کلام چھپتا رہا۔اکبر حمیدی کا

کلام "لاہور" میں تو ضرور چھپا، جماعت کے دیگر پرچوں میں بہت کم چھپا، اس لئے وہ جماعت احمدیہ کے ساتھ مخلصانہ وابستگی رکھنے کے باوجود جماعت میں زیادہ متعارف نہ ہوئے۔عبید اللہ علیم کو اب آ کے جماعت کے پرچوں کی طرف توجہ ہوئی ہے۔نئی نسل میں سے صابر ظفر ایسے شاعر ہیں جو ملک کے ادبی حلقوں میں بہت جانے پہچانے ہیں۔ان کا کلام بھی المنار میں چھپتا رہا۔ان کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔محمد خالد، ابرار احمد، طاہر عارف، افضال نوید، رشید ندیم، عارف ثاقب، احمد مبارک، رفیع رضا اور آصف محمود باسط، عبدالسلام اسلام اور چھپے رستم سید قمر سلیمان احمد نوجوان نسل میں اپنا منفرد لہجہ رکھنے والے شعراء ہیں۔اب ان میں مبارک احمد ظفر بھی آ شامل ہوئے ہیں۔ان کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔انوار احمد بہت نمایاں لہجہ رکھنے والا شاعر تھا مگر دستِ اجل کا شکار ہو گیا۔ان میں سے کچھ یعنی افضال نوید، رشید ندیم، رفیع رضا، اکرم ثاقب مظفر منصور کینیڈا میں ہیں۔افضال نوید اور اکرم ثاقب کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔کینیڈا میں ہی ایک اور مانوس نام ہدایت اللہ ہادی کا ہے خالد ربانی تو راہی بقا ہو گئے۔جرمنی میں نوجوان شاعر خالد ملک ساحل ہیں جن کا کلام چھپ چکا ہے۔برطانیہ میں آدم چغتائی ہیں۔عبدالسلام اختر کے برادر خورد منصور احمد ہیں۔یہ لوگ اپنے رنگ میں جماعت کے ادبی میدان میں کام کر رہے ہیں۔امریکہ میں حبیب الرحمن ساحر ہیں جن کا کلام جماعت کے پرچوں میں ساحر حبیب کے نام سے چھپتا رہتا ہے۔ہالینڈ سے جمیل الرحمن جمیل کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں ایک تو حال ہی میں چھپا ہے۔جمیل الرحمن نے جماعت کے ایم ٹی اے کے لئے بہت سے ترانے لکھے ہیں اور اللہ کے فضل سے مقبولیت حاصل کی ہے۔طاہر مجید، غلام محی الدین صادق اور راجہ محمد یوسف کا تعلق جرمنی سے ہے۔ان کا کلام بھی اب سلسلہ کے پرچوں میں چھپنا شروع ہوا ہے۔

موجودہ نسل کے جن شعراء کے کلام نے جماعت کے پرچوں میں چھپنے کے بعد اپنی پہچان بنائی

ان میں ذرا سینئر شعراء عبدالکریم قدسی اور، مبارک احمد عابد اور انجینئر مبشر خورشید ہیں۔اس کے بعد کے سلسلہ میں عبدالکریم خالد یوسف سہیل شوق، اکرم محمود اور طاہر عارف ہیں۔طاہر عارف کے دو مجموعہ ہائے کلام چھپ چکے ہیں ایک اردو کا ایک پنجابی کا۔لطیف قریشی نے آزاد شاعری کرنے کے علاوہ البتہ تنویر صاحب کا کلام یکجا کرنے اور شائع کرنے کی نیکی کی ہے۔انور ندیم علوی صاحب آج کل خوب لکھ رہے ہیں مگر ان کا کوئی مجموعہ چھپا یا نہیں یہ بات میرے علم میں نہیں۔

موجودہ دور کے نوجوان احمدی شعراء کے نام ہی لکھنے لگوں تو ایک دفتر ہو جائے۔مگر اس امر کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمارے نوجوان شعراء میں وہ شاعرانہ حسیت جس poetic sensibility کہتے ہیں ہماری پچھلی نسل سے کہیں زیادہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں ہمارے بہت سے شعراء اردو شاعری کے آسمان پر ستارے بن کر جگمگائیں گے اور اس امر کا بھی یقین ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو جماعت احمدیہ کے علمِ کلام کی ترویج میں صرف کریں گے۔

یہ بات کہنا خودستائی میں شمار نہ ہو تو کہہ دوں کہ نوجوان نسل کے جن شعراء کا نام میں نے لیا ہے ان میں سے اکثر تعلیم الاسلام کالج کے پڑھے ہوئے اور میرے شاگرد ہیں۔ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیہِ مَنْ یَّشَاءُ۔

حسن رہتاسی، جماعت کے مزاحیہ شعراء کے سرخیل تھے۔مگر ان کے رنگ کا تتبع کرنے والا کوئی نہ ہوا البتہ ناجی سبزواری اس راہ پر افتاں وخیزاں اب تک ثابت قدمی سے چلے آرہے ہیں۔اب بقول شخصے "بندے دے پتر" بن گئے ہیں اور "ابنِ آدم" کے نام سے لکھتے ہیں۔ناجی صاحب نے مدتوں پہلے "روح القدس کے موسیقار" کے عنوان سے احمدی شعراء کا ایک انتخاب شائع کیا تھا۔

خواتین شعراء میں سے بزرگ خواتین میں سے سب سے پہلا نام تو حضرت سیدہ نواب مبارکہ بیگم

صاحبہ کا ہے۔ ”درِ عدن“ جماعت کے علمِ کلام کا اعلیٰ نمونہ ہے پھر شاکرہ تھیں یا منیرہ ظہور، اب اس میدان میں صاحبزادی امتہ القدوس، ڈاکٹر فہمیدہ منیر، آپا طاہرہ صدیقہ ناصر سلمہا اور امتہ الباری ناصر اور ارشاد عرشی کی تگ و تاز جاری ہے۔ جرمنی میں مقیم نعیمہ ضیاء الدین بھی ادبی حلقوں میں خوب معروف ہیں۔ اسی طرح کینیڈا سے نزہت الماس صدیقی اور راشدہ اشرف سیال اور وسیمہ قدسیہ بہت معروف نام ہیں۔ نزہت کو بعض ادبی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ امریکہ کی عاتکہ صدیقہ کے مضامین ”لاہور“ میں چھپ رہے ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد پر ان کی دو تحقیقی کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔ پروفیسر نسیم سعید سلسلہ کے لٹریچر میں قابلِ قدر اضافے کررہی ہیں۔ ان کی بہت سی تصانیف معرضِ وجود میں آچکی ہیں۔ اپنے نامور باپ اور باپ سے زیادہ نامور ماں کے ورثہ کا تحفظ ان کا شیوہ ہے۔ ان کے بھائی سید برکات احمد سابق سفیر حکومت ہند نے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی کتاب ”مذہب کے نام پر خون“ کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔

یہ تو ادباء شعراء کا ذکر تھا۔ پاکستان میں اردو کی ترویج واشاعت میں ربوہ کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ تعلیم الاسلام کالج میں ملک کے ممتاز ادباء اور شعراء وقتاً فوقتاً آتے رہے۔ کالج میں 1964ء اور 1967ء میں دو کل پاکستان اردو کانفرنسیں بھی ہوئیں جن میں سے پہلی کانفرنس کی کارروائی ”ذکرِ اردو“ کے نام سے چھپی۔

تعلیم الاسلام کالج کو حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحبؒ جیسا پرنسپل ملا جسے آگے چل کر منصبِ خلافت پر فائز ہونا تھا۔ حضرت صاحب کی رہنمائی میں تعلیم الاسلام کالج اردو کی ترقی میں کوشاں رہا اور ملک کے ادباء اور علماء ان خدمات کے معترف ہیں! ان کانفرنسوں اور بزمِ اردو کی بیشتر سرگرمیوں کے لئے پروفیسر محبوب عالم خالد اور خاکسار راقم الحروف کو خدمت کی توفیق ملتی رہی!

اب پھر ذرا سا گریز نثر کی طرف۔ ہمارے افسانہ نگاروں میں سے سعید انجم، ناروے اردو کے چند مشہور ترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے تھے۔ عبد القیوم شاد، سلسلہ وار افسانوی داستانوں کے لئے بہت معتبر گنے گئے بلکہ وفات کے بعد بھی اب تک ان کے افسانوی سلسلے مختلف رسالوں میں دہرائے جا رہے ہیں۔ انشائیہ نگاری میں اکبر حمیدی اور حامد برگی کے نام بڑے ممتاز ہیں۔ اخباری نامہ نگاروں میں عرفان احمد خان نے اب آ کے قدم رکھا ہے اور اپنا لوہا منوا لیا ہے۔ امریکہ کے لطف الرحمن محمود تھیں مگر اب انہیں فرصت نہیں رہی یا "کشنا کشِ غمِ پنہاں" نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

راقم الحروف کو بھی نظم و نثر میں خدمت کی تھوڑی بہت توفیق ملتی رہی اور اس ہیچ میدان کے مضامین جماعت کے کسی ایک پرچے میں چھپنے کے بعد جماعت کے بہت سے دوسرے پرچوں میں اور دوسرے ممالک میں بھی مکرر چھپتے رہے۔ نظموں کا سلسلہ یہ رہا کہ خاکسار جماعت کے پرچوں میں تو چھپتا رہا مگر ملک کے وقیع ادبی رسائل کے مدیران کے کہنے کے باوجود ان رسائل سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں اپنی شعری صلاحیت کو صرف جماعتِ احمدیہ کی خدمت کے لئے وقف رکھنا چاہتا ہوں اور ان مدیران نے ازراہِ کرم میرے اس عذر کو قبول فرما لیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ ادبی جرائد نے جماعت کے پرچوں میں چھپنے والی کسی چیز کو اپنے پرچوں میں مکرر چھاپ کر میری عزت افزائی فرمائی۔ جماعت کے بہت سے شعراء کے مجموعہ ہائے کلام پر تعارفیے لکھنے کی توفیق ملتی رہی حتیٰ کہ ملک کے نامور نقاد ادیب اور شاعر ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک کتاب کا تعارفیہ لکھنے کا اعزاز بھی اس حقیر کے حصے میں آیا۔

غرض پاکستان میں اردو ادب کی ترویج و ترقی میں جماعت احمدیہ کے ادباء اور شعراء کا بھی حصہ ہے اور جماعت کے ادباء و شعراء کا مسلک بھی جماعت کا وہی عمومی مسلک ہے کہ صلے سے بے نیاز ہو کر

خدمت کرتے چلے جاؤ! اور بے حد خوشی ہے کہ ان پچاس برسوں میں ادب کے میدان میں بھی جماعت احمدیہ کسی سے پیچھے نہیں رہی!

ربوہ کے احمدی شعراء

ہماری ادبی ہوش کی آنکھیں کھلیں تو ربوہ میں مولوی مصلح الدین احمد صاحب راجیکی کی شاعری کا چرچا تھا۔ ان کی نظم "لغزش" بہت مشہور اور زبان زدِ عام تھی۔ مصلح صاحب سے ملاقات ہوئی تو یوں محسوس ہوا جیسے فانی بدایونی سے ملاقات ہوگئی ہے۔ فانی صاحب کے بارے میں کتابوں میں پڑھ پڑھ کر جو تصور قائم کر رکھا تھا مولوی مصلح الدین اس تصور پر ہو بہو پورے اترے۔ طبیعت کے نہایت مسکین۔ گفتگو میں دھیمے۔ چادر کی بکل۔ سر پر ٹوپی پاؤں میں گرد آلود جوتے۔ ہماری گلی کی نکڑ پر حافظ غلام محی الدین صاحب نے ایک چھوٹا سا چائے خانہ کھول رکھا تھا۔ بس مولوی صاحب وہیں براجمان رہتے تھے۔ سیلونی کے چائے خانہ میں بھی نہیں جاتے تھے کہتے تھے اس کی نفاست سے دم گھٹتا ہے۔ ہمیں شعر کہنے کا شوق چرایا تو سب سے پہلے مولوی مصلح الدین احمد صاحب کو اپنا کلام دکھایا۔ آپ نے اصلاح دی مگر ساتھ ہی نصیحت بھی کی کہ اساتذہ کا کلام غور سے پڑھیں، میر، سودا، آتش، ذوق اور غالب کا کلام خود مولوی صاحب کو میر اور غالب بہت پسند تھے۔ غالب کے تو وہ حافظ تھے۔

مولوی مصلح الدین احمد، حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی کے بیٹے تھے۔ باپ کی ولایت سے حصہ وافر پایا تھا۔ حد درجہ مستغنی الاحوال۔ ان کے ذریعۂ معاش کا کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا مگر فکرِ معاش سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ ان کا کلام ان کے چھوٹے بھائی مبشر احمد راجیکی نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ لیکن خود ہمیں بھی کئی مقامات پر احساس ہوا کہ چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کے کلام میں جہاں

تہاں دخل دیا ہے مگر وہ کلام ان کی پوری شخصیت پر محیط نہیں۔ بہت سا ایسا کلام ہے جو اس میں شامل نہیں یا بوجوہ شامل نہیں کیا گیا۔اب وہ کلام کون جمع کرے گا؟

مصلح الدین احمد کی شخصیت کا جو پہلو اب بھی میرے ذہن میں مستحضر ہے وہ ان کی حرماں پرستی ہے۔آپ نے حرماں پرستی میں تصوف کی چاشنی پیدا کر دی تھی۔ان کے شعر دردمندی کی تصویر ہوتے تھے۔مولوی صاحب کرسی پر اکڑوں بیٹھتے تھے۔چادر یا کمبل کو اپنے سارے وجود کے گرد لپیٹ لیتے تھے۔شعر سنانے کا ہوکا نہیں تھا۔بس کبھی کبھار طبیعت آئی تو سناتے تھے۔مجھے اب بھی کل کی طرح یاد ہے کہ حافظ محی الدین کے چائے خانے کی ایک بنچ پر بیٹھے،مولوی صاحب نے غزل سنائی تو حاضرین میں سے ایک صاحب اتنا روئے کہ ان کی ہچکی بندھ گئی۔غزل تھی۔

سلیقہ نہیں تجھ کو رونے کا ورنہ
بڑے کام کا ہے یہ آنکھوں کا پانی
اس غزل کا مطلع غالباً یہ تھا۔
محبت محبت جوانی جوانی
دلوں کا فسانہ نظر کی کہانی

الطاف مشہدی کی غزل بھی تھی جو ان دنوں بہت مقبول تھی۔مجھے یوں ہی شبہ سا ہو رہا ہے کہ یہ مطلع شاید الطاف کی غزل کا ہے! بہرحال مولوی صاحب کی غزل سے سننے والے وجد میں آجایا کرتے تھے۔

مصلح الدین احمد کے کلام کے ایک حافظ تو اب بھی ربوہ میں موجود ہیں اور وہ ہیں ہمارے چچا،قبلہ مولوی عبدالعزیز صاحب بھامڑی۔اب بھی ربوہ کے نوجوانوں میں سے کوئی ہمت کرے تو قبلہ مولوی

صاحب سے سن سن کر بہت سا کلام جمع کر سکتا ہے۔! کیا ربوہ کے نوجوان اہلِ ذوق میں سے کوئی صاحبِ دل ہے؟ (حیف کہ مولوی صاحب یہ سارا خزانہ اپنے ساتھ لے گئے)

حضرت حافظ مختار احمد شاہجہاں پوری ربوہ تشریف لے آئے تو ان سے بھی نیاز مندی کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت حافظ صاحب، امیر الشعراء، امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ اور لکھنؤ کی دبستان شاعری کے آخری چراغ! قادر الکلامی کا یہ عالم تھا کہ نہایت مشکل زمینوں میں طویل غزلیں کہتے۔ دو غزلہ سہ غزلہ اور چہار غزلہ تک تو ہم نے بھی سنا ہے۔ غزل کے روپے میں ایک طویل مرثیہ آپ نے کہا۔

بیڑیاں توڑ کے چلتے ہوئے یارانِ کہن
اب اسی دھن میں قریبِ درِ زنداں ہوں میں!

اس کے شعروں کی تعداد میرا خیال ہے سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اس کے کچھ اشعار ہم نے حضرت حافظ صاحب کی زبانِ مبارک سے سنے ہیں۔ حافظ صاحب، سید عبد الباسط صاحب کی بیٹھک میں ایک پلنگ پر تشریف رکھتے تھے۔ وہی بیٹھک ان کا گھر تھا۔ پلنگ پر ہر طرف کاغذ ہی کاغذ اور کمرے میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں ہوتی تھیں۔ حضرت حافظ صاحب سے ایک بار ایک غیر از جماعت اور جید عالم ملنے کو آئے۔ حافظ صاحب نے ان سے ایسی مدلل گفتگو کی کہ وہ انگشت بدنداں رہ گئے کہ اتنا سادہ شخص علم کا سمندر اپنے سینے میں دبائے بیٹھا ہے۔ باہر نکل کر انہوں نے جو پنجابی فقرہ کہا اس کا حوالہ ایک بار حضرت صاحب نے اپنی ایم ٹی اے کی گفتگو میں بھی دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا" ایہہ کی بلا بدّھی اوئی ایہہ"! یعنی آپ نے اس چھوٹے سے کمرہ میں کس بلا کا عالم بند کر رکھا ہے۔

بزرگ شعراء میں سے حضرت قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل سے صرف ایک بار ملاقات کا

موقع ملا۔اکمل صاحب بہت ضعیف ہو گئے تھے۔کھلتا ہوا گندمی رنگ تھا۔ناک پر چمکیلے سنہری فریم کی عینک تھی۔اکمل صاحب نہایت زود گو شاعر تھے۔اور سلسلہ کے پرانے اخبارات ورسائل ان کے کلام سے بھرے ہوئے ہیں۔ان کی کلیات برادرم محترم جنید ہاشمی صاحب نے چھاپ دی تھی۔"نغمہ اکمل" مگر یہ کلیات میر تقی میر کے کلیات کی طرح اتنی ضخیم ہے کہ پڑھنا مشکل ہے۔اور دوسرے یہ کہ بے ترتیبی سے چھپائی گئی ہے۔اور اپنی افادیت کھو بیٹھی ہے۔اے کاش کوئی اس کو دوبارہ ایڈٹ کر کے چھاپ کے۔اکمل صاحب کے دونوں بیٹے صاحبِ ذوق تھے جنید ہاشمی اور شبلی بی کام۔شبلی بی کام کے نام کے ساتھ بی کام کا لاحقہ ایسا چپکا کہ ایم کام ہونے کے بعد بھی لوگ انہیں بی کام ہی لکھتے رہے۔کسی زمانہ میں اخبار ملت کے ایڈیٹر تھے۔مانے ہوئے صحافی اور پاکستانی اخبارات میں اقتصادی ریویو لکھنے کے بانی تھے۔صدر ایوب کے زمانہ میں بیس خاندانوں کا بہت تذکرہ رہا۔یہ بیس خاندان وہ تھے۔جن کی اقتصادی چیرہ دستیوں کا تذکرہ شبلی ایم کام نے کیا تھا۔بہرحال شبلی صاحب کا سلسلہ سے زیادہ گہرا اور قریبی تعلق نہ رہا اس لئے وہ سلسلہ کے حلقوں میں معروف نہ ہوئے۔جنید ہاشمی صاحب تعلیم الاسلام کالج کے آفس سپرنٹنڈنٹ تھے۔اور نہایت اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے۔سلسلہ کے اخبارات ورسائل میں کبھی کبھار ادبی موضوعات پر لکھتے بھی تھے۔جنید صاحب کی بیٹیوں میں سے قانتہ اور فائزہ اچھی صاحبِ ذوق لڑکیاں ہیں ایک انگریزی کی پروفیسر ہے ایک فلسفہ کی۔ان دونوں میں سے کوئی ہمت کرے تو"نغمہ اکمل" کو ایڈٹ کر سکتی ہیں!۔

ربوہ کے تین شاعروں سے ہماری بہت دوستی رہی۔عبدالسلام اختر،نسیم سیفی اور روشن دین تنویر۔اب تینوں ہی اس دنیا میں نہیں ہیں۔زندہ شاعروں کے بارہ میں لکھنا تو مشکل ہوتا ہی ہے مگر مرے ہوؤں کے بارہ میں لکھنا زیادہ ذمہ داری کا کام ہے کیونکہ وہ اپنے بارہ میں کی گئی غلط بیانیوں کا جواب

نہیں دے سکتے یا غلط طور پر منسوب کی گئی بات کی تردید نہیں کر سکتے۔عبدالسلام اختر نہایت نعت گو شاعر تھے۔ناگپور یونیورسٹی سے فلسفہ کے ایم اے تھے۔اور شاعر باپ، یعنی ماسٹر علی محمد صاحب بی اے بی ٹی کے بیٹے تھے۔زندگی وقف کر کے سلسلہ کی خدمت میں مستعد رہے۔وفات کے وقت ایڈیشنل ناظر بیت المال تھے۔نائب ناظر تعلیم بھی رہے۔گھٹیالیاں کالج کے پرنسپل بھی رہے مگر شاعری کسی حال میں بھی نہیں چھوڑی۔کلام پر قدرت رکھتے تھے۔اور بڑے جذب وشوق سے جھوم جھوم کر پڑھتے تھے۔ان کی ایک نظم ”مور“ بہت مشہور ہوئی جب جھوم جھوم کر سناتے تو لوگ ان کے شعروں سے زیادہ ان کے جھولنے کا لطف لیتے اور ”ونس مور۔ونس مور“ کے نعرے لگاتے! اختر صاحب کی سادہ لوحی بہت مشہور تھی وہ کلام سنانے کا شوق بھی رکھتے تھے۔ایک روز غریب خانہ پر تشریف لائے۔ہمارا پوچھا۔ابا جی نے بتایا کہ ”کالج گیا ہوا ہے“ کالج تشریف لے گئے۔ہم وہاں نہیں تھے واپس ہمارے گھر پہنچے تو ابا جی نے بٹھالیا اور کہا کہ اختر صاحب اپنا تازہ کلام مجھے سنایئے۔میں شاعر تو نہیں شاعر کا باپ ہوں! اختر صاحب نے کہا آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں تازہ کلام سنانے کے لئے آیا ہوں؟ ابا جی نے کہا دیکھو میاں! شاعر شعر کہنے کے بعد اس بے تابی سے سامع کی تلاش میں گھومتا ہے جیسے مرغی انڈا دینے کے لئے مناسب جگہ کی تلاش میں ماری ماری پھرتی ہے۔آپ جس بے تابی سے ناصر کو ڈھونڈ رہے ہیں وہ آپ کی حالت کی غماز ہے۔شعر ارشاد ہو۔سارے ڈرامے کا کلائمکس یہ ہوا کہ اختر صاحب نے کلام سنانا شروع کر دیا۔کیسے سادہ دل لوگ تھے۔

اختر صاحب کا کلام یکجا ہوسکتا ہے تو سلسلہ کے ادب میں اچھا اضافہ ہوتا۔ان کے بیٹے نیدو اور ٹونی ہمارے شاگرد ہوئے (ان کے اصل نام ہمیں یاد نہیں آرہے) اچھے سعادت مند لڑکے ہیں وہ یہ پڑھیں تو ہماری بات پر کان دھریں۔کہیں نائیلہ بیٹی سن پائے تو وہ اس کام پر کمربستہ ہو۔ان کا باپ

کوئی ایسا معمولی شاعر نہیں تھا کہ اس کا کلام یوں ہی رسالوں میں پڑا پڑا ضائع ہو جائے۔مکرم میاں عبد السمیع نون ایڈووکیٹ سرگودھا اختر صاحب کے بڑے مداح تھے۔اور اختر اکثر ان کی نوازشات کا چرچا کرتے تھے۔نون صاحب ہی توجہ کریں۔

آج اپنی ایک کمزوری بھی بیان کر دیں۔اختر صاحب کی وفات کو لمبا عرصہ گزرا مگر ہم آج تک دوبارہ ان کے گھر افسوس کے لئے نہیں گئے۔کئی دوستوں نے کہا بھی کہ آپ کا تو اختر صاحب سے بڑا یارانہ تھا۔آپ ان کے بچوں کو ایسے بھول گئے؟ ہم نے سنی اَن سنی کر دی۔سچی بات یہ ہے کہ ہم دوستوں کو ہمیشہ زندہ سمجھتے ہیں ان کے مرنے کا افسوس کیوں کریں؟

اے ہم نفسان محفل ما	رفتید ولے نہ از دل ما

دوستوں کا وہی تصور آنکھوں میں موجود رہنا چاہیے۔یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں۔یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں!

دوسرے شاعر روشن دین تنویر الفضل کا ایڈیٹر بننے اور احمدی ہونے سے قبل وکالت کرتے تھے اور ادبی دنیا، نیرنگ خیال جیسے ادبی رسائل میں چھپتے تھے۔الفضل کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے تو اس ایڈیٹری کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔تنویر صاحب شاعر تو اعلیٰ درجے کے تھے ہی نثر بھی بڑی مدلل اور خوب صورت لکھتے تھے۔ہر روز کسی علمی موضوع پر اداریہ لکھنا خالہ جی کا گھر نہیں مگر تنویر صاحب کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ان کا ذہن بڑا صاف تھا۔حقہ گڑگڑاتے جاتے اور اداریہ لکھتے جاتے۔شعروں کے باب میں بھی یہی بات صادق آتی تھی۔مگر شعروں کی نوک پلک سنوارنے پر بڑی محنت کرتے تھے۔اور سو باتوں کی ایک بات کہ اپنے کمزور شعروں کو ترک کر دینے میں انہیں کبھی عار محسوس نہ ہوئی۔ہم نے کئی بار دیکھا کہ پندرہ پندرہ بیس بیس شعر کی نظم رات میں کہی مگر صبح اٹھ کر ان میں سے آدھے شعر قلم زد

کر دیئے۔ان کے بعض مسودات ہم نے دیکھے ہیں اوران کی جگر کاوی کی داد دی ہے!

تنویر صاحب کا اور ہمارا تعلق دوستی کا تھا۔عمروں کا تفاوت کبھی اس دوستی میں حائل نہ ہوا۔ وہ بڑے بوڑھے اور ہم ان کے سامنے کل کے بچے! مگر آفرین ہے کہ تنویر صاحب نے ادبی مسائل کے بارے میں ہماری رائے کو ہمیشہ ہی وقعت دی۔"الفضل" میں کبھی کبھی ہمارا کلام چھاپ بھی دیتے تھے۔ اوراپنی مرضی سے کانٹ چھانٹ بھی کر دیتے تھے۔ہم نے کبھی برا نہ مانا۔اس طرح ان کا یہ عالم تھا کہ اتنی پختہ کاری کے باوجود کسی بات پر کھٹک جاتے تو ہماری رائے طلب کرتے اور مناسب سمجھتے تو مان بھی لیتے تھے۔تنویر صاحب عیدِ قربان کے دن اس دنیا سے رخصت ہوئے۔آپ نے کیا حسبِ حال شعر مرنے سے کئی برس پیشتر کہہ رکھا تھا۔

عیدِ قرباں ہے مگر عید کا سامان کہاں!	جان قربان کروں؟ تن میں مگر، جان کہاں!

اب تیسرے نسیم سیفی صاحب! سیفی صاحب ہمارے ابا کے ہم عمر تھے ان کا بڑا بیٹا ظفر اقبال ہمارا ہم عمر ہے مگر سیفی صاحب کی اور ہماری ایسی بے تکلفی تھی جیسی ہم عمر دوستوں میں ہوتی ہے۔قادیان کے زمانہ کی ہمسائیگی کے ناطے دوستی کا رشتہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا تھا پھر ربوہ میں یہ ہماری ہی گلی میں رہتے تھے۔سیفی صاحب زود گو شاعر تھے چٹکیوں میں نظم کہہ لیتے تھے اور کثرت سے شعر کہتے تھے جب الفضل کے ایڈیٹر ہو گئے تو نثر میں بھی یہی کثرت نویسی آگئی سارے کا سارا الفضل ان کے نثر پاروں سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔تحریک کے پرچے تحریکِ جدید کے ایڈیٹر تھے تو وہاں بھی یہی طریقہ تھا۔ہم نے کئی بارانہیں لکھا کہ یار دوسروں کی چیزیں بھی الفضل میں چھپنے دیا کریں مگران کا جواب تھا کہ جتنی محنت دوسروں کی چیزیں ایڈٹ کرنے میں لگتی ہے اس سے آدھی محنت میں سارا پرچہ لکھا جا سکتا ہے چنانچہ یہی ہوتا تھا۔کچھ وقت ایسا نازک تھا کہ پابندیاں بہت تھیں ذرا اونچ نیچ ہوتی تو پرچے کے خلاف پرچہ

کٹ جاتا تھا۔ان حالات میں ایڈیٹر کا بتیس دانتوں میں زبان کی طرح رہنے کا محاورہ تو بالکل معمولی لگتا تھا ہر طرف سے دشمن تیر و تفنگ لے کر پل پڑے تھے اس لئے ان کے پاس یہی ایک چارہ رہ گیا تھا کہ احتیاط کا دامن پکڑ کر خود ہی سارا کچھ لکھ ڈالیں اور پھر اخبار بھی روز نامہ ہے۔روز کا اداریہ، مختلف مضامین پر شذرات، تبصرے، قطعات، نظمیں!! سارا پرچہ ان کا اپنا لکھا ہوتا تھا اس پر باتیں بہت بنتی تھیں مگر انہیں پروا نہیں تھی۔(اب نئے ایڈیٹر مولانا عبدالسمیع خان صاحب نے تو اداریہ لکھنے سے ویسے ہی توبہ کر لی ہے)۔یہی حال ان کی شاعری کا تھا نظمیں تو تھیں ہی، سیفی صاحب نے قطعات بھی شروع کر دیئے۔قطعے کیا چو مصرعے ہوتے تھے اور جب قید ہوئے تو روزِ الفضل کا ایک صفحہ ان کے قطعات سے بھرا ہوتا تھا۔ہم نے ایک بار مذاق میں انہیں لکھا کہ حکومت نے یہ دریافت کرنے کے لئے آپ کو گرفتار کیا ہے کہ یہ شخص بھلا ایک دن میں اتنی شاعری کیسے کر سکتا ہے؟

ان کی شاعری کے بہت سے مجموعے چھپے ہوئے ہیں۔ایک تو قادیان میں منے سے سائز پر چھپا تھا وہ بھی شاید قطعات ہی تھے۔ہمیں یاد ہے سیفی صاحب ہمارے گھر آئے تھے اور اپنی استانی یعنی ہماری پھوپھی جی کو اپنا مجموعۂ کلام پیش کیا تھا پھوپھی جی نے ہمیں دکھایا تھا کہ دیکھو نسیم سیفی صاحب کی شاعری کی کتاب چھپی ہے تم بھی شاعری کیا کرنا۔الحمدللہ کہ ہم نے شاعری تو جیسی کی سو کی مجموعہ ابھی تک نہیں چھاپا! سیفی صاحب بنیادی طور پر مبلغ تھے اس لئے ان کی شاعری میں بھی تبلیغ ہوتی تھی مشاعروں میں بھی الفضل کے مزاج کی چیزیں پڑھتے تھے تو لوگ باگ احتراماً انہیں سنتے تھے کچھ ان کی بزرگی کا احترام آڑے آتا تھا مگر خود مشاعروں کے بہت خلاف تھے بلکہ الفضل میں مشاعروں کے خلاف ایک آدھ بار لکھ بھی دیا۔ہم ان کی دوستی کے قائل ہیں دوستوں کے دوست تھے۔نظمیں سنتے سناتے بھی تھے دوستوں کی تنقید سن بھی لیتے تھے مگر اپنے موقف سے ذرا ادھر ادھر نہیں ہوتے تھے۔

ان کی طبیعت میں استواری تھی۔اللہ مغفرت فرمائے اب تو جنت میں آرام کررہے ہیں۔

جب یہ مضمون پہلے پہل الفضل میں شائع ہوا تھا اس وقت زندہ تھے حیف کہ کتاب کے چھپتے وقت وہ اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔

جانے والے کا جانا

جو بھی آیا ہے وہ ہے جانے والا۔جانے والے چلے جاتے ہیں ان کی یادرہ جاتی ہے ان کے کام رہ جاتے ہیں۔ابھی کل جو وجود گیا ہے اس کو یاد کرنے بیٹھا ہوں تو اس کے آنے کا وقت یاد آرہا ہے۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ، جون کا مہینہ ایک کے جانے کا غم دوسرے کے آنے کا انتظار۔ساری خلقت بے حال تھی کچھ گرمی کے مارے کچھ اس خوف کے مارے جس کا ذکر وَلَیُبَدِّلَنَّھُم مِّن بَعدِ خَوفِھِم اَمْنًا میں ہے۔ بارے یہ مرحلہ طے ہوا وہ آیا تو گویا خوف سے سہمی ہوئی خلقت کے چہروں کی رونق لوٹ آئی۔یوں محسوس ہوا ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ٹھنڈک اور سکینت کا چھینٹا دیتا ہوا گزر گیا ہے۔1965 میں سکینت اترتی ہوئی پہلے بھی دیکھی تھی مگر 1982 کا عالم اور تھا۔ آنے والا آیا سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔بیعت کا عہد تو سب نے اسی وقت باندھ لیا مگر ہم نے اگلے روز اس آنے والے سے ملاقات کی۔ یوں محسوس ہوا ہمارا ادبی مجلسوں میں بیٹھنے والا ساتھی روحانیت کی بلندیوں پر پہنچ گیا ہے۔دیکھنے میں وہی چہرہ تھا مگر اب اس کے طور اور تھے ایک عجیب نور اس پر برس رہا تھا اس کی باتوں میں موہنی تھی مگر اب اور میٹھی ہوگئی تھیں۔وہ تصویر دیکھتا ہوں تو اس میں اس کا ہاتھ ہماری کمر میں حمائل ہے اور ہم نے اس کے کندھے پر ادب سے ہاتھ رکھا ہوا ہے۔بس ایک تسلی سی ہوگئی کہ یہ ہاتھ ہمارے ساتھ ہے تو سب کچھ ہے۔ یہ ہاتھ جماعت کے سر پر ہے تو جماعت کو

کسی کڑی سے کڑی آزمائش میں بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اور وہ کڑی آزمائش جلد ہی آ گئی۔ مارشل لا اور وہ بھی اس مکروہ شخص کا مارشل لا جس نے اسلام کے مقدس نام کو استعمال کر کے اپنے اقتدار کو طول دیا اور وطن کو اندھیروں میں دھکیل کر اپنے انجام کو پہنچا۔ مارشل کا ضابطہ جمعرات کی شام کو نافذ ہوا ان کا خیال تھا کہ اگلے روز جمعہ ہے دیکھیں جماعت کا کیا ردِعمل ہوتا ہے؟ ہم نے بھی حیرت اور خوف سے مولوی محمد بشیر شاد صاحب کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا۔ اس کا مسجد میں آنا بھی یاد ہے ہاتھ اٹھا کر جماعت کو سلام کرنا بھی یاد ہے مگر اس کے منہ سے خلافِ قانون ملکی ایک لفظ تک نہیں نکلا کہ یہی اس جماعت کی روایت رہی ہے کہ ملک کے قانون کا پورا احترام کرو۔ اب سوائے اس کے کیا چارہ تھا کہ وہ امام جو اپنی جماعت کو محض خاموش سلام کر سکتا ہے السلام علیکم کہے تو قانون کی گرفت میں آتا ہے، جماعت کی دینی رہنمائی کرے تو گردن زدنی قرار پاتا ہے، ملک چھوڑ دے۔ ہمیں وہ دن بھی کل کی طرح یاد ہے کہ ہمارے چھوٹے بھائی نے لاہور فون کر کے ہم سے کہا کہ اس کی کراچی جانے کی ہوائی سیٹ بک کروا کر اسے مطلع کریں مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ہم نے سیٹ بک کروا دی وہ کراچی پرواز کر گیا۔ وہ ہراول کا آدمی تھا جسے امام وقت کے باہر جانے کا انتظام و انصرام کرنا تھا۔ سب کچھ ہوا، قانون کے اندر رہتے ہوئے ہوا، قانون کی کوئی خلاف ورزی نہ ہوئی۔ امام وقت کا قافلہ موٹروں سے کراچی روانہ ہوا دو یا تین کاریں تھیں۔ ڈرائیور کے ساتھ سامنے کی سیٹ پر وہ دلیر اور جری امام بیٹھا تھا جسے ملک چھوڑنا تھا۔ راستہ میں اپنے پسندیدہ روڈ سائیڈ ہوٹل پر رک کر اس نے چائے بھی پی۔ اتر کر اپنے جاننے پہچاننے والے ہوٹل والے سے علیک سلیک بھی کی۔ کراچی پہنچا۔ یورپ کی پرواز کا وقت ہوا تو وی آئی پی لاؤنج سے ہو کر جہاز تک گیا یہ نہیں کہ کسی خفیہ راستہ سے جہاز تک گیا ہو۔ قانون کی ذرا سی خلاف ورزی اس نے نہ کی کہ یہی اس کا شیوہ تھا اور یہی اس کا کہنا تھا کہ اگر اس کے خلاف کوئی

مقدمہ درج ہوا ہے تو وہ ہرگز ملک سے نہیں جائے گا۔ کے ایل ایم کا ہوائی جہاز اڑا تو الوداع کہنے والوں کی جان میں جان آئی۔ وہ بفضلہٖ تعالیٰ بخیریت پہلے ایمسٹرڈم اور پھر لندن پہنچا۔اس کی آنکھوں میں رت جگے کی وجہ سے سرخی تھی مگر اس کے چہرے پر بے آرامی کا کوئی اثر نہیں تھا اس کے دورِ خلافت کا سب سے کٹھن دور شروع ہو چکا تھا اور یہ اس کے کام کرنے کا وقت تھا آرام اس دن کے بعد اس نے نہیں کیا۔ دن کام رات کام، اس ملک کا سفر اس ملک کا سفر، یہ خطبہ، وہ تقریر، یہ جلسہ، وہ جلسہ، غرض اس کی لغت سے آرام کا لفظ یوں خارج ہو گیا گویا ایسا کوئی لفظ موجود ہی نہیں۔ وہ بیمار ہوا تو بھی اپنے فرائض کے مطابق سب نمازیں مسجد میں جا کر پڑھاتا رہا۔ ’ٹھیک ہو تو‘ ’علیل ہو تو‘ اس کے کام کے اوقات تبدیل نہیں ہوئے۔ حتیٰ کہ اس کے چاہنے والوں نے بھی محسوس کیا اور اس سے دبے لفظوں میں درخواستیں بھی کیں کہ وہ اپنے وجود کا اپنے آرام کا خیال بھی رکھے مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔ ہمارے پیارے عزیز شاگرد عزیزی سید قمر سلیمان احمد نے بڑی خوبصورت نظم میں اس سے خطاب کیا کہ تو جو سب کا خیال رکھتا ہے دوسروں کے دکھ درد بٹاتا ہے کچھ اپنا خیال بھی کر، مگر اس نے اپنے پیاروں کی آواز پر کان دھرا تو صرف اتنا کہ خطبہ دینے کے لئے کرسی پر بیٹھنے کی بات مان لی۔ اس سے زیادہ آرام اس نے قبول نہیں کیا۔ اپنی زندگی کے آخری روز سے ایک دن پہلے اس نے جمعہ کا خطبہ دیا۔ مغرب عشاء کے مابین سوال و جواب کی مجلسِ عرفان برپا کی۔ وصال سے چند گھنٹے قبل فجر کی نماز پڑھائی۔ قرآنِ حکیم کی تلاوت کی پھر ذرا سی دیر کو سویا اور ایسا سویا کہ پھر نہ اٹھا تھکے سب اس کو جگا جگا کر یعنی جب آرام کا وقت آیا تو لمبی تان لی۔

اس شخص کے عہد میں ہم نے اور معجزوں کے علاوہ ایک ایسا معجزہ بھی دیکھا ہے جو نئی نسل نے بھی دیکھا مگر وہ اس کے پس منظر سے آشنا نہیں۔ ساٹھ کی دہائی کے اواخر میں تیسرے امام نے ایک بار بڑی

حسرت سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ دور میڈیا کا دور ہے اے کاش جماعت کو کہیں کسی جگہ کسی ملک میں اپنا ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کا موقع مل جائے تو کیا خوب ہو۔ پھر اسی امام نے ایک بار بڑی خوشی سے یہ بتایا کہ افریقہ کے ایک چھوٹے سے ملک میں جماعت کو اپنا ریڈیو قائم کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ جماعت خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ حالانکہ ایک چھوٹے سے ملک کا ایک چھوٹا سا ریڈیو'اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا' کے مصداق کیا کرسکتا تھا؟ مگر چوتھے امام کی ہجرت نے جماعت کو نہ صرف یکجان اور متحد کر دیا بلکہ ایسا معجزہ بھی دکھا دیا جو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ ریڈیو ٹو ریڈیو اس دور میں جماعت نے اپنا ٹی وی قائم کرلیا اور یہ وہ کام ہے جو حکومتیں نہیں کرسکتیں کہ یہ گھاٹے کا سودا ہے۔ سود و زیاں کا حساب رکھنے والے کہنے لگے جماعت اس زیاں میں کیوں الجھنے لگی ہے؟ اس نے کہا "زیاں ہے عشق میں یہ ہم بھی جانتے ہیں مگر۔ معاملہ ہی کیا ہوا گر زیاں کے لئے"۔ اور ہمارے لئے یہ گھاٹے کا سودا منافع کا سودا بن گیا اور وہ آواز جو ایک چھوٹی سی مسجد فضل لندن میں محدود ومحصور ہوتی تھی سارے عالم میں گونجنے لگی۔

چار سو معجزہ حسن بیاں گونجتا ہے۔ ایک آواز سے اب سارا جہاں گونجتا ہے۔

ایک وقت تھا کہ ہمیں ربوہ میں لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی اور دوسرے برملا لاؤڈ اسپیکر پر دھاڑتے چنگھاڑتے اور اپنے ہی غیظ وغضب کے بھاڑ میں جلتے بھنتے رہتے تھے۔ ہم لاؤڈ اسپیکر کا نام بھی لیتے تھے تو مجرم قرار پاتے تھے وہی عالم تھا کہ

"ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام۔
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا"۔

عدو سمجھتا تھا ہم نے ان کا گلا گھونٹ دیا ہے اب "کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ؟"۔ ربوہ والوں

کی آوازیں لاؤڈ اسپیکر میسر نہ ہونے کی وجہ سے مسجد کے اندر بھی پہنچنا ممکن نہ ہوتا تھا اب پانچوں براعظموں میں سنی جارہی ہیں۔اور عدو اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتا ہے کہ ہمیں ان آوازوں سے بچاؤ وہ سننا نہیں چاہتے تھے اب دیکھ رہے ہیں کہ انہیں دیکھنا بھی پڑتا ہے۔خود چاہتے ہیں کہ گونگے بہرے اور اندھے بن جائیں کہ ہماری آواز ان کے کانوں تک اور چہرے ان کی آنکھوں تک رسائی نہ حاصل کریں۔ایک بار نام نہاد عالم نے حکومت کے سامنے دہائی دی تھی کہ اس ٹی وی کا داخلہ ہمارے گھروں میں بند کرو۔لوگوں نے اس کی کم عقلی پر ٹھٹھے لگائے کہ بھلا سیٹلائٹ سے آنے والی آوازوں تصویروں کو روکا جا سکتا ہے؟ وہ کہتے ہیں سیٹلائٹ کی تصویریں۔ہم کہتے ہیں یہ سیٹلائٹ سے نہیں آسمان سے آتی ہوئی آواز ہے اسے سنو اس میں تمہارا فائدہ ہے۔اسمعو اصوت السماء۔اسمعو اصوت السماء۔

میں نے اوپر اس جانے والے کے ذوقِ شعر کا ذکر کیا۔وہ برملا اور برجستہ غالب کے شعروں کا حوالہ دیا کرتے تھے اور ہمیں حیرت ہوا کرتی تھی کہ ان کا غالب کا مطالعہ کتنا گہرا ہے۔ان کی بیگم صاحبہ کی وفات ہوئی تو میں نے ایک نظم لکھ کر ان کی خدمت میں روانہ کی جس میں حضرت بیگم صاحبہ کی غریب الوطنی کی حالت میں وفات کا نوحہ تھا۔ان کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا جواب آیا:

”رشکِ ہم طرحی و درداثرِ بانگِ حزیں۔

نالۂ مرغِ سحر تیغِ دودم ہے ہم کو“

یہ غالب کا شعر ہے اور اس کے مشکل ترین شعروں میں شمار ہوتا ہے۔اتنی برجستگی کے ساتھ غالب کے اس شعر کا حوالہ دے دینا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ہر مردے و ہر کارے۔اس شعر کی معنویت سمجھنا تو کجا اس کو صحیح پڑھنے کے لئے بھی عمر بھر کی ریاضت کی ضرورت ہے۔ان لفظوں کو پڑھنے والے

اس بات کی گواہی دیں گے کہ یہ شعر واقعی مشکل شعر ہے اور سمجھنے کے لئے کسی سمجھانے والے کا محتاج ہے اس شعر کا مطلب یہ بنتا ہے کہ مرغِ سحر یعنی بلبل کی فریاد پر مجھے رشک آتا ہے کہ اے کاش کہ میں اس کی طرح اپنے غم کا اظہار کر سکتا اور اس کی آواز میں جو درد انگیزی ہے وہ میری آواز میں بھی پیدا ہو سکتی۔ ان دو وجوہ کی وجہ سے اس کا نالہ دودھاری تلوار کی طرح دل کو چیرے دیتا ہے۔ یہ کسے معلوم تھا کہ خود اس کا وقت بھی غریب الوطنی میں آجائے گا۔ مگر یہ بات ہم نے غلط لکھی اس کا وطن تو اب سارا جہان تھا جہاں جہاں اس کی آواز گونجتی تھی وہاں وہاں اس کا وطن تھا۔ ہم نے کل اسے اسلام آباد کی جس مٹی کو سونپا ہے وہ مقام بھی تو اس کا آباد کیا ہوا ہے اب جانے والے نے وہیں کی مٹی اوڑھ لی ہے۔

سو جائیں گے اک روز زمیں اوڑھ کے ہم بھی۔

”سلا دیا جسے مٹی میں ہم نے پچھلے پہر۔

وہ ایک شخص نہیں تھا وہ اک زمانہ تھا“ اس کا آنا ایک عہد کا آنا تھا اور اس کا جانا ایک عہد کا جانا ہے۔ وہ عہد جس میں جماعت لاکھوں سے کروڑوں تک پہنچی حدوں سے نکل کر بے حد ہوئی۔ جس کی آواز چار دانگِ عالم میں گونجی اور پانچوں براعظم اس کے حلقہ بگوش ہوئے بھلا وہ کوئی ایک شخص یا وجود ہو سکتا ہے؟

جانے والا بڑا تیز رو تھا اس کے ساتھ قدم ملا کر چلنا مشکل ہوتا تھا۔ ہم نے قادیان اور ربوہ میں خدام کے اجتماعوں میں اسے دیکھا اس کی پھرتی اور اس کی چستی پر بڑے بڑے زور آور رشک کرتے تھے۔ پھر ربوہ میں ہمیں ایک بار سائیکل پر ان کے ساتھ جانے کا موقعہ ملا ہمارے بھائی جان محمد احمد نعیم واقفِ زندگی مربیٔ سلسلہ مرحوم مرض الموت میں مبتلا تھے حالت لمحہ بہ لمحہ دگرگوں ہو رہی تھی انہوں نے لکھ کر اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ مرزا طاہر احمد صاحب کو بلائیں وہ ان کو دیکھیں اور ہومیو پیتھک کی کوئی

دوا دیں تو شاید وہ بچ جائیں۔ میں وقفِ جدید کے دفتر میں گیا۔ جب میں نے بھائی جان کی خواہش کا اظہار کیا تو فوراً جانے پر مستعد ہو گئے اپنی سائیکل پکڑی اور یہ جا وہ جا۔ ہم ہانپتے کانپتے اپنی سائیکل پر ان کے پیچھے روانہ ہوئے۔ بڑی مشکلوں سے انہیں جا لیا اور کہا

"تو ہمرہانِ قافلہ سے کہیو اے صبا۔ ایسے ہی گر قدم ہیں تمہارے تو ہم رہے"۔

فرمانے لگے آپ نے سکول کے زمانہ کا پسندیدہ شعر یاد دلا دیا۔ پھر ہمارے ساتھ آہستہ آہستہ سائیکل چلانے لگے۔ گھر پہنچے۔ بھائی جان نے حسرت بھری نظروں سے انہیں دیکھا کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ پائے کیونکہ فالج کا اثر تھا اور زبان نہیں ہلتی تھی۔ بس وہ ان کا آخری وقت تھا۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ واپس ہوئے ہمیں کہنے لگے بس آپ بھائی جان کے پاس ٹھہریں ان کا وقت شاید آ چکا ہے میں چلا جاؤں گا۔ ہم نے کہا جناب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم آپ کو یوں راہ میں چھوڑ دیں۔ میں انہیں دفتر پہنچا کر واپس ہوا تو بھائی جان اس جہان سے رخصت ہو چکے تھے لیکن انہیں یہ تو تسلی رہی ہو گی کہ ایک پاک وجود نے ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں الوداع کہا ہے۔ اس پاک وجود کا ہاتھ ہر مرحلہ پر لوگوں کو سکینت دیتا تھا۔ پھر تو اللہ تعالیٰ نے اس مہربان وجود کو ساری جماعت کے لئے سکینت کا منبع بنا دیا۔

خدام الاحمدیہ میں تھے تو ایک بار ایک مجلس والوں سے کہا کہ آپ کے ہاں فجر کی نماز میں حاضری کم ہوتی ہے اس کی فکر کریں۔ اس کے بعد خدام نے دیکھا کہ کئی دنوں تک وہ فجر کی نماز اس مجلس کے حلقہ کی مسجد میں پڑھتے رہے۔ کہاں دارالصدر میں ان کا مکان اور کہاں وہ دور افتادہ مسجد۔ سائیکل پکڑتے اور تہجد کے وقت وہاں پہنچ جاتے۔ تربیت کا یہ طریقہ ایسا کامیاب ہوا کہ ان کے زمانہ میں ربوہ میں خدامِ تہجد گزاروں کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ ان کا دستور یہی تھا کہ نصیحت زبانی نہیں کرتے

تھے عملاً اس کا ثبوت دیتے تھے۔

جلسہ سالانہ کے موقع پر نائب افسر جلسہ سالانہ مہمان نوازی تھے دن ہو یا رات ہر وقت اپنی ڈیوٹی پر موجود جلسہ کی سب سے مشکل ڈیوٹی مہمان نوازی کی ڈیوٹی ہوتی تھی کہ ذرا تاخیر ہوئی تو سارا کام تلپٹ ہو گیا۔کئی باریوں ہوا کہ رات کو دو ڈھائی بجے ان سے ہدایت لینے کی ضرورت محسوس ہوئی فون کیا تو اپنے دفتر میں مستعد اور موجود پایا۔ایک موقع ایسا آیا کہ ہم نے کارکن کو ایک رقعہ دے کر بھیجا وہ واپس آ گیا کہ نائب افسر جلسہ دفتر میں نہیں۔ہم نے اسے کہا کہ دو چار منٹ انتظار کر لیتے وہیں کہیں کسی جگہ معائنہ کے لئے گئے ہوں گے۔اتنے میں دیکھا کہ دسمبر کی سردی میں سائیکل پر سوار آ پہنچے کہ کیا ہوا مجھے کارکنوں نے بتایا کہ آپ کا معاون آیا تھا۔قضیۂ زمین برسرِ زمین طے ہوا۔لنگر خانہ جانے کی ضرورت تھی کہنے لگے آپ بھی ساتھ چلیں۔ وہ موقع تھا جب پہلی بار ہماری گاڑی میں تشریف فرما ہوئےلنگر کے بعد ہم نے گاڑی ان کے حوالہ کی کہ اب آپ اس میں دفتر افسر جلسہ میں تشریف لے جائیں ہم آپ کی سائیکل پر آ کر وہاں سے لے لیں گے۔تو ہماری اس ٹوٹی پھوٹی گاڑی کو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ آپ نے اس گاڑی کو چلایا بھی ہے۔وہ گاڑی جب تک چلتی رہی اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر سال جلسہ سالانہ کی ڈیوٹی میں استعمال ہوتی رہی۔جلسہ کے دنوں میں ان کی چستی اور مستعدی کو پر لگ جاتے تھے۔سوائے ”کڑک“ چائے کے اور کوئی چیز ان کو پسند نہیں تھی اور جلسہ کے دنوں میں شاید چائے پر ہی گزارا کرتے تھے کھانے کا یہ عالم بھی دیکھا کہ کسی لنگر میں تنور پر بیٹھے ہیں گرم گرم اترتی ہوئی روٹی بغیر سالن یا دال کے کھا رہے ہیں۔سالن آتے آتے ان کی بھوک کا تقاضہ پورا ہو جاتا تھا۔

پھر ربوہ کے رہنے والے اکثر لوگوں نے دیکھا کہ عصر کے بعد وہ سائیکل پر احمد نگر کو جا رہے ہیں آگے اپنی کسی بچی کو بٹھایا ہوا ہے ہینڈل پر یا سائیکل کے کیریئر پر دودھ والا ڈبہ رکھا ہوا ہے اور ہوا کی

طرح اڑے جا رہے ہیں۔ مغرب سے پہلے واپس ہوں گے اور مسجد مبارک میں نماز میں شریک ہوں گے۔ یہ روزانہ کا معمول تھا ورزش کی ورزش اور سیر کی سیر بچوں کی دل دہی الگ۔ بالکل ایک عام آدمی کی زندگی مگر دست با کار دل بایار۔ حتیٰ کہ خلافت کے منصب پر فائز ہوئے تو اگلے روز سائیکل پکڑ کر ہسپتال کی طرف چل پڑے حفاظت کا عملہ دم بخود دیکھتا رہ گیا۔ وہ تو خدام الاحمدیہ کے صدر ہمارے محمود احمد بنگالی صاحب نے کہا حضور اب حضور کی حفاظت کے انتظام کا فرض جماعت کے کندھوں پر ہے اس لئے حضور اپنے خدام کو آزمائش میں نہ ڈالیں اور اس انتظام والوں سے تعاون فرمائیں۔ تب کہیں جا کر انہوں نے سائیکل کا پیچھا چھوڑا۔

طبیعت میں مزاح تھا پاکیزہ مزاح سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہم 1990 میں لندن میں حاضر ہوئے انہی دنوں ائین آدم سن کی کتاب آئی تھی۔ ازراہِ شفقت میز سے ایک نسخہ اٹھا کر دستخط فرمائے اور ہمیں دے دیا۔ ہم نے ایک ہفتہ کے قیام میں اس کا اردو ترجمہ کرلیا۔ سویڈن جانے کے لئے روانہ ہونے لگے تو ترجمہ کا مسودہ ہمارے ہاتھ میں تھا فرمانے لگے "یہ کیا ہے؟" عرض کی حضور اس "بندے دے پتر" کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ حیرت سے فرمایا "بندے دا پتر" کون؟"۔ میں نے کہا "حضور میں نے" آدم سن" نام کا ترجمہ بھی کر دیا ہے"۔ بہت خندہ فرمایا۔ بعد میں ایک دو دوستوں کو خود بھی یہ لطیفہ سنایا۔ اور ان کی اردو کلاس کے لطیفے کسے یاد نہیں؟ ان کی طبیعت کی شگفتگی ماحول کو شگفتہ رکھتی تھی (سوائے مولویوں کے سب لطف اندوز ہوتے تھے) یہ ورثہ انہوں نے اپنے موعود باپ سے پایا تھا۔ اب ورثہ کی بات آ گئی تو" آنے والا" یاد آیا۔ وہ اپنے پیش رو کو مٹی دے کر واپس آ رہے تھے تو ہم نے ٹی وی پر انہیں دیکھا۔ کیمرہ کسی اونچی جگہ پر تھا اس لئے ہمیں صرف حضور کی پگڑی اور جسم کی حرکت نظر آ رہی تھی۔ ایک لحظہ کے لئے یوں لگا جیسے حضرت مرزا شریف احمد جا رہے ہیں۔ ان کی چال ڈھال

ایسی ہی تھی مجال ہے دائیں بائیں دیکھ لیں۔تواضع کا یہ انداز حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا بھی تھا۔ حضرت مرزا شریف احمد صاحب کوہم قادیان کے زمانہ سے دیکھتے رہے۔اب ان کا پوتا اطال اللہ بقاءہ ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔فرق صرف اتنا تھا کہ حضرت مرزا شریف احمد لنگی باندھتے تھے حضور نے پگڑی باندھی ہوئی تھی۔انہیں بھی آنکھ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنا نہیں آتا تھا نظریں زمین پر ٹکی رہتی تھیں۔ہم اپنی علالت کے باعث لندن میں حاضر نہ ہو سکے مگر یہ اسی جانے والے کا فیضان ہے کہ ہم گھر بیٹھے ان تمام نظاروں میں شریک رہے کون کہتا ہے وہ رخصت ہو گئے؟

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما۔

ایک عالی دماغ تھا نہ رہا

پاکستان کی تاریخ میں جن گنے چنے ناموراشخاص نے اپنے اپنے میدان میں نیک نامی اور قومی غیرت اور بے لوث خدمات کا ورثہ پیچھے چھوڑا ان میں سے تین کا تعلق جماعت احمدیہ سے تھا۔تینوں اپنے اپنے میدان کے مرد تھے، سیاست اور تدبر میں سر ظفر اللہ خاں، سائنس میں ڈاکٹر عبدالسلام اور اقتصادیات میں ایم ایم احمد! پہلے دو، پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے کل ایم ایم احمد کی سناؤنی بھی آ گئی! کُلُّ مَنۡ عَلَیۡہَا فَانٍ وَّ یَبۡقٰی وَجۡہُ رَبِّکَ ذُوالۡجَلٰلِ وَالۡاِکۡرَامِ!

ایم ایم احمد کا پورا نام مرزا مظفر احمد ہے۔آپ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے پوتے تھے۔تقسیم ہند سے قبل آئی سی ایس میں شامل ہوئے۔تقسیم ملک کے وقت سیالکوٹ کے ضلع کے ڈپٹی کمشنر تھے۔پھر رفتہ رفتہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ترقی کے زینے طے کرتے ہوئے مرکزی حکومت میں سیکرٹری فنانس، پھر ڈپٹی چیئر مین پلاننگ کمیشن۔پھر چیئر مین پلاننگ کمیشن، پھر مشیرِ خزانہ اور پھر وزیرِ خزانہ کے مؤقر عہدوں پر فائز رہے اور ہر رنگ میں قومی خدمات سرانجام دیں۔استاذی المحترم کنور ادریس نے

اپنے کالم میں لکھا ہے کہ "ایم ایم احمد اقتصادیات کے آدمی نہیں تھے مگر ان کے تجربہ نے انہیں اس میدان میں وہ کمال عطا کر دیا تھا کہ اقتصادیات کے معاملہ میں ان کی رائے پتھر کی لکیر سمجھی جاتی تھی"۔ سرکاری ملازمت سے بڑے وقار سے سبک دوش ہوئے تو عالمی بینک میں اونچے عہدے پر سرفراز کئے گئے۔ امریکہ کی جماعت احمدیہ کی امارت کے فرائض ساتھ ساتھ انجام دیتے رہے۔ شہرت اور نام ونمود کی خواہش کبھی نہ کی۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا! ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا۔ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں کسی رو رعایت کے روادار نہ تھے اسی لئے بعض حلقوں میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے بھی دیکھے گئے مگر سب لوگ، کیا ان کے ماتحت کیا ان کے افسر، ان کی لگن، ان کی محنت، بردباری اور اصول پرستی کے معترف رہے۔ یہی اوصاف ہماری نوکر شاہی میں مفقود ہیں اور ایم ایم احمد انہی اوصاف سے متصف تھے

قدرت اللہ شہاب جیسے متعصب سرکاری افسر نے اعتراف کیا ہے کہ جہاں کوئی ڈکٹیٹروں کے سامنے کھڑا ہو کر ایک لفظ نہیں کہہ سکتا تھا وہاں یہ کھڑے ہو سکتے تھے اور اپنے دل کی بات کہہ سکتے تھے اور اپنے دل کی بات وہی صاف طور سے کہہ سکتا ہے جس کا ضمیر صاف اور مطمئن ہو۔ ایم ایم احمد قلبِ مطمئنہ کی دولت سے مالا مال تھے۔ نام ونمود سے دور بھاگنے کی ایک مثال تو ہم نے خود دیکھی۔ پنجاب کے ایک آئی جی پولیس ہمارے اچھے جان پہچان کے تھے۔ جب عزیزی صاحبزادہ مرزا مسرور احمد صاحب امیر مقامی (اب سیدی حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز) کو پنجاب پولیس نے گرفتار کیا تو ہم نے سویڈن سے ان آئی جی پولیس کو فیکس دیا کہ "میاں شاباش جو کام ضیاء الحق نہ کر سکا وہ تمہاری پولیس نے کر دکھایا"۔ ان کا معذرت خواہانہ فیکس آیا اس میں لکھا تھا کہ ان کی گرفتاری میں پولیس کا کوئی قصور نہیں کوئی اور عوامل تھے جن کی وجہ سے ایسا ہوا۔ پنجاب پولیس کی مستعدی تو دیکھو کہ

ایم ایم احمد "مرحوم" کے بھتیجے کے اغوا کرنے والوں کو اس نے کس طرح جہنم واصل کیا تھا۔ میں نے آئی جی پولیس کو پھر فیکس دی کہ آپ نے ایم ایم احمد کو مرحوم لکھ دیا حالانکہ وہ اللہ کے فضل سے زندہ موجود ہیں اور امریکہ کی جماعت احمدیہ کے امیر ہیں اس لئے ایم ایم احمد کے باب میں آپ کی "پولیس رپورٹ" غلط ہے۔ آئی جی صاحب کا انتہائی ندامت کا خط آیا کہ مدتوں سے انہوں نے ایم ایم احمد کا نام ہی خبروں میں نہیں سنا تھا اس لئے غلط فہمی ہوگئی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایم ایم احمد اتنی خاموشی سے کام کرتے تھے کہ بڑے بڑے لوگوں کو ان کے بارے میں معلوم نہیں ہو پاتا تھا۔ یہ خاموشی ان کے ساتھ خاص تھی ورنہ ہماری نوکرشاہی کا طرہ یہ تھا کہ کام کم کرتے تھے اپنی پبلسٹی زیادہ کرتے تھے۔

سرکاری افسروں والی اکڑفوں بھی ان میں نہیں تھی کہ ایک کمرہ سے دوسرے کمرہ تک بھی جائیں تو اردلی اردل میں بھاگتا ہوا اور آگے آگے ہٹو بچو، باادب باملاحظہ، کہتا کرتا ہوا چلے۔ سیدھے سبھاؤ اپنی حفاظت کے رکھ رکھاؤ سے بے نیاز رہتے تھے اسی لئے تو اس بدبخت اسلم قریشی کو ان پر قاتلانہ حملہ کا موقع مل گیا تھا اس وقت بھی وہ لفٹ میں اکیلے تھے وہ انہیں اکیلا دیکھ کر ان کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو گیا۔ کوئی اور سرکاری افسر ہوتا تو جھڑک کر اسے لفٹ سے اتار دیتا کہ "یہ لفٹ سینئر سرکاری افسروں کے لئے مختص ہے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' مگر ایم ایم احمد کی دینی تربیت آگے آ گئی کہ سب انسان برابر ہیں کسی کو کسی پر کوئی فوقیت نہیں۔ اس لئے انہوں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ لفٹ میں اس بدبخت نے عقب سے ان پر چاقو سے قاتلانہ حملہ کیا۔ اس مردِ مومن کے حواس قائم رہے حملہ آور کا ہاتھ یوں پکڑا کہ اسے دوسرا وار کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ لفٹ نیچے پہنچی تو خون میں لت پت تھے مگر ہوش و حواس بجا تھے حملہ آور کو دوسروں نے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا اور اس بدبخت کا وار مہلک ثابت نہ ہوا، گردے بہت بری طرح مجروح ہو گئے تھے مگر اللہ نے فضل کیا آپ صحت مند ہو کر پھر اپنے فرائضِ

منصبی میں مشغول ہو گئے۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے!

ہم نے پہلی بار ایم ایم احمد کو جانا تو اس وقت وہ پنجاب کے ایڈیشنل چیف سیکرٹری تھے۔ ہم ان کے والد گرامی حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کے ساتھ خدمت کر رہے تھے۔ ایم ایم احمد کو لاہور سے اپنے ابا سے دفتر میں ملاقات کے لئے آنا تھا، ہمیں ارشاد تھا کہ مظفر آئیں تو انہیں انتظار نہ کروایا جائے فوراً اندر بھیج دیا جائے کیونکہ ان کا وقت بہت قیمتی ہے۔ میاں مظفر احمد اتفاق سے ایک آدھ منٹ دیر سے پہنچے۔ ہم پہلے ہی ان کے منتظر تھے پوچھنے لگے ابا کو انتظار تو نہیں کھینچنا پڑا ناراض تو نہیں؟ ہم نے جواب دیا ناراض تو نہیں البتہ بیتاب ضرور ہیں۔ ایم ایم احمد نے ہماری اس ''زبان درازی'' پر ہمیں غور سے دیکھا۔ ہم نے فوراً انہیں اندر دفتر میں پہنچا دیا۔ السلام علیکم کی آواز گونجی، ہم دروازہ بند کر کے باہر آ گئے۔ غالباً دفتر میں ایم ایم احمد کی اپنے ابا سے پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد ہمیں یاد نہیں کہ وہ دفتر میں آ کر ملے ہوں۔ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کی یہ بیقراری سب کے لئے تھی کسی کو ربوہ کے باہر سے آنا ہوتا تو بے چین رہتے جب تک آنے والا پہنچ نہ جاتا، انہیں کسی کل چین نہ پڑتا۔ ربوہ والوں میں سے کسی کا انتظار ہوتا تو کان دروازہ پر لگے رہتے تھے۔

اپنے والد گرامی کے نام دعا کی درخواست کے خط ان کی طرف سے باقاعدگی سے آتے تھے اور جواب بھی باقاعدگی سے جاتا تھا۔ خط کے القاب بھی سیدھے سادھے ہوتے تھے ''عزیزم مکرم مرزا مظفر احمد سلمہٗ'' اور کبھی کبھی ان کی بیگم صاحبہ کے نام بھی ساتھ ہی میں لکھا جاتا ''عزیزہ مکرمہ صاحبزادی امتہ القیوم سلمہا''۔ ہمیں عجیب لگتا تھا کہ بیٹے کے ساتھ صاحبزادہ نہیں لکھتے تھے۔ زبان و بیان کی یہ باریکی ہمیں انہوں نے بتائی کہ اپنی اولاد کے لئے خود 'صاحبزادہ' کا سابقہ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ ایم ایم احمد کی تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی یہ اس کا اثر تھا کہ انہیں دعا پر پورا یقین تھا۔ اس وجہ سے ان

کے ہاں اللہ تعالیٰ پر اعتماد بھی بہت تھا۔ ہمارے ہاں کے افسروں کا وطیرہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنے کئے پر بھروسہ رکھتے ہیں خدا پر کچھ نہیں چھوڑتے اس طرح اپنی انانیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ایک سینئر سی ایس پی دوست نے نواب کالاباغ کی جو مغربی پاکستان کے گورنر اور طبعاً بہت جابر حاکم تھے، یہ بات ہمیں سنائی۔ نواب صاحب نے کمشنروں کی کانفرنس میں ان سے کہا صاحبزادہ مظفر احمد ہمارے ڈپٹی کمشنر رہے ہیں۔ ہم نے انسانی استطاعت کے مطابق تدبیر کر دینے کے بعد نتیجہ خدا پر چھوڑنا ان سے سیکھا ہے۔ نواب کالاباغ ہمیشہ انہیں صاحبزادہ مظفر احمد کہا کرتے تھے۔

ایم ایم احمد ایسے وقت میں پاکستان کے اقتصادی لحاظ سے اہم عہدوں پر فائز رہے جب مشرقی پاکستان والے مغربی پاکستان والوں کو اور حکومت کو اپنی اقتصادی بدحالی کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ ادھر پلاننگ کمیشن ایم ایم احمد کے دائرہ کار میں شامل تھا اس لئے کیا کیا باتیں نہ بنتیں کہ مشرقی پاکستان کے استحصال کی ساری ذمہ داری ایم ایم احمد کی ہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد بھی ایم ایم احمد تنقید کا ہدف بنتے رہے مگر حقیقت بہر حال حقیقت ہے۔ اعداد و شمار نے ہمیشہ ایم ایم احمد کی صفائی میں گواہی دی تنقید کرنے والے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ ایم ایم احمد سے بھی کئی لوگوں نے اس قسم کے سوال کئے مگر آپ نے بڑے وقار سے اپنی صفائی پیش کی کسی دوسرے پر الزام نہیں لگایا۔ حالانکہ ہمارے لوگوں کا وطیرہ یہ ہے اپنے کئے کی ذمہ داری بھی دوسروں پر ڈال کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اب تو حمود الرحمن کمشن کی رپورٹ الم نشرح ہوگئی ہے اقتصادی استحصال کی ساری باتیں ہوائی باتیں تھیں اور سیاسی لیڈر سیاسی اشکلہ کے طور پر کہتے تھے۔ جماعتِ اسلامی پاکستان کے سابق امیر خرم مراد کی خودنوشت اب آ کے شائع ہوئی ہے اس میں بھی انہوں نے ایم ایم احمد پر الزام لگایا ہے کہ وہ کہتے تھے ”مشرقی پاکستان کے لوگ بھک منگے اور بوجھ اور خوامخواہ کی ذمہ داری ہیں اس لئے ان سے پیچھا چھوٹ ہی

جائے تو اچھا ہے'' (لمحات صفحہ 492) مگر اس الزام کا کوئی حوالہ یا ثبوت انہوں نے نہیں دیا محض اپنی صالحیت کا اظہار کیا ہے۔

جب ایم ایم احمد محکمہ خزانہ کے سیکرٹری تھے تو ایک روپیہ کا نوٹ ان کے دستخطوں سے جاری ہوا۔ ہم ان کے دادا کے رفیق ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہیں آبدیدہ پایا۔ پوچھا ''خیر باشد؟'' فرمانے لگے بات معمولی سی ہے مگر مجھے غیر معمولی لگتی ہے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لیا ہے کہ میرے مرشد کے پوتے کے نام کا سکہ چل رہا ہے۔ یہ کہہ کر پھر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے یہ محبت کے آنسو تھے۔ ہم نے ایم ایم احمد کو ایک خط لکھا کہ آج ہم نے آپ کے دادا ابا کے ایک ساتھی کی یہ بات آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سنی ہے۔ بات ذوقی سی ہے مگر ہمیں یہ بات یاد ہے اور یاد رہے گی۔ اسی طرح مدتوں بعد ایک بزرگ کے پاس ایک پھٹا پرانا نوٹ دیکھا جو انہوں نے سینت سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ کہنے لگے دیکھتے نہیں اس پر کس کے دستخط ہیں؟ یہ کہہ کر ان کی آواز بھرا گئی۔ پاکستان کے کرنسی نوٹوں پر دستخط کرنے والے تو بے شمار تھے اور ہوں گے مگر یہ عزت کس کو ملے گی؟ کون ان کے دستخطوں سے جاری ہونے والے نوٹ کو سینے سے لگا کر رکھے گا۔ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہوتا ہے مگر ایم ایم احمد کا جاری کردہ ہاتھ کا میل بھی محبت کرنے والوں کی آنکھوں کا سرمہ بن گیا۔ ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ یہ سارا اشرف اس خاندان کا ہے جس کی ایک شاخ وہ تھے۔

ہمیں ذاتی طور پر صرف دو ایک بار ان سے ملاقات کا شرف ملا۔ ایک بار تو لاہور میں جب یہ ایڈیشنل چیف سیکرٹری تھے۔ ان کے والد گرامی کا بھیجا ہوا ایک بند لفافہ تھا جو ہمیں ان کی خدمت میں پہنچانا تھا۔ ہم دفتر میں پہنچے، پی اے کو اپنے نام کی چٹ دی۔ اس نے ہمیں ایک طرف بٹھا دیا کہ صاحب مصروف ہیں۔ ہم نے کہا بھی کہ ضروری خط ہے اور ہمیں واپس جانے کی بھی جلدی ہے مگر

صاحب وہ ایڈیشنل چیف سیکرٹری کا پی اے تھا اس پر ہماری بات خاک اثر کرتی ۔ بیٹھے انتظار کھینچتے رہے۔ اتنے میں ایم ایم احمد اپنے کسی ملاقاتی کو رخصت کرنے دروازہ تک آئے تو ان کی نظر ہم پر پڑی۔ جانتے تھے کہ ہم ان کے ابا کے خادم ہیں ۔ باہر چلے آئے پوچھا آپ کب آئے اور کیا کام ہے؟ ہم نے وہ خط ان کے حوالہ کیا اور جواب کا مطالبہ کیا۔ ہمیں اپنے ساتھ اندر لے گئے ۔ چائے پانی کا پوچھا۔ اپنے والد گرامی کا خط پڑھا جواب لکھا بند کیا، ہمارے حوالے کیا اور دروازہ تک ہمیں چھوڑنے آئے ۔ پی اے حق دق حیران ہمیں دیکھتا رہا کہ یہ کون شخص ہے اور اس کا اتنے بڑے سرکاری افسر سے کیا تعلق ہے؟

دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب ان کے والد ماجد کا انتقال ہوا۔ لوگ تعزیت کے لئے حاضر تھے مصافحہ ہو رہا تھا۔ ہماری باری آئی تو ایم ایم احمد نے گیلی آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور لپک کر گلے لگا لیا۔ کوئی بات ہم نے کی نہ آپ نے کی ۔ ایک ملاقات یہاں امریکہ کی بیت الرحمن میں ہوئی ۔ نماز کے لئے ہم البیت میں داخل ہوئے تو ساتھ ہی امیر صاحب بھی داخل ہوئے ۔ آپ نے ہمیں دیکھا، نظریں ملیں، مصافحہ کیا، لب ہلے، شاید سلام کیا تھا مگر ہم نے الفاظ نہیں سنے ۔ ایسی غیر ملفوظ محبتیں ہم نے ان کے سوا دوسروں میں نہیں دیکھیں ۔ آنکھوں کی ملائمت سب کچھ کہہ دیتی تھی ۔ اگلے روز ان کی بھانجی نے بتایا کہ کل گھر میں آپ کے ربوہ والے مضمون کا ذکر کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے میں نے اس مضمون والے کو بیت الرحمن میں دیکھا ہے ۔ وہ مضمون برسوں پہلے رسالہ خالد میں پھر الفضل میں دوبارہ چھپا تھا۔ لاہور میں ''ہماری بستی کے پچاس سال'' والا مضمون بھی ان کی نظر سے گزرا تو تحسین کے الفاظ کہے ۔ ایم ایم احمد کو بھی اس بستی سے وہی لگاؤ تھا جو ہم سب کو ہے ۔ ان کا وقتِ موعود امریکہ میں آ گیا۔ بڑی دیر سے علیل تھے، علاج معالجہ کی بھلا ان کے لئے کیا کمی تھی؟

مگر جان تو جان آفریں کے سپرد کرنی ہے، کردی اور اب ان کی مٹی اسی زمین کو واپس بھیجی جا رہی ہے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں اپنے وطن کی مٹی کو اوڑھ کر سو جائیں گے۔ سو جائیں گے اک روز زمیں اوڑھ کے ہم بھی!

تمہاری نیکیاں زندہ تمہاری خوبیاں باقی!!

قدم قدم تیری یادیں

مرحوم شاعر دوستوں کے تذکرہ میں سے ہم نے اپنے دوست ڈاکٹر نصیر احمد خان کا ذکر علیحدہ کر دیا تھا کیونکہ نصیر صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے ساتھ محض شاعر کہہ دینے سے انصاف نہ ہو پاتا، اسی طرح اپنے استادوں میں انہیں شامل کرنا چاہا مگر پھر خیال آیا کہ سائنس تو ہم نے پڑھی ہی نہیں ہاں ہم نے ان سے پڑھا کچھ نہیں سیکھا بہت کچھ ہے۔

نصیر صاحب نہایت وجیہہ اور حد سے زیادہ جامہ زیب انسان تھے۔ ہر لباس ہی ان کے وجود پر پھبتا تھا۔ سرخ و سفید چہرہ، چمکتی دمکتی پیشانی،

بالائے سرش نہ ہوش مندی،

می تافت ستارہ بلندی!

استادوں میں استاد تھے۔ لڑکوں میں لڑکے، شاعروں میں شاعر اور حسینوں میں حسین! نصیر احمد خان صاحب کالج یونین کے انچارج تھے۔ کڑے منتظم تھے۔ یونین کے جلسوں میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اونچی نیچی بات کہہ جائے۔ نصیر صاحب کی شخصیت کے آگے بڑے بڑوں کے چراغ گل ہو جاتے تھے!

ہمارے ساتھ ان کا تعلق محض یونین کا نہیں رہا۔ شاعر تھے اس لئے ہم پر مہربان تھے۔ کبھی کوئی

تازہ غزل کہتے تو بلا بھیجتے۔حاضر ہوتے تو جس استاد کی زمین میں غزل کہی ہوتی پہلے اس پر طبع آزمائی کرتے پھر نہایت لطف لے لے کر کلام سناتے۔ہم منہ لگے تھے اس لئے کبھی کبھی چٹکی بھرتے تو تلملا اٹھتے۔مگر نصیر صاحب آخر نصیر صاحب تھے جواب میں ایسی دور کی کوڑی لاتے کہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔مگر یہ بے تکلفی ہم دونوں کا ذاتی معاملہ تھی۔گھر سے باہر ہم نے کبھی ان کے بارہ میں کوئی بات کہی نہ نصیر صاحب نے ہم پر کوئی فقرہ چست کیا اور یہ وضع داری آخر تک نبھائی۔

فزکس کے مانے ہوئے عالم تھے اور پاکستان میں نکلیئر فزکس کے گنے چنے ماہروں میں شمار ہوتے تھے۔مگر نا قدری کا یہ عالم تھا کہ تعلیم الاسلام کالج میں ان کے اوپر فزکس ہی کے ایک معمولی استاد کو بطور پرنسپل لگا دیا گیا جس سے سائنس سے اتنا ہی واسطہ تھا جتنا کسی ان پڑھ کو ہو سکتا ہے۔نصیر صاحب اپنے پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ میں مگن رہے مگر اس بات پر ہمیشہ ہی نالاں رہے کہ محکمہ ان کی ایک نہیں سنتا! پوسٹ گریجویٹ شعبہ چلانا کارے دارد ہے ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔نصیر صاحب نے اپنی تمام تر توانائیاں اس شعبہ پر صرف کر دیں!

ہم نے شعبہ فزکس کا عروج بھی دیکھا اور زوال بھی نیو کیمپس کو زبانِ خلق نے ہمیشہ یونیورسٹی ہی کہا اس یونیورسٹی کے وسیع وعریض کیمپس میں نصیر صاحب نے اپنا علم کا چراغ روشن کر رکھا تھا۔صاف ستھری لیبارٹریاں، لیکچر تھیٹر، لائبریری، کوئی دیکھنے کے لئے آ نکلتا تو نصیر صاحب ایک ایک کمرہ ایک ایک لیبارٹری اتنے پیار اور اتنے لگاؤ سے دکھاتے کہ دیکھنے والا ان کی محبت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا!

نصیر صاحب کے انتقال پر کالج کے نیو کیمپس میں میں نے ایک تقریبِ تعزیت برپا کی۔باہر سے بہت سے دوست آئے۔پروفیسر غلام جیلانی اصغر پر تو اتنی رقت طاری ہوئی کہ ان کی ساری طلاقتِ لسانی دھری رہ گئی کہنے لگے ”میں جذبات سے مغلوب ہو کر کبھی خاموش نہیں ہوا مگر میں چپ

ہوں اور نصیر صاحب کے کیمپس کے سناٹے میں ہر طرف نصیر صاحب کی یاد گونج رہی ہے‘‘ میر انیس کے شعر کی بلاغت اس روز سمجھ میں آئی۔

یہ بے سبب نہیں سونے گھروں کے سناٹے
مکان یاد کیا کرتے ہیں مکینوں کو

نصیر صاحب کی خواہش تھی کہ وہ اپنا کلام یکجا کر کے چھاپ دیں۔ چنانچہ وہ ’’رودِ چناب‘‘ کے نام سے چھپ چکا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے دیباچہ لکھا ہے۔اس کے مرتب کرنے میں کچھ ہماری بھی کوشش شامل ہے۔مگر صاحب! نصیر صاحب اپنے ہر شعر سے اتنا پیار کرتے تھے کہ کسی شعر کو برا کہنا ممکن ہی نہیں تھا۔مگر ہم نے کئی شعروں پر چھری پھیر دی آفریں ہے کہ نصیر صاحب نے ہماری بات مان لی اور وہ شعر ترک کر دیئے۔مگر ہر شعر میں سقم نکالنے کے بعد پورے سائنسی طریقے سے انہیں قائل کرنا پڑتا تھا کہ اس شعر میں واقعی سقم ہے۔

نصیر صاحب کی نفاست ضرب المثل تھی۔ان کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، گفتگو کرنے، کھانے پینے میں ایک خاص سلیقہ تھا کسی اور میں اتنی خوش سلیقگی کم ہی دیکھنے میں آئی۔آدابِ مجلس کا پاس اور لحاظ بھی ان پر ختم تھا مگر ان کی مجلس میں یبوست کا گزر نہیں ہو پاتا تھا۔لطیف مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے تھے۔ہم نے کسی اور جگہ یہ بات لکھی ہے کہ ’’جس مجلس میں بھائی مسعود احمد خاں دہلوی، سیٹھ محمد اعظم حیدر آبادی اور نصیر صاحب اکٹھے ہو جاتے وہاں وہ پھلجھڑیاں چھوٹتیں کہ چراغاں ہو جاتا‘‘!

نصیر صاحب پی ایچ ڈی کر کے انگلستان سے لوٹے تو ایک نیلی فوکس ویگن کار بھی خرید لائے۔ کالج کے سٹاف میں پہلی بار نئی کار نصیر صاحب کو ہی اللہ تعالیٰ نے عطا کی۔مگر رفتہ رفتہ وہ کار پرانی ہوتی گئی۔ربوہ کی مٹی اور اس کی شوریدگی کے آگے بھلا کون ٹھہر سکتا ہے؟ کار پرانی ہوئی تو واقفِ زندگی

پروفیسر کے وسائل اس کے علاج معالجہ کے کہاں متحمل ہو سکتے تھے۔اس کی برق رفتاری رفتہ رفتہ آہستہ خرامی میں بدلنے لگی تو اسے بیچ کر نصیر صاحب نے ایک فیٹ کار خریدی وہ آہستہ خرام بلکہ مخرام پر عمل پیرا نکلی۔ایک بار ہم کالج کی طرف جا رہے تھے کہ پیچھے سے نصیر صاحب آئے گاڑی روکی کہنے لگے ''آؤ بیٹھ جاؤ'' ہم نے عرض کیا ''شکریہ آپ چلیں۔ مجھے ذرا جلدی جانا ہے'' تلملا کر رہ گئے۔ مدتوں بعد ہماری گاڑی ان کے گھر کے آس پاس خراب ہوگئی۔ہم نے جا ان کا دروازہ کھٹکھٹایا پہلے تو چائے پانی سے تواضع کی پھر فرمانے لگے ''اگر آپ کو جلدی نہ جانا ہو تو میں اپنی گاڑی پر چھوڑ آؤں''۔

ایک بار کسی محفل میں آپ نے ایک غزل سنائی، زمین تھی۔

''بےخودی تھی میں نہ تھا'' ''سرخوشی تھی میں نہ تھا''

وغیرہ۔''میں نہ تھا'' کی ردیف نبھانا بہت مشکل کام تھا۔نصیر صاحب آخر تک نبھا گئے۔مگر مقطع میں آپڑی وہ سخن گسترانہ بات! مقطع تھا۔

رک گئی تھی لب پہ جو آ کر نصیر
اک صدائے بےکسی تھی میں نہ تھا

ہم نے پکڑ لیا کہ ردیف حشو ہوگئی ہے۔الجھ پڑے کہ ثابت کرو۔ہم نے کہا پہلے مصرعہ میں لب پر آ کر رکنے کا قرینہ ہے۔صدائے بےکسی یا آہ وفریاد لب پہ آ کر رک سکتی ہے آپ خود کیسے لب پر آ کر رک سکتے ہیں؟ بہت جزبز ہوئے مگر قائل نہیں ہوئے۔المنار میں چھپانے کے لئے دی تو ہم نے مقطع کاٹ دیا۔ بہت دنوں ناراض رہے پھر ایک روز کہنے لگے۔ یار اب سمجھ آ گئی ہے۔اس لئے ناراضگی کو گولی مارو۔ یہ نئی غزل سنو! کیا لوگ تھے۔کہاں گیا وہ زمانہ کہاں گئے وہ لوگ!

اپنے بچوں سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔خود بتاتے تھے کہ عاشی، (عزیزہ عائشہ نصیر) چھوٹی سی

تھی۔ بھاگتی ہوئی آتی اور میرے کندھوں پر سوار ہو جاتی مگر لباس کے معاملہ میں نفاست اور رکھ رکھاؤ کے باوجود میں دم نہ مار سکتا!۔ عاشی سے ان کے پیار کا یہی عالم تھا۔عزیزی ظہیر احمد خان اور عزیزی منیر احمد خان ان کے دو بیٹے ہمارے شاگرد ہوئے۔ایک انجینئر بنے اور دوسرے ڈاکٹر۔ظہیر احمد خان لاہور میں تھے۔ایک روز میں نصیر صاحب سے ملنے گیا تو غصہ میں تھے کہنے لگے،ظہیر کی حرکت دیکھو ''مہینے بھر کے بعد خط لکھا اور اس میں اپنی خیریت کے بارہ میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا'' پھر اس خط کا جواب دکھایا جو یوں شروع ہوتا تھا۔''عزیزی ظہیر احمد خان والد ماجد عزیزی حماد احمد خان''۔ہم نے کہا ''یہ کیا؟'' کہنے لگے''اسے احساس دلانا چاہتا ہوں کہ وہ بھی باپ ہے اس لئے باپ کے جذبات کا خیال رکھنا آنا چاہیئے''۔

بہت برس پہلے کی بات ہے عزیزی ظہیر احمد خان سے اچانک ملاقات ہوگئی۔حضرت نے نہایت بھونڈی داڑھی چھوڑ رکھی تھی۔ہم نے کہا'' بیٹے! یہ ریش طرازی (درازی؟) تمہارا ذاتی معاملہ ہے مگر ہمیں اتنا یقین ہے کہ تمہارا باپ تمہیں اس حال میں دیکھتا تو خوش نہ ہوتا''،ظہیر کی آنکھیں گیلی ہوگئیں۔ اسے باپ کی نفاست یاد آئی ہوگی۔

ہمارے شاگرد اور دوست عزیزم ڈاکٹر عنایت اللہ منگلا نے جو اقتصادیات کے پی ایچ ڈی اور گولڈ میڈلسٹ ہیں،ہم سے خواہش کی کہ عزیزی عائشہ نصیر کے رشتہ کی تحریک کریں۔ہم چونکہ دونوں گھروں کو جانتے تھے ہم نے موقع جان کر یہ تحریک کر دی۔نصیر صاحب یکدم خاموش ہو گئے! اتنا خاموش ہم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ہم نے پوچھا کیا بات ہے۔ کہنے لگے آج مجھے احساس ہوا ہے کہ میری ایک بیٹی بھی ہے جسے مجھے بیاہنا بھی ہے۔ ورنہ میری آنکھوں میں تو وہ ایک معصوم سی بچی ہے! عاشی کا اور منگلا کا رشتہ ہو گیا۔اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے دونوں گھر بار سے خوش اور صاحبِ اولاد ہیں مگر نصیر

صاحب کی خاموشی ہمیں نہ بھولی!

نصیر صاحب کا ذکر تو ایک پیارے دوست کا ذکر ہے کیسے ختم ہو؟ جب قدرت نے ہی وہ رشتہ اچانک توڑ دیا تو ہم اسے کیسے دراز تر کر لیں؟

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے
ایک ایک کر کے ہوئے کتنے ستارے رخصت

پچھلے چند ہی مہینوں میں ہماری بستی کے کتنے درخشندہ ستارے غروب ہو گئے۔ جانا تو ہر ایک کو ہے مگر غریب الوطنی میں بیٹھ کر کسی کی سناؤنی سنیں تو سیدھی دل پر چوٹ پڑتی ہے حالانکہ ان لوگوں سے جو اپنا وقت گزار کر آگے گزر جاتے ہیں ایسا قریبی تعلق نہیں ہوتا کہ جسے قربت اور دوستی کا تعلق کہا جا سکے۔ مگر وہ لوگ بستی میں چلتے پھرتے جیتے جاگتے نظر آتے رہیں تو دل کو ایک گونہ تسلی رہتی ہے کہ یہ لوگ ہمارے پاس ہی ہیں کسی وقت بھی استفادہ کا موقع ملے تو ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ لوگ نہ رہیں تو محرومی کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے۔ یہ زندگی کا دستور ہے۔ دیکھتے دیکھتے منظر نامہ بدلتا ہے اور لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور دنیا والے انہیں مٹی کو سونپ آتے ہیں۔ مٹھیوں میں خاک بھر کر دوست آئے بہر دفن۔ زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے۔

ہم بہت چھوٹے تھے تو اپنے تایا کے ہمراہ اپنی بستی کے ایک درویش نواب کی ڈیوڑھی پر جایا کرتے تھے۔ تایا تو اپنے کارِ دربانی میں مصروف رہتے ہم ان نواب صاحب کے پوتوں میں سے ایک سے کھیلتے رہتے جو ہمارے ہم عمر تھے اور جن سے بعد میں کلاس میں ہمنشینی کا موقع بھی ملا۔ انہی نواب صاحب کے ایک بزرگ پوتے تھے جنہیں ہم نے دور دور سے بہت دیکھا لیکن قریب آنے کا موقع نہ

ملا۔ہجرت کے بعد یوں ہوا کہ ان سے تھوڑا تھوڑا علمی تعلق پیدا ہونے لگا کہ صاحبِ ذوق تھے۔ پھر ہمارے بزرگ چچا مولوی عبدالکریم لندن سے آتے تو ان نوابزادہ صاحب کی موٹران کی سواری میں رہتی۔اس موٹر کو ڈرائیو کرنے کا موقع ہمیں ملتا کیونکہ چچا کا خیال تھا کہ پاکستان میں ڈرائیونگ کرنا ان جیسے کہنہ مشق ڈرائیور کے بس کا روگ نہیں۔ یوں قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ ہم لاہور میں پڑھتے تھے تو دارالذکر میں ان سے علیک سلیک ہوتی رہتی۔اصل تعلق اس وقت پیدا ہوا جب ان کے صاحبزادے ہمارے شاگرد ہوئے۔ ایک نواب کے پڑپوتے دوسرے نواب کے پوتے تیسرے نوابزادہ کے صاحبزادے (اس صفحہ کی آخری لائن کٹی ہوئی ہے)

ہونے کے باوجود ہمارا بچہ بن کر رہا بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے اپنے بچے رہتے ہیں۔وہی بے تکلفی رہی۔ ہم اکثر سوچتے تھے کہ اس نوابزادہ میں اتنی فروتنی کیسے آ گئی ہے؟ اس کا عقدہ اس وقت کھلا جب اس کے باپ کو نمازیوں کی جوتیاں سیدھی کرتے دیکھا۔اس کے پردادا کے بارے میں بھی یہی سنا کہ ماموروقت کی جوتیوں میں بیٹھنے کو اپنے لئے فخر سمجھتے تھے۔ہم جس نوابزادہ کا ذکر کر رہے ہیں وہ نوابزادہ میاں عباس احمد خان تھے اور ان کے دادا نواب محمد علی خان تھے۔پچھلے دنوں نوابزادہ عباس احمد خان صاحب کی رحلت کی اطلاع ملی تو دیر تک اس درویش نوابزادہ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا۔ بات کرنے میں دھیمے، مہمان نوازی میں مستعد اور آگے آگے۔کئی بار یوں ہوا کہ ان کی کوٹھی پام ویو میں کھانے کا وقت آ گیا تو نوابزادہ صاحب خود اٹھ کر غسل خانے میں ہاتھ دھونے کا انتظام چیک کرتے۔خود اٹھ کر پینے کا پانی لاتے۔نوکر چاکر موجود ہیں مگر مہمان کی خدمت میں انہیں لطف آتا تھا۔ خاموش طبع تھے زیادہ باتیں بنانا یا کرنا انہیں نہیں آتا تھا مگر کبھی کبھار کسی علمی موضوع پر رواں ہو جاتے تو ان کا گویا بحر کھل جاتا۔ایسے ایسے نکتے بیان کرتے کہ سننے والا عش عش کرتا رہ جاتا۔(دلی والے اسے

اش اش لکھتے ہیں)۔ہم نے بچپن سے انہیں دیکھنا شروع کیا تھا اس لئے ایک رعب داب ان کی شخصیت کا تھا ان سے بے تکلف ہو کر کھل کر بات کرنے کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا مگر جب بے تکلفی ہو گئی تو احساس ہوا کہ یہ رعب داب محض ہماری اپنی طبیعت کی وجہ سے تھا ورنہ وہ تو ہر ایک سے بے تکلف ہو کر ملنے والے ہیں۔اب وہ اٹھ گئے ہیں تو ان کی باتیں یاد آتی ہیں۔ان کے ہاں ان کے کارخانے میں کام کرنے والے ایک دوست سید سجاد احمد کا انتقال بھی انہیں دنوں ہوا ہے وہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے کسی آجر کو ان جیسا ملائم طبع نہیں دیکھا مزدوروں کام کرنے والوں کے حق میں رحمت۔اللہ تعالیٰ اس درویش صفت نوابزادہ کو اپنی رحمت میں ڈھانپ لے اوران کے علمی فیض اور طبیعت کی ملائمت کو ان کی اولاد و اخلاف میں جاری رکھے۔پھر ہماری بستی میں دلی کے خواجہ میر درد کے خاندان کے ایک بزرگ تھے۔ان کی بزرگی اور علمیت کا ایک زمانہ گواہ تھا۔ہم نے جس کو بھی دیکھا ان کی علمیت کی تعریف میں رطب اللسان پایا۔حدیث اور قرآن ان کا تخصص تھا۔ان کا قرآن کا ترجمہ تو اب بھی مقبولِ خلائق ہے۔ان کی مہمان نوازی اور غریب پروری کے چرچے آج تک لوگوں کی زبان پر ہیں۔معذوروں ناداروں کی دستگیری کرنے اور کسمپرسوں کو پوچھنے والے۔ان کی شخصیت اور بزرگی کا رعب بچوں بڑوں سب پر تھا مگر ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے کبھی ان کی بزرگی سے ڈر کر انہیں سلام کرنے میں ذرا بھی جھجھک محسوس کی ہو۔یہی لگتا تھا کہ یہ بزرگ تو بس اپنے ہی ہیں۔ان کی اولاد میں سے ان کے تینوں بیٹوں کو ہم نے اپنی بستی کے لوگوں میں مقبول و محبوب پایا۔ایک اپنی انتظامی قابلیت کی وجہ سے معروف ہوئے اور ایک دینی ادارہ کے سربراہ رہے اور دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے رونے والوں کا ایک گروہِ کثیر چھوڑ کر رخصت ہوئے۔لوگ اب بھی ان کو یاد کرتے ہیں۔ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو۔دوسرے صاحبزادے جو ابھی پچھلے دنوں اس دنیا سے گئے ہیں عجیب منکسر المزاج بزرگ تھے۔

دیکھنے میں بالکل سادہ اور درویش۔طبع میں حد سے زیادہ فروتنی۔علمی ذوق کے حامل تھے مگر اپنی علمیت اور بزرگی کا اظہار کرنے میں بہت محتاط تھے۔یورپ میں سیکنڈے نیویا میں مدتوں دینِ حق کا چرچا کرتے رہے۔ان کے اپنے ادارہ والوں نے ان کو خط لکھا اور کہا کہ آپ اتنے لمبے عرصہ تک اس نیک کام میں مصروف رہے ہیں مادرِعلمی میں آکر ایسے واقعات سنائیں جو ''ایمان افروز'' ہوں۔اسی چٹھی کے پیچھے لکھ بھیجا کہ ''میرے ان ملکوں میں قیام کے دوران کوئی ''ایمان افروز'' واقعہ نہیں ہوا اس لئے مجھے اس تحریر سے معاف رکھئے''۔یہ ان کی عاجزی کی انتہا تھی ورنہ ہم جیسوں کو موقع ملے تو ہر واقعہ کو ایمان افروز بنا کر اپنے ایمان میں کمی اور دوسروں کے ایمان میں اضافہ کرتے پھریں۔اس فروتنی بزرگ نے یہ ورثہ اپنے بزرگ باپ سے لیا تھا۔سید میر مسعود احمد بھی اپنے بزرگ باپ کی طرح ''یَمْشُونَ فِی الأَسْوَاقِ'' کرتے تھے۔بستی میں چلتے پھرتے۔لوگوں سے ملتے ان کا دکھ درد سنتے ان کے ہم و غم میں شریک ہوتے تھے۔ان کے جوتوں کو بھی ہم نے ان کے باپ کے جوتوں کی طرح گرد آلود پایا۔ان کو شاید ''اشعث اغبر'' رہنے میں مزا آتا تھا۔ان کی شخصیت کے گرد بھی احترام کا ہالہ تھا ہر کس و ناکس ان سے ملنے کے ان کی طرف نہیں لپکتا تھا یہ اپنی دھن میں مگن چلتے چلے جاتے۔ایک دو بار ہم نے انہیں سائیکل سے اتر کر لوگوں سے بات چیت کرتے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس لئے اتر آئے ہیں کہ اس پیدل چلنے والے نے انہیں سلام کہا تھا اور یہ سائیکل پر جاتے جاتے اس کا سلام لوٹانا نہیں چاہتے تھے باقاعدہ اتر کر سلام کا جواب دیا ہے اور پھر یہ جا وہ جا۔جسم بھاری تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ ''کار جہاں'' سے بیکار ہو گئے ہوں اس لئے چلنے میں کچھ حجاب محسوس کرتے تھے مگر ہم نے انہیں چلتے اور سائیکل چلاتے دیکھا ہے ہمیں تو محسوس نہیں ہوا کہ ان کا جسم ان کی مستعدی کی راہ میں حائل ہوا ہو۔لائبریری کو جانے والا راستہ ان کی علمی تگ و پو کا گواہ ہے۔اللہ تعالیٰ ان کے باپ کے علمی فیضان کو ان

کے اخلاف میں جاری رکھے۔میری واقفیت تو ان کے کسی بچے سے نہیں البتہ اس دودمانِ علمی کا ایک بچہ قمر سلیمان ہے جس پر اس کے استادوں کو فخر ہے اللہ تعالیٰ اس کے علم اور قلم میں برکت دے۔

یہ تو ہماری بستی کا ذکر تھا ہماری اپنی گلی کے دو بزرگ انہی دنوں گئے اور ہماری گلی کی رونقوں کو ساتھ لے گئے۔قریشی محمد افضل اور مولانا رشید احمد چغتائی۔قریشی افضل صاحب کو ہم نے ہجرت سے پہلے اپنی بستی کے ''افضل برادرز'' کے حوالہ سے جانا۔ان کی دکان مشہورِ خلائق تھی مگر ہمیں یاد نہیں کہ ہم کبھی ان کی دکان پر گئے ہوں ہاں اتنا ہے کہ بڑے بازار میں آتے جاتے وہاں سے گزر ہوتا تھا دو دکا نہیں ذہن کے پردہ پر کل کی طرح آج بھی لکھی ہوئی نظر آتی ہیں ان کی دکان اور علی گوہر اینڈ سنز کی دکان۔ پھر ہجرت کے بعد نئی بستی میں آئے تو ان کی دکان پھر پہلے پہل اس بستی میں قائم ہوئی۔ادھر ان لوگوں نے گھر ہماری گلی کی نکڑ پر بنا لیا منڈی کی طرف سے داخل ہوں تو دائیں ہاتھ پہلا مکان ان کا تھا اور مشرق کی جانب سے آئیں تو اس زمانہ میں پہلا مکان قریشی نذیر احمد صاحب کا تھا بعد کو اولیت ابراہیم اینڈ سنز نے چھین لی۔قریشی صاحب تو افریقہ میں دین کی اشاعت کا کام کر رہے تھے ان کی اولاد میں سے طاہر قریشی ہمارا شاگرد ہوا۔دوسرے بھائی قریشی محمد اکمل صاحب گول بازار میں جا بیٹھے ان کا بیٹا انور قریشی ہمارا شاگرد ہوا اس طرح پرانی بستی کے اس خاندان سے ہمارا ہمسائیگی کے علاوہ بھی ایک تعلق بن گیا۔ان کے بھتیجوں محمد احمد قریشی اور اسلم قریشی شہید سے کچے کوارٹروں کے زمانہ سے دوستی رہی۔یہ دونوں بھائی محمد افضل قریشی اور قریشی محمد اکمل صاحب اپنی طرز کے بزرگ ہیں۔خاموش مخلص اور حد سے زیادہ دیانت دار اور امین۔قریشی افضل صاحب سے تو محلہ داری کی وجہ سے اکثر آمنا سامنا اور علیک سلیک ہو جاتی تھی ہمیں یہ بات بہت اچھی طرح یاد ہے کہ ہم نے قریشی محمد افضل صاحب کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ زیرِ لب پڑھتے دیکھا کسی آیہ کریمہ کا ورد کرتے ہوں گے۔ذکر الٰہی کرتے ہوں گے۔

درود شریف پڑھتے ہوں گے۔ ہم نے اس بات کی کرید نہیں کی مگر ہم نے ان کے ہونٹ ہمیشہ ہلتے دیکھے۔ ہمارا یار قریشی محمد احمد تو ایسا کراچی گیا کہ وہیں کا ہو رہا۔ محمد اسلم قریشی کو اللہ تعالیٰ نے شہادت سے سرفراز کیا اور اپنے پاس بلا لیا اب ان کی آل اولاد یہاں ٹورنٹو میں ہے مگر انہیں اس بات کا علم نہیں کہ ہمارا اور ان کے باپ کا کتنا دوستانہ تھا۔ مگر ذکر قریشی محمد افضل صاحب کا ہے۔ ان کی دعا گوئی کا چرچا بھی بہت تھا۔ یہ بزرگ اپنی گلی کے مکینوں کے لئے شجرِ سایہ دار ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کا فیض جاری رکھے۔

ادھر مشرق کی جانب استاذی المحترم قبلہ شیخ محبوب عالم صاحب خالد کے مکان کے ساتھ مولانا رشید احمد چغتائی صاحب تھے ہمیشہ کلاہ پر سفید پگڑی باندھ کر باہر نکلنے والے۔ بر میں اچکن ہم نے ہمیشہ دیکھی۔ ایک وضع داری تھی جسے نبھا رہے تھے۔ بلاد عربیہ میں برسوں رہے۔ عربی خوب جانتے تھے جن لوگوں نے ان سے پڑھا ہے (اور ان میں ہماری بیگم بھی شامل ہیں) وہ ان کے تبحرِ علمی کی تعریف کرتے ہیں۔ چغتائی صاحب سے ایک گلی میں قریب تر رہنے کے باوجود ہمارا بے تکلفی کا تعلق اس لئے نہ ہوا کہ ان کی طبیعت میں خوردوں سے میل ملاپ رکھنے میں حجاب تھا ادھر ہماری تمام تر دوستی اپنے سے بڑی عمر کے بزرگوں سے رہی۔ چغتائی صاحب کی دوستی سے ہم محروم رہے مگر ان کی دعاؤں سے ہرگز محرومی نہیں رہی وہ گلی کے سب مکینوں کے ساتھ ہمسائیگی کے حق کو نباہتے تھے۔ ہر ایک کی خبر گیری کرتے رہنا بیماروں کی عیادت کرنا۔ دعاؤں میں یاد رکھنا۔ اسی لئے تو ہم نے ابتدا ہی میں یہ لکھا تھا کہ ہماری گلی اتنے تھوڑے عرصہ میں اتنے بزرگ لوگوں سے محروم ہو گئی۔ اب شیخ محبوب عالم صاحب خالد ہیں اللہ ان کی زندگی میں برکت دے۔ ہم جیسے غریب الوطن لوگ دعائیں ہی تو دے سکتے ہیں۔ قبلہ شیخ محبوب عالم خالد بھی اس کتاب کے مرتب ہوتے وقت رخصت ہو چکے ہیں۔ کل من

علیہا فان۔

ہوا تھی گو تندو تیز لیکن۔۔۔

ہجرت کے بعد قادیان میں جو درویش دھونی رما کر بیٹھ گئے ان میں کا ایک وجود ملک صلاح الدین صاحب کا بھی تھا۔ وہی بستی جو اپنی تھی پرائی ہو گئی تھی۔ وہ گلی کوچے جن میں اپنائیت کا ہن برستا تھا انہیں اجنبیت کا گھن لگ گیا تھا۔ جائے ماندن نہ پائے رفتن کا مضمون تھا۔ لوگ دارالمسیح میں محصور ہو کر جان ہتھیلی پر رکھے، بتیس دانتوں میں زبان کی طرح بیٹھے تھے۔ باہر کی دنیا سے صرف دعاؤں کا رابطہ تھا۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ان کے اپنے انہیں بھولے نہیں بلکہ ان کی یاد میں بے قرار ہیں۔ دن رات ان کی سلامتی کی دعائیں کرتے نہیں تھکتے۔ شعب ابی طالب کی تاریخ دہرائی جا رہی تھی۔ وقت کی طنابیں رفتہ رفتہ ڈھیلی ہونے لگیں۔ حالات میں ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ باہر کی دنیا سے رابطہ ہونے کی موہوم سی صورت ہویدا ہونے لگی۔ ان محصور درویشوں کی پامردی اور اولوالعزمی نے تاریخ کا سینہ شق کر دیا۔ اجنبیت کے بادل چھٹنے لگے اور زندگی معمول پر آنے لگی۔ ایسے جاں کاہ ماحول میں جس شخص نے قلم کو ہاتھ سے رکھ کے نہیں دیا تھا پچھلے دنوں موت نے اس کے ہاتھ سے قلم رکھوا لیا۔ وہ درویش منہم من قضی نحبہ کے زمرہ میں جا شامل ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کی خدمات کو قبول فرمائے۔ آمین۔ کیا صاحبِ قلم تھا کہ جان ہتھیلی پر لئے پھرتا تھا مگر تاریخ کے اوراقِ پارینہ کو محفوظ کرنے کی دھن لگی ہوئی تھی۔ اس کے لئے دن دن تھا نہ رات رات تھی، قلم تھا اور وہ تھا۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں اور وہ قومیں خوش نصیب ہوتی ہیں جنہیں ایسے دیوانہ وار کام کرنے والے مل جائیں۔

ہمارا ان سے تعلق قادیان کی ہمسائیگی کا تعلق تھا۔ ہم ان کے دیوار بیچ کے پڑوسی تھے۔ ہم نے اپنے ہوش میں جب بھی انہیں دیکھا ان کے ہاتھ میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب ہی دیکھی۔ اس زمانہ میں

یہ تو اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے یہ ہم سائے علمی دنیا میں جانے پہچانے ہیں۔ بعد میں جا کر اندازہ ہوا کہ ہماری طرح محض ادب ہی نہیں چھانٹتے اپنے قلم کو سلسلہ کی خدمت کے لئے وقف رکھتے ہیں۔ ہمارے پھوپھا حضرت مولوی غلام نبی مصری سے ان کا عاشقانہ تعلق تھا ہر وقت ان سے کچھ نہ کچھ پڑھتے پوچھتے رہتے۔ آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے ان کا یہی طریق تھا۔ ہمارے گھر میں ان کا پڑوسی ہونے کے ناطے بڑا احترام تھا اس پر مستزاد ان کا ہمارے بڑوں سے علمی رابطہ اور رشتہ اس لئے ملک صلاح الدین صاحب ہمارے گھر کے ایک فرد ہی تھے اور قادیان میں محلہ داری کے سارے تعلقات ایسے ہی تھے حق ہمسایہ ماں جایا لوگوں کے نزدیک محض لفظ نہ تھے مگر ہمارے ہاں قادیان میں اور بعد کو ربوہ میں جیتا جاگتا رویہ بن گئے تھے۔ جب دونوں ملکوں کے مابین آمدورفت شروع ہوئی اور قادیان کے درویشوں کو ربوہ آنے کا موقع ملا تو ہمارا قوی خیال ہے کہ ملک صاحب جب آئے تو حضرت مصلح موعودؓ اور حضرت مرزا بشیر احمدؓ صاحب سے ملنے کے بعد سیدھے ہمارے ہاں آئے تھے اور پھوپھا جی سے گلے لگ کر، ٹوٹ کر ملے تھے۔ ہماری پھوپھی جی نے اپنے بچوں کی طرح ان کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ کئی سال بعد ان کے برادرِ محترم اپنے بیٹے کے لئے بھائی جان محمد احمد نعیم مرحوم کی بیٹی کا رشتہ لینے آئے تو اور کچھ نہیں کہا صرف یہ کہا تھا کہ میں اپنے بزرگوں کی اولاد میں سے ایک بچی کا رشتہ مانگ رہا ہوں اور ہم نے بلا چون و چرا اس رشتہ پر صاد کر دیا تھا۔ قادیان کی ہمسائیگی اور ملک صلاح الدین کا خاندان اور بھلا کس چیز کی ضرورت تھی۔

ملک صاحب نے سلسلہ عالیہ احمدیہ کی جو خدمت کی اس کا صلہ تو اللہ تعالیٰ ہی دے گا مگر ایک نازک وقت میں ایک نازک موضوع کو چن لینا اور پھر ساری عمر اس کی تحقیق و جستجو میں کھپا دینا ہر کسی کا کام نہیں۔ ہر مردے دہر کارے۔ سلسلہ کی ابتدائی تاریخ تو حضرت شیخ یعقوب علی عرفانی نے محفوظ کی

اوراب اس بنیاد پر مؤرخِ احمدیت مولانا دوست محمد شاہد تاریخِ احمدیت کی عمارت استوار کر رہے ہیں اگر یہ بنیاد موجود نہ ہوتی تو عمارت کیسے استوار ہوتی؟ ملک صاحب نے جو کام اپنے ذمہ لیا اور کیا وہ بھی کسی ایک شخص کے کرنے کا کام نہیں تھا اداروں کا کام تھا مگر ملک صاحب نے تنِ تنہا اس کام میں ہاتھ ڈالا اور اللہ تعالیٰ نے اسے قبولِ عام بخشا اور توفیق ارزانی فرمائی کہ وہ اس کام کو اپنی بساط کی حد تک پایہ تکمیل تک پہنچا سکے مگر افراد تو ایسے کاموں کی بنیاد ہی رکھ سکتے ہیں۔ بعد میں آنے والے ان بنیادوں پر عمارت اٹھاتے ہیں۔ ملک صاحب نے بروقت اس ضرورت کو محسوس کیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ماننے والوں کی زندگی کے حالات اگر اب محفوظ نہ کئے گئے تو عین ممکن ہے پھر وقت ایسے کام کی مہلت ہی نہ دے کیونکہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا ان اصحاب کے جاننے والے معدوم ہوتے چلے جائیں گے کیونکہ زندگی کا قافلہ تو رکتا نہیں۔ وقت اس بات کا انتظار نہیں کیا کرتا کہ بزرگوں سے جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو ورنہ کچھ ایسے بھی اٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے۔

ہمیں یاد ہے حضرت مرزا بشیر احمد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اصحابِ مسیح موعودؑ کی روایتوں کو جمع کرنے اور سیرت المہدی مرتب کرنے کی جو توفیق دی وہ ان کی زندگی کا سب سے قیمتی کام رہے گا کیونکہ یہ روایتیں اس وقت محفوظ نہ ہوتیں تو معدوم ہو جاتیں۔ ان روایتوں کے بیان کا سلسلہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی جلسہ سالانہ کی تقریروں میں جاری رہا۔ ملک صاحب نے ان اصحاب کے حالاتِ زندگی جمع کرنے اور چھاپنے کا بیڑا اٹھایا اور تن تنہا یہ کام کرتے رہے اور یہ اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں۔ ہمیں تفصیلات کا تو پتہ نہیں کہ ملک صاحب کو ان حالات کے حصول اور پھر تدوین اور پھر اشاعت کے لئے جو اخراجات اٹھانا پڑتے تھے ان کا کیا انتظام ہوتا تھا مگر

ظاہر ہے کہ حالات حاصل بھی ہوئے مدون بھی ہوئے اور زیورِ طبع سے آراستہ بھی ہوئے اور اب انہیں بنیادوں پر لوگ آگے کام کر رہے ہیں۔

ملک صلاح الدین صاحب کی سیرت کے بارے میں جو کچھ میں لکھنا چاہتا ہوں وہ بھی اپنی ذات میں عجیب ہے۔ قادیان میں جب ملک صاحب سے ملاقات ہوتی تو ہم سے پہلا سوال یہ کرتے کہ حضرت مولوی صاحب کیسے ہیں؟ پھر فرداً فرداً تمام گھر والوں کی خیریت دریافت کرتے۔ ہماری پھوپھی جی کو استانی جی کہا کرتے تھے اور سارا محلہ ہی انہیں استانی جی کہتا تھا کیونکہ وہ شہر بھر کے بچوں کو قرآن پڑھاتی تھیں۔ ہم نے ایک مضمون میں جس میں پھوپھی جی کا ذکر خیر تھا یہ لکھ دیا کہ قادیان کا شاید ہی کوئی بچہ ایسا ہو جس نے پھوپھی جی سے قرآن نہ پڑھا ہو۔ اس پر کسی بزرگ نے کہا بھئی اپنے محلہ تک ہی بات رکھو کیوں سارے شہر تک اس دائرہ کو ممتد کرتے ہو؟ ہم چپکے ہو رہے کیونکہ ہمارے ناقص علم کے مطابق دور دور کے محلوں کے بچے بھی پھوپھی جی سے قرآن پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ مضمون ملک صاحب کی نگاہ سے بھی گزرا۔ قادیان سے ان کا خط آیا کہ تم نے بالکل ٹھیک لکھا ہے استانی جی سارے قادیان کے بچوں کی استانی تھیں اور شاید ہی قادیان کا کوئی بچہ ایسا رہا ہو جس نے ان سے استفادہ نہ کیا ہو۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری بات کی تصدیق اس دور کے ایک بزرگ سے بھی کروا دی۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ملک صاحب اپنے خوردوں کے لکھے ہوئے مضمون پڑھا بھی کرتے تھے ان بر خود غلط علماء کی طرح نہیں تھے جو خود تو لکھتے نہیں اور دوسروں کے لکھے کو پڑھنا مستحب نہیں سمجھتے۔ ہمارے پاس سویڈن میں ان کے کئی خطوط آئے جس میں الفضل یا بدر یا سلسلہ کے دوسرے پرچوں میں چھپے ہوئے مضامین پر ان کی رائے درج تھی یعنی وہ سلسلہ کے سارے پرچے بالاستیعاب پڑھتے تھے اور لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے یہ صفت بہت

کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ اہلِ ادب یہ کہتے ہیں کہ جو لکھنے والا دوسروں کے لکھے پر اپنی رائے کا اظہار کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے وہ بہت بڑا ادیب ہوتا ہے۔ ملک صاحب نے کبھی ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہوگا مگر ہم گواہی دیتے ہیں کہ وہ بہت بڑے ادیب تھے کیونکہ وہ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ بعض شعراء کے بارے میں ادب والوں نے ان کے ’’بے فیض‘‘ ہونے کی یہ دلیل دی ہے کہ وہ اس لئے بے فیض تھے کہ وہ اپنی رائے کے اظہار میں بخیل تھے۔ ہم نے اپنی جماعت کے بزرگوں کو فیض رسان پایا۔ حضرت مرزا بشیر احمد تھے، حضرت حافظ مختار احمد شاہجہان پوری تھے، حضرت قاضی محمد ظہور الدین اکمل تھے۔ پھر متاثرین میں روشن دین تنویر تھے بھائی مسعود احمد خاں دہلوی ہیں، نسیم سیفی تھے یہ لوگ اپنی جماعت کے کسی فرد میں ادبی صلاحیت اور سلیقہ دیکھتے تو اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ملک صاحب بھی صاحبِ فیض تھے ہم جیسے دور بیٹھے ہوئے ان کے فیض سے متمتع ہوتے تھے تو ان کے قریب رہنے والوں نے ان سے کیا کیا فیض نہ پایا ہوگا۔

ہمیں 1958 میں یعنی تقسیمِ ملک کے کوئی گیارہ برس بعد قادیان جانے کا موقع ملا۔ ملک صاحب از بسکہ بے حد مصروف تھے مگر ہمیں خود اپنے ساتھ لے کر محلہ دار الفضل گئے اور ہمیں ہمارے بزرگوں کے مکان دکھائے اور ان کا ذکر خیر کر کے آبدیدہ ہوتے رہے۔ ہمارے گھر میں آم کا جو درخت تھا وہ اس وقت تک موجود اور ثمر ور تھا۔ اس کے نیچے چارپائی بچھا کر بیٹھے تو ان وقتوں کو یاد کر کے سسکیاں بھر بھر کے روئے کہ وہاں بیٹھ کر وہ پھوپھا جی سے درس لیا کرتے تھے۔ ہم نے انہیں یاد دلایا کہ ہم نے اپنے دادا جان کی جو تصویر دیکھی ہے اس میں وہ اس آم کے نیچے چارپائی پر بیٹھے قرآن پڑھ رہے ہیں اور ملک صاحب کو یہ بات بھی یاد تھی۔ ان سے مل کر یہ معلوم ہوتا تھا وقت رک گیا ہے ان کی باتوں میں ملائمت اور مزاج میں دھیما پن تھا۔ ان کی ٹوپی اور ان کی عینک ان کے چہرے کا جزو لاینفک تھی۔ ہمیں

یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے کبھی انہیں ٹوپی یا عینک کے بغیر دیکھا ہو ہاتھ کبھی خالی نہیں ہوتے تھے کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں ہوتی تھی۔ ربوہ میں ہم نے انہیں فائلیں بغل میں دبائے دیکھا وہ فائلیں صحابہ کے جمع شدہ حالات پر مشتمل ہوتی تھیں۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ انہوں نے اتنا کچھ لکھا اور ہمارے پڑوس میں بیٹھ کر لکھا مگر ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے انہیں کبھی لکھتے دیکھا ہو۔ شاید لکھنے میں انہیں یکسوئی درکار ہوتی ہوگی اس لئے تنہائی میں بیٹھ کر لکھتے ہوں گے۔ ہمارے پھوپھا جی تو چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے مسجد میں نماز کے لئے جاتے ہوئے بھی لکھتے رہتے تھے انہیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی سنت کی پیروی میں چل پھر کر لکھنے کی مشق ہوگئی تھی۔ ہم نے ملک صاحب کے ذکر خیر کا مضمون اس شعر کے ایک حصہ سے شروع کیا تھا کہ ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے وہ مرد درویش جس کو حق نے دئے ہیں انداز خسروانہ۔ ملک صاحب نے بھی تند و تیز مخالف ہوا کے باوجود اپنے کام کو جاری رکھا اور اس چراغ کو جو ہوائے مخالف کے جھونکوں سے کسی وقت بھی بجھ سکتا تھا اپنی اولوالعزمی سے نہیں بجھنے دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے آمین۔ ان کے اٹھ جانے کے بعد بظاہر کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو ان کے کام کو جاری رکھ سکے۔ مگر الٰہی جماعتوں کے کام کبھی رکتے ہیں؟ یہ فیض انشاء اللہ جاری رہے گا۔

دو تین سفرنامے

جادہ، جادہ، جادہ پیمائی

''یورپ میں رہتے ہوئے بھی ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر کرنا اتنا مہنگا ہے کہ عام آدمی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہاں سویڈن میں تو سفر اتنا گراں ہے کہ اپنے پڑوس کے شہر سٹاک ہالم تک

ایک بار جانا ہو تو دو بار سوچنا پڑتا ہے مگر ہمارے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمارے شاگردوں کی وساطت سے سفر آسان اور راستے کشادہ کر رکھے ہیں۔ ابھی پچھلے برس انگلستان اور جرمنی کا سفر کیا تھا۔ اب کے پھر تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن والوں نے جرمنی بلا بھیجا کہ 'جدید اردو شاعری میں احمدی شعراء کا حصہ' کے عنوان پر لیکچر دیں۔ کالج کے پہلے گروپ کے 'اولڈ' بوائے میاں عبدالسمیع نون پاکستان سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان کی صدارت تھی۔ اللہ تعالیٰ ان بچوں کو خوش رکھے کہ امسال پھر انگلستان اور جرمنی جانے کا موقع مل گیا نہ صرف جرمنی اور انگلستان کا سفر میسر آیا بلکہ سویٹزر لینڈ، آسٹریا، لی سٹنٹائن، فرانس کو بھی جھانک آئے جرمنی کے بلیک فارسٹ کو بھی دیکھا جھیل ٹی ٹی سی کا نظارہ بھی کر لیا۔ پچھلے برس کی اپنی غیر حاضری کی تلافی ہی نہیں کی جتنے دن ہم اس کے ہاں رہے وہ پا بہ رکاب ہی رہا اور ہم جادہ جادہ، جادہ پیمائی کرتے پھرے۔ اگر ہمارے ساتھ ''وہی دیرینہ بیماری وہی ناگہی دل کی'' والی علت نہ لگی ہوتی تو خدا جانے اور کون کون سے مقامات کی سیر کروالاتا۔ اس لئے ہم ان سب لوگوں کے احسان مند ہیں جو اس سفر کا سبب بنے اور ہماری سیر و تفریح کا اہتمام کیا۔ لیکچر دینا اور مشاعرے پڑھنا تو اب ایک عام سی چیز ہوگئی ہے اور اس سے ہم نے بڑے سبق حاصل کئے ہیں مگر شاگردوں کی محبتوں میں شرابور ہیں۔ اللہ کا کرم ہے ورنہ ہم کیا ہماری حیثیت کیا!

جرمنی جانے کا پروگرام بنا تو حسب دستور نصیر شاہ درمیان میں آ گئے کہ وہ اپنے ایک پاکستانی دوست کے اعزاز میں برمنگھم میں ایک شعری نشست کا اہتمام کر رہے ہیں اس لئے ہماری موجودگی ضروری ہے۔ ہم مان گئے اور ٹکٹ اسی حساب سے بنوا لیا۔ بریڈ فورڈ کہ انگلستان میں ایک چھوٹا سا پاکستان کہلاتا ہے، کب سے ہماری ''ہٹ لسٹ'' پر تھا۔ باری ملک کو فون کر کے ہم نے خود متنبہ کیا کہ اب کے بریڈ فورڈ جائے بغیر ہم آگے نہیں بڑھیں گے۔ ادھر برمنگھم کی نشست جسے ہم اپنوں کی نشست

سمجھ کر گئے تھے غیروں کے انتظام میں نظر آئی تو کان کھڑے ہوئے مگر مفر نہیں تھا اسے بھگتا یا اور اگلے روز بریڈ فورڈ جانے والی بس میں بیٹھ گئے۔ لندن سے بریڈ فورڈ جانے میں چار گھنٹے لگتے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ آدھا سفر تو ہم طے کر کے برمنگھم آئے بیٹھے ہیں باقی دو گھنٹے کا سفر ہوگا۔ باری ملک کو دو گھنٹے کا حساب رکھ کر مطلع کر دیا کہ ہم گیارہ بجے چلیں گے اور کوئی ایک ڈیڑھ بجے پہنچیں گے۔ ریز رویشن ہو چکی تھی تو باری کا فون آیا کہ جناب کوئی کوچ ایک ڈیڑھ بجے نہیں آتی پہلی کوچ تین سوا تین بجے پہنچتی ہے آپ کون سے کوچ سے سفر کر رہے ہیں؟ وہی ہوا جس بات کا ڈر تھا رستے میں ایک شیر کا گھر تھا۔ معلوم ہوا برمنگھم سے بریڈ فورڈ تک چار گھنٹے لگتے ہیں اور اس حساب سے ہمارے ورود کا وقت عین وہ وقت بنتا تھا جس سے ہمیں باری ملک نے منع کیا تھا کہ تین سے چار بجے تک وہ شہر سے باہر مصروف ہیں اس لئے ہم تین اور چار کے درمیان ہرگز نہ آئیں اور ہم نے اپنی دانست میں اتنی احتیاط کی تھی کہ ایک ڈیڑھ بجے تک پہنچ جائیں تا کہ باری ملک کو کوئی دقت نہ ہو۔ اب کیا ہو سکتا تھا وہاں پہنچے تو باری کے ابا جان ہمارے منتظر تھے ان کو ہماری پیشوائی کے لئے آنا پڑا تھا۔ اگر ''پسر'' نتواند ''پدر'' تمام کند!

برمنگھم کی شعری نشست واقعی ''نشست'' تھی۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں کوئی چالیس پچاس آدمی ٹھسے بیٹھے تھے۔ مشاعرہ فرشی تھا۔ ادھر ہمارا حال یہ ہے بیٹھے جائیں تو وہ حال ہوتا کہ حضرت شیخ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔ کوئی دوسرا ہی اٹھائے تو اٹھ سکتے ہیں۔ گھٹنوں نے زمین پر بیٹھنے کی حد تک بلکہ یوں کہیئے کہ فرشی مشاعرے کی حد تک ساتھ دینا چھوڑ رکھا ہے۔ طوعاً کرہاً بیٹھے تو یوں بیٹھے جیسے کوئی بوسیدہ دیوار بیٹھتی ہے۔ جب شعر سنانے کی باری آئی تو بھی دوزانو بیٹھنا مشکل نظر آیا۔ بعد میں ویڈیو دیکھی تو محسوس ہوا ہم ایسے شعر پڑھ رہے ہیں جیسے کوئی بچہ گھٹنوں چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ نصیر شاہ صاحب سے نشست شروع ہونے سے ذرا پہلے ملاقات ہوئی تب اندازہ ہوا کہ اس نشست کے اہتمام

میں شاہ صاحب قبلہ بھی محض مہمان ہیں میزبان نہیں۔ جی تو چاہتا تھا انہیں کہیں جناب یہاں بلا کر آپ نے ہمیں دوسروں کے حوالے کیوں کر دیا ہے مگر ان کی مسکراہٹ سے اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی مروت کے مارے ہوئے ہیں۔ انہیں بھی اندازہ نہیں تھا کہ میزبان مہمانوں کو اس بلیک ہول میں اکٹھا کر کے مشاعرے کی سولی پر چڑھا دیں گے۔ وہ تو اتفاق ایسا ہوا کہ لاہور سے آنے والے معزز مہمان ہمارے اورینٹل کالج کے اولڈ بوائز نکلے اور بے تکلفی کی صورت نکل آئی ورنہ ہم ان اجنبیوں میں کسی مانوس اجنبی کو تلاش کرتے رہ جاتے۔ لندن سے بخش لائل پوری اور اعجاز احمد اعجاز آئے ہوئے تھے۔ مقامی شعراء میں یاسمین حبیب تھیں۔ اپنے چغتائی صاحب تھے اقبال ندیم صاحب میزبانی کر رہے تھے۔ مہمانوں میں سے ایک مبتدی سے شاعر تھے عزیز احمد ان کی کتاب کی تقریب رونمائی ہوئی۔ جب وہ عزیز صاحب اپنا کلام سنانے لگے تو معلوم ہوا مہمان خصوصی نے ''ر'' پر نقطہ ڈال کر انہیں ''عزیز'' کر رکھا ہے ورنہ اس قابل کہاں تھے کہ صاحب کتاب ہوتے! استاد ہی کا فیضان تھا۔ ہماری تھوڑی سی بے تکلفی مہمان خصوصی سے تھی۔ ہم نے کہہ بھی دیا کہ صاحب کتاب بنا دیا ہے تو شعر کہنا بھی سکھا دیتے۔ وہ حضرت مسکرا کر چپ ہو رہے۔ مشاعرے کے بعد لندن سے آنے والے ایک شاعر نے ہمیں علیحدہ لے جا کر پوچھا آپ کو کتنا معاوضہ ملا ہے؟ ہم نے کہا ہم تو نصیر شاہ صاحب کے مہمان ہیں ہمیں معاوضہ سے غرض نہیں۔ وہ بڑے حیران ہوئے اور اپنے معاوضے کی رقم ہمیں بتائی اور کہا کہ آپ تو دیارِ غیر سے آئے ہیں آپ کا معاوضہ تو کہیں زیادہ ہونا چاہئیے۔ ہم نے ان سے کہا آپ ٹھہرے پیشہ ور شاعر ہم محض استاد ہیں شاعری کو ہیچ جانتے ہیں اس لئے معاوضہ کی خاطر مشاعرے نہیں پڑھتے محض دوستوں شاگردوں کا دل رکھنے کی غرض سے مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں۔ انہیں ہمارا فلسفہ ایک آنکھ نہیں بھایا فوراً بھاگ لئے۔ وہ غالباً ہمارے معاوضے کا حوالہ دے کر اپنے معاوضے میں اضافہ کروانا چاہتے

تھے۔

اس مشاعرہ کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مطیع اللہ درد سے کوئی چالیس بیالیس سال کے بعد ملاقات ہوگئی اسی بازیافت کو ہم نے اپنا معاوضہ جانا۔ وہ آدم چغتائی صاحب کی نظم کا انگریزی ترجمہ پڑھنے کے لئے مجلس میں شریک ہوئے تھے ورنہ شاعر وہ کہاں تھے۔ اپنے بزرگ صوفی عبدالقدیر نیاز کی سنت کی پیروی میں ترجمے کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ہم کالج میں فرسٹ ایئر میں داخل ہوئے تو پہلے سال ہی کالج کے مجلہ المنار کی مجلس ادارت میں شامل کردئے گئے۔ چیف ایڈیٹر مطیع اللہ درد تھے۔ وہ کالج سے گریجویشن کر کے نکلے تو ایسے غائب ہوئے کہ اب چالیس برس کے بعد نظر آئے۔ فرمانے لگے جب تم نے اپنے ایک مضمون میں یہ لکھا تھا کہ مطیع اللہ درد خدا معلوم کہاں ہے اور کہاں نہیں تو میں نے تمہیں پیغام بھجوایا تھا کہ میں یہیں رہتا ہوں۔ ہم نے کہا جناب آپ تو اب بھی یہیں رہتے ہیں مگر ہمیں آپ کا پیغام نہیں ملا۔ ہم تو آپ کو گمشدہ چیز سمجھتے تھے آج مل گئے ہیں تو دل باغ باغ ہو رہا ہے کہ اتنی مدت کا بچھڑا ہوا دوست مل گیا دولتے ہست کہ یابی سرراہے گاہے۔

اگلے روز بریڈ فورڈ روانہ ہوئے۔ موسم ابر آلود تھا جو انگلستان والوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا مگر ہم گرمیوں میں جھلسے ہوئے لوگوں کو اچھا لگتا ہے۔ پھر خدا لگتی بات ہے کہ بھیگے ہوئے موسم میں سبزے کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے اور اس موسم میں سارے یورپ پر سبزے کا راج ہوتا ہے۔ اترتی چڑھتی بل کھاتی ہوئی سڑک، ایک متوازن اور معین رفتار پر ہوا سے باتیں کرتی ہوئی بس، وہ جو ذہن پر چار گھنٹے کے سفر کا بوجھ تھا اتر گیا اور طبیعت آسودگی محسوس کرنے لگی۔ رستے میں دو چار شعر بھی ہو گئے۔ اس طرح ہم اپنی روایت کو قائم رکھنے میں کامیاب ہو گئے کہ اوّل تو مشاعرے پڑھتے نہیں پڑھیں تو ہمیشہ تازہ ترین کلام سناتے ہیں لوگوں کی طرح ایک ہی غزل کو بقول شخصے ''ری پیٹتے'' نہیں چلے جاتے۔ ہمارے

ایک دوست ہیں جو برسوں سے ایک ہی غزل ہر مشاعرہ میں سناتے تھے جس کی زمین ہے ''فرہاد ہونا چاہیئے، ایجاد ہونا چاہیئے''۔ وہ یہ غزل سنا رہے تھے کہ ہم نے آواز لگایا ''اس غزل کو صاحب اولاد ہونا چاہیئے''۔سارے سامعین نے بیک آواز یہ مصرعہ اٹھالیا اور الاپنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اب وہ اپنی غزل کی اولاد لوگوں کو سناتے ہیں اگر چہ وہ اولاد بھی اب سن بلوغ کو پہنچنے والی ہے۔ ایسی حرکت کرنے والے اپنی اس حرکت کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ مشاعرے کے سامعین کے ذوق کا اندازہ نہیں ہوتا اس لئے ہر شاعر اپنا ایسا کلام ہی سناتا ہے جو مشاعروں میں مقبول ہو چکا ہو۔ ہمارا استدلال یہ ہے کہ شعراء ایک ہی چیز کے قبول عام پر قناعت کر کے کیوں بیٹھ رہتے ہیں؟ اچھا کلام خود بخود لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالے گا ہاں بعد میں فرمائش پر وہی پرانا آزمودہ کلام بھی سنایا جا سکتا ہے۔ ہمارے یار انور مسعود نے بنیان کا جانگیہ کیا بنایا اب لوگ ہر مشاعرے میں اسی کی فرمائش کرتے ہیں۔ اس کا نقصان لوگوں کو نہیں انور مسعود کو ہو رہا ہے جو اسی نظم پر رکے ہوئے ہیں نئی چیز لکھنے کی تحریک کیسے ہو؟ نہ بنیان بکتی ہے نہ سامعین کی جان چھوٹتی ہے نہ انور مسعود کے ہاں نیا مال آتا ہے۔

بریڈ فورڈ جاتے ہوئے شیفیلڈ اور لیور پول سے گذرے۔ چلے دو مقامات جو مدتوں کے سنے ہوئے تھے دیکھنے میں بھی آ گئے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ہمارے اعزاز میں ہونے والے مشاعرے کے صدر محترم ڈاکٹر مختار الدین احمد بھی لور پول سے تشریف لائے ہیں۔ ہم اپنی دانست میں انہیں علی گڑھ یونیورسٹی والا ڈاکٹر مختار الدین احمد سمجھے ہوئے تھے اور عند الملاقات پہلی بار ہی علی گڑھ کے ایک عزیز دوست کے بارے میں پوچھ بیٹھے۔ وہ کچھ چہ می گنم سے ہو گئے تو ہمیں اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب علی گڑھ سے تشریف نہیں لائے آپ نے خود ہی وضاحت فرما دی کہ میرا تخلص مختار ہے اور علی گڑھ والے ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو تخلص کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس مشاعرے

میں اتنے لوگ آ جائیں گے۔ ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ سامعین میں کچھ ہمارے شاگرد تھے، کچھ مقامی لوگ۔سابق لارڈ میئر جناب محمد عجیب بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔آپ سٹیج پر رونق افروز ہوئے اور سیاسی سوجھ بوجھ کی باتیں کیں۔ مشاعرے کی روداد لکھنا مقصود نہیں مگر اچھے اچھے شعر سننے میں آئے۔ بریڈفورڈ میں عزیزی باری ملک نے سیاسی اور سماجی حلقوں میں خوب جان پہچان بنا رکھی ہے۔ پہلے روز ہی ڈیلی ٹیلیگراف کے فوٹو گرافر کو اپنے استقبال کے لئے آیا ہوا پایا تو ماتھا ٹھنکا مگر دوسرے روز سن رائز ریڈیو والوں نے لائیو انٹرویو کوئی چالیس منٹ تک نشر کیا تو اندازہ ہوا کہ باری ملک نے میڈیا سے خوب تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔اردو بولنے والے حلقہ میں خاصی یکجائی ہے اور تعاون ہے اور یہ بات اردو کے حق میں اچھا شگون ہے۔محمد عجیب صاحب نے اپنی تقریر میں تارکین وطن کے اس جذبہ کو سراہا کہ وہ لوگ ادیبوں اور شاعروں کو بلاتے اور اپنی زبان سے دلچسپی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں مگر ہم نے اپنی تقریر میں یہ سوال اٹھایا کہ اس نسل تک تو آپ اردو لکھتے بولتے پڑھتے ہیں کیا اگلی نسل بھی ایسا کر سکتی ہے؟ اپنی اگلی نسلوں کی فکر کریں۔اردو بولنے تک تو بات حوصلہ افزا ہے مگر نئی نسل میں کتنے لوگ ہیں جو اردو لکھ اور پڑھ سکتے ہیں؟ اگر نئی نسل ایسا نہیں کرے گی تو ادب اور شعر کے ساتھ دلچسپی نہیں رہے گی اور اپنے کلچر سے رابطہ ٹوٹ جائے گا۔اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔یورپ میں ہی نہیں برصغیر سے باہر رہنے والے سب لوگوں کا یہی مسئلہ ہے۔سویڈن میں بھارت کے طلباء ہندی سیکھتے ہیں اس لئے ہندی اور سنسکرت کے کورسز موجود ہیں اردو کوئی نہیں پڑھتا اس لئے استاد موجود ہونے کے باوجود کوئی کورس جاری نہیں کیا جا سکتا۔ہم ''متعلقہ مضامین'' پر سیمینار دے دے کر اپنی روزی حلال کرتے رہتے ہیں۔ برصغیر پر آٹھ سو برس تک مسلمانوں کی حکومت رہی اس لئے فارسی شاعری اور اسلامی ثقافت اور اسلامی تاریخ ہمارے دائرہ کار میں شامل ہے۔غالب اور اقبال تو فارسی

شاعری کے حوالہ سے پڑھائے جا سکتے ہیں باقی رہے نام اللہ کا۔ یہاں کی پاکستانی کمیونٹی سے رابطہ کریں تو کہتے ہیں نئی نسل نہیں پڑھنا چاہتی تو ہم کیا کریں۔ بریڈفورڈ میں ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے ہمارے سوال کا یہی جواب دیا مگر یہ بھول گئے کہ جب تک پہلی نسل اپنے ورثہ کو آگے منتقل نہیں کرے گی وہ ورثہ اور دلچسپی آگے منتقل نہیں ہوگی۔ کتنے بڑے ہیں جنہوں نے اپنے مشاغل میں سے کچھ وقت نکال کر اگلی نسل تک اپنے ورثہ کو پہنچایا؟ شاید ایک یا دو فیصد لوگ ایسے ہوں گے۔ اس کی مثال یہ بھی ہے کہ اگر آپ اپنی اولاد کو بچپن میں قرآن پڑھنا نہیں سکھائیں گے تو بڑے ہو کر وہ نہیں پڑھیں گے ورثہ کے منتقل کرنے کی بنیاد بچپن ہی میں پڑتی ہے حیف کہ یہ نکتہ لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ رہ جاتا ہے۔ مغربی معاشرہ میں پیدا ہو کر بڑھنے والے بچے صرف اسی صورت میں اپنے وراثتی کلچر سے منسلک رہ سکتے ہیں جس میں بڑے اپنے کلچر سے وابستگی کی بنیاد اگلی نسل کے بچپن ہی میں رکھ دیں۔ احمدیوں نے البتہ اس نکتہ کو سمجھا ہے ان کا بین الاقوامی ٹی وی ایم ٹی اے دیگر دینی پروگراموں کے ساتھ ساتھ اردو کے اسباق بھی نشر کرتا ہے۔ حضرت امام جماعت احمدیہ اردو میں خود دلچسپی لیتے اور بچوں کو، اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود، بذات خود اردو پڑھاتے ہیں اس لئے احمدیوں کے ہاں وہ خلا پیدا نہیں ہوتا جو دوسروں کے ہاں ہو رہا ہے۔ اے کاش سب لوگ اس طرف توجہ کریں دین میں ان کے مسلک کی پیروی نہیں کرتے تو دنیا کی اور اپنے کلچر کی خاطر ہی اس نیک اسوہ کو اپنا دیکھیں کہ اس میں ان کی اور ان کی آئندہ نسلوں کی بھلائی ہے۔

بریڈفورڈ میں مشاعرے کی نظامت بریڈفورڈ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک خاتون نجمہ خان کر رہی تھیں اس لئے جب ہمارے تعارف کا مرحلہ آیا تو اپنے استاد اور ہمارے شاگرد عزیزی جاوید احمد کو تعارف کروانے کی دعوت دے کر سبکدوش ہوگئیں۔ جاوید احمد نے ہمارے کہنے کے باوجود تعارف

میں خاصی طول بیانی سے کام لیا حالانکہ دو چار لفظ ہی کہہ دینا کافی تھے۔ نجمہ خان کی بن آئی جب ہمیں دعوت کلام دینے لگیں تو استاد الاساتذہ کہہ کر اگلی پچھلی کسر نکال دی۔ لاحول ولاقوۃ۔ ہم کہاں کے دانا ہیں، کس ہنر کے یکتا ہیں؟ من آنم کہ من دانم! تعارف سے پہلے جاوید کہنے لگا کہ آپ سے کوئی بیس برس بعد ملاقات ہورہی ہے مجھے علم نہیں کہ اس دوران آپ کی کون کون سی کتابیں چھپ چکی ہیں اس لئے ایک مختصر سا تعارفیہ مجھے لکھ دیں۔ ہم نے کہا تو تعارف کروانا کیا ضرور ہے کہہ دو کہ بیس سال سے ان سے ملا نہیں اس لئے بیس سال پہلے کی باتیں کہہ رہا ہوں مگر وہ مصر رہے کہ اجنبی لوگوں کو بتانا ضروری ہے کہ آپ کون ہیں؟ خیر ہمیں شرارت سوجھی۔ ہم نے ایک مختصر سا خاکہ اپنے تعارف کا لکھ کر انہیں دے دیا کہ کہاں رہے کہاں نہیں رہے۔ کیا کیا، کیا نہیں کیا۔ ایک فقرہ ہم نے آخر میں لکھا کہ ''الحمدللہ کہ ابھی تک کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا''۔ جاوید بڑے خوش ہوئے اور اسی کاغذ کو لے کر تعارف کروانے کھڑے ہو گئے۔ حتیٰ کہ اس فقرہ تک پہنچ گئے۔ پڑھا ''الحمدللہ کہ ابھی تک۔۔۔'' یکدم ٹھٹکے مگر آدمی ذہین ہیں بات بنالی کہ ابھی تک ادب کی خدمت میں سرگرم ہیں۔ تعارف کروا کے بیٹھے تو پسینے میں شرابور تھے۔ بعد میں کہنے لگے آپ نے مروا دیا تھا فقرہ پڑھ کر مجھے دانتوں پسینہ آ گیا تھا مگر اللہ نے خیر کی کہ وقت پر بات سوجھ گئی اور میں سرخرو ہو گیا۔ ہم نے کہا میاں اگر ہمیں سے ہمارا تعارف لکھواؤ گے تو ایسا ہی ہو گا۔

اگلے روز ریڈیو والوں نے انٹرویو کے لئے بلایا۔ چالیس منٹ تک لائیو انٹرویو نشر ہوتا رہا۔ انٹرویو کرنے والے ہماری ادبی اور ثقافتی تاریخ سے پوری طرح آگاہ تھے۔ بزرگ آدمی تھے نام ذہن سے اتر گیا ہے مگر تراسی برس کی عمر میں بھی حافظہ چاق چوبند تھا۔ ہمارے سالک ومہر کے شناسا اور ان کی باتیں کرنے والے۔ گفتگو کرتے کرتے پنجابی پر آ گئے۔ ہم نے بھی پنجابی کا دامن پکڑ لیا۔ چنانچہ یہ

انٹرویو بائی لنگوئل (دو زبانی) ہو گیا۔

بائی لنگوئل سے بات ٹورنٹو تک جا پہنچی۔ دو برس پہلے وہاں کی جماعت احمدیہ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کا موقع ملا۔ وہاں کی روایت ہے کہ ہر مقرر بائی لنگوئل تقریر کرتا ہے۔ اردو میں بولے تو ساتھ ساتھ انگریزی میں ترجمہ خود ہی کرتا ہے یعنی آدھا وقت ایک زبان آدھا وقت دوسری زبان اسی ڈگر پر جلسہ کی کارروائی چل رہی تھی کہ ہمارے ایک بے تکلف دوست مولانا کی باری آ گئی۔ مولانا نے فراٹے سے اپنی انگریزی میں تقریر فرمائی اور چپکے سے بیٹھ گئے۔ ہمارے قریب ہی ایک دوست بیٹھے تھے فرمانے لگے مولانا نے بائی لنگوئل تقریر نہیں کی، صرف انگریزی میں تقریر کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ ہم نے جواب دیا آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے مولانا نے بائی لنگوئل تقریر فرمائی ہے۔ کہنے لگے وہ کیسے؟ ہم نے جواب دیا ایسے کہ مولانا نے ''ٹھیٹھ پنجابی'' میں انگریزی ارشاد فرمائی ہے۔

وہاں سے فارغ ہوئے تو احمدیہ مشن ہاؤس میں حاضری دی اور پھر لندن کا رخ کیا کہ انگلستان آئے ہیں تو ایک جمعہ مسجد فضل میں پڑھ لیں کیونکہ اگلے روز جرمنی پہنچنا ہے۔ جمعہ کے بعد عزیزی مرزا لقمان احمد نے پکڑ لیا کہ شام میرے ساتھ گذاریں۔ ہم نے اس عزیز کو سمجھایا کہ شام کو ایک عزیز بچی کی رخصتی ہے ہم لندن میں ہو کر بھی اس میں شریک نہ ہوئے تو ''شریک'' باتیں بنائیں گے اس لئے آپ نے ہمارے ساتھ جو سلوک روا رکھنا ہے ابھی اس سے سبکدوش ہو جائیں۔ چنانچہ ہم مرزا لقمان احمد کے ہاں جانے کی بجائے گیسٹ ہاؤس میں رفیق روزی کے ہاں جا بیٹھے اور مرزا لقمان احمد سے اس کے ابا، حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نور اللہ مرقدہ، کے کالج کے سنہری زمانہ کو یاد کرتے رہے اور ان مشاعروں کو بھی جن کا ذکر میں نے ''ثاقب زیروی کے ساتھ ساتھ والے'' مضمون میں لاہور میں کیا تھا۔ کالج کا ذکر ہو اور سننے والے کالج کے پرانے طالب علم ہوں تو وقت پر لگا کر اڑتا ہے۔ چنانچہ وہی

ہوا ہوش اس وقت آئی جب شادی میں شرکت کا وقت عین سر پر آ گیا۔عزیزی وسیم چوہدری نے ہمیں اپنی گاڑی میں ہمارے میز بانوں کے ہاں پہنچایا اور ہم وقت پر رخصتی کی تقریب میں شریک ہو گئے۔ اللہ وسیم کو جزائے خیر دے۔

لندن میں ہمارا قیام ہمیشہ ہی لالہ جی عبدالکریم کے ہاں ہوتا ہے مگر اب کے اتنا کم تھا کہ کسی کی دعوت قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ہاں خالد اختر کا کہا کیسے ٹالتے کہ انہوں نے ناشتہ میں پائے کھلانے کا وعدہ کیا۔ جب سے دل کی تکلیف اور ڈاکٹروں کی طرف سے پائے کھانے کی ممانعت ہوئی ہے پائے کھانے کوٹوٹ کر جی چاہتا ہے۔ چنانچہ ایسی ترغیب ہو تو ہم کیسے انکار کر دیتے۔البتہ یہ شرط لگائی کہ پائے کھلانے کے بعد انہیں ہمیں ہیتھرو ایئر پورٹ تک بھی بروقت پہنچانا ہوگا۔ چنانچہ صبح ''پایوں'' سے ''شرف تلذذ'' حاصل کرنے کے بعد سیدھے ہوائی اڈہ پر پہنچے۔خالد نے ہوائی اڈہ پر پہنچانے میں بڑی عجت دکھائی۔یہی سوچا ہوگا کہ اگر پائے کھا کر اس شخص کو ہائی کولیسٹرول کی پیچیدگیوں کا شکار ہونا ہی ہے تو دوسرے ملک میں جا کر ہو۔ہم دوپہر کے وقت بخیریت فرینکفرٹ پہنچے اور اب تک اللہ کے فضل سے توانا اور ٹانٹے ہیں۔اب بھی داؤ لگے تو ''پایوں'' سے دودو ہاتھ کرنے سے نہیں چوکتے!

فرینکفرٹ میں اتوار کے روز دو بجے دوپہر تقریب تھی جس کے پروگرام میں کھانا بھی شامل تھا۔ہم نے جانا رات کا کھانا ہوگا کیونکہ دو بجے دوپہر کا کھانا کون کھاتا ہے؟ اس لئے گھر سے کھانا کھا کر اطمینان سے ہال میں پہنچے تو معلوم ہوا وہ لوگ کھانے پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ہم نے کہا بھلے لوگو بِسمِ اللّٰہِ کرو کیوں ہم جیسے ذیابیطس کے ماروں کے لئے اپنے کھانے کا خون کرتے ہو؟ ہمارے تو کھانے کے اوقات ہی نرالے ہیں۔گھر میں بھی جب ہم ناشتہ کر رہے ہوتے ہیں سارا گھر خوابِ خرگوش کے

مزے لے رہا ہوتا ہے۔ بھلا یورپ میں صبح 5 بجے کوئی ناشتہ کیا کرتا ہے؟ دوپہر کا کھانا ہم نے عین 6 یا 7 گھنٹے بعد کھا لیتے ہیں وہ وقت بھی شرفاء کے کھانے کا نہیں ہوتا۔ علیٰ ھذا القیاس۔ بہرحال لوگ کھانے سے فارغ ہو کر جماہیاں لیتے اور ''ڈکارتے'' ہوئے ہال میں پھر جمع ہوئے اور اجلاس شروع ہوا۔

میاں عبدالسمیع نون صاحب سرگودھا سے ''ٹوپی صدارت'' کے طور پر پھندنے والی سرخ رومی ٹوپی پہن کر تشریف لائے تھے۔ چوہدری سر ظفر اللہ خاں کے بعد ہم نے مدتوں بعد کسی کو ویسی ٹوپی پہنے دیکھا مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ ہمارا خیال ہے چوہدری صاحب کے بعد دنیا سے اس ٹوپی کا رواج ہی اٹھ گیا۔ اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے! صاحبِ صدر نے اپنا خطبہ صدارت پہلی فرصت ہی میں ارشاد فرما دیا کہ خدا معلوم لوگ مجلس کے آخر تک بیٹھیں گے بھی یا نہیں؟ خطبہ صدارت کے بعد ادیب شہیر بھائی مسعود احمد خاں دہلوی نے ٹھیٹھ دلی کی با محاورہ زبان میں اپنا مقالہ ارشاد فرمایا جو ادیبوں کی ذمہ داریوں کے موضوع پر تھا۔ بھائی مسعود احمد خاں دہلوی دلی والوں کی آخری یادگار کے طور پر رہ گئے ہیں۔ ان جیسی زبان کون لکھے گا؟ اشرف صبوحی نہ رہے، شاہد احمد دہلوی نہ رہے۔ اب لے دے کے شان الحق حقی رہ گئے ہیں یا بھائی مسعود احمد خاں دہلوی اللہ انہیں سلامت رکھے۔ ان کی زبان کا چٹخارہ! سُبحَانَ اللّٰہِ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!!

اجلاس شروع ہونے سے پہلے عزیزی عرفان احمد خاں نے کہ مجلس کے میزبان تھے ہمیں پوچھا آپ کا لیکچر کتنی دیر کا ہے؟ ہم نے کہا میاں جتنا وقت تمہارے پاس ہے اس کے مطابق کمی بیشی کی جا سکتی ہے کوئی لکھا ہوا مقالہ تو ہے نہیں۔ چنانچہ کہنے لگے آپ کلاس لیکچر دے دیجئے۔ مطلب یہ تھا چالیس منٹ بولئے۔ اور ہم نے اللہ کے فضل سے اپنا لیکچر ختم کیا تو عین انتالیس منٹ اور ساٹھ سیکنڈ ہوئے تھے۔ لیکچر کیا تھا جدید شعراء کا مختصر تعارف اور ان کے اشعار ہی تھے جو لوگ سنتے اور سر

دھنتے رہے کہ ان لوگوں کا نام سنا نہ کلام کہیں پڑھنا مگر شعر کس بلا کے ہیں! ہم نے انہیں صرف یہ بتایا کہ جماعت احمدیہ اس باب میں کسی سے ہٹی نہیں فرق صرف یہ ہے کہ ہم لوگ عام ادبی محاذوں پر ''محاذ آرائی'' سے دور رہ کر اپنا کام کئے جاتے ہیں!

اس کے بعد مشاعرہ ہوا۔ یہ تو میزبان کا فرض تھا کہ شعراء کو وقت کا بتا دیتے کہ ایک معین وقت کے بعد ہال خالی کرنا ضروری ہے نہ بتایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں پڑھنے والے شعراء کو گلہ ہوا کہ ہمیں کماحقہ سنانہ گیا حالانکہ کسی شاعر نے بھی تین غزلوں سے کم شعر نہیں سنائے تھے۔ اگرچہ ہم ذاتی طور پر بہت خوش ہوئے کہ زیادہ شعر سنانے سے بچ گئے کہ ایک سے زیادہ غزلیں سنانا ویسے ہی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ خدا جانے وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو سٹیج پر آ جائیں تو جانا پسند نہیں فرماتے۔ ہمیں یاد ہے ہم نے ایک مشاعرہ میں شعرا کی کثیر تعداد کے پیش نظر میزبان ہونے کے ناطے یہ پابندی لگا دی کہ کوئی صاحب ایک نظم یا غزل سے زیادہ نہ سنائیں۔ ہمارے ایک دوست نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ صرف ایک غزل ارشاد فرمائی جس میں بلا مبالغہ ستر شعر تھے۔ ہال یہاں بھی ''کھچا کھچ'' بھرا ہوا تھا مگر آدھا حصہ بالکل خالی تھا۔ اس شتر گربہ کا مطلب یہ ہے کہ خواتین نے اپنے والے آدھے حصہ کو پر کرنے کے بجائے پچھلی سیٹوں پر دبک کر بیٹھنے اور اپنے ''کھسر پھسر کرنے کے نسائی حقوق'' کو محفوظ رکھنے کو ترجیح دی۔ اس نسائی حصے میں بزرگ شاعر جناب غلام محی الدین صادق اپنی چھتنار ریشِ مبارک سمیت اکیلے ہی پر کر کے بیٹھے رہے اور حق بھی یہی ہے کہ وہ حصہ ان کی بھراوں ریشِ مبارک کی وجہ سے بھرا بھرا نظر آتا رہا۔ منتظمین ان کے عصائے پیری سے ڈرتے رہے اور انہیں یہ کہنے کی جرات نہ کر سکے کہ حضرت یہ حصہ خواتین کے لئے مخصوص ہے۔ ان کے عصائے پیری سے یاد آیا کہ اپسالا یونیورسٹی میں ہمارے فارسی کے ایک بزرگ رفیق کار جن کا خاندانی نام ''جواں مردی'' ہے ایک

بار گر کر پاؤں کی ہڈی تڑوا بیٹھے۔ کچھ عرصہ کے بعد یونیورسٹی تشریف لائے تو ایک ہاتھ میں عصا تھا دوسرا ہاتھ اپنی اہلیہ خانم جواں مردی کے کاندھے پر رکھے ہوئے تھے۔ اسٹاف روم میں داخل ہوئے تو ہم نے کہا ''سبحان اللہ آپ کے ایک ہاتھ میں عصائے پیری ہے اور دوسرا ہاتھ آپ نے عصائے جواں مردی پر رکھا ہوا ہے''۔ سب لوگ ہنسنے لگے پروفیسر صاحب نے فرمایا ''میں نے اپنے خاندانی نام کا اس سے بہتر ''سجع'' پہلے نہیں سنا'' یہاں بھی جناب غلام محی الدین صادق صاحب کی وجہ سے وہ خالی حصہ ''سجا'' ہوا تھا۔

اس فرض سے ادا ہو جانے کے بعد ہمارے پاس فرینکفرٹ میں اور کوئی کام کرنے کا نہیں تھا۔ اپنے پوتے شاہد منصور اور اس کی نئی نویلی دلھن سے فون پر رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ انس اور اس کی بیوی پہلے ہی آ کر ہمیں مل چکے تھے۔ اس لئے ہم نے معاذ اللہ کو فون کیا کہ ہم فارغ ہیں آ جاؤ۔ معاذ اللہ بھٹی ہمارا چہیتا شاگرد ہے۔ سکھیکی کے قریب کا بڑا زمیندار مگر گردشِ روزگار کہ اب یہاں جرمنی میں آیا بیٹھا ہے وہ جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر واقع شہر فرائی برگ کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا ہے۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا وہ پہلی فرصت میں آ گیا اور ہم نے رختِ سفر باندھا۔ آٹو باہن پر دوڑتے بھاگتے کوئی تین چار گھنٹوں میں فرائی برگ پہنچے۔ اس کے چھوٹے بھائی کے ہاں جھانکا۔ وہ عزیز بھی ہمارا شاگرد ہے۔ پھر معاذ اللہ کے گاؤں پہنچے۔ مدتوں کا کیا ہوا وعدہ پورا ہو گیا۔ معاذ اللہ پاکستان میں جب کبھی ہمیں سکھیکی سے گزرتے ہوئے دیکھتا اصرار کرتا کہ میرے گاؤں چلیں۔ ہم عدیم الفرصت ہونے کا بہانہ کر کے آئندہ آنے کا وعدہ کر لیتے۔ چنانچہ ہم نے گاؤں پہنچتے ہی اسے کہا لو بھئی ہمارا وعدہ پورا ہو گیا ہم تمہارے گاؤں آ گئے ہیں۔ واقعی گاؤں، کھیتوں اور انگور کے باغوں کے درمیان مختصر سی آبادی، صاف ستھری، آلائشوں سے مبرا۔ اس کی بیوی ہمارے ایک اور

شاگرد ڈاکٹر عبدالخالق مانگٹ کی بہن نکلی دوہرا رشتہ ہو گیا۔ساجدہ پروین نے ہماری خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔اللہ اس کو جزائے جزیل دے۔میاں بیوی نے اپنا ماسٹر بیڈ روم ہمارے لئے خالی کر دیا اور ہم چار دن اور چار راتیں اس پر قابض رہے۔کھانے میں بٹیر کا گوشت،مکئی کی روٹی،سرسوں کا گندلوں والا ساگ، ہر نعمت ملتی رہی جو شہروں میں نہیں ملتی۔ بالکل ایسے لگتا تھا کوٹ مراد میں زمیندار معاذ اللہ بھٹی کے ہاں بیٹھے ہیں۔جس روز گئے تھے اس روز تو کسی اور جگہ جانے کی گنجائش نہیں تھی ورنہ ہم اتنے ''مائل بہ سیر'' تھے کہ سیر پر چل پڑتے تو بعید نہ تھا۔کچھ معاذ اللہ آتے ہوئے ایک طرف اشارہ کرتا تو کہتا بس اس پہاڑی کے پیچھے سوئٹزرلینڈ کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے اور فرانس تو انگوروں کے اس باغ کے عقب میں دھرا رکھا ہے وہ سامنے جو اونچی پہاڑی نظر آ رہی ہے وہ آسٹریا کا علاقہ ہے۔ہم رات کو سوئے تو انہیں ملکوں کے خواب دیکھتے رہے۔

اگلے روز صبح سویرے یورپ کے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ بازل کے راستے سوئٹزرلینڈ میں داخل ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس ملک کو بے پناہ قدرتی حسن عطا کر رکھا ہے۔سکینڈے نیویا بھی کوئی کم خوبصورت نہیں مگر سوئٹزرلینڈ اور آسٹریا کا حسن حسنِ بے پرواہ ہے اور بے محابا مگر ان لوگوں نے قبلہ شیخ منظور الٰہی کے قول کے مطابق حسنِ فطرت کو تسخیر کر رکھا ہے یعنی پانی ہے تو قابو میں ہے، پہاڑ ہیں تو ان کے نیچے سے سرنگیں بنا کر فاصلے کم کر رکھے ہیں۔اگرچہ ان پہاڑوں کے اوپر سے گزرنا ہوتا تو فطرت کے اور حسین مناظر دیکھنے کو ملتے۔ بازل شہر میں تھوڑی دیر کے۔گاڑی ایک جگہ پارک کی۔شہر کے وسط میں گھومنے پھرنے کا ارادہ کیا مگر دیکھا کہ ایک طرف جائیں تو اتار ہی اتار ہے۔ظاہر ہے واپس آتے ہوئے وہی اتار چڑھائی میں بدل جائے گا تو کیا ہوگا؟ ہمیں دل کی بیماری کے ہاتھوں ہر وہ کام کرنا منع ہے جس میں سانس چڑھنے کا اندیشہ ہو کیونکہ سانس چڑھے تو اس کے اکھڑنے کا خطرہ موجود رہتا ہے۔

بھاگ سکتے ہیں نہ سیڑھیاں چڑھ سکتے ہیں نہ سوئٹزر لینڈ کے شہروں میں پا پیادہ سیر کر سکتے ہیں۔ اس لئے پتھر کو بھاری جانا چوم کر چھوڑ دیا حالانکہ شہر بہت خوبصورت تھا۔ جوانی میں آئے ہوتے تو شہر گردی کا لطف اٹھاتے۔ ناچار پھر ہائی وے پر پہنچ گئے اور آگے کا رخ کیا۔ پروگرام تھا کہ ایلپس کے ساتھ ساتھ ڈرائیو کریں گے۔ سڑک پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چلتی چلی جاتی ہے اور اونچے نیچے پہاڑوں کا سبزہ بیگانہ، جھیلوں میں منعکس ہوتا چلا جاتا ہے۔ یکا یک سامنے ایک فلک بوس پہاڑ آ جاتا، سڑک اس کے اردگرد چکر کاٹتی ہے گویا راستہ تلاش کر رہی ہے پھر زن سے ایک لمبی سرنگ میں داخل ہو جاتی۔ عام سرنگیں پانچ پانچ چھ چھ کلومیٹر لمبی تھیں اور چھوٹی سرنگوں کا تو حساب نہیں۔ مگر ہمیں سرنگوں اور پہاڑوں کے ساتھ سڑک کی آنکھ مچولی اچھی لگی حتیٰ کہ ہم ایک اونچے پہاڑ کے دامن میں سوئے ہوئے شہر فلیومسر برگ پہنچے۔ دریا جو ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا اسے عبور کیا، شہر میں داخل ہوئے اور پھر اللہ دے اور بندہ لے پہاڑ کی چڑھائی شروع ہو گئی۔ بل کھاتی ہوئی صاف ستھری سڑک رفتہ رفتہ بلند ہوتی گئی یہاں تک کہ نیچے فلیومسر برگ کا شہر کھلونا سا دکھائی دینے لگا۔ پہاڑ کی ڈھلوان پر گھاس کے قطعے تھے مگر لگتا تھا انہیں بھی باقاعدہ تراش کر ہموار کیا گیا ہے۔ واقعی یہ لوگ حسنِ فطرت کو تسخیر کرنے کے لئے بہت محنت کرتے ہیں۔ اوپر پہلی چوٹی پر پہنچے تو ایک ہوٹل تھا ''میٹ وائس'' جو ٹورسٹوں سے اٹا اٹ بھرا ہوا تھا۔ انفارمیشن والوں سے پوچھا تو معلوم ہوا ایک دن کا کرایہ کوئی ہزار ڈالر کے قریب ہے۔ توبہ توبہ! یہ کون لوگ ہیں جو ٹھہرے ہوئے ہیں؟ سب کے سب کروڑ پتی تو ہو نہیں سکتے مگر حسنِ ذوق کے لحاظ سے کروڑ پتی ضرور تھے۔ رک کر، تھم کر، دم لے کر، قدرت کے حسن کی داد دینا جانتے تھے۔ ہماری طرح عجبت اور غریب الوطنی کے مارے ہوئے نہیں تھے۔ آگے گئے تو لوگوں کے جھنڈ کے جھنڈ پہاڑ پر ہائیکنگ کرتے نظر آئے۔ پیادہ پا چل کر حسنِ فطرت سے لطف اندوز ہونے والے ہاتھوں میں ہائیکنگ والی

چھتریاں، پاؤں میں مناسب جوتے یا جوگر، کاندھوں پر تھرموس میں پانی یا کافی۔ ہم ہوتے ہوتے اس مقام تک پہنچ گئے جہاں سے آگے ہائیکنگ والوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ آگے سربفلک چوٹی تک جانے کے لئے چیئر لفٹ ہے۔ ہمیں کیبل رائڈ کا اتنا شوق نہیں تھا جتنا خود ڈرائیو کرکے پہاڑ کے دوسری طرف جا پہنچنے کا۔ چنانچہ کچھ دیر کے۔ لوگوں کو واپس اپنی اپنی بسوں کوکوچوں میں بیٹھتے دیکھا اور سفر کی اگلی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ سردیوں میں یہ سارا علاقہ ایک عظیم الشان گلیشیئر بن جاتا ہے۔ پہاڑی سے اترتے ہوئے حسن کا نیا پہلو آیا۔ وہی رفتہ رفتہ قریب ہوتی ہوئی چوٹی اب ہوتے ہوتے دور اور اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ ہم پھر ہائی وے پر آ گئے اور اگلی منزل کی جانب رواں دواں ہو گئے۔ پہاڑ، سبزہ، پانی اور تہ بہ تہ ہوتی ہوئی ڈھلوانوں پر انگور کے باغات، ہزار بادہ ناخوردہ در رگِ تاک است!

ایلپس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک مقام پر ''لی سٹن ٹائن'' کا نشان ملا معلوم ہوا یہ منی سی ریاست یعنی پرنسی پیلیٹی ہے جیسی فرانس میں مناکو ہے۔ اس کے دارالحکومت ''وادوز'' میں پہنچے۔ ایک بس اسٹاپ پر رک کر کچھ معلومات حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو ایک نوجوان ملا۔ اس نے بتایا کہ یہ پرنسیلیٹی رقبہ کے لحاظ سے کوئی زیادہ بڑی نہیں مگر امیر پرنسیلیٹی ہے۔ دنیا کے لوگ اپنی دولت ہمارے پاس امانت رکھواتے ہیں اور ہم امین لوگ ہیں۔ اس نوجوان نے ایک مبلغ کے جذبہ سے ہمیں اپنے وطن کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔ سکریٹیریئٹ ایک چھوٹی سی عمارت میں تھا جو ہمارے لاہور کی فری میسن ہال جتنی ہوگی۔ بنکوں کی البتہ بھرمار تھی۔ وادوز پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ پہاڑ بھی ایسا عمودی طور پر بلند ہوتا ہوا کہ چوٹی کو دیکھنے کے لئے دستار تھامنا پڑے۔ عمودی پہاڑ کے اوپر ایک مخروطی چوٹی پر حکمران جوڑے کا قلعہ ہے۔ میاں، بیوی، ہز ہائی نس آدم ثانی اور ان کی بیگم ہر ہائی

نس ماری، دنیا میں زیادہ مشہور و معروف تو نہیں لیکن لوگوں میں مقبول و محبوب ہیں۔ ہم نے مشکل سوس نام اپنی اور قارئین کی آسانی کے لئے مختصر کر کے لکھ دیئے ہیں یہ آدم اور ان کی حوا پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے اپنی رعایا کو دیکھتے رہتے ہوں گے۔ صاف ستھرا شہر ہے۔ ٹورسٹوں کا ازدحام رہتا ہے۔ اس ملک کا اپنا دستور ہے، اسمبلی ہے، جمہوریت ہے، بادشاہ سلامت آئینی حکمران ہیں۔ دولت کی ریل پیل ہے۔ راوی چین لکھتا ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں دنیا کی آدھی جائز و ناجائز دولت چھپی ہوئی ہے اس آدھی میں لسٹن ٹائن کو برابر کا شریک جانئے۔ ابھی پچھلے دنوں جرمنی کے سابق چانسلر ہیلمیٹ کوہل صاحب پر الزام تھا کہ آپ نے اپنی پارٹی کے لئے کوئی خفیہ فنڈ اکٹھا کیا تھا وہ سوئٹزرلینڈ کے بینکوں میں جمع ہے۔ سوئٹزرلینڈ والوں نے کہا ہاں ہے مگر آپ کو اس سے کیا؟ کچھ دنوں کے بعد خبر آئی کہ ملین مارک کی وہ رقم اپنے اکاؤنٹ سے غائب ہے۔ پھر معلوم ہوا غائب نہیں ہوئی تھوڑا سا سفر کر کے لی سٹن ٹائن تک پہنچ گئی ہے اور لی سٹن ٹائن کے ساتھ جرمنی والوں کا کوئی ایسا معاہدہ نہیں کہ وہ اس رقم کا حساب مانگ سکیں۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ ایسی ہی خبریں پاکستان کے بعض سیاست دانوں کی دولت کے بارے میں بھی تھیں۔ کوئی اخباری نمائندہ ہمیں پاکستانی لباس میں چلتا پھرتا دیکھ کر یہ خبر بھی اڑا سکتا تھا کہ اس نے بچشم خود پاکستانی ''سیاست دانوں'' کو لی سٹن ٹائن کی سیر کرتے دیکھا ہے مگر لمبے اکاؤنٹ رکھنے والے یوں چہل قدمیاں تھوڑے ہی کیا کرتے ہیں۔ ہم نے بازل میں ایک عرب شہری کو فرلانگ بھر لمبی لیموزین میں بینک کے اندر جاتے دیکھا تھا۔ ان کی لیموزین کے پارک ہو جانے اور ان کے قدم رنجہ فرما کر دفاتر میں غائب ہو جانے تک باقی تمام کاریں پارکنگ کے باہر انتظار کرتی رہیں۔ ہمارے بھی دس منٹ اس انتظار میں ضائع ہوئے تھے مگر ہمارے دس منٹوں کا عرب کے پیٹرو ڈالر سے کیا مقابلہ؟

''لی سٹن ٹائن'' کی پرنسپیلیٹی دیکھ کر ہمیں اپنے برطانوی ہند کی ریاستیں یاد آئیں جن میں سے ہر ایک اپنے زعم میں خود مختار تھی اور ان کے حکمران دولت وثروت کے صید زبوں تھے اور سوائے اسے ضائع کرنے کے اور کوئی مشغلہ نہیں رکھتے تھے نظام کی ریاست حیدرآباد ریاستوں میں سب سے بڑی تھی۔ جوش صاحب نے لکھا'' وہ عجب اور خود پسندی میں اتنے بڑے تھے کہ بندے نہیں خدا معلوم ہوتے تھے'' مگر ہم نے یورپ کی اس خود مختار ریاست کے حکمرانوں کے اخلاق کے بارے میں رعایا کو رطب اللسان پایا۔ ان کی تصویر بھی دیکھی۔ نہایت شریف میاں بیوی لگتے ہیں۔ مسکین صورت لوگ ہیں اور انسان لگتے ہیں۔ ان لوگوں نے رعایا کو یورپ کی ہر ممکن سہولت بہم پہنچا رکھی ہے۔ لوگ تھوڑے ہیں مگر مطمئن اور مسرور ہیں۔ وادوز ایک چھوٹا سا شہر ہے مگر اس میں چار مختلف فرقوں کے گرجے نظر آئے۔ آزاد خیال اور کشادہ دل لوگ لگتے ہیں۔ ہمارا قیام وادوز میں زیادہ نہیں رہا مگر ہم پہاڑ کے اوپر بادشاہ سلامت کے محل تک ضرور گئے۔ کوئی پہرہ وغیرہ بھی نہیں تھا۔ عام سا گھر لگتا تھا۔ ہر چند قلعہ تھا مگر قلعوں والی قدامت کے سوا اور کوئی چیز اس میں ہیبت والی نہیں تھی۔ ساز وسامان بھی ایک عام متوسط خاندان کے سامان جیسا لگتا تھا۔ معاذ اللہ کہنے لگا ہم یہاں کیوں نہ آ گئے؟ خواہ مخواہ جرمنی کے سمندر میں گم ہو گئے ہیں۔ یہاں کم از کم اپنی انفرادیت تو قائم رہتی۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں .... الخ! ''لی سٹن ٹائن'' کی یہ ریاست آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ میں گھری ہوئی ہے۔ معاذ اللہ کو اس بات پر حیرت ہوتی رہی کہ جنگ میں جرمنی نے اس پر قبضہ کیوں نہ کر لیا؟ ہمارا خیال ہے اتنی منی سی ریاست کو ہڑپ کر جانے کو ان لوگوں نے اپنی ہتک جانا ہوگا۔ اس ریاست کی ساری آمدنی دودھ، دہی اور پنیر کی برآمد پر ہے۔ مصنوعات کے نمونے دیکھے تو گایوں کے گلے میں باندھی جانے والی گھنٹیوں کے سوا اور کوئی چیز نظر نہ آئی یا ایک دو بگل تھے وہی سینگوں کے بنے ہوئے بگل، جو

چرواہے اپنے جانوروں کو اکٹھا کرنے کے لئے پھونکتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ سرسبز وشاداب علاقہ پہاڑوں، وادیوں، دریاؤں سے بھرا پڑا ہے۔ سارا ملک ایک چراگاہ معلوم ہوتا ہے۔ سردیوں میں برف سے ڈھک جاتا ہے تو لوگ گاڑیوں کو گیراجوں میں بند کر دیتے ہیں اور سلیج (برف پر کھینچنے والے تختے) پکڑ لیتے ہیں۔ زندگی کا کاروبار چلتا رہتا ہے یہ لوگ اپنے آپ کو ''چھٹیاں گزارنے کا ملک'' کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں۔

واپسی پر ہم نے ہائی وے چھوڑ کر عام سڑک لے لی تا کہ آسٹریا کے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے سمندر نما سلوش سی نامی جھیل کے کنارے کنارے چلیں اور جرمنی کے بلیک فارسٹ کا کچھ حصہ جس میں جھیل ٹی ٹسی شامل ہے دیکھ سکیں۔ اس سفر میں فاصلہ کچھ بڑھ گیا مگر بلیک فارسٹ میں جھیل ٹی ٹسی کے کنارے رکے تو یوں لگتا تھا جیسے خوابوں کے کسی ملک میں آ گئے ہیں۔ جھیل کے کنارے مناسا شہر آباد ہے۔ دنیا بھر کے ٹورسٹوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ سنا ہے برسوں پہلے ہوٹلوں کی بکنگ ہو جاتی ہے۔ ہم پہنچے تو شام کا جھٹ پٹا ہو چکا تھا اس لئے ماحول اور بھی خواب گوں بن گیا۔ کچھ دیر وہاں رکے۔ ان رنگوں کو آنکھوں میں سمیٹنے کی کوشش کی جو دور اوپر جنگل کے گھنے درختوں کی چوٹیوں پر ڈوبتے سورج کے دھنک رنگوں میں بنتے بگڑتے دکھائی دے رہے تھے اور نیچے جھیل کے گہرے پانی میں ان کا عکس اپنا جادو جگا رہا تھا۔ کسی نے کیا خوبصورت بات کہہ رکھی ہے کہ نقاشِ فطرت سے بڑا رنگوں کا جادوگر اور کوئی نہیں۔

ہم ٹی ٹسی سے واپس چلے تو لمبے سفر کی تھکان اپنا اثر دکھانا شروع کر چکی تھی مگر اونچے سربفلک پہاڑوں کے درمیان بے حیثیت چیونٹی جیسی سڑک رینگتی جا رہی تھی۔ ایسے سربفلک پہاڑوں کے درمیان بے حیثیت اور حقیر سڑک کا ایک نظارہ ہم نے وینکوور کے راکیز کے سفر کے دوران دیکھا تھا۔

دونوں جانب پر ہیبت پہاڑ اور درمیان میں گھری ہوئی حقیر سڑک جو پہاڑ کے اوپر سے یقیناً محض سیاہ لکیر دکھائی دیتی ہوگی۔ بلیک فارسٹ میں بھی کچھ دور تک سڑک کا یہی عالم رہا پھر جیسے پہاڑوں کی ہیبت نے راستہ چھوڑ دیا اور ہم واپس اس زمین پر دوڑنے لگے۔ بلیک فارسٹ جرمنی کا قابلِ دید حصہ ہے جسے جرمنوں نے اب تک محفوظ رکھا ہے۔ اونچے پہاڑ سر بفلک دیو ہیکل درخت، جھیلیں اور پہاڑوں کے ساتھ ساتھ اور کہیں کہیں پہاڑوں کے اندر سرنگوں میں دوڑتی ہوئی ریلیں عجیب نظارہ ہے۔ اللہ نے چاہا تو پھر کبھی صرف اس علاقہ کی سیاحت کے لئے آئیں گے۔

واپس گھر پہنچے تو تھک کر چور تھے۔ معاذ اللہ اگلے روز کسی اور جگہ سیر کا پروگرام بنا رہا تھا۔ ہم نے کہا میاں توقف کرو۔ ایک دن آرام کریں گے پھر فرانس کا رخ کریں گے۔ فرانس میں بھی سٹراسبرگ کا جہاں ان لوگوں نے یورپ کا نیا دارالحکومت بنا رکھا ہے۔ یورپ کی اسمبلی، یورپ کا سیکریٹیریٹ وغیرہ۔ اگر چہ متحدہ یورپ کا غلغلوں پر وجود میں آچکا ہے مگر بعض ممالک ابھی تک یورپ کی ایک کرنسی اور ایک حکومت میں شامل نہیں ہیں۔ مثلاً ہمارے پاس جو پاسپورٹ ہے اسے یوروپین پاسپورٹ کہتے ہیں۔ ہم یورپ میں کہیں بھی سفر کریں تو ایسے ہی ہے جیسے ہم اپنے ملک کے اندر سفر کر رہے ہیں مگر کرنسی مختلف ہے، کرنسی کی قدر بھی مختلف ہے۔ انگلستان بھی ابھی تک یورپ کی متحدہ کرنسی میں شامل نہیں۔ اسی طرح یورپ کے ایک ملک کا یوروپین ویزا سویڈن، برطانیہ جیسے ملکوں میں کارآمد نہیں۔ ان ملکوں کا علیحدہ ویزا لینا پڑتا ہے۔

یورپ کی کرنسی جسے ایکو کہتے تھے اب ''یورو'' کہتے ہیں ابھی پوری طرح رائج نہیں ہوئی۔ ہم نے امتحان کے طور پر کچھ کرونز تبدیل کروائے کہ دیکھیں جرمنی یا انگلستان میں کام آتے ہیں یا نہیں۔ کام نہیں آئے۔ یہ بھی محض تکلف تھا ورنہ ہم نے جرمنی سوئٹزرلینڈ کے سفروں کے دوران جرمن مارک یا

سوس مارک کی شکل تک نہیں دیکھی۔ ہمارے میزبان ہی ہمارے متکفل ہوتے رہے۔ فجز اھم اللہ احسن الجزاء۔

ایک دن کا وقفہ دے کر فرانس کی طرف چلے۔ یورو پارک تو ہمارے رستے میں تھا کیونکہ معاذ اللہ نے ہائی وے کی بجائے عام سڑک سے سفر کرنا پسند کیا تھا۔ دریائے رائن جو کسی مقام پر آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ کے درمیان سرحد بن جاتا ہے کسی مقام پر جرمنی اور فرانس کے درمیان سرحد کا کام دیتا ہے، آڑے آیا مگر ہم زن سے اس پل کو طے کر گئے۔ لیجئے فرانس شروع ہو گیا۔ وہی علاقہ جہاں سے جرمنی نے فرانس پر قبضہ کرنے کی طرح ڈالی تھی۔ تحدیثِ نعمت میں ایک جگہ چوہدری صاحب نے لکھا ہے کہ وہ ''جنگ کے بعد میدانِ جنگ دیکھنے گئے مگر میدانِ جنگ زیرِ کاشت تھا''۔ ہم نے بھی وہی عالم دیکھا۔ ہر طرف مکئی کی فصل کھڑی تھی۔ لمبا میدانی علاقہ ہے۔ حدِ نگاہ تک کھیت نظر آئے اور ان کھیتوں میں اکا دکا چھوٹی چھوٹی آبادیاں۔ ایک گاؤں میں بھی جھانکا۔ جنگ کے زمانے کی ایک تباہ شدہ عمارت کو گاؤں والوں نے محفوظ کر رکھا ہے۔ اچانک ہمیں خیال آیا کہ ابھی پچھلے دنوں ہم نے ایک برطانوی جرنیل سرجان ہیکٹ کی ایک کتاب پڑھی ہے ''میں اجنبی تھا''۔ یہ صاحب برٹش پیراڈروپ بریگیڈ کے بریگیڈئیر تھے اور جنگ کے آخری زمانہ میں دشمن کی صفوں کے پیچھے اپنے چھاتہ بردار اتارتے ہوئے طیارہ کے زخمی ہو جانے کے بعد خود بھی زخمی ہو گئے تھے اور اسی علاقہ میں کود گئے تھے۔ یہاں کے ریڈ کراس ہسپتال میں ان کی دیکھ بھال ہوتی رہی تا آنکہ ان کے فوجیوں کی خفیہ سروس نے انہیں ہسپتال سے بحفاظت ''اغوا'' کر لیا اور دریائے رائن کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک ڈچ مہاجر فیملی کے پاس چھپا دیا اور پھر مناسب انتظامات کرنے کے بعد انہیں دشمن ملک سے نکال لیا۔ وہ صاحب بعد میں جنرل بنائے گئے اور نیٹو کی برٹش فوجوں کی کمان کرتے رہے۔ اس گاؤں کے ہر مکان

پر ہمیں یہی شبہ ہوتا رہا کہ یہی وہ مکان نہ ہو۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔ مطالعہ میں آنے والی اجنبی کتاب نے ہماری سیر کو ایک معنویت دے دی۔

چھوٹے چھوٹے کئی گاؤں دیکھنے کے بعد ہم نے سٹراسبرگ کی راہ لی۔ ہائی وے اختیار کرنے کی وجہ سے فاصلہ مختصر ہو گیا۔ سٹراسبرگ خوبصورت شہر ہے۔ پرانی تاریخی عمارتوں کا شہر۔ یورپ والوں نے اسے نئی یورپی یونین کا دارالحکومت بنانے کا فیصلہ بھی شاید اس شہر کی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے کیا ہے۔ کچھ دیر شہر میں گھومتے رہے۔ پارکنگ کی بڑی دقت ہوئی۔ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھانا چاہتے تھے مگر اردگرد پارکنگ نہیں مل رہی تھی۔ ایک جگہ ایک دو گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ ان کے عقب میں گاڑی کھڑی کر کے کھانے بیٹھ گئے۔ یکا یک خیال آیا کہ ہم نے گاڑی غیر مناسب جگہ پر پارک کر رکھی ہے۔ پردیس میں اگر پولیس والے ''کرین'' کے ذریعہ گاڑی اٹھا کر لے گئے تو کس سے داد فریاد کریں گے؟ ہم نے دل کو بہتر سمجھایا کہ گاڑی میں کلثوم نواز شریف تھوڑی ہی بیٹھی ہیں کہ پولیس والے کرین سے کام لیں گے۔ (اب تو یہ سارا قصہ ہی داستان پارینہ ہوا۔)

آخری فیصلہ ہوا کہ معاذ اللہ گاڑی کو کہیں مناسب جگہ لے جا کر پارک کر دے اور ہم وہیں بیٹھ کر کھانے کے آنے کا انتظار کریں۔ معاذ اللہ گیا تو ایسا گیا کہ ایک گھنٹہ تک واپس ہی نہ آیا ہم اپنی جگہ بہت پریشان کہ خدا معلوم کیا ہوا وہ جوان کدھر گیا؟ خدا خدا کر کے آیا تو اس وقت تک کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا مگر اس بات سے اطمینان ہوا کہ اسے کوئی ایک کلومیٹر دور پارکنگ مل گئی ہے اور اب گاڑی کے کرین سے اٹھائے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ہم تو اپنے حصے کا کھانا کھا چکے تھے معاذ اللہ کو ٹھنڈا کھانا ہی مار کرنا پڑا۔ اس کے بعد یورپی پارلیمنٹ کی نئی بلڈنگ کی تلاش میں نکلے۔ جس سے راستہ پوچھیں وہ کھیسیں نکال دے کہ جرمن آتی ہے نہ انگریزی۔ فرانسیسی ہمیں نہیں آتی تھی۔ کس سے پوچھیں کیسے

پوچھیں؟ بذات خود کوشش کی تو ہر پھر کر ایک ہی چوک میں پہنچ جاتے رہے۔ آخر تنگ آ کر فرائی برگ کی راہ پکڑی۔ اتفاق ایسے ہوا کہ ایک موڑ مڑے تو سامنے یورپی پارلیمنٹ کی شیشے کی بنی ہوئی عمارت آ گئی رشید قیصرانی یاد آ گیا۔ ایک عمر جستجو میں گزاری تو یہ کھلا۔ وہ میرے پاس تھا میں جسے ڈھونڈ تا رہا۔

بس ایک موڑ کا فاصلہ تھا۔ اترے۔ سیکریٹریٹ کی عمارت کے اندر جانا چاہا تو معلوم ہوا کہ پہلے سے وقت لینا پڑتا ہے۔ سامنے سارے ملکوں کے جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف دریا کا کنارہ ہے دوسری جانب سبزہ زار ہے۔ خوب صورت جگہ ان لوگوں نے چن رکھی ہے۔ پارلیمنٹ کی نئی عمارت بن رہی ہے اور تقریباً مکمل ہے۔ یہ عمارت شیشہ کی بنی ہوئی لگتی ہے۔ یعنی اس میں باہر کا سارا حصہ شیشے کا ہے، شیشہ کیا فائبر گلاس ہوگا۔ چمکتی دمکتی گول عمارت ہے۔ قریب بہتے ہوئے دریا کے پانی میں اس کا عکس بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے کہا اس عمارت کے لئے یورپ والوں نے میٹیریل خوب چنا ہے کیونکہ شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر نہیں پھینکے جا سکتے اس لئے ممبر ممالک کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جسے دوسرے سنگ زنی سے تعبیر کریں۔ پچھلے دنوں یورپی یونین کا جو وفد چیچنیا کے مسئلہ کا جائزہ لینے کے لئے روس گیا اس کا جو حشر ہوا وہ سب کے سامنے ہے اس پارلیمنٹ میں ایسی ہی قانون سازیاں ہوں گی جو کسی کی طبع نازک پر گراں نہ گزریں۔ یہ عمارت دیکھنے کے بعد سٹراسبرگ میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی اس لئے واپس ہائی وے پر آئے اور الٹی سمت میں ہائی وے پر چڑھ گئے۔ جب کوئی پچیس تیس کلومیٹر سفر کر چکے تو نشان راہ نظر آیا۔ لکھا تھا پیرس چھ سو کلومیٹر! اب کیا ہو؟ مزید دس بارہ کلومیٹر جانا پڑا تب باہر نکلنے کی سبیل ہوئی۔ دوسری جانب سے اسی ہائی وے پر دوبارہ روانہ ہوئے اور کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے سفر کے بعد اپنی صحیح منزل کی جانب گامزن ہوئے۔ رستہ میں رکے۔ کافی وغیرہ پی اور تازہ دم ہو کر جرمنی کی سرحد میں داخل ہوئے فرائی برگ تک پہنچتے تھکاوٹ بہت ہو گئی

تھی معاذ اللہ کا خیال تھا ہمیں مزید ایک دو قابل دید مقامات کا سفر کرنا چاہیے جن کی گنجائش وقت کے لحاظ سے موجود تھی مگر ہم نے ہتھیار ڈال دیئے کہ ہماری توانائی میں گنجائش نہیں۔ ہمیں ڈاکٹر نے بڑی اچھی ہدایت کر رکھی ہے کہ ''کسی صورت میں بدن کی آواز کو نظر انداز نہ کرو'' یعنی جسم کہے کہ تھک گیا ہوں تو اس کو مزید مت آزماؤ۔ گھر واپس آئے۔ اگلے روز گاؤں کے مئیر صاحب نے از راہ بندہ پروری ہمیں ملاقات کے لئے وقت دیا۔ ان سے ملے، بھلے آدمی تھے۔ انگریزی کا ایک حرف نہیں جانتے تھے۔ نہیں یہ بات ہم نے غلط کہی۔ انہوں نے دو لفظ انگریزی کے بھی بولے تھے۔ ابتداء میں ویلکم کہا تھا اور رخصت ہوتے ہوئے تھینک یو۔ ان سے ملے۔ تصویر کھینچوائی کہ یادگار رہے اور اپنی دانست میں اس گاؤں سے رخصت ہونے کے انتظامات مکمل کر لئے۔ اگلے روز ہمیں فرینکفرٹ واپس جانا تھا۔ معاذ اللہ تو ہمیں واپس ''گھر'' تک پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر ہم نے کہا نہیں بس بہت ہو چکی اب یہاں سے انٹرسٹی ایکسپریس میں بٹھاؤ۔ فرینکفرٹ تک تین گھنٹے جانے کی اور تین گھنٹے واپس آنے کی ڈرائیو کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے اصرار پر وہ مان گیا۔ چنانچہ ہم نے اس کے ساتھ قریب کے ریلوے اسٹیشن پر جا کر ریزرویشن کروائی اور اسٹیشن سے ہی عزیزی عرفان احمد خاں کو اپنی آمد کے وقت سے مطلع کیا تا کہ وہ اسٹیشن سے ہمیں وصول کر کے واپس شکیل کے گھر پہنچا دے جہاں ہم نے چھاؤنی چھا رکھی تھی یعنی نہ صرف یہ کہ خود وہاں ٹھہرے تھے بلکہ ہمارے مہمان بھی اسی گھر میں ٹھہرتے اور مبشرہ کی مہمان نوازی سے متمتع ہوتے تھے۔

گاڑی کا وقت ہوا تو دیکھا کہ معاذ اللہ اپنی زمینداروں والی ڈانگری پہنے کھڑا ہے اور ساجدہ بی بی ڈرائیور بنی کھڑی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ہم نے درمیان میں نیند کی جھپکی لی تھی تو اس دوران دونوں میاں بیوی اپنے کھیتوں کی جانب نکل گئے تھے اور اب ساجدہ ڈرائیو کریں گی تا کہ واپس آ کر میاں صاحب

اپنے کام میں جت جائیں۔ساجدہ نے ہمیں فرائی برگ اسٹیشن تک پہنچایا۔معاذ اللہ اسی لباس میں ہمارے ساتھ تھا۔جب تک گاڑی میں ہمیں سوار نہ کروالیا ساتھ کھڑا رہا اور ساجدہ بیچاری باہر گاڑی میں بیٹھی انتظار کرتی رہیں کیونکہ پارکنگ کا مسئلہ یہاں بھی بدستور تھا۔اللہ ان کو جزائے خیر دے۔میاں بیوی اور ان کے بچوں نے ہماری خاطر داری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔فجز اھم اللہ احسن الجزاء۔

انٹرسٹی ایکسپریس نے دو گھنٹے اور کچھ منٹ میں ہمیں فرینکفرٹ لا اتارا۔ہمیں یورپ کے ریلوے سٹیشنوں پر اس بات پر ہمیشہ حیرت ہوتی ہے کہ سامان اٹھانے والی ٹرالیوں کو حاصل کرنے کے لئے سکے ڈالنے پڑتے ہیں۔اب مسافر کے پاس سکے نہ ہوں تو کیا کرے؟ائیر پورٹوں والے اتنے مہربان ہیں کہ وہاں ٹرالیاں عام اور مفت دستیاب ہوتی ہیں۔(بات پرانی ہوئی اب ائیر پورٹ والے بھی ریلوے والوں کی طرح چالاک ہو گئے ہیں) ریلوے والوں میں اتنی سوجھ بوجھ نہیں ہے یا ضرورت سے زیادہ سمجھدار ہیں کہ ہر مسافر کو ہمارے ملک کے سکے ضرور جیب میں رکھنے چاہئیں!اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عزیزی عرفان احمد خاں کو ہمارا سامان بڑی دور تک اٹھا کر لانا پڑا مگر آفرین ہے کہ ماتھے پر شکن نہیں پڑی ورنہ اتنا تو پوچھ ہی سکتا تھا کہ اتنے سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر اسے اندازہ تھا کہ ہمارے سامان میں سامان کم اور کتابیں زیادہ ہوتی ہیں۔وہ اس لئے ہم جہاں جائیں کتابوں کی دکانیں جھانکتے پھرتے ہیں فرینکفرٹ پہنچے تو اپنے پوتے سے رابطہ ہو گیا۔شام کو وہ اپنی دلہن کو لے کر آ گیا ہم نے دس برس کے بعد اسے دیکھا تھا۔ماشاء اللہ شاندار نوجوان نکلا ہے۔اس کی دلہن طاہرہ بھی ماشاء اللہ دسیوں انگلیاں دسیوں چراغ!اللہ انہیں زندگی دے۔اگلے روز ہم ان کے ہاں گئے۔ایک وقت کا کھانا کھایا اور دعائیں دیتے ہوئے کہ اللہ گھر بسائے رکھے اور خوشیوں سے معمور رکھے۔شام کو

ہمیں حلقۂ ارباب ذوق والوں نے بلا رکھا تھا مگر ہم نے معذرت کر دی تھی۔ اب عرفان احمد آڑے آ گیا کہ وہ ہماری جانب سے دعوت قبول کر چکا ہے اس لئے جانا چاہیے۔ چنانچہ گئے۔ پاکستانی قونصل خانہ والوں نے انہیں اپنا کمرہ اجلاس کے لئے دے رکھا تھا۔ گنے چنے چند اہل ذوق تھے۔ کارروائی کم باتیں زیادہ ہوئیں۔ بہر حال اہل ذوق سے مل کر خوشی ہوئی۔ اجلاس کے بعد بھائی مسعود احمد خاں دہلوی کے ہاں حاضری دی اور ان کی قلعۂ معلیٰ کی زبان کے مزے لئے۔ میاں عبدالسمیع نون صاحب سے ملاقات نہ ہو سکنے کا دکھ ہے۔ صرف فون پر ''اے لوٗ'' ''ہے لوٗ'' ہوئی۔ بہر حال چودہ روز کے اس سفر کے بعد اگلی صبح فرینکفرٹ سے لندن اور لندن سے سٹاک ہالم پہنچ گئے۔ غالب نے کہا تھا۔ ''ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے۔'' ہم اس میں تحریف کے مرتکب ہو رہے ہیں سفر تمام ہوا پر تھکان باقی ہے!

ذرا اوسلو تک

سکینڈے نیویا کے سارے ملک ہی خوب صورت ہیں مگر ناروے اپنے پہاڑوں، سمندروں، فورڈوں، برفوں اور آدھی رات کے سورج کی وجہ سے دنیا میں منفرد ہے۔ نارتھ پول کا وہ حصہ جس پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا ناروے ہی میں ہے۔ اگرچہ سویڈن کو بھی حصہ رسدی خورشید نصف شب میں سے کچھ نہ کچھ ملا ہے مگر ''نورد کیپ'' کا وہ مخصوص علاقہ ناروے کی تخصیص ہے اس لئے ناروے سکینڈے نیویا کے دیگر ممالک سے ''مزید'' خوب صورت ہے۔ اس تخصیص میں ایک اور اضافہ ہونے والا ہے یعنی دنیا کے شمال ترین علاقہ میں خدا کا جو گھر تعمیر ہوگا وہ یہیں نورد کیپ میں ہوگا اور اس کی تعمیر کا سہرا جماعت احمدیہ کے سر بندھے گا۔ اپسالا میں مسجد تعمیر ہوئی تو اس بات کا بہت چرچا کیا گیا کہ یہ مسجد نارتھ پول کے قریب ترین علاقہ کی مسجد ہے مگر نورد کیپ میں جو اللہ کا گھر بنے گا وہ فی الحقیقت

نارتھ پول کے عین وسط میں بنے گا۔زمین خریدی جا چکی ہے نقشہ بن رہا ہے کوئی دن کی بات ہے کہ اس علاقہ میں اللہ کا نام پانچ وقت بلند ہوا کرے گا۔نارتھ پول پر پہلی اذان بھی جماعت احمدیہ ہی نے دی تھی جب چند برس قبل حضرت امام جماعت احمدیہ نورد کیپ تشریف لے گئے تھے اور وہاں جمعہ پڑھایا تھا۔

''فورڈ'' اصطلاح میں اس منظر کو کہتے ہیں جہاں سمندر دور تک پہاڑوں کے اندر تک گھستا چلا گیا ہو اور یوں محسوس ہو جیسے سمندر پہاڑوں میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔ایسے مقامات پر سمندر کا پانی بھی بہت پرسکون ہو جاتا ہے کیونکہ باہر کے کھلے سمندر کا جوار بھاٹا یہاں تک نہیں پہنچتا۔یہ فورڈز بہت صحت افزا مقام سمجھے جاتے ہیں جن پر پہاڑوں اور سمندروں کا موسم یکساں اثر انداز ہوتا ہے۔بھلے زمانوں میں جرمنی کے قیصر ولیم ناروے کے فورڈز ہی میں آکر اپنا شاہی یاچ Yacht یعنی جہاز لنگر انداز کرتے اور سیر سے لطف اندوز ہوتے تھے۔قبلہ چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں صاحب نے تحدثِ نعمت میں قیصر ولیم ثانی کے یاچ کے ''سوگن فورڈ'' میں لنگر انداز ہونے اور قیصر ولیم سے آمنا سامنا ہونے کا ذکر کیا ہے۔ سویڈن سے جاتے ہوئے ہم ایک ایسے ہی فورڈ سے گزرے وہاں سمندر دو پہاڑوں کے اندر اتنا محصور ہے کہ چھوٹا سا دریا لگتا ہے۔اس مقام پر ناروے والوں نے جرمنی کے بحری بیڑے کو اپنی توپوں کی زد پر رکھ لیا تھا اور اس بیڑے کے لئے آگے بڑھنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ہم نے ذرا سی دیر کو رک کر ان توپوں کے آثار دیکھے جو ناروے والوں نے یادگار کے طور پر محفوظ کر رکھے ہیں۔

باہر کے بادشاہ تو یہاں کے فورڈوں میں سیر و تفریح کے لئے آتے تھے خود یہاں کے بادشاہ کے بارے میں مشہور ہے کہ بہت سادہ تھے۔سیر کے لئے اپنے شہر کے عام باغ میں جا بیٹھتے تھے۔ایک بار ہمارے برصغیر کا کوئی بڑا آدمی سرکاری سفر پر ناروے آیا تو یہ لوگ اسے اسی باغ کی سیر کروانے کے

لئے لے گئے۔ وہ بہت سیخ پا ہوا اور کہنے لگا مجھے کسی خاص جگہ کی سیر کرواؤ جہاں تمہارے بادشاہ اور شہزادے جاتے ہوں۔ آخر ہم بھی تو تمہیں تاریخی محلات اور باغوں کی سیر کرواتے ہیں۔ میزبانوں نے کہا ہم نے تو ماحضر پیش کر دیا وہ دیکھیں سامنے ایک بوڑھا بیٹھا ہے۔ کہنے لگے ہاں بیٹھا ہے اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں وہاں لے کر چلو جہاں فقیر نہیں جاتے بادشاہ جاتے ہیں۔ میزبان نے کہا یہ جو بوڑھا آپ کے سامنے بینچ پر بیٹھا ہے یہ اتفاق سے ہمارا بادشاہ ہے۔ وہ صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ یہاں اپسالا میں بھی ہم نے ایک روز دیکھا کہ پرانے قلعہ کے سامنے سڑک کے کنارے ایک جوڑا ٹہل رہا ہے لوگ باگ بڑے جوش خروش سے ہاتھ ہلاتے ان کے پاس سے گزر رہے ہیں۔ معلوم ہوا ہمارے سویڈن کے بادشاہ سلامت اور ملکہ چہل قدمی فرما رہے ہیں۔ حفاظتی انتظامات ہوں گے ہمیں تو نظر نہیں آئے حالانکہ اسی سادہ زندگی کی وجہ سے سویڈن والے اپنا ایک وزیر اعظم قتل کروا بیٹھے تھے۔ اولف پالمے سوشل ڈیموکریٹ وزیر اعظم تھے اور عام عوام میں بہت مقبول تھے۔ ایک روز سینما سے رات کو فلم دیکھ کر نکلے اور بیوی کا ہاتھ پکڑ کر پیدل ہی اپنے گھر کی جانب رواں دواں ہو گئے۔ بڑی سڑک پر پہنچے تو قاتل نے انہیں گولی کا نشانہ بنا دیا آج تک ان کے قتل کا معمہ حل نہیں ہوا۔ ہم فورڈوں کے ذکر سے چلے تو کہیں کے کہیں نکل گئے باگ موڑ کر واپس اپنے مضمون کی طرف آ رہے ہیں۔

ہم دس سال سے سکینڈے نیویا میں بیٹھے ہیں مگر اوسلو تک صرف دو بار گئے ہیں۔ دونوں بار اپنے شاگرد اور ٹی آئی کالج کے اولڈ بوائے سعید انجم کی دعوت پر۔ ایک بار اس کی زندگی میں دوسری بار اس کے مرنے پر۔ یہی زندگی کا کاروبار ہے۔ پہلی بار واپس آ کر جی چاہا کہ اوسلو کا سفرنامہ لکھیں مگر کچھ ایسی مکروہات حائل ہوئیں کہ موقع نہ ملا۔ وقت گزر گیا تو ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ مشتے کہ بعد از جنگ والا سلسلہ نہ ہو تو بہتر ہے۔ اس لئے کچھ نہ لکھا۔ اس کے بعد باوجود خواہش کے اوسلو تک جانا نہ ہو سکا تا

آنکہ سعید انجم کی وفات کا حادثہ پیش آ گیا۔ وہ جانہار خود بھی اوسلو سے باہر کوپن ہیگن میں راہیٔ عدم ہوا مگر اس کی تدفین کے لئے تو ہمیں جانا ہی تھا۔ مٹھیوں میں خاک بھر کر دوست آئے بہر دفن۔ زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے۔

پہلی بار اوسلو گئے تو ایک مشاعرہ کی دعوت پر گئے مگر سعید انجم کے ہاں قیام کیا کہ اصل مقصد اس سے ملاقات تھا سعید جدید افسانہ نگاروں میں منفرد تھا علامتی افسانہ میں تو اس نے ایسا کمال حاصل کیا کہ اس کا افسانہ ''نیک بندوں کا زیور'' اردو کا بہترین علامتی افسانہ شمار کیا جاتا ہے۔ ہم سائیں سچا کے ساتھ اس کی فیملی کے ساتھ گئے تھے فیملی کا قیام کہیں اور تھا سعید کے ہاں ہم تھے اور سائیں سچا کہ کچھ وقت ادب کی باتوں میں گزار سکیں۔ اگلے روز مشاعرہ پڑھا تو اجنبیوں کی طرح پڑھا کیونکہ میزبان ہمیں پہچاننے سے انکاری تھے۔ البتہ انور مسعود اور عطاالحق قاسمی بہت حیران ہوئے کہ ہم سکینڈے نیویا میں رہتے ہیں اور اوسلو والے ہمیں نہیں جانتے پہچانتے۔ اگرچہ عطاالحق قاسمی ناروے میں پاکستان کے سفیر بن کر آ گئے تو انہیں بھی ہمیں پہچاننے میں وقت ہونے لگی۔ اب کے برس برمنگھم میں ان سے ملاقات ہوئی تو آپ نے خوب پہچانا۔ ہم نے کہا دونوں کی بہتری اسی میں ہے جان پہچان تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جو جانے پہچانے ہوں اپنے شعروں کی وجہ سے یا اپنی پی آر کی وجہ سے۔ ہم دونوں باتوں سے محروم و نابلد ہیں۔ اب سعید کی وفات پر جانا ہوا تو سب لوگوں نے پہچان لیا بلکہ منتظمین مشاعرہ نے چار سال پہلے نہ پہچاننے پر معذرت بھی کی کہ افسوس ہے کہ ہم آپ کی قدر افزائی نہ کر سکے۔ ہم نے کہا بہت شکریہ کہ چار سال بعد آپ نے پہچان لیا نہ پہچانتے تو ہم آپ کا کیا بگاڑ لیتے؟ فرق صرف یہ تھا کہ اس موقعہ پر ہم ان کے مہمان نہیں تھے فہیم شاہ کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور انہیں ہم سے کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ خطرہ؟ جی یہ لفظ ہم نے یونہی استعمال نہیں کیا۔ مغرب میں جو لوگ مشاعرے پڑھنے

آتے ہیں یا بلائے جاتے ہیں بسا اوقات وہ منتظمین کے لئے بلائے بے درماں بن جاتے ہیں۔ دو تین برس پہلے لندن میں تو باقاعدہ ایسا حادثہ ہو گیا کہ اردو کے دو بڑے شعرا کو منتظمین نے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا اور ایک معین وقت تک ان کے ہوٹل کا سارا خرچ بھی ہوٹل والوں کو ادا کر دیا۔ شعرا کو ان کا مقررہ معاوضہ بھی ادا کر دیا۔ اب شعرا پانچ ستاروں والے ہوٹل میں قیام فرما تھے اور ہر دوسرے شخص کی دعوت قبول کر کے مشاعرے پڑھتے دعوتیں اڑاتے اور معاوضے وصول فرماتے رہتے تھے۔ جب میعاد سے زائد قیام کے بعد ہوٹل سے جانے لگے تو ہوٹل والوں نے کرایہ طلب کیا تو شعرا ہکا بکا ان کا منہ دیکھنے لگے۔ منتظمین سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے فلاں تاریخ تک کرایہ اور معاوضہ ادا کر دیا تھا اور بتا دیا تھا کہ اس وقت کے بعد آپ ٹھہرنا چاہیں تو اپنے خرچ پر ٹھہر سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم تو سبک دوش ہو چکے ہیں۔ شعرا نے کہ پاکستان کے نمائندہ اور مشہور شاعر ہوتے ہیں بہت واویلا کیا کہ ہمیں تو اتنا معاوضہ بھی نہیں ملا جتنا کرایہ آپ لوگ مانگ رہے ہیں۔ وہ تو خدا بھلا کرے پاکستان کے ہائی کمشنر کا کہ وہ آڑے آئے اور شعرا کا بل سفارت خانے کے ہنگامی فنڈ سے ادا کر کے ان بزرگوں کی جان چھڑائی۔ اخباروں میں اس بات پر بڑا فضیحتا ہوا۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ اب شعرا کو لوگ بلانے سے اباء کرنے لگے۔ ان باتوں سے ہم نے خوب عبرت پکڑ رکھی ہے۔ مشاعروں میں تو مارے باندھے جانا پڑتا ہے کیونکہ گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است۔ لوگوں کو بڑے شاعر نہیں ملتے تو ہم جیسے بھس پر گزارا کرتے ہیں مگر اس کے علاوہ ہمارے شاگردوں کا اپنا ذوق ہے جو ہمیں دور دراز کے علاقوں تک بلاتے اور جی کڑا کر کے ہمارا ''کلام بلاغت نظام'' سنتے بھی ہیں۔ اسی لئے ہم باہر کے حلقوں میں جانے سے گریز کرتے ہیں۔ دعوتیں تو بہت آتی ہیں مگر ہم پیشہ ور شاعروں کی طرح ہر مشاعرہ میں کودنہیں پڑتے سال میں ایک دو مشاعرے پڑھ لیں تو ہماری حرص پوری ہو جاتی ہے کہ یہی

رفتار ہماری شاعری کی ہے۔دو یا حد تین غزلیں سالانہ۔

پہلی بار اوسلو گئے تو سعید نے اپنی بساط کے مطابق ہمیں خوب خوب سیر کروائی اوسلو ایسا شہر ہے جو پہاڑوں پر اور وادیوں میں آباد ہے اونچ نیچ اور اتار چڑھاؤ یہاں بہت ہے۔ہم نے دوسرے دن ہی اعلان کر دیا کہ بس بھر پائے ہم ایسے شہر میں نہیں رہ سکتے جہاں آدمی پیادہ پا چل ہی نہ سکے۔ چار گز زمین بھی سیدھی اور ہموار نہیں۔ ہم ہیں کہ چہل قدمی کے بغیر ہمارا گزارا نہیں۔ نہ چلیں تو محاورہ کے مطابق بھی اور ویسے بھی ہمارا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ذیابیطس کے اور دل کے مارے ہوئے ہیں دونوں بیماریوں کا بہترین پرہیز اور علاج پیدل چلنے میں مضمر ہے اس لئے پیدل چلتے ہیں اور اپسالا میں بھی انتظار حسین کی زبان میں پا پیادہ ٹخ ٹخ کرتے پھرتے ہیں۔پچھلے دنوں ہمارے سویڈش دوست شاعر لارش بیکسٹروم کی پچھترویں سالگرہ پر اخبار میں ایک مضمون چھپا تھا اس کا عنوان تھا ''سائیکل پر شہر گردی کرنے والا شاعر۔'' ہمیں یقین ہے کہ اگر اپسالا کے کسی رہنے والے نے ہمارے مرنے یا جینے پر کوئی مضمون لکھا تو اس کا عنوان ہوگا ''پا پیادہ چلنے والا پروفیسر''۔بس یوں سمجھئے کہ اوسلو ہمارے مزاج کا شہر نہیں ہے۔

اب کی بار جانے سے پہلے ہم نے سید فہیم شاہ سے کہہ دیا کہ ہم اس کے ہاں ٹھہریں گے کیونکہ سعید کے ہاں تو ٹھہرنے کا موقع نہیں۔تعزیت کے لئے آنے والوں کا ہجوم ہوگا اور ہمارے اعصاب ہجوم کا دباؤ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔اس کی آخری رسومات میں شرکت کریں گے مگر قیام ایسی جگہ رکھیں گے جہاں پر آرام میسر ہو۔رشید اس کا بھائی ہمارا دوست ہے۔نعیم برادر خورد ہمارا شاگرد ہے مگر ہمارا اندازہ صحیح تھا کہ دونوں تعزیت کرنے والوں کے ساتھ اور تجہیز وتدفین کے انتظامات میں مصروف ہوں گے انہیں تکلیف دینا مناسب نہیں۔ ہم لوگ کار کے ذریعہ کوئی چھ گھنٹے کا سفر کر کے گئے تھے

تعزیت کے فرض سے ادا ہوئے سعید کی بیوی طلعت سے تعزیت کی بچوں یاسر اور حنا کو پیار کیا۔ اتنے میں ہمارے طے شدہ پروگرام کے مطابق فہیم ہمیں اپنے گھر لے آیا۔ اگلے روز اس کی تدفین میں شریک ہوئے اور یوں اس منفرد صاحب اسلوب افسانہ نگار کو مٹی میں دفن کر آئے۔ جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے۔

فہیم شاہ نے ماشاء اللہ داڑھی ترک اور توند چھوڑ رکھی ہے۔ ''فارغ البال'' بھی حد سے سوا ہے مگر الحمد للہ کہ طبیعت میں مزاح اور بردباری بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح کالج کے اور ہمارے پڑوس کے زمانہ میں تھی۔ بیوی اس کی ہمارے قادیان کی بوٹی ہے۔ اس کے ابا اب بھی وہاں درویش ہیں۔ یہ بوٹی کا لفظ ہم نے اس لئے استعمال کیا کہ فہیم کے والد قبلہ سید عبداللہ شاہ صاحب کلر سیداں کے رہنے والے تھے ہمارا آبائی وطن بھی پوٹھوہار ہے اس لئے قبلہ محترم شاہ صاحب جہاں ملتے جب ملتے یہی فرماتے تھے کہ تم ہمارے ''وطناں دی بوٹی ہو'' اس لئے ہمیں پیارے ہو۔ روفی ہمارے ''وطناں دی بوٹی'' ہے اس لئے ہمیں اور بھی اچھی لگی۔ اس نے خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اللہ اسے جزا دے۔ موقع سیر کا تھا نہ مشاعروں کا مگر دونوں کی دعوتیں پے بہ پے آنے لگیں۔ ہم نے مشاعروں سے تو سختی سے انکار کر دیا مگر سیر کی دعوت کو رد نہ کیا صرف اتنی شرط لگائی کہ جو بھی سیر کے لئے اوسلو سے باہر لے کر نکلے وہ پہلے درامن لے کر چلے کہ وہاں بھی ہماری ربوہ کی ایک بیٹی بچاری حال ہی میں اپنے شوہر کی وفات کے حادثہ سے دوچار ہوئی ہے اس سے ٹیلیفون پر تو ہم تعزیت کر چکے تھے مگر ناروے میں آ کر اس کے گھر نہ جانا ہمیں اچھا نہ لگا وہاں پہنچے تو نبیلہ نے پہلی بات ہی یہ کہی کہ میں اس انتظار میں تھی کہ آپ میرے ہاں تعزیت کے لئے کب آئیں گے؟ اگر آپ میرے ہاں آئے بغیر چلے جاتے تو مجھے بہت دکھ ہوتا۔ ہم نے اس سے کہا بیٹی ہم یورپ میں آ تو گئے ہیں مگر ابھی اتنے

یورپین نہیں ہوئے کہ اپنے کلچر کے سب قرینے بھول جائیں۔اس بچی کے میاں فوزی صاحب سے ہمارا تعارف نہ تھا مگر بیٹی تو اپنی ہی تھی اس کے ہاں کیسے نہ جاتے؟ ہاں درامن جانے سے پہلے فوزی صاحب کی قبر پر فاتحہ کے لئے حاضری دے کر گئے تھے۔نبیلہ رفیق ہمارے بزرگ ڈاکٹر بشیر احمد صاحب ایم سی کی بیٹی ہے۔ایم سی سے یاد آیا کہ ایک بار ایک سینئر فوجی افسر ربوہ تشریف لائے ہوئے تھے۔گول بازار سے گزرتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ ایک کلینک پر کتبہ ڈاکٹر بشیر احمد ایم سی لکھا ہوا ہے۔رک گئے کہنے لگے یہ کون ڈاکٹر ہیں؟ مجھے ان سے ملواؤ۔اندر گئے تو ڈاکٹر صاحب کو انہوں نے باقاعدہ ملٹری والا سلیوٹ کیا حالانکہ خود حاضر سروس بریگیڈیئر تھے۔کہنے لگے تمہیں معلوم ہے یہ ایم سی کیا ہوتا ہے؟ ہم نے کہا نہیں۔فرمایا یہ ملٹری کراس کا مخفف ہے اور بہادری کا تمغہ ہے۔صرف اس شخص کو انگریز دیتے تھے جس نے جان جوکھوں میں ڈال کر کوئی نمایاں کام کیا ہو۔لو، ہم تو سمجھے ہوئے تھے کہ یہ کوئی ڈاکٹری ڈپلومہ ہوگا اب معلوم ہوا کہ ہمارے ڈاکٹر صاحب تو باقاعدہ تمغہ یافتہ ڈاکٹر ہیں۔تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد۔ڈاکٹر صاحب پہلے قادیان میں درویشوں کی خدمت کرتے رہے پھر ربوہ میں اہالیان ربوہ کی خدمت کرتے کرتے وہیں پیوند خاک ہوئے۔

درامن اوسلو کے نواح کا شہر ہے کوئی پچاس ساٹھ کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔سعید کے ساتھ ہم درامن کی مشہور زمانہ SPIRAL یعنی پہاڑ کے اندر بنی ہوئی وہ سرنگ جو اندر ہی اندر بل کھاتی پہاڑ کی چوٹی پر جانکلتی ہے دیکھ چکے تھے۔جس طرح گلہری درخت پر چڑھے تو سیدھی نہیں چڑھتی۔درخت کے گرداگرد چکرا لگا کر اوپر چڑھتی ہے درامن والوں نے یہ جدت روا رکھی ہے کہ بجائے باہر سڑک تعمیر کرنے کے پہاڑ کے اندر بل کھاتی سرنگ تعمیر کر رکھی ہے ہم اس سرنگ کو ایک بار دیکھ چکے تھے اس لئے ہم نے قدم آگے بڑھائے۔ اسلام صاحب ہمارے رہنما بھی تھے اور کار چلانے والے بھی۔فہیم اور

میں محض مسافر اور تماشائی تھے ہم نے اسلام صاحب کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ جہاں چاہیں لے جائیں۔

درامن سے آگے بڑھے اور طویل وعریض جھیل کے گرداگرد لمبا چکر کاٹ کر اس مقام پر آ گئے جہاں پہاڑ کی چوٹی سے لوگ پیراشوٹ جمپ کرتے ہیں۔ سردیوں میں یہی پہاڑ سکی والوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور وہ پہاڑ کی چوٹی سے سکی کرتے کرتے جھیل کی ترائی تک اترتے اور زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ چلنے سے پہلے روفی نے آلوؤں والے پراٹھے بنا کر ساتھ کر دیئے تھے کہ جہاں بھوک لگے ان سے دو دو ہاتھ کر لیں چنانچہ جھیل کے خوب صورت کونے پر پہاڑ کے عین دامن میں پانی کے کنارے بیٹھ کر کافی لی اور پراٹھوں سے حظ اٹھایا۔ بھوک چمکی ہوئی تھی سامنے جھیل میں راج ہنسوں کے جوڑے تیر رہے تھے اوپر سروں پر رنگ برنگے پیراشوٹ منڈلا رہے تھے موسم بھی اللہ کے فضل سے بہت خوش گوار تھا۔ بہت لطف آیا پیٹ پوجا کے بعد پہاڑ پر چڑھنے کی ٹھانی۔ آگے ایک ٹال سپاٹ تھا یعنی اوپر جانے سے پہلے اس سڑک والوں کو نذرانہ دینا تھا۔ دیکھا کہ کوئی آدمی وہاں متعین نہیں۔ اترے آگے فارم پڑے تھے اور پلاسٹک کے لفافے۔ ایک بکس تھا لکھا تھا فارم پر اپنی گاڑی کا نمبر لکھئے اور ٹول کی فیس اس لفافے میں ڈال کر بکس میں ڈال دیجئے۔ شکریہ۔ ہم نے فارم پر کیا فیس کے پیسے اس لفافے میں ڈال کر بکس میں ڈال دیئے اور اوپر چڑھنے لگے۔ سڑک چھوٹی تھی۔ راستہ خطرناک بھی تھا خوب صورت بھی۔ مڑتے بل کھاتے پہاڑ کی چوٹی کا رخ کیا ایک ذرا سی جگہ پارکنگ کی ملی تو رک گئے اور پیراشوٹ والوں کو دیکھنے لگے۔ جو بڑے مزے سے فضاؤں میں تیر رہے تھے اور درختوں میں الجھنے سے بچتے بچاتے پھر رہے تھے ہمارے رہنما اسلام صاحب بڑے خطر پسند نکلے۔ جہاں ہم کھڑے ہوئے تھے وہاں جنگلے سے باہر صرف پاؤں ٹکانے کی جگہ ہے ورنہ نیچے تک

عمودی چٹان ہے اگر خدانخواستہ ذرا پاؤں پھسلے تو آدمی نیچے تک گرتا چلا جائے اور اس کا انجر پنجر بکھر جائے۔ مگر اسلام صاحب فہیم سے اصرار کرنے لگے کہ میں اس ذرا سی جگہ میں پاؤں ٹکا کر کھڑا ہوتا ہوں آپ تصویر کھینچیں فہیم تصویر کھینچتے ہوئے ڈر رہا تھا مگر اسلام صاحب تصویر کھنچواتے ہوئے نہ ڈرے۔ ہم نے یہی اندازہ لگایا کہ یہ جو ہر جگہ اور ہر وقت ''اسلام خطرے میں ہے'' کا نعرہ لگتا ہے یہ شاید ''اسلام'' کی فطرت میں ودیعت ہے کہ ہر وقت خطرے ہی میں رہتا ہے اور خطر پسند ہے۔ خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں۔ وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد۔ ہم تو سمجھے تھے اسلام صاحب نام کے ''اسلام'' ہیں وہ تو فی الحقیقت اسم با مسمیٰ نکلے۔

پیراشوٹ رنگ برنگے تھے ایک دو پیراشوٹ سویڈن کے جھنڈے کے رنگ کے تھے یعنی زرد اور نیلے جو یقیناً سویڈش پیراشوٹر ہوں گے۔ کچھ دیر رک کر ان کا نظارہ کیا۔ آگے بڑھے تو وہ جگہ آ گئی جہاں سے پیراشوٹ والے چھلانگ لگاتے تھے۔ دیکھا کہ دو تین پیراشوٹر قطار میں کھڑے ہیں۔ پیراشوٹ کا سارا پیرافرنیلیا تیار ہے صرف دو قدم بھاگنے اور پیراشوٹ کھولنے کی کسر ہے وہ فضا میں تیرنے لگتے ہیں۔ یہ نظارہ بڑا دلچسپ تھا کچھ دیر رک کر دیکھتے رہے اور پیراشوٹروں کو فضاؤں میں تیرتے اور پھر دور نیچے صاف جگہ پر میدانوں میں اترتے دیکھتے رہے کیسا خطرناک کھیل ہے مگر خطروں سے مردانہ وار ٹکرانا ہی تو زندگی ہے۔ آگے چلے تو سڑک ایک موٹل میں گھس گئی معلوم ہوا یہ مہنگا موٹل نئے شادی شدہ جوڑوں کے ہنی مون کا مقام ہے۔ وہ لوگ دنیا سے دور پہاڑ کے اوپر آ جاتے ہیں جہاں بہ قول اقبال ''دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو''۔ یہاں دامن کوہ کی بجائے کلۂ کوہ تھا اور جھونپڑے کی بجائے اچھا خاصا پانچ ستاروں والا ہوٹل۔ دوست لواحقین دولہا دلہن کو یہاں تک چھوڑنے آتے ہیں دعوت میں کھاتے پیتے ہیں اور پھر دونوں کو پہاڑ سے نیچے اتر جاتے ہیں کہ لو اب زندگی کا پہاڑی راستہ

خود طے کرو۔ بِسۡمِ اللّٰہِ مَجۡرٖہَا وَمُرۡسٰہَا۔

ہم واپس اترے۔ پیٹرول اسٹیشن سے پیٹرول لیا۔ اسلام صاحب نے اس اسٹیشن پر کام کرنے والی لڑکی سے شناسائی بگھارنے کی ناکام کوشش کی۔ ہم نے طعنوں پر دھر لیا تو فرمانے لگے میں اسی مقام پر اپنے ابتدائی زمانہ میں رہ چکا ہوں۔ یہ بچی اس وقت بہت چھوٹی تھی اور بھولی بھالی۔ ہم نے کہا اس کی شکل وصورت سے یہی لگتا ہے کہ چھوٹی تو یقیناً ہوگی مگر بھولی والی بات بھول جایئے۔ اتنی بھولی بھی نہیں لگتی۔ چلیے خاموشی ٹوٹنے کی کوئی صورت بھی نکل آئی ورنہ ہم لوگ اس نظارہ سے اتنے متاثر تھے کہ دم بخود بیٹھے تھے۔ واپسی کا سفر ایسے وقت میں شروع ہوا جب سڑکوں پر رش شروع ہو چکا تھا۔ کچھ راستہ بھی پہاڑی تھا اترتی چڑھتی بل کھاتی سڑک کبھی فراز کبھی نشیب۔ ساتھ ساتھ جھیل۔ بائیں طرف پہاڑ کی فصیل۔ چلتے باتیں کرتے ایک ''سرِ راہ شیوسک'' پر رک کے ذرا چائے وائے ہو جائے مگر وہ تو اسلام کے اور فہیم کے دوست نکلے اور مخلص احمدی۔ فرمانے لگے نورد کیپ کے سفر میں میں حضرت صاحب کے قافلہ کے ساتھ بطور باورچی گیا تھا۔ وہاں حضرت صاحب نے قافلہ والوں کی دعوت کی تو فرمانے لگے اب ہم دو باورچی آپ کے لئے کھانا پکائیں گے چنانچہ میں نے اور حضرت صاحب نے مل کر کھانا پکایا۔ یہ سناتے ہوئے ان کی آواز رندھ کر گلے میں اٹک گئی۔ ابھی کچھ دن پہلے حضرت صاحب نے ایم ٹی اے پر اپنی اردو کلاس کو ناروے کی تصویریں دکھاتے ہوئے ایک مقام دکھایا اور فرمایا اس مقام پر یہ جو مکان ہے اس میں ہم لوگ ٹھہرے تھے اور میں نے چوہدری انور حسین صاحب کو دال پکا کر کھلائی تھی۔ وہ ہونٹ چاٹتے رہ گئے تھے کہ اتنی لذیذ دال تو میں نے زندگی میں کبھی نہیں کھائی۔ خیر جملہ معترضہ برطرف۔ ہم ان کے ہاں بیٹھے چائے وغیرہ پی اور پھر واپسی کی راہ پکڑی ہمارے وہاں بیٹھے ہوئے سویڈن کی تین چار کاریں بھی وہاں رکیں اور پھر آگے بڑھ گئیں اس کا مطلب

یہ ہوا کہ وہ لوگ بھی پیرا شوٹ جمپ کے لئے ادھر کا رخ کر رہے تھے وہ جگہ اہل ذوق میں خاصی مقبول لگتی ہے۔

اگلے روز اوسلو کی سب سے مشہور جگہ دیکھنے کا پروگرام تھا یعنی اوسلو کا سکی جمپ۔ ہلال کی شکل کا بنا ہوا یہ سکی جمپ اوسلو کا سب سے مشہور اور سب سے اونچا مقام ہے۔ رات کی تاریکی میں بھی یہ سکی جمپ روشن رہتا ہے اور سردیوں میں تو آباد بھی رہتا ہے مگر ہم ایسے موسم میں گئے تھے کہ سکی کا موسم نہیں تھا۔ بل کھاتی سڑک کے ساتھ ہم بھی بل کھاتے اوپر سکی جمپ تک پہنچ گئے۔ دور سے جو منا سا ہلال لگتا تھا قریب سے ایک عظیم الشان ڈھلوان نظر آیا سکی کرنے والے اس ڈھلوان کے اوپر سے سکی کرتے ہوئے نیچے سامنے بنے ہوئے تالاب میں جا کر گرتے ہیں جو سردیوں میں برف کا میدان بنا ہوتا ہے اور یہ کھیل برفانی کھیلوں میں بہت مشہور کھیل اور تفریح سمجھا جاتا ہے۔ سکی میں تو ہمارے سویڈن والے بھی کسی سے ہٹے نہیں بلکہ سردیوں کے اولمپک کھیلوں میں سکی کی چیمپئن خاتون ہمارے سویڈن ہی کی ہیں۔ سویڈن ہی کی کیا ہمارے اپنے شہر اپسالا ہی کی ہیں۔ یہ سکی جمپ دنیا کا سب سے اونچا سکی جمپ ہے اور اپنی ساخت کے اعتبار سے بھی نرالا۔ دوسرے لوگ بھی چاہیں تو بنا لیں مگر اوسلو جیسی بلندی کہاں سے لائیں اس لئے اہل ذوق اوسلو میں آتے اور اس جمپ سے سکی کرنے کا لطف اٹھاتے ہیں۔ ہم نے سکی تو نہیں کی البتہ اس کے ریستوران میں بیٹھ کر ایک وقت کا کھانا ضرور کھایا اور اوپر سائیڈ ریلنگ پر کھڑے ہو کر فہیم سے سکی جمپ کھیل کے قواعد سنتے رہے مگر اس کا علم بھی محض سماعی ہے عملاً وہ بھی سکی کہاں کرتا ہوگا؟ اس دوران سکول کے بچوں سے لدی پھندی بسیں بھی آئیں۔ بچے اس مقام کی سیر کر کے پھولے نہ سماتے ظاہر ہے واپس جا کر اپنے ہمجولیوں کو دنیا کے مشہور ترین سکی جمپ کی روداد سنائیں گے۔ اتفاق یوں ہے کہ ہم پہلی بار آئے تھے تو سعید باوجود خواہش کے ہمیں سکی جمپ نہ دکھا سکا تھا اب

فہیم اور اسلام نے وہ کسر پوری کر دی۔اس کے بعد ہم اوسلو میں تعمیر ہونے والی مسجد دیکھنے گئے۔اس مسجد کا کافی حصہ بن چکا ہے مگر شاید اسے مکمل ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔یہاں بھی سویڈن کی طرح ہر کام سج دھج اور دھیمے دھیمے ہوتا ہے۔ترت پھرت ہمارے مشرق والوں کے حصہ میں ہی رہ گئی ہے ہاں پری فیبریکیٹڈ یعنی پہلے سے بنے بنائے گھر ہوں تو ان کی تعمیر میں تھوڑا وقت لگتا ہے کہ ہر چیز ایک سائز اور معیار کے مطابق پہلے سے تیار شدہ مل جاتی ہے مگر خاص نقشہ والی عمارتیں وقت لیتی ہیں کیونکہ انہیں رک رک کر قدم بہ قدم چلنا پڑتا ہے۔جمعہ کی نماز مسجد میں پڑھی۔سعید کے گھر الوداعی ملاقات کے لئے گئے۔طلعت اور بچوں کو خدا حافظ کہا اور اگلے روز بس میں بیٹھ گئے۔نہایت آرام دہ بس تھی۔وقت پر چلی وقت پر سٹاک ہالم پہنچایا اور سٹاک ہالم سے ہم ایک گھنٹہ میں واپس اپنے گھر پہنچ گئے۔

اوسلو میں دعوتوں کا موقعہ نہیں تھا اس کے باوجود لوگ دعوتیں دیتے جاتے تھے ہم نے صرف اپنی بے بی یعنی فرزانہ کی دعوت قبول کی وہ بھی اس لئے کہ فرزانہ سے کوئی پینیتیس برس بعد ملاقات ہوئی تھی۔وہ ہمارے قبلہ وکعبہ سید عبداللہ شاہ صاحب کی بیٹی اور ہماری چھوٹی بہن ہے۔شادی کے بعد اپنے میاں نثار شاہ صاحب کے ساتھ ناروے آبسی۔فہیم کے گھر ہمیں ملنے آئی تو ہم حیران رہ گئے۔وہ منی سی بے بی ماشاءاللہ بڑے بڑے بچوں کی ماں بنی ہوئی ہے۔شکل وصورت سے تو اسی طرح معصوم اور پیاری لگی۔طبیعت میں اپنے بڑے بھائی جان یعنی ہمارے یار بوجان سے ملتی ہے اس کا کہا کیسے ٹالتے؟ پھر اپنے بہنوئی نثار شاہ صاحب سے ملاقات کا پہلا موقعہ تھا اور بے بی کے بچوں سے ملنے کا بھی اس نے دعوت میں بڑا تکلف روا رکھا تھا۔اللہ اسے خوش رکھے۔دوسری بہنوں شاہدہ کی بیٹی اور راشدہ کا بیٹا دونوں آپس میں بیاہے ہوئے ہیں وہ بھی اس دعوت میں آ گئے اس طرح قبلہ شاہ جی عبداللہ شاہ صاحب کا ناروے کا سارا خاندان اکٹھا ہو گیا۔ایسی یکجائی بہت غنیمت ہوتی ہے پھر یا قسمت یا

نصیب۔ بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا۔غنیمت ہے کہ ہم ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں۔اب واپس گھر آ بیٹھے ہیں توفہیم اور روفی کے چھوٹے چھوٹے بچے یاد آ رہے ہیں۔عدنان اور صائمہ۔اس کی بیٹی تو ہماری نواسی جیسی موٹی تازی اور گول مٹول ہے۔بڑے بیٹے کا نام بھول گیا ہے۔ شاید عثمان ہے؟ اللہ انہیں زندگی دے اور ماں باپ کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے۔آمین۔

ناروے والوں کا شکوہ کئی سال سے چلا آ رہا تھا کہ ہم نے ابھی تک ناروے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔خاص طور سے ہمارا یار محمد احمد منیر تو بہت ناراض رہتا ہے حالانکہ ہم اس کی اقتدا میں بہت نمازیں پڑھ چکے ہیں۔ چلئے اب وہ شکوہ ڈھل جانا چاہئے مگر اس سفر میں ایک تاریخی واقعہ بھی ہوا ہم ہمیشہ اپنے شاگردوں کا شکوہ کرتے رہتے ہیں کہ وہ پہچاننے پر اصرار کرتے ہیں اور ہمارے حافظہ کا امتحان لیتے رہتے ہیں۔اس سفر میں اپنے ایک شاگرد کا سامنا ہوا۔وہ تعزیت کے لئے سعید انجم کے ہاں آیا تھا۔کسی نے تعارف کروایا۔ہم نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا کہ وہ ہمارا شاگرد بھی تھا اور محلہ دار بھی۔دو برس ہم دارالبرکات میں اس کے محلہ دار رہے تھے اور دو برس ہی وہ عزیز ہمارا شاگرد بھی رہا تھا۔ہم نے پوچھا خاکسار ٹھیک ہو؟ ابا راضی ہیں؟ کہنے لگا معاف کیجئے میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔لا حول ولا قوۃ۔ہم اس کا منہ دیکھنے لگے۔یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہمارے کسی شاگرد نے ہمیں نہ پہچانا ہو یا پہچاننے سے انکار کر دیا ہو۔ہم بہت خفیف ہوئے۔مجلس میں کسی حاضر شخص نے ہمارا تعارف کروایا تب بھی ان کے چہرے پر اعتنا کی کوئی دھاری نمودار نہ ہوئی۔معلوم ہوا اپنے ابا سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔یہ 1952 کی بات ہے ہم نور ہسپتال میں کلرک تھے۔ایک صاحب جواب جرمنی میں مقیم ہیں اپنے کسی بچے کی دوا لینے کے لئے ہسپتال تشریف لائے۔پرچی پر نام لکھنا اور پرچی کو درج کرنا ہمارا کام تھا۔ہم نے پوچھا مریض کا کیا نام ہے؟ سوچ میں پڑ گئے ماتھے پر ہاتھ مار کر بولے براہونسیان کا

بچوں کے نام بھی یاد نہیں رہتے۔ہم نے پرچی پر دختر فلاں یا پسر فلاں لکھ دیا۔دوائی وغیرہ لینے کے بعد تشریف لائے کہنے لگے ہاں نام یاد آ گیا ہے لکھ لیجئے۔ یہ حضرت انہیں صاحب کے صاحبزادے تھے باپ پر پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ یہاں تھوڑا تھوڑا کیا پورا پورا سے بھی آگے کا مقام تھا۔ جرمنی گئے تو انہی بزرگ کی طرف سے ان کی کتاب کسی دوسرے کے ہاتھ تحفۃً موصول ہوئی۔ہم نے رسید بھیجی تو لکھا الحمدللہ کہ آپ کو ہمارا نام یاد رہ گیا ورنہ آپ کے خلف الرشید تو ہمارا نام بھولے بیٹھے ہیں۔ ناروے کے ساتھ یہ تاریخی یاد بھی وابستہ ہے جو ناروے کو کبھی بھولنے نہیں دے گی۔

سر بریدہ کی واپسی

بات سجاد ملک کے ٹیلیفون سے شروع ہوئی اور ہوتے ہوتے ہمارے کینیڈا کے دوسرے سفر تک پہنچ گئی۔ ہمیں قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ اتنی جلدی ہمیں دوبارہ کینیڈا لے جانے کا بندوبست کر دے گا۔اس کی قدرتیں بھی عجیب ہیں اور انسان چاہے بھی تو اس کی بے انتہا مہربانیوں کرم فرمائیوں کا احاطہ نہیں کرسکتا وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا۔

ایک روز اچانک سجاد ملک کا کینیڈا سے فون آیا کہ وہ چوہدری محمد علی صاحب کو اور ہمیں کینیڈا بلانا چاہتا ہے ہمیں فرصت ہے؟ ہم نے کہا فرصت؟ تم بلا کے تو دیکھو ہم کیسے اڑ کر پہنچتے ہیں۔ چنانچہ لندن کا ویزا لگوا کر اپنی طرف سے تیار ہو گئے لندن کا ویزا اس لئے کہ کینیڈا والوں نے یہاں اسٹاک ہالم میں اپنا سفارت خانہ تو کھول رکھا ہے مگر ویزا سیکشن لندن میں ہے وہی اپنے سکھ بھائی بندوں کی طرح کہ کالج لاہور میں بنایا تھا تو کالج کا ہوسٹل امرتسر میں کھول دیا تھا کہ کسی بھائی کی حق تلفی نہ ہو۔کینیڈین حکومت نے بھی ایسا ہی انتظام کر رکھا ہے۔سفارت خانہ اسٹاک ہالم میں اور ویزا سیکشن لندن میں۔

پھر ایک روز اچانک عزیزی نعیم کا جرمنی سے فون آ گیا کہ آپ کینیڈا جانے کو تیار ہیں؟ ہم نے کہا تیار سے تیار ہیں۔ اس نے کہا تو آپ فوراً لندن پہنچیں اور مکرم چوہدری محمد علی صاحب کا ویزا لگوائیں کیونکہ کینیڈا والوں نے ویزا لگانے سے انکار کر دیا ہے۔ ہم نے سوچا ہم چوہدری صاحب کے ویزا کا کیا انتظام کریں گے اسی بہانہ لندن چلتے ہیں وہاں جماعت برطانیہ چوہدری صاحب کے ساتھ جو شام منانے کا اہتمام کر رہی ہے اس میں شرکت کریں گے چوہدری صاحب سے ملاقات بھی ہو جائیگی ہم خرما و ہم ثواب۔ لندن پہنچے چوہدری صاحب سے ملے ابھی ان کے کمرہ ہی میں بیٹھے تھے کہ مکرم بشیر الدین سامی صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ مکرم امیر صاحب فرماتے ہیں کہ اگر زحمت نہ ہو تو ذرا سی دیر کو تشریف لائیں۔ ہم نے سوچا کہ مکرم امیر صاحب تو قبلہ قاضی محمد اسلم کے ناطے سے ہمیں خوب جانتے ہیں اس طرح تکلف سے بلانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ بہر حال حاضر ہوئے۔ ایمبیسیڈر آفتاب احمد خاں صاحب فرمانے لگے آج چوہدری محمد علی صاحب کے ساتھ ایک شام کا اہتمام ہے۔ کیا آپ اس مجلس میں چوہدری صاحب کا تعارف کروا سکیں گے؟ ہم نے کہا کیوں نہیں۔ پھر ہم نے قبلہ امیر صاحب کو بتایا کہ مکرم بشیر احمد رفیق صاحب اس بارے میں کل شب ہی ہمیں حکم دے چکے ہیں کہ ہم لندن ذرا سوچ سمجھ کر آئیں کیونکہ ہمیں چوہدری صاحب کا تعارف بھی کروانا ہوگا لہٰذا ہم نہ صرف تیار ہیں بلکہ اس حد تک تیار ہیں کہ چوہدری صاحب کا تعارفیہ لکھ بھی رکھا ہے۔ وہ تعارفیہ یہ ہمارے کام آ گیا چوہدری صاحب کا تعارف ہم کیا کرواتے کہ وہ اپنا تعارف آپ ہیں۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ اس تعارف کا ہمیں یہ فائدہ ہوا کہ سیدی حضرت اقدس کے جلو میں اسٹیج پر بیٹھنے اور حضور کے قرب سے متمتع ہونے کا موقع مل گیا قبلہ امیر صاحب تعارف کے ایسے موقعوں پر ہمیں یاد کر لیا کریں ہم سر کے بل آئیں گے آزمائش شرط ہے۔ ہم نے ایک روز قبل قبلہ محترم مولینا محمد احمد صاحب جلیل مدظلہ کا ویزا

لگوایا تھا اگلے روز چوہدری صاحب کے ویزے کے لئے پہنچے تو امیر صاحب کینیڈا کی طرف سے تاکیدی فیکس بھی پہنچ چکا تھا قبلہ چوہدری صاحب کا ویزا بھی لگ گیا اوران لوگوں نے چوہدری صاحب سے ویزے کی جو فیس وصول کی تھی وہ بھی واپس کر دی۔ہم نے کہا اب قابو آئے ہو نا کینیڈا والو! محترم چوہدری صاحب کا ویزا لگنے کی دیر تھی کہ ہم نے سیدنا حضرت اقدس کی خدمت میں اجازت کی درخواست پیش کر دی حضور نے از راہ بندہ پروری اجازت مرحمت فرما دی صرف اتنی پابندی لگائی کہ ویک اینڈ سے پہلے سفر نہ کریں۔ہم نے خوش خوش چوہدری صاحب کو حضور کی اجازت کا فرمان سنایا تو چوہدری صاحب حسب دستور سابق پسر گئے کہ وہ خود حضور سے اجازت طلب کریں گے تب اپنا پروگرام معین کریں گے۔ چوہدری صاحب نے خدا جانے کیا اجازت طلب فرمائی اور کیسے فرمائی کہ حضور کا ارشاد آیا جب تک اپنا کام مکمل نہیں کر لیتے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چلئے چھٹی ہوئی جب تک چوہدری صاحب اپنا کام ختم نہیں کریں گے جا نہیں سکتے اور کام ختم کرنا چوہدری صاحب کی سنت جاریہ نہیں۔ہم سویڈن سے جا کر لندن میں بیٹھے تھے گویا مسلسل سفر میں تھے اب دو ہی صورتیں تھیں یا تو ہم واپس سویڈن آ جاتے اور پھر چوہدری صاحب کا کام ختم ہونے پر دوبارہ رخت سفر باندھتے یا سیدھے کینیڈا چلے جاتے اور وہاں بیٹھ کر چوہدری صاحب کی آمد کا انتظار کھینچتے عزیزی نعیم سے مشورہ مانگا تو اس نے کہا آپ سیدھے کینیڈا چلے جایئے عزیزی سید شکیل احمد برطانیہ ہی میں ہے وہ دو دن میں کینیڈا کے کاغذات پہنچا دے گا چنانچہ عزیزی شکیل ہمارا کینیڈا کا پروانہ لے کر برمنگھم پہنچ گیا اور تیسرے روز ہم ٹورنٹو پہنچ گئے ہمیں اللہ تعالیٰ کی مہربانی کے سوا اور کچھ سمجھ نہیں آئی کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ بات سجاد ملک کے فون سے شروع ہوئی ہیمبرگ سے کسی اور نے لندن جانے کو کہا اور فرینکفرٹ سے کوئی اور ہمارا کینیڈا کا پروانہ لے کر برمنگھم پہنچ گیا۔کارساز ما بہ فکر کار ما۔

عزیزی مہدی تو ہمارے پہنچنے کے دو چار دن بعد ہی جرمنی بھاگ لیا کیونکہ اسے وہاں جرمنی کے جلسہ میں تقریر کرنا تھی مگر ہمیں بھی اللہ تعالیٰ نے فارغ نہیں بیٹھنے دیا۔ ایڈمنٹن البرٹا سے کہ کینیڈا کا 'تیل کا کنواں' کہلاتا ہے عزیزی ہشام ملک کا فون آیا کہ کیا آپ اب کے برس ہمیں خدمت کا موقعہ نہیں دیں گے؟ ہم نے کہا کیوں نہیں دیں گے تم آزما کے تو دیکھو۔ دوسرے دن ہی ایڈمنٹن جانے کا انتظام ہوا اور تیسرے دن ہم ایڈمنٹن پہنچ گئے۔ مری گرانی رفتار پر نہ کر تنقید۔ تو دیکھ یہ میں کہاں آ گیا کہاں سے چلا۔ ایڈمنٹن میں عزیزی ہشام ملک تو خیر ہمارا شاگرد تھا۔ زیادہ کھدبد اپنے دوست مرزا محی الدین سے ملنے کی لگی ہوئی تھی کیونکہ یہ شخص اچھا بھلا بیالوجی کے کسی میدان میں پی ایچ ڈی تھا اب سننے میں آیا تھا کہ ہومیوپیتھی کے کسی میدان میں بھی پی ایچ ڈی کی ڈگری لئے بیٹھا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ اس کے طور اطوار دیکھیں کہ ہومیوپیتھی نے اس بھولے بھالے (اس میں بھلا مسکرانے کی کیا بات ہے؟) شخص پر کیا اثرات مرتب کئے ہیں؟

ایڈمنٹن پہنچے تو سب سے زیادہ خوشی قبلہ پروفیسر مرزا منظور احمد صاحب سے مل کر ہوئی۔ مرزا صاحب ہمارے استاد پروفیسر صوفی بشارت الرحمن مرحوم کے برادر نسبتی ہیں۔ مگر انہیں قبلہ صوفی صاحب کے مزاج سے دور کی نسبت بھی نہیں۔ نہایت خندہ رو اور خندہ پرور شخصیت نکلے۔ ہمیں اس لئے بھی اچھے لگے کہ ہمارے ساتھ ذرا سی بھی شناسائی نہیں تھی اس کے باوجود ملنے کے لئے تشریف لائے اور ٹوٹ کر ملے فرمانے لگے بس آپ سے الفضل کا رشتہ ہے ورنہ اس سے پہلے ہم کبھی نہیں ملے۔ قبلہ مرزا صاحب کی زندہ دلی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا ملنے کے بعد اندازہ ہوا کہ لوگ دوسروں کے مزاج کا صرف ایک ذرا سا ادراک ہی حاصل کر پاتے ہیں اصل جوہر تو عندالملاقات ہی کھلتے ہیں۔ مرزا صاحب سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اے کاش ان سے اور ملنا ہوتا اور ملنا ہوتا۔ بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر۔ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ اللہ تعالیٰ انہیں خوش و خرم اور صحت و سلامتی سے

رکھے۔آمین۔(اس کتاب کے مرتب ہوتے وقت مرزا صاحب وہاں چلے گئے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا)۔الفضل کی قوت کا بھی اس روز اندازہ ہوا کہ یہ بظاہر چھوٹا سا پرچہ کتنا بے پناہ توانا پرچہ ہے۔مقبول چوہدری صاحب بھی تھےمقبول صاحب کے بارے میں ہشام نے پوچھا آپ انہیں پہچانتے ہیں؟ میں نے کہا صورت شناسا ہے باجوہ خاندان میں سے لگتے ہیں وہ واقعی باجوہ خاندان میں سے تھے اور خود ان کے قول کے مطابق سکول کے زمانہ میں یعنی 1957-1958 ہمارے اتنے سے شاگرد رہے تھے کہ انہیں یہ ضرور یاد تھا کہ ہم کلاس میں سوائے شعر سنانے کے اور کوئی کام نہیں کیا کرتے تھے ہم نے جھٹ اپنے اس گناہ کا اعتراف کیا اور انہیں اپنا سچ مچ کا شاگرد مان لیا مقبول صاحب تو بہت دلچسپ نکلے ان کے جوہر اگلے روز کھلے جب ہمیں ان کے ساتھ کینیڈین راکیز کے طویل سفر کی رفاقت اختیار کرنا پڑی یہ شخص تو مروت اور خلوص کا پتلا نکلا (یہ لفظ زبر سے بھی پڑھا جاسکتا ہے) ہمارے دوست مرزا محی الدین کی ہومیوپیتھی کا امتحان بھی ہوگیا۔مقبول نے از راہ تفنن مرزا صاحب سے کہہ دیا کہ کوئی ایسی دوا ایجاد نہیں ہوئی جس سے بیوی مطیع وفرماں بردار بن جائے؟ مرزا صاحب نے کہا کیوں نہیں میں نہ صرف ایسی دوا ایجاد کر چکا ہوں بلکہ میری جیب میں بھی موجود ہے آپ چاہیں تو آج ہی آزما بھی سکتے ہیں۔ ہمارا جی تو چاہا کہ محی الدین سے پوچھیں یہ دوا صرف دوسروں کی بیویوں پر کیوں اثر کرتی ہے؟ مگر ہم چاہتے تھے کہ ذرا بات بڑھے تا کہ مرزا محی الدین کی ہومیو پیتھی کے کچھ اور گوشے سامنے آئیں مگر معلوم ہوتا ہے مقبول صاحب اسی ایک نسخہ پر مطمئن ہو گئے تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا۔ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی تھا۔

ہشام ہمارے بزرگ مکرم ومحترم ملک سیف الرحمن مرحوم مفتی سلسلہ عالیہ احمدیہ کا بیٹا ہے۔نہایت زندہ دل اور شوخ۔ کہنے لگا ہم آپ کے شاگرد تو رہے ہیں مگر ہمیں آپ کی باتیں کبھی سمجھ نہیں آتی تھیں۔ ہم نے کہا درست کہتے ہو جس کچی عمر میں تم ہمارے شاگرد رہے ہو ہماری پکی باتیں تمہیں کہاں سمجھ

آتیں؟ اگر سمجھ میں آ گئی ہوتیں تو آج اس احترام سے نہ ملتے جس احترام سے مل رہے ہو۔ دلیل اس بات کی یہ ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کے قول کے مطابق غالب واحد شاعر ہے کہ جس کا کلام سمجھ میں نہ آئے تو دونا مزا دیتا ہے۔ ہماری استادی کا بھی یہی عالم رہا ہے۔ جن شاگردوں کو ہماری باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں وہ ہمارے زیادہ گرویدہ ہوتے تھے۔ ہم شاگردوں کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت ہی خوش نصیب رہے ہیں اور ہیں۔ ملک صاحب سلسلہ کے مفتی تھے۔ جامعہ کے پرنسپل بھی رہے۔ سلسلہ کے بزرگوں میں سے تھے مگر ہمارے ساتھ ہمیشہ محبت کا سلوک فرماتے تھے فرماتے تھے تم میرے بیٹوں کے استاد ہو اس لئے میرے دل میں تمہارا بہت احترام ہے اب ایسی محبتیں کرنے والے لوگ کہاں ہیں؟

کینیڈین راکیز کی سیر پر روانہ ہوتے ہوئے یہ طے پایا تھا کہ راستہ میں کھانے پینے کا جو سلسلہ ہوگا اس کی ذمہ داری مرزا محی الدین پر ہوگی۔ چنانچہ یہ سوچ سوچ کر جان ہلکان ہوتی رہی کہ کہیں ایسا نہ ہو کھانے کا وقت ہو تو مرزا محی الدین جیب سے ہومیوپیتھی کی کوئی شیشی نکالیں اور کہیں حضرات ناشتہ تناول فرمایئے اور ہتھیلی پر کوئی کینیڈین 'کیورینو' قسم کی گولیاں رکھ دیں کہ نوش جان فرمایئے۔ کھائی نہ جا سکیں تو ان کا سونگھنا بھی مفید ہوتا ہے۔ مگر اللہ نے بچا لیا۔ محی الدین نے پراٹھے پکوا رکھے تھے۔ دو تین قسم کا سالن بھی بندھا ہوا تھا۔ چائے بھی تھی اور اس بات کے علی الرغم تھی کہ محی الدین خاندانی طور پر چائے سے بیزار ہے۔ سفر پر روانہ ہوئے تو طے پایا کہ اولیں پڑاؤ پر رک کر ناشتہ کیا جائیگا چنانچہ اولیں پڑاؤ پر ہی ہم سب لوگ ناشتہ سے کیا دوپہر کے کھانے سے بھی فارغ ہوئے۔ کینیڈین راکیز کے سلسلہ میں سیر کرتے ہوئے ہم لوگ جاسپر پارک کے ایک مقام پر رکے اور کیبل کار کے ذریعہ 'سیٹیاں بجانے والے' پہاڑ کی چوٹی تک بھی گئے راکیز کے سلسلہ کی یہ اونچی چوٹی دور دور تک کے مناظر پر محیط ہے پھر

واپسی کا سفر شروع کیا تو سلسلہ در سلسلہ پہاڑوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے کولمبیا گلیشیر کے دامن تک پہنچ گئے راستہ میں ایک منی سی آبشار بھی دیکھی منی سی اس لئے کہ نیا گرا فالز دیکھنے کے بعد اس آبشار کو منی سی فال ہی لگنا تھا۔جھیلوں اور پہاڑوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے ہم لوگ رات کے کھانے سے پہلے مقبول صاحب کے گھر پہنچ گئے اور مرزا محی الدین کی دوا استعمال نہ کرنے کے باوجود نہایت تپاک استقبال سے دوچار ہوئے مسز مقبول نہایت سمجھدار اور مہمان نواز خاتون نکلیں۔تب ہمیں معلوم ہوا کہ مقبول صاحب راستہ بھر جو قصیدہ پڑھتے رہے وہ محی الدین کی ہومیوپیتھی کی آزمائش کے لئے تھا اور بس ہمیں مقبول کی یہ ادا بہت پسند آئی۔میاں بیوی میں محبت بڑھانے کا یہ ایک نسخہ بھی بہت مفید ہوتا ہے اور زود اثر۔کسی ہومیوپیتھی کی دوائی کی ضرورت نہیں ہوتی!

اپنے بزرگ دوست تیمور احمد چغتائی صاحب سے ملنے کے لئے میں خود ان کے در دولت پر حاضر ہوا تیمور صاحب لاہور پنجاب گورنمنٹ کے سیکریٹریٹ میں انڈر سکریٹری رہے۔پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں اس کمیشن کے نہایت ابتدائی زمانہ میں ڈائریکٹر فنانس رہے اور خدا معلوم کہاں کہاں رہے مگر احمدی رہے۔ہر احمدی کی مدد کرنا اپنا فرض جانا اور اس فرض سے عہدہ برآ ہوتے رہے۔ہمیں ان کی نوازشوں کا اندازہ تب ہوا جب خود ہمیں کالج کے نیشنلائز ہونے کے بعد حکومتی سرخ فیتہ کے تلخ تر تجربات ہونا شروع ہوئے قبلہ صوفی بشارت الرحمن صاحب کے استعفیٰ اور استعفیٰ کی واپسی کے زمانہ میں تو ہمارا لاہور کے قیام کا اکثر حصہ تیمور صاحب کے دفتر میں گزرتا رہا تیمور صاحب چونکہ اس مشین کا حصہ تھے اس لئے دفتری اونچ نیچ سے خوب آگاہ تھے ان کی راہنمائی کے بغیر سیکریٹریٹ میں ایک قدم چلنا بھی دشوار تھا تیمور صاحب نے اپنی خدمات کا دروازہ کسی پر کبھی بند نہیں کیا ہر احمدی ان کے دفتر میں جاتا اور ان کی شفقتوں سے متمتع ہوتا تھا ہم نے خود کئی ایسے ضرورت مندوں کو تیمور صاحب کے پاس

بھیجا جن کی تیمور صاحب سے ذرا سی شناسائی بھی نہیں تھی مگر تیمور صاحب نے ان کی پذیرائی میں کبھی تساہل نہیں کیا۔ فجز اہ اللہ احسن الجزاء۔ تیمور صاحب کی بہو عزیزہ نسیم تو ہماری بھانجی ہے اس کے اصرار پر ہم اس کے گھر کھانا کھانے بھی گئے۔ جہانگیر سے بھی ملاقات ہو گئی۔ یک پنتھ دو کاج۔ ٹورنٹو سے چلتے ہوئے سید حسنات احمد نے ایک لفافہ ہمارے حوالہ کیا تھا کہ سید حمید احمد صاحب کو پہنچا دیں۔ حمید ہمارے لاہور کے زمانہ کے دوست ہیں اردو کے نامور ادیب سید شفیع احمد دہلوی کے اور اپنے شوہر سے بھی زیادہ نامور ماں یعنی بیگم شفیع کے بیٹے ہیں۔ سید حمید احمد تکلیف فرما کر کہیں باہر دور سے ہمیں ملنے کے لئے تشریف لائے وہی کھلکھلاتا مسکراتا چہرہ لاہور کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ہم بیگم شفیع کی خدمت میں حاضر ہوتے تو وہ اپنے بیٹے کا دوست ہونے کے ناطے ہم پر بہت شفقت فرماتیں۔ ان کا دستکاری پریس آڑے وقت میں جماعت کے بہت کام آتا رہا۔ میکلیگن روڈ پر حمید کی رہائش تھی یا پریس تھا بہر حال حمید اور میکلیگن روڈ سے وابستہ یادیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں۔ حمید سے مل کر بہت سی پرانی باتیں یاد آ گئیں جن کے دہرانے کا موقعہ ہے نہ محل۔ چھوڑیئے رات گئی بات گئی۔

جماعت احمدیہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ قادیان کے ایک قصبہ سے اٹھنے والی تحریک اس وقت سارے عالم پر محیط ہے اور دنیا کے ہر ملک میں احمدی آباد ہیں اور اپنے اپنے ملک کے وفادار شہریوں کی حیثیت سے زندگی کر رہے ہیں کہ یہی احمدیت کے بانی کی تعلیم ہے۔ اس کتاب کا موضوع احمدیوں کے سماجی، معاشرتی اور دینی رویوں کا جائزہ لینا ہے اس جائزہ کی بنیاد قادیان اور ربوہ کے ماحول کے مطالعہ پر رکھی گئی ہے۔ وہ ماحول کیا تھا اس میں کیسے لوگ بستے تھے اور ان کی زندگی کا محور کیا تھا۔ وہ لوگ بنیادی اسلامی اخلاق سے متصف تھے اور یہی ورثہ تھا جسے وہ اپنی نسلوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔

رانا عبدالرزاق خان، لندن کی عنقریب شائع ہونے والی کتاب

برگزیدہ شجر

مضامین

حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکیؓ

مرتّبہ

رانا عبدالرزاق خان، لندن

جلد شائع ہونے والی کتب

1۔ برگزیدہ شجر۔ 2۔ عندلیب گلشن احمد۔ 3۔ رجل خوشاب۔ 4۔ میرے دوست احباب

URDU ADAB KA CHAND

تعارف مصنّف

رانا عبدالرزاق خاں

پیدائش۔ 13اپریل 1951۔ چک نمبر 2TDA ضلع خوشاب۔

تعلیم۔میٹرک، ایف اے تعلیم الاسلام سکول وکالج ربوہ۔۔بی اے پنجاب یونیورسٹی لاہور

1972. ملازمت۔۔سپروائزر۔پیکیجز بورڈ ملز لاہور۔زعیم۔خدام الاحمدیہ حلقہ جنرل ہسپتال قیادت ماڈل ٹاؤن لاہور

1975 بحرین عربین گلف روانگی بطور ایگریکلچر اسسٹنٹ بحرین۔وہاں نو سال سیکٹری مال جماعت کام کی توفیق ملی۔

شادی 28نومبر 1977 ربوہ۔۔سسر چچا جان ناصر احمد بہادر شیر افسر حفاظت خاص۔۔شمولیت حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ

1984 میں والد صاحب کی وفات پر تقرری نمبر دار چک نمبر 2TDA ضلع خوشاب۔

1985 قائد خدام الاحمدیہ ضلع خوشاب۔1989 صدر جماعت احمدیہ چک نمبر 2TDA ضلع خوشاب مسلسل 2005 تک صدر رہے۔16 سال۔

1995۔ناظم مجلس انصاراللہ ضلع خوشاب وشمولیت ممبر شوریٰ مرکزیہ۔سیکٹری دعوت الی اللہ ضلع خوشاب 1997۔۔ذیابیطس کی بیماری لگی۔

2001۔انتخاب بطور امیر ضلع خوشاب۔ 2005۔روانگی لندن۔رضا کارانہ خدمت شعبہ عمومی مجلس انصاراللہ مرکزیہ عرصہ دس سال۔

2009 مجلس شعروسخن کا قیام بوساطت محترم مبارک صدیقی صاحب

2010۔کالم نگاری یوکے ٹائمز۔۔۔ایڈیٹر گوشہ ادب یوکے ٹائمز۔۔۔اخبار احمدیہ یوکے کے ادارتی بورڈ میں شمولیت۔جو کہ آج تک ہے۔

2012۔ معاون صدر TICOSA UK 2013۔قندیل ادب انٹرنیشنل کا اجرا جنوری سے شروع۔

2014۔سیکرٹری تجنید TICOSA UK ساری تجنید مرتب کی۔رسالہ قندیل حق کا جنوری 2018 میں اجرا کیا۔

2015۔جنرل سیکرٹری TICOSA UK مشاعرے اور دورہ جات کروائے۔

2017۔جنرل سیکرٹری TICOSA UK۔دو کتب کی اشاعت۔قندیل حق 500 صفحات۔قندیل علم۔506 صفحات

2018۔تیسری کتاب کی اشاعت ہوئی۔دانشکدہ عظیم 600 صفحات۔ایک دینی میگزین، قندیل حق سہ ماہی شروع کیا گیا۔

2020۔چوتھی کتاب کی اشاعت۔۔سپوت ایشیا۔630 صفحات 2022۔پانچویں کتاب۔تاریخ کا ٹھگرڑھ 500۔صفحات

2023۔چھٹی کتاب بہادر شیر مرحوم۔صفحات 100۔ساتویں کتاب نافلہ مہدی ایم ایم احمد صاحب۔قندیل ادب انٹرنیشنل کے دس سال مکمل۔

آٹھویں کتاب مجموعہ کلام (قندیل صحرائی) کے نام سے شائع ہونے کو تیار ہے۔

اس عرصہ میں رانا عبدالرزاق خاں نے تین صد سے زائد مشاعرے کروائے۔جس میں ہزاروں شعراء نے شمولت کی۔زوم پر بھی مشاعرے کروائے گئے۔

2023 نویں کتاب... موسیقارِ دربارِ خلافت ثاقب زیروی کی سوانح تحریر کی۔دسویں کتاب قائداعظم کا دستِ راست۔۔چوہدری ظفراللہ خان

2024 تذکرہ شعرائے حق، سیرت ڈاکٹر عبدالسلام، تاریخ مسجد فضل لندن، سیرت سوانح خالد احمدیت مولانا عبدالرحمٰن صاحب خادم، سیرت سوانح قاضی ظہورالدین اکمل صاحب

زیر ترتیب ہیں۔۔۔نیز قندیلِ حق کے 30 رسالے نکال چکے ہیں۔

Written by:

Rana Abdul Razzaq Khan, London